مولوی خدا بخش خاں

حیات اور کارنامے



خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری۔ پٹنہ

مولوی خدابخش خاں

حیات اور کارنامے

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری۔ پٹنہ

نام کتاب : مولوی خدا بخش خاں : حیات اور کارنامے

Maulvi Khuda Bakhsh Khan
Life and Achievements

اشاعت : ۲۰۰۱ء
قیمت : ۔/۲۵۰ روپے
غیر ممالک کے لیے : بارہ ڈالر

ناشر: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۔ ۴
پروڈکشن: اپلائڈ پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ، نئی دہلی۔110002 فون:3289268
مطبع: اصیلہ آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی

فہرست

☆☆☆



حرفِ آغاز

علمی اور ادبی حلقوں میں مولوی خدابخش خاں مرحوم کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ اس بین الاقوامی شہرت یافتہ کتابخانہ کے بانی ہیں۔

خدابخش خاں کو علم کا ذوق اور کتابوں کا شوق اپنے والد محمد بخش خاں صاحب سے ورثے میں ملا تھا۔ جنھوں نے اپنے ذاتی ذخیرۂ کتب سے اپنے آبائی وطن چھپرہ ضلع (سارن) بہار میں محمدیہ کتب خانہ قایم کیا۔ یہ ۱۸۴۸ء کی بات ہے۔ ۱۸۵۳ میں آپ ترک سکونت کر کے مع اہل وعیال پٹنہ تشریف لے آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ ان ہی کے ساتھ محمدیہ کتب خانہ بھی پٹنہ منتقل ہوگیا۔ ۲/اکتوبر ۱۸۷۶ء کو محمد بخش خاں کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد ان کا کتب خانہ ترکے میں ان کے بڑے بیٹے خدابخش خاں صاحب ایڈوکیٹ کے حصہ میں آیا۔ انھوں نے اس کی نہ صرف دل وجان سے حفاظت کی، بلکہ اس میں وقیع اضافے بھی کیے۔ آپ کا رجحان مطبوعات سے زیادہ قلمی نسخوں کی طرف تھا۔ چنانچہ انھوں نے نہ صرف ہندوستان، بلکہ بیرون ممالک سے بھی انتہائی نادر و نایاب مخطوطات حاصل کیے۔ کتابیں جمع کرنے کا ان کا یہ شوق بڑھتے بڑھتے عشق کی حدود میں داخل ہوگیا، چنانچہ اپنی یافت کا بیشتر حصہ وہ اسی کی نذر کرنے لگے۔ انھوں نے محمدیہ کتب خانہ کے ذخائر میں بے پناہ اضافہ کیا اور اس کا فیض عوام وخواص سب کے لیے عام کردیا۔ اور ۱۴/جنوری ۱۸۹۱ء کو ایک وقف نامہ کے ذریعہ باقاعدہ اسے عوام کے لیے وقف کردیا۔ ۵/اکتوبر ۱۸۹۱ء کو اورینٹل پبلک لائبریری، کی حیثیت سے باقاعدہ اس کا افتتاح ہوا۔ سرچالس ایلیٹ(Sir Charles Elliot) کے مبارک ہاتھوں سے افتتاح کی رسم ادا ہوئی۔ آج کل یہ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری کے نام سے چاردانگ عالم میں مشہور ہے۔

۱۹۶۹ء میں پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت حکومتِ ہند نے اسے قومی اہمیت کا ادارہ تسلیم کرکے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس طرح اس کی مزید ترقی کی راہ ہموار ہوئی۔

مولوی خدابخش خاں کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے، پیشہ کے لحاظ سے وہ

وکیل تھے۔ وہ تین سال تک دکن ہائی کورٹ حیدرآباد کے چیف جسٹس بھی رہے۔ وہ علم کے دلدادہ تھے، کتابوں کے عاشق تھے، ادیب تھے، شاعر تھے، سماجی کارکن تھے اور سب سے بڑھ کر ایک اچھے اور مخلص انسان تھے۔ ان ہی صفات کے سبب وہ عوام وخواص میں بے حد مقبول اور ہردلعزیز تھے۔ ان کے نیازمندوں اور دوستوں کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ حکومت نے بھی انھیں مختلف اعزازات سے نوازا تھا۔ آپ کی حیات میں ہی آپ کے احباب نے آپ کے گوناگوں اوصاف کو ضبط تحریر میں لانا شروع کردیا تھا۔ آپ کی وفات (۳/اگست ۱۹۰۸ء) کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور تا ہنوز جاری ہے۔ ہمارے مصنفین اور سوانح نگاروں نے مولوی خدا بخش کے ساتھ ان کی زندہ یادگار یعنی خدا بخش لائبریری کو بھی موضوع بحث بنایا اور کثرت سے مضامین لکھے۔ لیکن یہ تمام تحریریں اور مضامین مختلف رسالوں اور کتابوں میں منتشر ہیں۔ عام قاری کو اول تو ان کا علم ہی نہیں ہے اور اگر حسن اتفاق سے کسی تحریر کا علم ہو بھی جائے تو اس کو تلاش اور اس کتاب یا رسالہ کو حاصل کرنا، اکثر و بیشتر جوئے شیر لانے کے مترادف ہو جاتا ہے۔ لہٰذا قارئین کی سہولت کی خاطر لائبریری نے یہ فیصلہ کیا کہ ایسی تمام تحریروں کو یکجا کر کے کتابی شکل میں شایع کر دیا جائے۔ یہ تحریریں اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں ہیں۔ ان کو زبان کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ تین جلدوں میں شایع کرنے کا منصوبہ ہے۔ اس سلسلہ کی پہلی جلد جس میں اردو کے مضامین شامل ہیں، قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ بقیہ دونوں جلدیں بھی ان شاء اللہ جلد منظر عام پر آجائیں گی۔ اِس جلد میں پہلے حصہ کے طور پر مولوی خدا بخش خاں صاحب سے متعلق مضامین ہیں، دوسرے حصہ میں خدا بخش لائبریری پر تحریریں ہیں۔ جب کہ تیسرا حصہ منظومات کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ اس میں چند فارسی کی نظمیں بھی شامل کرلی گئی ہیں۔ امید ہے قارئین ہماری اس کوشش کو بنظر تحسین دیکھیں گے اور لائبریری کی دیگر مطبوعات کی طرح اسے بھی حسن قبول نصیب ہوگا۔

محمد ضیاء الدین انصاری
ڈائرکٹر

خدابخش لائبریری کا قیام

پہلا سال

قیامِ کتاب خانہ کے سلسلے میں بانی کتاب خانہ کی تقریر: اکتوبر ۱۸۹۰ء

''کل ۵ ر اکتوبر کو صبح کے آٹھ بجے ایک جلسہ بغرض انتظام کتب خانہ خان بہادر مولوی خدابخش خاں صاحب بمکان کتب خانہ مذکور واقع محلہ چوہٹہ، بانکی پور، منعقد ہوا۔ معززین حضار جلسہ کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو ہوگی۔ بہ اتفاق رائے جناب سید بادشاہ نواب صاحب خلف اکبر نواب سید لطف علی خاں صاحب مرحوم، رونق افروز کرسیٔ صدارت ہوئے۔ پہلے جناب خان بہادر مولوی خدابخش خاں صاحب نے ایک دلچسپ و مؤثر تقریر کی (خان صاحب کی تقریر بہ دلچسپی ناظرین کے لیے بجنسہ وبلفظہ ذیل میں درج کرتے ہیں)۔ بعدہٗ سید محمد خاں صاحب بہادر ڈپٹی مجسٹریٹ نے خاں صاحب ممدوح کی تقریر کی تائید کی اور فرمایا کہ اس کتب خانہ کے آئندہ مصارف کے لیے کوئی سامان ضرور ہونا چاہیے۔ ہماری قوم اس کا سامان نہ کرے تو اس کے لیے نہایت شرم کی بات ہے۔ اس کے بعد خان بہادر مولوی سید فضل امام صاحب وائس چیئر مین نے فرمایا کہ میں بھی اپنی کل کتابیں جو کچھ میرے پاس موجود ہیں اس کتب خانہ میں دے دوں گا۔ جناب بابو گر پرشاد سین صاحب اور بابو گجادھر پرشاد صاحب وکیل نے بھی نہایت خوبی اور حسن بیان کے ساتھ یہ فرمایا کہ اس کتب خانہ کی بقا کے لیے سب قوموں کو کوشش کرنا چاہیے۔ جناب

بابوگرپرشادسین صاحب کی یہ تقریر نہایت دلچسپ تھی کہ علوم وفنون کی کتابیں
چاہے وہ کسی زبان میں ہوں کسی خاص قوم یا کسی خاص شخص کے لیے نہیں ہیں،
جب کہ یہ ایک ودیعت ہے موجودہ اور آئندہ نسل کے لیے۔ پس اس کی
حفاظت ہر فرد بشر اور ہر قوم و ہر ملت پر واجب و لازم ہے۔ اس کے بعد
حضرات حاضرین جلسہ نے فہرست چندہ پر دستخط کیے۔ چندہ کی فہرست انشاء
اللہ ہم آئندہ شائع کریں گے'' ۔ الپنچ

اے ہماری قوم کے اراکین اور اے ہمارے شہر کے اساطین! آپ لوگوں کا میں شکر گزار ہوں کہ آپ حضرات نے تکلیف فرما کر مجھے سرفراز فرمایا اور مجھے موقع ظاہر کرنے کا اپنے خیالات کے جو متعلق بہ انتظام آئندہ اس کتب خانہ کے ہے دیا۔ قبل عرض مدعا کہ مجھے تھوڑی سی حالت مسلمانوں کی جو قرن ثانی میں ہوئی اور مابعد کے قرون میں ہوتی گئی عرض کر دینی ضروری ہے تاکہ آپ حضرات کے ذہن مبارک میں یہ بات بخوبی آجائے کہ پیشینان اہل اسلام نے کس قدر محنت، مشقت سے تحصیل علم وفراہمی کتب کی۔ ابتداء میں قرن ثانی کے خلفاء بنی عباس نے اوّلاً تحصیل علوم کی توجہ فرمائی۔ ہارون الرشید نے بزور شمشیر اپنے معاصر قیصر روم سے یونانی زبان کی کتابیں لیں اور بہ استعانت علماء یہود ونصاریٰ یونانی زبان سے کتابیں عربی میں ترجمہ کرائیں اور خود مسلمانوں نے اس زمانے کی زبان یونانی سیکھ کر یونانی سے عربی میں کتابیں نقل کیں اور اس زمانے سے تاقتل خلیفہ مستعصم باللہ بغداد جو دارالخلافہ بنی عباس کا تھا، بڑا دارالعلم رہا۔ جس زمانے میں کہ بغداد میں خلفاء بنی عباس ترقی میں علوم وفنون کے مصروف تھے اس وقت میں ان کے معاصر خلفائے بنی فاطمہ نے مصر میں اور خلفائے بنی امیہ نے اندلس میں اس عمدہ کام کی کوشش میں کمی نہیں کی۔ فتنۂ ہلاکو خاں نے بغداد کو اور فرڈینینڈ اور ایزابیلا نے اندلس کو مٹا دیا۔ یہاں ایک حسرت انگیز واقعہ عرض کرنا ضروری ہے کہ جس کی جہت سے سیکڑوں برس کا ریاض ایک حیوانی صفت ظالم کے ہاتھ سے ضائع اور برباد ہوا جس کی حسرت آج تک نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ انیسویں صدی کے علماء یورپ کو بھی ہے۔ فرڈینینڈ نے اندلس کو اور خلفاء بنی

عباس کی مشقت کو ہلاکو نے دجلہ میں ڈبو دیا۔ وہ کتب خانہ عظیم الشان اندلس اور بغداد کا جن کی کتب کی تعداد میں ارباب سیر کو مبالغہ ہے حرق اور غرق ہوا۔ خلفائے بنی فاطمہ کا کتب خانہ مصر کا یوسف صلاح الدین کے ہاتھ سے منتشر ہوا۔ مگر کتابیں اس کی ہنوز کچھ جامع از ہر میں قاہرہ کے اور کچھ کتاب خانہ میں دمشق کے موجود ہیں۔ مجھ سے ایک سیاح نے عجیب واقعہ یہ بیان کیا کہ دو سو جلد کتابیں خلفائے بنی فاطمہ کے کتاب خانہ کی لندن کے کتاب خانۂ عمومیہ میں موجود ہیں۔ فی زمانا سوائے ان کتاب خانوں کے جو انگلینڈ اور یورپ کے بڑے بڑے شہروں میں ہیں، ...... بلاد اسلامیہ کے کتاب خانوں کی تفصیل یہ ہے: مکہ معظمہ میں ایک کتاب خانہ متعلق حرم کے ہے مگر اس کتاب خانہ میں نہ کتابوں کا عدد زیادہ ہے اور نہ بہت قدیم کتابیں ہیں۔ دو کتاب خانے اس وقت مدینہ طیبہ میں موجود ہیں۔ ایک قبۂ محمودیہ کا کتاب خانہ جس میں ہمارے ہندوستان کے میر عابد سندھی کی بھی کتابیں ہیں اور دوسرا کتابخانہ شیخ الاسلام کا۔ یہ دونوں کتاب خانے مل کر ایک مجموعہ دس بارہ ہزار جلدوں کا ہے۔ القاہرہ میں دو کتاب خانے ہیں۔ ایک جامع از ہر میں اور دوسرا کتاب خانہ عمومیہ جو باہتمام خدیو مصر ہے۔ ان دونوں کتاب خانوں کی کتابوں کے عدد میں نہیں کہہ سکتا۔ مگر البتہ کتابیں زیادہ ہیں۔ ساٹھ چھوٹے بڑے کتاب خانے قسطنطنیہ میں ہیں اور قیاس میرا یہ ہے کہ کشف الظنون عن اسامی الکتب و الفنون انہی کتب خانوں کی مجموعی فہرست ہے۔ دمشق کا کتاب خانہ جہاں تک میں اس کا حال دریافت کر سکا ہوں، اوّل درجہ کا کتاب خانہ بلاد اسلامیہ میں ہے۔ اس کتاب خانہ میں ابن عساکر کی تاریخ اسی جلدوں میں اور مختارنامہ کا نسخہ کئی جلدوں میں کامل ہے۔ ہندوستان میں ابراہیم عادل شاہ نے کتاب خانۂ نورس ترتیب دیا تھا کہ وہ بالکل مٹ گیا۔ بعضے نسخے اس کتاب خانہ کے اور بھی کتاب خانہ قطب شاہیہ کے اس کتاب خانہ میں فقیر کے موجود ہیں۔

بہترین کتاب خانہ ہندوستان میں بعہد شاہ جہاں مرتب ہوا۔ تین سو غلاموں کو کتابت سکھلائی گئی جو شاہ جہانی کتاب خانہ کے لیے کتابت کتابوں کی کرتے تھے۔ مگر یہ کتاب خانہ (جس میں کتابیں قریب پچاس جلدوں کے اس کتاب خانہ میں موجود ہیں) ہندوستان سے

روانہ ہوگیا۔ بارہویں صدی میں کتاب خانہ آصفیہ لکھنؤ میں نہایت عمدہ تھا۔ اس کتاب خانہ کی متعدد کتابیں اس مجموعہ میں ہیں مگر جہاں تک مجھ کو تحقیقات سے معلوم ہوا ہنگام غدر مجموعہ اس کتاب خانہ کا پریشان ہوگیا۔ غدر کے بعد ایک اچھا کتاب خانہ نواب کلب علی خاں مرحوم نے جمع کرلیا۔ اب اس کتاب خانہ کا انتظام کیا ہے میں کہہ نہیں سکتا۔ دہلی میں اس وقت کوئی مجموعہ کتابوں کا ایسا نہیں ہے، جس پر اطلاق اچھے کتاب خانہ کا ہو، اور نہ لکھنؤ میں، سوائے مرحوم مولوی حامد حسین کے کتاب خانے کے۔ کلکتہ جو حاکم نشیں اور گویا دارالسلطنت ہے اس میں صرف ایک کتاب خانہ متعلق باشیا ٹک سوسائٹی عربی و فارسی کا ہے، اس کتاب خانہ کی فہرست چھپ گئی ہے۔ البتہ اس میں کچھ یادگار چیزیں موجود ہیں۔ جہاں تک میری واقفیت ہے صوبہ بہار میں اب کوئی کتاب خانہ کہ جس میں قدیم تصانیف علماء اہل اسلام کی پائی جائیں اور ان کی یادگار تحریریں ان کتابوں پر ہوں، پایا نہیں جاتا۔ کتاب خانہ کی حاجت ہر پڑھی لکھی قوم کو عموماً اور فارسی عربی کتابوں کی مسلمانوں کو خصوصاً ہے۔

اے اکابر اسلام! آپ کی کتاب سماوی زبان عربی میں ہے۔ آپ کی کتب مذہبیہ عربی میں ہیں۔ کیا بخیال مذہب آپ لوگوں پر استحفاظ ایک ایسے کتاب خانے کا واجب نہیں ہے اور اے علم دوست حضرات! کیا مسلمانوں کی ان علوم وفنون کی کتابیں جن کی بدولت یورپ کی انیسویں صدی ایسی مشہور اور علم کی ترقی کے لیے یادگار ہوگئی ہے، آپ لوگوں سے اپنی تعظیم نہیں چاہتی ہیں۔ فن طب عربی کا آج بھی یہ ایسا ہے کہ جن کے دیکھنے کی ضرورت تکملۂ فن طب کے لیے ہے۔ اور یہ مفردات کا مجموعہ فن طب میں جو اس وقت اس کتاب خانے میں بھی موجود ہے، ایسا ہے کہ گورنمنٹ کو اس کی تحقیقات اور تفتیش کی طرف بغرض تہذیب وترتیب انگریزی کے مٹیر یا میڈیکا کے ضرورت ہے۔ ڈریپر کی کتاب جن حضرات نے ملاحظہ فرمائی ہے کیا ان کے دل میں اس کی خواہش نہیں ہے کہ اصل کتاب ابو یونس مصری کی علم مرایا اور مناظر میں دیکھیں جس کا ذکر اس نے اپنی کتاب میں کس جوش کے ساتھ کیا ہے۔ کیا یہ خیال پڑھی لکھی قوموں کے دل میں نہیں آتا ہے کہ اس بات کو جانیں کہ علمائے اسلام نے کیا لکھا تھا کہ جن کے علم کی روشنی

باعثِ دفع تاریکی جہالت یورپ کی ہوئی۔ لارڈ میو نے اپنی ایک اسپیچ میں جو علی گڑھ میں دی تھی یہ فرمایا تھا کہ اے مسلمانو! تم لوگوں کو ہم واپس دینے کو موجود ہیں، جو تمھارے آبائے پیشینان سے لیا تھا۔ پس اے حضرات! کیا آپ لوگوں کا جی نہیں چاہتا ہے کہ آپ لوگ دریافت کریں اور دیکھیں ان کتابوں کو جو علماے اسلام پیشینان نے لکھی ہیں۔ میرا ادعا نہیں ہے کہ یہ کتاب خانہ ہمارا ایسا کامل ہے کہ جس سے تمام اغراض ہر قسم کے برآویں۔ مگر اس میں شک نہیں ہے کہ اس کتاب خانے میں عموماً اچھے نشانات علمائے پیشینان اسلام کے ہیں۔ کتابیں از ابتدائے قرن ثانی تا قتل خلیفہ مستعصم باللہ جو وسط قرن ہفتم میں واقع ہوا ہے اکثر معدوم الوجود ہیں اور نشانات بھی علما کے اس زمانہ کے بہت کم وجود میں ہیں مگر قرن ہشتم سے دوازدہم تک کے دستخطی نسخے بتلاش بسیار پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ دستخطی نسخے علما گرامی کے مثل مزی وبکی وذہبی و حافظ وابن حجر وسیوطی وسخاوی وشوکانی وغیرہم کے اس کتاب خانے میں موجود ہیں۔ یہ سب نامی علما محدثین اہل سنت کے ہیں۔ اثنا عشری علما کے بھی دستخطی نسخے مثل ملا باقر داماد وملا باقر مجلسی و صدرالدین شیرازی، غیاث منصور وغیرہم کے بھی اس کتاب خانے میں بطور یادگار ہیں۔

اے حضرات! کتابوں کی قدر چاہے وہ کسی زبان میں ہو، اسی قوم میں ہوتی ہے جس میں کہ دولت کے ساتھ علم بھی ہو۔ چنانچہ معتبر شاہد بے زبان اس وقت کے یورپ کے کتاب خانے ہمارے اس دعوے پر ہیں۔ آپ لوگوں نے ولکی کالنس کا نام سنا ہوگا، یہ ایک اچھا ناولسٹ لندن میں گذرا ہے۔ اس کی ناولیں سب چھپ گئی ہیں اور بہت تھوڑی قیمت کو بکتی ہیں۔ اتفاق سے ایک مسودہ بدست خاص ولکی کالنس انھیں ناولوں میں سے جو چھپ گئی ہیں آغاز میں اس سنہ رواں کے ولایت میں نیلام ہوا، اور وہ تین سو پونڈ کو بکا، صرف اس خیال سے کہ ولکی کالنس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ کیا آپ لوگوں پر یہ واجب نہیں ہے کہ اپنے علماء گرامی کے دستخطی نسخوں کو دست بردِ زمانہ سے محفوظ رکھنے کی فکر کیجیے! یہ کتابیں وہ ہیں جن سے وقتاً فوقتاً استدلال امور مذہبی ہوتا ہے۔ اس کا استحفاظ تو عموماً مسلمانوں پر واجب اور لازم ہے کیونکہ ہم کا سہ وہم آش، دنیا کے لیے باقیات الصالحات اور آخرت کے لیے رافع سیئات۔ یہ باقیات الصالحات ایسے ہیں کہ

جس کو خیر جاری کہتے ہیں اور یہ مسئلہ درمیان فریقین کے متفق علیہ ہے۔ میں نے حسب وصیت اپنے والد مرحوم کے اس کتاب خانے کو وقف کر دیا ہے۔ یہ وقف مسلمین پر خصوصاً اور علم دوست قوموں پر عموماً ہے۔ اس وقف میں مجھ کو انسان مختلف الالوان والاقسام کا خیال نہیں اور غرض ہماری محض خیر جاری ہے۔ اس سے کوئی افتخار دنیاوی مقصود نہیں۔ کوئی حصول اعزاز حکام سے منظور نہیں۔ اس وقت گفتگو اس مادہ میں ہے کہ پھر آئندہ اس کتاب خانے کے رہنے کی کیا صورت ہے۔ تیس ہزار روپے درکار ہیں جس کے منافع سے سو (۱۰۰) روپیہ ماہواری بلا خیال آفت خشکی وسماوی وارضی آوے۔ اے حضرات! میں اس قدر روپے اوّل تو نہیں دے سکتا اور اگر میں دے بھی سکتا تو نہیں دیتا اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ اگر کسی کو کوئی چیز مفت ہاتھ لگے اس کی قدر نہیں ہوتی ہے اور جب خود کسی چیز کے حاصل کرنے میں کوئی شخص کچھ صرف کرتا ہے، تو بمقدار مصارف اس کے اس کی وقعت اس کے دل میں ہوتی ہے، اگر آپ حضرات چاہتے ہیں کہ یہ کتاب خانہ مع اس مکان کے جس میں آپ حضرات اس وقت رونق افروز ہیں دائماً اپنی حالت میں رہے تو آپ سب حضرات اس کی کفالت خرچ کی فکر کیجیے اور گورنمنٹ کو اس روپے کا امانتدار بنائیے۔ اس وقت آپ حضرات کو اس کا خیال رہے گا کہ اس کتاب خانہ کے پیچھے ہم لوگوں نے روپے صرف کیے ہیں اس کی نگرانی ہونی چاہیے۔ اگر آپ لوگ اس کے مصارف کے متحمل نہیں ہیں تو آپ لوگ اس بات کو باور کریں کہ مجھ سے اس کی حفاظت بہ آسانی ممکن نہیں ہے۔ یعنی اس کتاب خانے کو مسلم میر عابد سندھی کی طرح سے یا توقیہ محمودیہ میں دے دوں گا یا کتاب خانہ عمومیہ خدیو میں داخل کر دوں گا۔ مگر آپ لوگ اس بات کو خوب خیال رکھیے کہ پھر پٹنہ کے مسلمانوں کو ایسا مجموعہ اپنے آبا و پیشینان کے نشانات کا نہیں ملے گا۔ میں امید کرتا ہوں کہ آج آپ لوگ اپنے خیالات سے مجھے اطلاع فرمائیں، تاکہ میں اس کے موافق کارروائی کروں اور گورنمنٹ کو بھی تکلیف سے بچاؤں۔ والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ۔

☆☆☆

(الپنچ ۷/اکتوبر ۱۸۹۰ء)

افتتاح کے موقع پر
بانی کتاب خانہ کی پہلی رپورٹ
اکتوبر ۱۸۹۱ء

اس کے قبل کہ میں اس کتب خانہ کے متعلق حالات گذارش کروں مترصد ہوں کہ مجھے ان سرگرمیوں کے بیان کرنے کی اجازت دی جائے جو مسلمانوں نے اوّل اوّل مختلف علوم کے حاصل کرنے اور ان کے محفوظ رکھنے میں ظاہر کیں

مسلمانوں نے تحصیل علوم میں مذہبی اختلافات سے کچھ تعرض نہ کیا اور اپنے کتب خانوں اور دلوں کو یونانی کتابوں اور یونانی علوم سے معمور کرلیا۔

تاریخیں شاہد ہیں کہ جب دوسری صدی سنہ ہجری کی ابتدا میں عربوں کو کافی فرصت ملی وہ یونانی علوم وفنون کی طرف جھک پڑے۔ المنصور عباسی نے مسلمانوں کو اس طرف زیادہ تر متوجہ کیا اور خود بھی کامیابی کے ساتھ علم ہیئت کی تحصیل میں مصروف رہا۔

ہارون رشید (مشہور خلیفہ بنی عباس) نے جو شارلی مین (شاہ فرانس) کا معاصر تھا، المنصور کے قدم بقدم ترقی علوم میں ہمت صرف کی۔

المامون (ہفتم خلیفہ بنی عباس) نے اس بات میں خلفاء ماسبق پر فضیلت حاصل کی۔ خلیفہ مذکور نے نہ صرف قیصر روم سے یونانی کتابیں حاصل کیں، بلکہ اس کے عمال نے آرمینیہ، شام اور مصر سے بھی یونانی کتابیں بہم پہنچائیں اور اسی پر بس نہ کیا بلکہ ان کتابوں کا عیسائی علما سے عربی زبان میں ترجمہ بھی کرایا اور عربوں کو یونانی زبان بھی سکھا دی۔ ہارون کا قائم مقام کسی طرح المنصور سے کم نہ تھا۔ یہ بادشاہ قطع نظر ترویج وترغیب کے خود بھی یونانی علوم کی تحصیل میں مصروف رہا۔ اس کی مشہور روایت ہے، اس کو اقلیدس سمجھنے کی طرف ایسا شغف تھا کہ اس نے مقالۂ اولیٰ کی پانچویں شکل اپنی آستین پر منقش کرالی تھی اور اس لیے عربی اقلیدس میں یہ شکل شکل مامونی کہلاتی ہے۔ بغداد میں جو اس کا دارالسلطنت تھا، اتنے مصنف پیدا

ہوئے کہ اگر ان کے اسماء منضبط کیے جائیں، تو ایک کتاب بن جائے۔ حنین ابن اسحاق، جابر ابن حیان، ابوموسیٰ کے نام سے آج تک یورپ کے علما کی زبانیں نامانوس نہیں ہیں۔

جس زمانہ میں خلفاء بنی عباس ترویج علوم اور ترقی زبان میں سرگرمی کے ساتھ مصروف تھے ان کے معاصرین خلفائے بنی فاطمہ مصر میں اور بنی امیہ اسپین میں اسی سرگرمی کے ساتھ ترویج علوم کا حق ادا کر رہے تھے۔ خلفائے بنی فاطمہ نے اپنے کتب خانہ میں بہت سی کتابیں بہم پہنچائیں۔ سیوطی نے حسن المحاضرہ میں لکھا ہے کہ اس کتب خانہ میں صرف فن طب میں چھ ہزار جلدیں تھیں۔ ابو یونس مصری کی لیاقت نے یورپ اور امریکہ کے مصنفین سے داد پائی۔ اس کی تصنیف علم مرایا و مناظر میں، بہت بلند رتبہ سمجھی جاتی ہے۔

ابن ہیثم مصری کی تصنیفات خصوصاً علم مرایا و مناظر اور ہیئت میں جو فیثا غورثی اور بطلیموسی دونوں اصول پر مبنی ہیں، اس وقت کے علماء کے نزدیک بھی مقبول ہیں۔

خلفائے بنی امیہ نے اسپین میں نہ صرف بذات خود علم و فضل حاصل کیا بلکہ اپنے ہمسایہ عیسائیوں کو بھی بہ طیب خاطر دولت علم سے مالا مال کر دیا۔ ویز ابل پیٹر جو ابیلا ڈ کا دوست اور محافظ تھا، کہتا ہے کہ جب میں اسپین گیا تو یورپ اور انگلینڈ کے طلبہ کو خلفائے بنی امیہ کے ظل عاطفت میں علم ہیئت سیکھتے ہوئے دیکھا۔ ڈریپر صاحب فرماتے ہیں کہ اسپین کے مدرسوں میں نصرانی علما جمع تھے اور علوم کی ترقی جو مسلمانوں کی محنت کا نتیجہ تھی اسی لیے تھی جس کا ایسا نمایاں اور روشن نتیجہ حاصل ہوا۔ خاندان عباسیہ اور بنی امیہ کی تباہی کے بعد بغداد اور اسپین کے دو بڑے کتب خانے جو چار سو برس کے ریاض کا نتیجہ تھے، برباد ہو گئے۔ مغربی کتب خانہ فرڈیننڈ نے جلا دیا جس کے ناشائستہ فعل پر آج تک ہر ملک کے علما کے دل جل رہے ہیں اور عباسیوں کا عظیم الشان کتب خانہ ہلاکو خاں ایک دوسرے مشہور حیوان کے ہاتھوں دجلہ میں ڈال دیا گیا۔ تیسرا مجموعہ خلفائے بنی فاطمہ کی کتابوں کا صلاح الدین اعظم کی دست برد سے دمشق کو منتقل ہو گیا۔ یہ مجموعہ اگرچہ نہ جلا، نہ پانی میں ڈالا گیا مگر مسلمانوں کی خانہ جنگیوں نے اس کی بہت سی کتابیں برباد کر دیں۔ باقیات اس کی کتب خانہ شام میں جو بنی امیہ کا قدیم

دارالسلطنت تھا ہنوز موجود ہیں۔ ان تینوں خلافتوں کی تباہی کے بعد چنگیز خاں کے بعض جانشینوں نے جو مشرف بہ اسلام ہوئے اور تیمور کے بیٹوں اور پوتوں نے علوم کی قدردانی کی اوران ہی کے زمانہ میں نصیرالدین طوسی، قطب الدین شیرازی، سعدالدین تفتازانی جیسے علما کا علم وفضل اپنے کمال کو پہنچا۔

خاندان تیموریہ نے ہندوستان میں البتہ علم کی قدردانیاں کیں۔ شاہجہاں خود بھی ایک معقول تعلیم یافتہ اور غایت درجہ کتابوں کا قدردان بادشاہ تھا۔ دکن کے شاہان خاندان قطب شاہی وعادل شاہی نے بھی اس امر میں شاہان خاندان تیموریہ کی تبعیت کی۔

مذہب اسلام میں مصوری ممتنع تھی اس لیے مسلمانوں نے اپنی توجہ خوشنویسی کی طرف مائل کی، ابن مقلہ نے جو مقتدر باللہ اور دوسرے خلفائے بنی عباس کا وزیر تھا، خط نسخ اور چند خطوط ایجاد کیے جن کا تکملہ سنہ ہجرت کی ساتویں صدی میں یاقوت مستعصمی نے کیا جو مستعصم باللہ آخر خلیفہ بنی عباس کا غلام تھا۔ میر علی تبریزی نے خط نستعلیق ایجاد کیا اور کمال کو پہنچایا۔ دوسرے خطاط یاقوت مستعصمی اور میر علی تبریزی کے بعد ہوئے۔ خوشخط کتابیں خطاطوں کی لکھی ہوئی وہی حیثیت و قیمت رکھتی تھیں جو رفائل اور مائکل انجلو کی تصویریں یورپ میں رکھتی تھیں۔

ہندوستان میں چند کتب خانے تھے جن میں عمدہ عمدہ کتابیں تھیں، مگر ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد یہ کتب خانے غائب ہوگئے۔ مسلمانوں کی حالت میں جو تبدیلی آئی اس نے ان قلمی کتابوں کو سخت ضرر پہنچایا جو ان کے اجداد کا سرمایۂ افتخار تھیں۔ غربت اور اس سے بڑھ کر جہالت نے یہ دن دکھلایا کہ وہ کتابیں یا کیڑوں کو کھلا دی گئیں یا غیر ملک والوں کے ہاتھ بیچ ڈالی گئیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں جہاں تک میرا علم ہے کوئی کتب خانہ اس جامعیت کا نہیں ہے، جو قاہرہ یا مدینہ کے کتب خانوں کے مقابلہ میں خیال کیا جا سکے۔

یہ کتب خانہ جس کی تقریب افتتاح کو حضور پُر نور کی رونق افروزی سے عزت حاصل ہے، مجموعہ ہے عربی اور فارسی کتابوں کا۔ اس کتب خانہ کے بانی ہمارے والد مرحوم مولوی محمد

بخش خاں ہیں۔ ولادت ان کی ۱۸۱۰ء میں بقصبہ چھپرہ واقع ہوئی۔ اور تحصیل علوم عربی اور فارسی کے بعد کتابوں کا شوق پیدا ہوا۔ اس زمانہ میں کتابیں بہت ہی کمیاب تھیں اور نسخ و نستعلیق یہ دونوں خط ہی اچھا لکھتے تھے اسی لیے بہت سی کتابیں اپنے ہاتھ سے نقل کیں اور بہت بڑا حصہ اپنی آمدنی کا انہی کتابوں کی خریداری میں صرف کیا۔ ۱۸۷۶ء میں بروقت وفات مرحوم چودہ سو جلدیں موجود تھیں جن کو مجھے سپرد کیا اور یہ وصیت کی کہ جب موقع ملے ان کتابوں کو وقف کر کے ایک عام کتب خانہ قائم کروں۔ مجھ کو یہ خیال رہا کہ جو ذخیرہ مجھے سپرد ہوا ہے وہ عام کتب خانہ کے لائق نہیں ہے۔ اس لیے میں نے اس کو ترقی دی اور اب قلمی کتابوں کی تعداد تین ہزار جلدوں تک پہنچ گئی ہے۔ یہ کتابیں ہندوستان کے مختلف حصوں سے مکہ مکرمہ سے، قاہرہ سے اور مسٹر کوارٹیج برناڈ کے ذریعہ سے حاصل کی گئیں۔

اس کتب خانہ میں سر گور اوزلی کے کتب خانہ کی کتابیں بھی ہیں، جو مسٹر جی۔ پی۔ ایلیٹ کے قبضہ میں تھیں۔ اس کے علاوہ آٹھ مختلف کتب خانوں کی کتابیں جو پٹنہ، لکھنؤ، دلی اور بمبئی میں تھیں، اس کتب خانہ میں داخل کی گئیں۔ مجھ کو بلاک مین صاحب کے مجموعۂ کتب سے بھی انتخاب کرنے کا موقع ملا جو کلکتہ میں پرنسپل تھے۔

ان وجوہات سے اگر مجھ کو اجازت دی جائے، تو میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ کتب خانہ ان قلمی کتابوں کا بہترین مجموعہ ہے جو اس ملک میں مل سکتی تھیں۔ اس کا ذکر بھی یہاں بے محل نہ ہوگا کہ مصنفین اہل اسلام کی تصنیفیں جو دوسری صدی سے سنہ ہجرت کی ساتویں صدی تک ہوئیں وہ فرڈنینڈ اور ہلاکو خاں کی وحشیانہ حرکت کے سبب سے نایاب ہوگئیں۔ اس وقت جو کتابیں متداول ہیں وہ ان علماء کی ہیں جو ساتویں صدی کے وسط سے گیارہویں صدی تک گذرے ہیں۔ میں اپنے کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ اس کتب خانے میں بعض قلمی کتابیں علم ہیئت، جراحی، طبابت، ریاضی کی اگلے مصنفوں کی تصنیفیں ہیں۔ زہراوی کی تصنیف فن جراحی میں ایسی ہے جس کا ذکر کرنا میں خاص کر پسند کرتا ہوں۔ یہ نسخہ ۵۸۴ ہجری کا مکتوب ہے۔ اس کا مصنف اندلسی ہے اور سنہ ہجرت کی پانچویں صدی میں مرا ہے۔ اس کتاب میں آلات

جراحی کی ہیئت کذائی بھی مندرج ہے اور اکثر ان آلات میں سے وہ ہیں جو اس زمانہ میں بھی استعمال میں آتے ہیں۔ اس کتاب سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ پانچویں صدی کے مسلمانوں میں یہ آلات اندلس اور بغداد میں مستعمل تھے۔ دوسرے ایک قلمی کتاب جو محتاج ذکر ہے وہ دیاس قریدوس کی کتاب نباتات طبیہ کے بیان میں ہے۔

یہ کتاب یونانی زبان سے مامون الرشید کے عہد میں ترجمہ ہوئی۔ ڈکلائین اینڈ فال آف دی رومن امپائر کا مصنف اس کتاب کا ذکر کر کے لکھتا ہے کہ علم نباتات وہ علم ہے جس میں روز روز ترقیاں ممکن ہیں۔ تحقیقاتیں ہوں تو اب بھی گرم و سرد ملکوں کی نباتات مجموعہ دیاس قریدوس پر ہزار دو ہزار بڑھ سکتی ہیں۔ اس کتاب کا جو نسخہ اس کتب خانہ میں ہے اس میں مختلف قسم کے درخت اور نباتات کی تصویریں بھی دی ہوئی ہیں اور یہ خود ایک عجیب امر ہے کہ یہ نسخہ ایک زمانہ میں آج سے چھ سو برس پہلے دار الشفاء جلالی شیراز میں وقف تھا، مسلمانوں نے اس کتاب کو اپنی تحقیقات کا سنگ بنیاد بنایا اور وقتاً فوقتاً اس پر افزائشیں ہوتی رہیں۔ مکمل مجموعہ ان افزائشوں کا اس کتب خانہ میں موجود ہے۔

ابونصر فارابی اور ابوریحان بیرونی کی تصنیفات نہایت نایاب ہیں۔ مگر میں شکر گزار ہوں کہ اس کتب خانہ کو اس کا افتخار حاصل ہے۔ ان کے تصانیف مختلف علوم میں اس کتب خانہ میں ہیں۔

اس کتب خانہ میں اچھے سے اچھے خوشنویسوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وہ کتابیں بھی ہیں جو ایک زمانہ میں شاہان دہلی کے کتب خانہ کی زیب و زینت کا باعث تھیں۔ دیوان مرزا کامران (جو ہمایوں بادشاہ کا بھائی تھا) اسحاق شہابی کا لکھا ہوا ہے۔ یہ دیوان عہد اکبر سے محمد شاہ کے عہد حکومت تک خاندان تیموریہ میں رہا۔ اس پر شاہجہاں اور جہانگیر کے دستخط ثبت ہیں۔ اس کے علاوہ اور کتابیں بھی اس کتب خانہ میں ایسی ہیں جن پر شاہ جہان اور خاندان عادل شاہی اور قطب شاہی کے بعض شاہان دکن کے دستخط ثبت ہیں۔

اس کتب خانہ میں مسلمانوں کی مذہبی کتابیں بھی حدیث، فقہ، اصول اور تفسیر میں بہت سی ہیں۔ اس میں سے اکثر تو خاص مصنف اور بعض ذہبی، سبکی اور ابن حجر جیسے علماء مستند

کے دستخطوں سے مزین ہیں۔

تاریخ کی کتابوں کا مجموعہ جو اس کتب خانہ میں ہے لائق توجہ ہے۔ متعدد مصنفوں کی تصنیف کردہ ہندوستان کی تاریخیں اور خاندان تیموریہ کے بادشاہوں کے حالات فرداً فرداً اس کتب خانہ میں موجود ہیں۔ ان میں سے اکثر کتابیں کمیاب ہیں۔ اگر ان کے استحفاظ کی کوئی خاص فکر نہ کی جائے، تو یہ کتابیں نصف صدی میں عدیم الوجود ہو جائیں گی۔

یہ واقعہ ہے کہ ابتدائے ترقی دولت اسلام میں مسلمانوں نے عموماً فنِ ادب کی طرف بہت کم توجہ کی اور اکثر امرائے اہل اسلام اعلیٰ درجہ کے ادیب تھے اس لیے دواوین اور ادب کی کتابیں نہایت تکلف سے لکھی گئیں اور انتہا درجہ کے صرف سے ان کی تزئین کی گئی۔ جہانگیر نے اپنے سوانح میں جس نسخۂ زلیخا کا ذکر کیا ہے، اس سے میں سمجھتا ہوں کہ وہ یہی نسخہ ہے جو اس کتب خانہ میں موجود ہے، جس کی قیمت جہانگیر نے تیس ہزار سکہ رائج الوقت مقرر کی تھی۔ ایک دوسری تاریخ پر، جو بحکم شاہجہاں لکھی اور مذہب کی گئی آٹھ ہزار روپے صَرف کے لکھے ہوئے ہیں۔ کتابوں کی تیاری کے مصارف دیکھنے کے بعد بخوبی خیال کیا جاسکتا ہے کہ ان کتابوں کے فراہم کرنے میں کیسا صرف اور کیسی محنت و جانفشانی عمل میں آئی ہوگی۔

مثنویاں اور دواوین اس کتب خانہ میں تین سو سے زیادہ ہیں۔ ان میں سے اکثر نسخے نہایت خوشخط، پُر تکلف اور قیمتی ہیں۔

اس کتب خانہ کے وقف کرنے کا خیال پہلے پہل میں نے کیمبل صاحب سے ظاہر کیا جو قائم مقام کمشنر تھے۔ صاحب نے نہایت مہربانی سے ہماری تحریک سماعت فرمائی اور جو اعانت اس باب میں کی ہے میں اس کا بغایت مشکور ہوں۔ اسی زمانہ میں ہماری خوش نصیبی سے جناب مسٹر استوارٹ بیلی صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر بھی تشریف لائے۔ صاحب موصوف نے ایک اچھے موقع سے ہماری تحریک بذات خاص پیش کی۔ جناب لفٹنٹ گورنر بہادر موصوف نے چھ سو روپیہ سالانہ اس کتب خانہ کے لیے اس شرط پر منظور فرمایا کہ پہلے چندہ پندرہ ہزار روپے فراہم کیے جائیں۔

میں نہایت خوشی سے گذارش کرتا ہوں کہ اس شہر کے اکثر دولت مند بطیب خاطر اس چندہ میں شریک ہوئے جن کی فیاضی نے اگیارہ ہزار روپیہ جمع کر دیا۔

سید ابو صالح صاحب نے جو سید ابو سعید خاں بہادر مرحوم کے بھائی ہیں بغرض انجام امر رفاہ عام اس کتب خانہ کے اخراجات کے لیے ایک معیشت جو بارہ ہزار روپیہ کو خریدی تھی اور جس کی بچت تین سو روپیہ سالانہ ہے وقف کر دی۔ دو ہزار پانچ سو اسی روپیہ اوّل اوّل چندہ کے ذریعہ سے جمع ہوا تھا وہ اس زر چندہ کے ساتھ شامل کیا گیا۔ اب کتب خانہ کی تحویل میں تیرہ ہزار پانچ سو اسی روپے ہیں۔

میں اپنے فرض سے کبھی ادا نہ ہوسکوں گا اگر میں اپنی شکرگزاری خاتونان ورؤسائے ذیل کی فیاضی کی نسبت ظاہر نہ کروں جنھوں نے اس پندرہ ہزار روپے کے پورا کرنے میں چندے سے مدد فرمائی ہے۔

سید ابو صالح صاحب کے بعد جن کا عطیہ اگر نقدی پیرائے میں منتقل کیا جائے تو اس کی قیمت ساڑھے سات ہزار روپے ہوتی ہے، راضیہ بیگم صاحبہ کا درجہ ہے، جو نواب لطف علی خاں مرحوم سی۔ آئی۔ ای کی بڑی صاحبزادی ہیں۔ بیگم صاحبہ نے اکیس سو روپے چندہ میں دیئے اور اس جہت سے وہ بہت زیادہ تعریف کی مستحق ہیں۔ ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی سید اکبر علی خاں صاحب کی تائید بھی لائق شکریہ ہے۔ انھوں نے آٹھ سو روپے تو پہلے دیے تھے اور اب یہ وعدہ فرمایا ہے کہ باقی پندرہ سو روپے جو پندرہ ہزار میں گھٹتے ہیں وہ عنایت فرمائیں گے۔

مسماۃ دیومورت کنور بابو بیجناتھ سنگھ کی زوجہ نے ایک ہزار روپے سے امداد کی اور اس حیثیت سے کہ وہ ایک ہندو عورت ہیں ان کی یہ عنایت بھی لائق داد ہے۔

قاضی سید رضا حسین صاحب خان بہادر نے اپنی معمولی سخاوت کو کام فرما کر ایک ہزار روپیہ عنایت فرمایا اور اسی قدر سید بادشاہ نواب صاحب نے بھی۔

میں نہایت تہہ دل سے ان صاحبوں کی شکرگزاری کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ

گورنمنٹ بھی اس کو نظر انداز نہ کرے گی۔

میں حکام ضلع کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے اس کام میں ہمیشہ اور ہر حالت میں میری مدد فرمائی۔ میں مولوی فضل امام خاں بہادر کا بھی بغایت شکر گزار ہوں کہ وہ ہمیشہ اور ہر وقت اس کام میں ہمارے معین رہے۔

جو شکر گزاری میں نے جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی اس مادہ میں ادا کی ہے کہ ان کی ذات بابرکات کی حمایت سے اس کتب خانہ کا استحفاظ دائمی ہو گیا وہ بشارکت دیگر حضرات ہم مذہب اپنے ادا کی ہے۔ مگر چونکہ میں خود اس کتب خانہ کا بانی ہوں اس واسطے میں پھر جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی شکر گزاری ادا کرتا ہوں کہ مجھے اس کتب خانہ کی طرف سے مطمئن اور اس کے بار حفاظت سے سبکدوش فرمایا۔ اس عنایت کی جہت سے مجھے اس بات کا موقع ملا کہ میں نے اپنے والد مرحوم کی وصیت پوری کی اور یہ نایاب کتابیں آئندہ کے خطروں سے محفوظ ہو گئیں۔

میرا خیال تھا کہ اس سے بھی بہتر کوئی عمارت تعمیر کرتا جس میں یہ کتابیں رکھی جاتیں مگر میں نہ کر سکا۔ یہ کتابیں ان بزرگوں کی تصنیفات سے ہیں جن کی ذات پر نہ صرف اس ملک کو بلکہ اس قوم کو نازش تھی جس کے وہ افراد تھے۔ ان کی تصنیفی محنت کے نتائج ایک دائمی یادگار ہیں جو علمی دنیا میں ہمیشہ قائم رہے گی۔

میں نے ان کتابوں کے ساتھ مربیانہ توجہ صرف کی ہے اور چونکہ ان کا استحفاظ کامل ہو گیا تو میں ان کتابوں کو بحضور جناب نواب لفٹنٹ گورنر بہادر سپرد کرتے وقت اس مصرعہ پر کفایت کرتا ہوں۔ ع

این را بخدا و بخداوند سپردم

اور یہ وہ مضمون ہے جو دستور الملک نے اپنے بیٹے کے حق میں ملک شاہ سلجوقی کو لکھا تھا۔

خدا بخش

سکریٹری و لائبریرین اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

☆☆☆

(خدا بخش لائبریری جرنل شمارہ نمبر ۶، ۱۹۷۸ء)

شبلی نعمانی

مولوی خدابخش خاں عظیم آبادی کا کتب خانہ

ایک مدت سے ہم اس کتب خانہ کا شہرہ سنتے تھے۔ دہلی اور لکھنؤ میں بعض تاجر ہیں جو قلمی نایاب کتابیں جابجا سے بہم پہنچاتے ہیں اور ان کو نہایت گراں قیمت پر بیچتے ہیں۔ ہم جب کبھی ان سے ملے اور کمیاب نسخوں کی فرمائش کی، تو انھوں نے کہا کہ اس قسم کی کتابیں سب سے پہلے مولوی خدابخش کے پاس جاتی ہیں، کیونکہ ہمارے ملک میں کوئی شخص ان سے زیادہ قیمت نہیں دے سکتا۔ ان باتوں نے ہم کو کتب خانہ مذکور کا نہایت مشتاق بنا رکھا تھا۔ اسی شوق نے آخر پٹنہ پہنچایا اور چار دن وہاں رہ کر ہم نے اس نادر کتب خانہ کی سیر کی۔ اس بات کا افسوس رہا کہ فرصت نہایت کم تھی۔ سیکڑوں بیش بہا کتابیں تھیں اور ہمارا یہ حال تھا کہ:

بداں پروانہ می مانم کہ افتد در چراغانے

ممالک اسلامیہ میں جو مقامات اسلامی تصنیفات کے مخزن سمجھے جاتے ہیں وہ حرمین، قاہرہ، دمشق، قسطنطنیہ ہیں۔ قاہرہ کے کتب خانہ خدیو کی فہرست تین جلدوں میں چھپ کر حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ قسطنطنیہ میں کم و بیش ۶۰ ر کتب خانے ہیں جن میں سے اکثر کی فہرستیں کشف الظنون (مطبوعہ لندن) کے اخیر میں ہیں۔ حرمین کے کتب خانے ہم نے خود دیکھے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ہندوستان میں بھی چند عمدہ کتب خانے موجود ہیں۔ اگرچہ ان کتبخانوں کی حیثیتیں اور خصوصیتیں مختلف ہیں اور اس وجہ سے ان میں موازنہ نہیں ہو سکتا۔ تاہم اجمالاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولوی خدابخش خاں کا کتبخانہ جس کا اس وقت ہم ذکر کر رہے ہیں اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے روم و مصر و عرب و ہند کے نامور کتب خانوں کی صف میں جگہ پانے کے قابل ہے۔ مولوی خدابخش خاں نے جس اہتمام اور زر خطیر کے صرف سے کتابیں بہم پہنچائی ہیں اس کی نظیر سے تمام ہندوستان خالی ہے۔ کیا یہ

کچھ کم تعجب کی بات ہے کہ ایک معمولی حیثیت کا وکیل جس کے پاس کچھ جائداد نہیں اور جس کی آمدنی صرف ضلع کی وکالت پر محدود ہے، ایک کتب خانہ کی تیاری میں ڈیڑھ لاکھ روپیہ صرف کردے؟ بے شبہ ایسا اولوالعزم شخص ان نامور قدیم مسلمانوں کا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے جن کی حوصلہ مندیوں کا ہم افسانہ سنایا کرتے ہیں۔

اس آرٹیکل میں ہم کتبخانہ کی ایک مختصر رپورٹ پیش کر کے ان خصوصیتوں کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں جن کی وجہ سے کتب خانہ نے یہ ناموری حاصل کی ہے۔

کتب خانہ کی بنیاد اول مولوی خدابخش خاں صاحب کے والد مرحوم مولوی محمد بخش نے ۱۸۲۸ء میں قائم کی۔ ۱۸۷۶ء میں جب انہوں نے انتقال کیا، تو ایک ہزار چار سو کتابیں کتبخانہ میں موجود تھیں، جن میں اکثر قلمی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد مولوی خدابخش خاں نے نہایت اہتمام سے ان پر توجہ کی۔ عرب، مصر، فرانس، لندن اور ہندوستان کے مختلف اطراف سے کتابیں بہم پہنچائیں۔ ۱۸۹۰ء تک وہ ایک پرائیوٹ کتبخانہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ ۲۴ر نومبر ۱۸۹۰ء کو ایک عام جلسہ اس مکان میں منعقد ہوا، جس کو مولوی خدابخش خاں نے لائبریری کی غرض سے تعمیر کرایا ہے۔ نواب احمد علی خاں جلسہ کے پریسیڈنٹ تھے اور شہر کے بڑے بڑے امراء و بزرگ شریک تھے۔ سکریٹری نے اول اس خط و کتابت کا مضمون پڑھا جو کتبخانہ کے انتظام کی بابت گورنمنٹ سے ہوئی تھی۔ پھر باتفاق رائے طے ہوا کہ کتبخانہ پبلک قرار دیا جائے اور فلاں فلاں اشخاص اس کتب خانہ کے ممبران انتظامی کمیٹی قرار پائیں (پٹنہ گزٹ، مطبوعہ ۵ر دسمبر ۱۸۹۰ء نے ان لوگوں کے نام تفصیلاً لکھے ہیں) دوسرا رزولیوشن یہ پاس ہوا کہ "سر اسٹوارٹ بیلی، لفٹیننٹ گورنر نے کتب خانہ کے ساتھ جو ہمدردی ظاہر کی ہے اور اس کو مدد دی ہے، اس کے شکریہ کی چٹھی ان کی خدمت میں ارسال کی جائے۔"

کتبخانہ کی ماہوار آمدنی جو اس کے انتظامی مصارف کے لیے درکار ہے اس وقت تک سوا سو روپیہ کے قریب ہے۔ اس میں ۵۰ر روپیہ ماہوار گورنمنٹ کی اعانت ہے جس کو

لفٹیننٹ گورنر سر اسٹوارٹ بیلی نے بذریعہ ایک باضابطہ چٹھی کے منظور کیا ہے۔ باقی ۲۵ر روپیہ ماہوار کی جائداد میر ابو صالح زمیندار کڑا ضلع گیا نے وقف کی ہے۔ اس کے علاوہ چندہ کا سرمایہ ہے، جس کی تعداد وصول شدہ اس وقت تک سات ہزار آٹھ سو آٹھ روپیہ ہے۔ اس سے پہلے ایک پبلک کتبخانہ کے لیے عام چندہ ہوا تھا جس میں دو ہزار پانچ سو روپے جمع ہو گئے تھے وہ روپیہ گورنمنٹ میں جمع تھا۔ گورنمنٹ نے وہ رقم بھی اسی کتب خانہ کو عنایت کر دی۔ کتبخانہ کی بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ پٹنہ کے بڑے بڑے معزز رئیس اس کے حامی ہیں جن میں جناب قاضی سید رضا حسین کا نام بھی شامل ہے، جو اپنی قومی فیاضیوں کے وجہ سے ہر ایک قسم کی عزت اور شہرت کے مستحق ہیں۔ کتبخانہ کا مکان نہایت خوبصورت اور عالیشان ہے۔ ایک طرف کے برآمدہ کا تمام فرش سنگ مرمر کا ہے۔ باقی فرش سنگ سپید و سنگ سیاہ کی منبت کاری ہے۔ الماریاں نہایت قرینہ سے سجائی گئی ہیں۔ میز، کوچ اور بہت سی خوبصورت کرسیاں ہر کمرہ میں موجود ہیں۔

جس قدر کتابیں اس کتب خانہ میں موجود ہیں انکی تین قسمیں قرار دی جاسکتی ہیں:

وہ کتابیں جو ہندوستان میں نایاب ہیں اور اپنے باب میں اعلیٰ درجہ کی تصنیفیں ہیں، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

فن حدیث ورجال میں:

اطراف مزی تمام وکمال در چار جلد، النکتُ الظراف علی الاطراف لابن حجر، الادب المفرد بخاری، الالمام فی احادیث الاحکام لابن دقیق العبد، کتاب العلل دار قطنی، کتاب الاسماء والصفات بیہقی۔ مستدرک حاکم، جمع بین الصحیحین لعبد الحق الاشبیلی الاندلسی المتوفی ۵۸۲ھ تلخیص الجبیر لحافظ ابن حجر، کاشف ذہبی، بغیۃ العلماء والرواۃ السخاوی۔ طبقات ابو یعلی، طبقات اللغۃ ابن رجب حنبلی۔ تاریخ ابن عساکر دمشقی ناقص۔ مراتب الاجماع لابن حزم الظاہری۔

ادبیات میں:

تہذیب اللغات ازہری، جمہرہ ابن درید فی اللغۃ، خصائص ابن جنی شرح دیوان

متنبی از ابن جنی۔ الجامع الکبیر لابن الاثیر الجزری۔ شرح حماسہ از مرزوقی۔ شرح سبعہ معلقہ از ابن نحاس، شرح مفتاح سکاکی از سید شریف و علامہ تفتازانی۔ نزہتہ الالباب۔ کتاب المصادر لابی بکر محمد بن عبداللہ العبقی برہان فی اعجاز القرآن لزکی الدین ابن الاصبع۔

فلسفہ و طب میں:

شفاء بوعلی سینا تمام و کمال۔ مجموعہ رسائل فارابی۔ رسائل ارسطو مترجمہ در عربی۔ ملتقطات افلاطون۔ کلمات افلاطون رسالہ یعقوب کندی۔ رسالہ اسکندر افردوسی۔ اثولوجیا لارسطو۔ ما اختصرہ حکماء الاسکندریۃ من کتب ارسطو۔ مباحث مشرقیہ امام رازی۔ کتاب سنان بن ثابت فی حرکات الشمس۔ کتاب ارشمیدس تعلیقات بن سینا۔ تلویحات شیخ الاشراق، خمسہ باقر داماد۔ شرح تلویحات لابن کمونہ۔ کنز الفوائد حنین بن اسحاق۔ من لایحضرہ الطبیب لابی بکر الرازی۔ کناش بقراط۔ شرح عبداللطیف بغدادی بر فصول بقراط۔ کتاب الادویہ لدیاسقوریدوس مترجمہ ابن ابی اصیبعہ، کتاب التشریح و آلات ابن زہراوی مصور۔ رسائل ابوریحان بیرونی وابراہیم بن سنان بن ثابت بن قرہ فی سایر اعمال الہندسہ۔

اس کے علاوہ فقہ و اصول و قرأت میں اور بہت سی نایاب کتابیں ہیں جن کو ہم اختصار کی وجہ سے قلم انداز کرتے ہیں۔

دوسری قسم کی وہ کتابیں جو نہایت قدیم زمانہ کی لکھی ہوئی ہیں اور بلحاظ قدامت کے ایک یادگار خیال کی جاسکتی ہیں:

قشیری کا ایک رسالہ ہے جو ۴۳۷ھ کا لکھا ہوا ہے۔ ایک قرآن ہے جس پر سنہ کتابت نہیں لکھا ہے لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کے زمانہ کا لکھا ہے، خط کوفی ہے اور کاغذ نہایت قدیم ہے۔ جابجا حرف اُڑ گئے ہیں۔ بہت بڑا قرینہ یہ ہے کہ تمام قرآن میں زیر زبر رکوع نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ ترتیب بھی نہیں ہے۔ گمان ہوتا ہے کہ عبداللہ بن مسعود کے نسخہ کی نقل ہے۔ ان کے علاوہ اور متعدد کتابیں ہیں جو آٹھ آٹھ سو برس کی لکھی ہوئی ہیں۔

تیسری قسم کی وہ کتابیں ہیں جو کسی مشہور کاتب یا خود مصنف کی یا مصنف کے زمانہ کی لکھی ہوئی ہیں یا بڑے بڑے علما کے استعمال میں رہی ہیں اور ان کے دستخط و اجازہ سے مزین ہیں۔ ہمارے ملک میں تو اس قسم کی چیزوں کی چنداں قدر نہیں ہے لیکن یورپ میں ان چیزوں کو یادگار سمجھا جاتا ہے اور ان کے بہم پہنچانے میں لاکھوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں۔ تھوڑے دن ہوئے کہ لندن میں ایک قلمی کتاب ۱۴/ہزار روپیہ کو بکی جس کی خوبی صرف یہ تھی کہ وہ نہایت قدیم زمانے کی لکھی ہوئی تھی۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے ہندوستان میں صرف مولوی خدابخش خان ایسے شخص ہیں جنھوں نے ان چیزوں کے لیے زر خطیر صرف کرنے میں یورپ کے حوصلہ مندوں کا مقابلہ کیا ہے۔ اس قسم کی کتابوں میں ایک قرآن ہے جو یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ یاقوت مستعصم باللہ عباسی کے عہد کا مشہور خطاط تھا۔ دعائے سیفی کا ایک نسخہ بھی یاقوت کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود ہے۔ اس نسخہ پر کتب خانہ شاہجہانی و عالمگیری کی مہریں ہیں۔ شاہجہاں کی مہر کے نیچے لکھا ہے "سی صد و پنجاہ و پنج روپیہ۔" قصیدہ بردہ نوشتہ قاضی ظہرائے حنبلی جو انھوں نے بایزید یلدرم کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ شاہنشاہ نامہ جس کو محمد ثالث نے لکھوایا تھا، تمام مطلا و مذہب اور کل معرکوں کی طلائی تصویریں بنی ہیں۔ تاریخ تیموریہ، اس نسخہ پر شاہجہاں کے دستخط ہیں اور لوح پر لکھا ہے کہ "حکم والا صادر شد کہ قیمت این کتاب یکصد و پنجاہ مہر قرار یافت۔" اس میں بھی تمام معرکوں کی طلائی تصویریں بنی ہیں اور مختلف مصوروں کے ہاتھ کی ہیں۔ ہر موقع پر مصور کا نام بھی لکھا ہے۔ مولوی خدابخش خان نے یہ دونوں نسخے تین ہزار پانچ سو روپیہ کو خریدے ہیں۔ بہت سی حدیث و فقہ کی کتابیں ہیں جن پر حافظ بن حجر، جلال الدین سیوطی، ابن قبلہ ہاشمی، جمال الدین محدث اور بڑے بڑے اساتذہ کے دستخط ہیں اور عبارتیں ان کے ہاتھ کی لکھی ہیں۔

ابن عساکر کی تاریخ دمشق نہایت نایاب کتاب ہے۔ اس کی دو جلدیں یہاں موجود ہیں اور مصنف کے نسخہ مقروءہ سے منقول ہیں۔ دیوان جامی خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا

ہے۔ باقر داماد و بہاء الدین عاملی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی بیاضیں ہیں۔ نہایت الادراک پر خود مصنف و جلال الدین دوانی و غیاث منصور کے دستخط ہیں۔ اس قسم کی سینکڑوں کتابیں ہیں۔

یہ کتب خانہ جس فیاضی اور زر خطیر کے صرف سے تیار ہوا ہے اس کے اندازہ کرنے کے لیے ہم بعض کتابوں کی قیمت لکھتے ہیں، جو مالک کتب خانہ نے ادا کی۔

قرآن مجید و جوشن کبیر اعصا سدحمائل شریف الـسعہ، قرآن شریف سـما، جامع الاصول الـسعے ، مجالس خمسہ سعدی مزین بدستخط شاہجہاں اسار، کلیات خاقانی مـعہ پونڈ، شیوخ بخاری ماصہ کتاب سیبویہ امعـہ طبقات ابویعلی نوشتہ ۶۳۷ھ اللعہ

حقیقت یہ ہے کہ یہ کتبخانہ، پٹنہ اور پٹنہ والوں کے لیے بڑے فخر کی چیز ہے۔ بلکہ ہندوستان کے عام مسلمان اس پر فخر کر سکتے ہیں۔ ہم نے اس کی کیفیت کے بیان کرنے میں بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ جب اس کی فہرست جو آجکل زیر طبع ہے، چھپ کر شائع ہو گی، تو لوگوں کو اس کی خوبیوں سے پوری اطلاع حاصل ہو گی۔ ہم مولوی خدا بخش خان صاحب کو ان کی اس کامیابی پر دل سے مبارکباد دیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ان کے شہر میں ایسے لوگ پیدا ہوں جو اس دولت کی قدر کریں اور اس سے فائدہ اٹھائیں۔

(دبدبہ سکندری، رام پور ۱۸۹۱)



صلاح الدین خدابخش
تلخیص وترجمہ: عشرت رومانی

میرے والد ماجد، ان کی زندگی اور سرگذشت

اس مضمون کو خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کے بانی جناب خدابخش (۱۸۴۲-۱۹۰۸ء) کے صاحبزادے جناب صلاح الدین خدابخش (وفات ۱۹۳۱ھ) نے انگریزی زبان میں تحریر کیا تھا جو خدابخش لائبریری جرنل شمارہ نمبر ا، ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون بہت طویل ہے۔ اس کا ترجمہ اور تلخیص جناب عشرت رومانی نے کی ہے جسے ہم پیش کر رہے ہیں۔

اپنے والد ماجد جناب خدابخش کی سوانح عمری کو تحریر کرنے سے میرا یہ مدعا نہیں ہے کہ میرے لیے یہ کام باعث شہرت ہو یا اس سے میرے کسی جذبے کی تسکین ہو سکے، میں تو فقط اپنے فرض کی ادائیگی کر رہا ہوں جس کے لیے بے شمار دوستوں نے درخواست کی ہے کہ میں ان کے سفر حیات کے متعلق وہ سب کچھ قلمبند کروں جو میں نے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ کسی بھی شخصیت کی سوانح حیات کو کاغذ پر منتقل کرنا ایک دشوار کام ہے خاص کر جب کہ ایک بیٹا اپنے والد کی زندگی کے گوشوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرے۔ اس کی بنیادی وجہ وہ عقیدت و محبت ہے جو ایک بیٹے کو اپنے باپ سے ہوتی ہے اس لیے میرے لیے یہی بہتر ہے کہ میں تاریخی تناظر میں غیر جانبدار ہو کر سارے واقعات بیان کروں۔ میں اپنے قارئین پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ نہ تو میں کسی غیر جانبداری کا دعویٰ کرتا ہوں اور نہ میں کوئی تاریخ داں ہوں۔ یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ میں خود اپنی ذات سے بالاتر ہو کر منصف کی حیثیت سے کسی بھی رائے کا اظہار کروں۔ میں نے بھرپور کوشش کی ہے کہ اپنے والد گرامی کے سفر حیات اور ان کی جد و جہد کو اسی طرح پیش کروں جیسا کہ میں نے دیکھا اور اس سے نتائج اخذ کیے ہیں۔ میں نے طوالت سے بچنے کے لیے غیر ضروری واقعات

سے احتراز کیا ہے۔ اب یہ قارئین پر ہے کہ وہ سارے واقعات اور جزئیات کو پیش نظر رکھ کر کس طرح کوئی نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ میرے والد گرامی کی عوامی خدمات، ان کا پیشہ، عہدہ اور حیثیت سے سب ہی واقف ہیں۔ دنیا والوں کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ کون سے عوامل ہیں جو کسی بھی شخصیت کی تعمیر میں کارفرما ہوتے ہیں، جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتے ہیں۔ اس کے لیے مذہبی اعتقادات، سیاسی نظریات اور عوامی خدمات سب ہی کچھ سامنے رکھ کر کوئی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے مگر میرے خیال میں کسی بھی انسان کی بڑائی اور روحانی پاکیزگی کو ظاہر کرنے کے لیے یہ سارے عوامل ہی کافی ہیں۔ لوگ یہ نہیں سوچتے ہیں کہ کسی بھی کامیاب شخص نے کس طرح جدوجہد کی ہوگی اور کس طرح آہستہ آہستہ اپنی منزل کی جانب قدم بڑھائے ہوں گے۔ وہ یہ بھی غور نہیں کرتے ہیں کہ کچھ پانے کے لیے کتنی دشواریوں سے گزرنا پڑتا ہے اور کتنے سنگین حالات سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ شدید ناکامیوں کے بعد ہی کامیابیوں کا باب مکمل ہوتا ہے۔ یقیناً کسی بھی کامیاب انسان کی ذہنی بلندی اور محبت لوگوں کے دل جیت لیتی ہے اور پھر وہ شخص اپنی قوم میں اس طرح مقبول ہو جاتا ہے کہ تاریخ کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ میرے والد گرامی کی زندگی دوسروں سے مختلف نہ تھی وہ بھی بے شمار مسائل میں گھرے رہتے تھے۔ غم اور خوشی دونوں ہی ان کے ساتھ تھے۔ انھوں نے بلند حوصلوں اور استقامت کے باعث وہ سب کچھ حاصل کر لیا جو وہ چاہتے تھے۔ ان کی زندگی کا اختتام بھی اس منزل پر پہنچ کر ہوا جس کی انھیں تمنا تھی۔ میں انھیں سرسید اور محسن الملک کے مقابل تو نہیں لاسکتا مگر اتنا تو ہے کہ انھوں نے بھی مسلمانوں کی سربلندی اور بہتری کے لیے وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے اپنا قیمتی وقت اور دولت جو کچھ بھی اور جتنا بھی وہ صرف کر سکتے تھے انھوں نے کی۔ انھوں نے ہمیشہ جرأت، ہمت اور بے غرضی کا مظاہرہ کیا۔ اپنے اہل و عیال سے زیادہ اپنے عوام کا خیال رکھا۔ میرے خیال میں ان کی لحد پر یہ کتبہ ہونا چاہیے جو ایک فرانسیسی فلسفی نے کہا تھا ''میں نے اپنے اہل و عیال سے زیادہ محبت کی ہے اور ان سے زیادہ اپنے ملک سے محبت کی ہے مگر ان سبھوں سے زیادہ انسانیت سے محبت کی ہے''۔ وہ تمام زندگی علم کے حصول کے لیے سرگرداں رہے اور کتابوں سے محبت کرتے رہے۔ ان کی زندگی کا اہم اور

خوبصورت پہلو یہ تھا کہ انھیں خالق کائنات پر مکمل یقین اور اعتماد تھا۔ وہ آخری دم تک پاکیزگی قلب کو اہم سمجھتے رہے جس نے ان کے مذہبی اعتقادات کو ہمیشہ پختگی عطا کی۔ انھوں نے ۲ ر اگست ۱۸۴۲ کو صوبہ بہار کے ایک شہر چھپرہ (CHAPRA) میں آنکھیں کھولیں۔ ان کی پیدائش کے بعد فوراً ہی یہ خاندان بانکی پور پٹنہ منتقل ہو گیا جہاں میرے دادا نے براہ راست اپنی نگرانی میں ان کی پرورش کی۔ میرے دادا ایک مشہور وکیل اور علم و ادب کے شائق تھے۔ انھیں کتابوں سے بہت محبت تھی۔ ۱۸۵۴ء میں پٹنہ کے ڈسٹرکٹ جج مسٹر تھاور (MR.THAVAR) کے مشورے کے مطابق انھوں نے میرے والد کو پٹنہ ہائی اسکول میں داخل کرا دیا جہاں وہ ۱۸۵۴ء تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔ حالات کی خرابی اور غدر کے باعث اس سال وہ اسکول ختم کر دیا گیا اور انھیں تعلیم کے لیے کلکتہ جانا پڑا جو ان دنوں اتنا وسیع شہر نہیں تھا اور نہ وہ تجارتی طور پر ہی مشہور تھا۔ ان دنوں کلکتہ اور پٹنہ براہ راست ریلوے کے نظام سے منسلک نہیں تھے اس لیے سفر بہت ہی دشوار اور پُر خطر تھا۔ حصول علم کے لیے مال و اسباب کے ساتھ سفر کرنا بہت مشکل تھا۔ جب میرے والد کلکتہ گئے تو وہاں نواب امیر علی خاں کی زیر نگرانی رہے جنھوں نے ان کا بہت خیال رکھا۔ ۱۸۶۱ء میں انھوں نے کلکتہ یونی ورسٹی سے انٹرنس (ENTRANCE) کے امتحان میں کامیابی حاصل کی لیکن خراب آب و ہوا اور خرابی صحت کے باعث کلکتہ کا قیام مختصر کرنا پڑا اور وہ پٹنہ واپس آ گئے۔ یہاں انھوں نے قانون کی جماعت میں داخلہ لیا تاکہ وکالت کے پیشہ کو اپنائیں۔ ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۸ء کے درمیانی عرصہ میں جب وہ پٹنہ بار سے منسلک ہوئے تو انھیں بہت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ میرے دادا کی صحت و تندرستی خراب ہونے لگی اور ان کے لیے یہ دشوار ہو گیا کہ وہ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات جاری رکھ سکیں حالانکہ وہ ہمارے خاندان کے واحد کفیل تھے۔ اس طرح خاندان کی کفالت کا پورا بوجھ میرے والد پر آ پڑا اور وہ بہت مشکلوں سے اپنے خاندان کو یکجا رکھ سکے۔ انھوں نے تحصیلداری کی ملازمت کے لیے درخواست دی جو مسترد کر دی گئی۔ بہر حال انھوں نے پیشکار کی حیثیت سے ایک ملازمت حاصل کر لی لیکن وہاں جناب لیٹور (MR.LATOUR) سے جو جج کے عہدے پر فائز تھے مفاہمت نہ ہو سکی اور انھیں ملازمت چھوڑنی پڑی۔ دوسری ملازمت

جوانھوں نے حاصل کی وہ ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول کی تھی لیکن یہ ملازمت بھی پندرہ ماہ تک برقرار رہی۔ انھوں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ وہ اپنے ارادوں کی تکمیل کریں گے۔ وہ جب کبھی بھی ان ایام کو بیان کرتے تو جذباتی ہو جاتے تھے۔ مصیبتوں اور پریشانیوں نے ان کے عزائم کو متزلزل نہیں کیا وہ ہمیں بتاتے تھے کہ کس طرح وہ ذہنی کرب سے گذرے ہیں جس کا انھوں نے تن تنہا مقابلہ کیا۔ بہرحال ۱۸۶۸ء میں مصیبت کے ایام بھی ختم ہو گئے۔ جب پٹنہ بار میں ان کا نام درج کرلیا گیا تو ان کے حالات میں تبدیلی آنے لگی جس کی وجہ ان کے پیشہ میں بتدریج ترقی تھی جس نے ان پر آسودگی اور خوشحالی کے دروازے کھول دیے۔ چند ہی دنوں میں وہ مالی طور پر مستحکم ہو گئے اور شہری مقدمات میں کامیاب رہے۔ انھوں نے اپنے دادا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے علم و ادب سے محبت جاری رکھی اور ان کی خوبیوں کو اپنایا۔

۱۸۷۷ء میں انھیں ان کی خدمات کے عوض ایک اعزازی سند دی گئی۔ لارڈ رپن (LORD RIPPON) نے انھیں پٹنہ میونسپلٹی اور پٹنہ ڈسٹرکٹ بورڈ کا چیرمین بنا دیا۔ ان میں ایک کامیاب قانون داں کی تمام خصوصیات تھیں۔ غیر معمولی ذہانت کے سبب وہ بہت آسانی کے ساتھ معاملات کی تہ تک پہنچ جاتے تھے۔ ان کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ وہ جرائم پر مبنی مقدمات سے ہمیشہ خائف رہتے تھے اور کبھی بھی انھیں سنجیدگی کے ساتھ نہیں قبول کیا۔ ۱۸۸۰ء میں پٹنہ کے سرکاری وکیل مقرر ہوئے اور ۱۸۸۱ء میں انھیں خان بہادر کا خطاب ملا۔ ۱۸۹۱ء میں انھوں نے اورینٹل پبلک لائبریری (ORIENTAL PUBLIC LIBRARY) کی بنیاد رکھی۔ ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد دکن کی عدالت میں چیف جسٹس (CHIEF JUSTICE) کے عہدے پر فائز ہوئے، ۱۸۹۸ء میں وہاں سے پٹنہ واپس آ کر دوبارہ عدالت سے منسلک ہوئے۔ اسی سال ان پر فالج کا حملہ ہوا جس نے ذہنی طور پر انھیں منتشر کر دیا اور مکمل طور پر صحت بحال نہ ہو سکی۔ وہ دن بدن کمزور ہوتے گئے۔ میرے بھائی شہاب الدین اور ان کی اہلیہ نے ان کا بہت خیال کیا۔ ۱۹۰۳ء میں انھیں سی۔آئی۔ای (C.I.E) کا خطاب ملا اور حکومت نے انھیں کتب خانے کا سکریٹری مقرر کیا، تنخواہ دوسو (۲۰۰)

روپے مقرر ہوئی اور قرضوں کی ادائیگی کے لیے آٹھ ہزار (۸۰۰۰) روپے کی خاص منظوری بھی ملی۔ رفتہ رفتہ ان کی صحت خراب ہونے لگی اور آخر کار عدالت جانا ختم کرنا پڑا لیکن وہ بیکار نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ اپنا وقت کتب خانے میں گذارنے لگے جہاں مطالعہ کرتے اور مضامین لکھتے تھے۔ ۱۸۷۴ء میں مسٹر میکڈونل (MR.MACDONELL) کے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ میرے والد کتنے ہر دلعزیز تھے۔ میرے دادا نے بستر مرگ پر اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ ایک عوامی کتب خانے کا اجرا کریں۔ میرے والد نے ان کی خواہش پوری کر کے فقط اپنے خاندان کی شہرت ہی میں اضافہ نہیں کیا بلکہ ہندوستان کی ادبی تاریخ میں ایک پُر وقار مقام حاصل کر لیا۔
اب میں اپنے خاندان کے متعلق کچھ بتاتا ہوں۔ صوبہ بہار کے کسی بھی خاندان کے لیے یہ دشوار ہے کہ وہ کسی دوسرے خاندان کی مثال دے جس کی تین پشتوں میں علم وادب کی شمعیں جلتی رہی ہوں۔ ہمارا سلسلۂ نسب قاضی ہبیت اللہ (QAZI HUBATULLAH) سے ملتا ہے جنھوں نے فتاوائے عالمگیری مرتب کی تھی لیکن میں اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتا ہوں۔ میرے والد اپنی عادت اور طور طریقوں کے باعث ہمیشہ ایک نمایاں طبقے کے فرد لگتے تھے۔ قاضی رضا حسین اور مولوی محمد حسن میرے والد کے مخلص دوست تھے جو آپس میں بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی یہ محبت ہمیشہ برقرار رہی۔ وہ لوگ باقاعدگی سے میرے گھر آتے تھے اور بہت دلجمعی سے مسلمانوں کے مسائل کا تجزیہ کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مسلمان طالبعلموں کے تعلیمی اخراجات میں ان کی مدد کرتے تھے۔ ان لوگوں نے انگریزی تعلیم سے متعلق شکوک وشبہات اور دقیانوسی خیالات کا پامردی سے مقابلہ کیا۔ یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے صوبہ بہار میں علم کی شمع روشن کی جو مدھم سہی مگر اب تک روشن ہے۔
مجھے یقین ہے یہ شمع آب وتاب کے ساتھ فروزاں رہے گی۔ شدید مصروفیت کے باوجود بھی میرے والد نے علم وادب سے رابطہ برقرار رکھا اور مطالعہ کرتے رہے۔ عدالت سے واپس آنے کے بعد وہ فوراً کھانا کھا کر ایک گھنٹہ آرام کرنے کے بعد اپنے کتب خانے میں چلے جاتے تھے جو ان دنوں ان کی رہائش گاہ بھی تھا۔ وہاں یا تو مطالعہ کرتے یا پھر کتابوں پر

یادداشت قلمبند کرتے تھے اور اس کے علاوہ لوگوں سے مذہب اور تاریخ کے موضوع پر گفتگو کرتے۔ سورج غروب ہونے کے بعد اپنے موکلوں سے نہیں ملتے تھے، پیشہ وارانہ کام بھی نہیں کرتے تھے۔ اپنے کتب خانے میں چند گھنٹوں تک اپنی کتابوں میں گھرے رہنے کے بعد خوش و خرم دکھائی دیتے اور غم و فکر سے آزاد ہو جاتے تھے۔ علم و ادب کی چھاؤں نے انھیں پریشانیوں سے نجات دلا دی تھی۔ مولانا حافظ اور رومی دونوں ہی ان کے علمی ساتھی تھے جن سے وہ جدا نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ ان کی تصنیفات کے مطالعہ کو مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔

میرے والد عربی سے زیادہ فارسی کے عالم تھے لیکن عربی کی معلومات بھی کچھ کم نہیں تھیں۔ وہ گھنٹوں عربی اور فارسی کے اشعار سناتے تھے۔ یہاں میں محبوب الالباب (MAHBOOB UL ALBAB) کا ذکر کروں گا جو عربی اور فارسی مخطوطوں کی ایک طویل فہرست ہے اور پانچ سو (۵۰۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ انھوں نے یہ فہرست بہت محنت سے مرتب کی تھی جس میں مصنفین اور ان کی تصنیفات کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔ چند ناگزیر حالات اور حیدرآباد دکن جانے کے باعث وہ یہ کام مکمل نہیں کر سکے۔ پروفیسر جی۔ براؤن (PROF. G. BROWNE) نے پرشیا کی ادبی تاریخ (LITRARY HISRTORY OF PERSIA) کی پہلی جلد ہمارے کتب خانے کو پیش کی۔ وہ گرچہ فارسی اور عربی کے عالم تھے لیکن انگریزی زبان سے نابلد نہیں تھے۔ انھوں نے لارڈ بائرن (LORD BYRON) کے مقالوں کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا جس سے ان کی فارسی اور انگریزی زبان کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انگریزی شاعروں میں لارڈ بائرن اور شیلے کی بہت تعریف کرتے تھے۔ ان کے خیال میں شیلے کی شاعری میں نغمگی اور کیٹس کے یہاں وقار ہے جب کہ ورڈس ورتھ (WORDSWORTH) کی شاعری دلوں میں اتر جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ٹینسن (TENYSON) بھی ان کے پسندیدہ شاعر تھے۔ وہ گبن (GIBBON) کی بہت تعریف کرتے تھے اور انھیں رائز آف اسلام (RISE OF ISLAM) کا پورا باب زبانی یاد تھا۔ وہ کہتے تھے کہ زندگی میں کچھ بھی نہ ہوتا اگر فہم و فراست اور عقل و دانش کے حصول کی لگن نہ ہوتی۔ جب

میں انگلستان جا رہا تھا تو انھوں نے مجھے ہدایت کی کہ میں فرانسیسی اور جرمن زبانیں ضرور سیکھوں۔ چونکہ مشرق اور مغرب دونوں ہی ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور نظریات و احساسات کا فرق ہے اس لیے کسی بھی یورپی مصنف کے لیے یہ مشکل کام ہے کہ وہ مکمل طور پر مشرق کی ترجمانی کر سکے۔ اس کے علاوہ مشرق میں مذہب کو کلیدی حیثیت حاصل ہے جب کہ مغرب میں یہ محض ایک سماجی فریضہ ہے۔ والد صاحب مذہبی طور پر انتہا پسند نہیں تھے۔ انھوں نے سچے مسلمان کی طرح زندگی بسر کی۔ وہ پابندی کے ساتھ پانچوں وقت کی نماز پڑھتے تھے۔ صبح کی نماز کے بعد کلام پاک کی تلاوت کرتے تھے۔ انھیں ہمیشہ اس بات کا افسوس رہا کہ وہ مدینہ شریف اور مکہ معظمہ کبھی نہیں گئے۔ مذہبی معاملات میں اکثر و بیشتر مجھ سے اتفاق نہیں کرتے تھے لیکن برہمی کا اظہار کبھی نہیں کیا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں سر ولیم مویئر (SIR WILLIAM MUIR) کی تصنیف لائف آف محمدؐ اور ڈوڈاس (DODAS) کی تصنیف بدھا، کرائسٹ اینڈ محمدؐ (BUDHA, CHRIST AND MUHAMMAD) کا مطالعہ ضرور کروں۔ اس کے علاوہ مجھے دوسرے مخطوطات کے مطالعہ کے لیے ہدایت کی یعنی ابن ہشام (IBNE HASHAM) کی تصنیف شفا آف کادھ لیاہ (SHIFA OF KADH LYAH) ملا کا ایک نادر مخطوطہ کتاب الوسیلہ (KITAB-UL-WASILA) اور ابن قیم (IBN-E-QAYYUM) کا ایک مخطوطہ زاد المعاد (ZAD-UL-MAAD) کے مطالعہ کے لیے ہدایت کی۔ یہ سب مخطوطے ہمارے کتب خانے کی زینت ہیں۔ وہ یہ کہتے تھے کہ اسلام ایک مثالی مذہب ہے جو مذہبی فرائض کی ادائیگی کے ساتھ دنیوی فرائض اور ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی کے ساتھ پورا کر سکتا ہے۔ انھیں اپنے مذہب سے وابستگی تھی مگر دوسرے مذاہب کا احترام کرتے تھے۔ وہ کبھی بھی یہ سوچ نہیں سکتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جو مہربان، منصف اور انصاف پسند ہے وہ کس طرح بیشتر انسانوں کو دوزخ کی دائمی آگ میں جھونک دے گا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر یقین رکھتے تھے اور پریشانیوں اور مصیبتوں کو آزمائش سمجھتے تھے۔ ان کا فلسفۂ حیات تھا کہ جو ہے وہ صحیح ہے۔ انھیں اس بات کا دکھ تھا کہ دولت کی تقسیم غیر مساوی ہے لیکن یہ بھی کہتے تھے کہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ ایک دفعہ ان کی

جوانی کے دنوں میں ان کے ایک دوست جو بہت پریشان تھے اور انھیں رقم کی بہت ضرورت تھی ان کے پاس ایک مخطوطہ لے کر آئے جسے وہ فروخت کرنا چاہتے تھے۔ والد صاحب نے انھیں سو روپے دیے اور مخطوطہ بھی واپس کر دیا۔

وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان خوشگوار تعلقات چاہتے تھے۔ ۱۸۹۳ء میں انھوں نے گائے کے ذبیحہ کے سلسلے میں بہت خوش اسلوبی کیساتھ معاملات طے کیے۔ اس موقع پر اس وقت کے لفٹیننٹ گورنر سر انتھونی میکڈونل (SIR ANTHONY MACDONEL) نے ان کے خیالات اور افکار کی تعریف کی۔ وہ سیاسی نظریات کو عملی طور پر پرکھتے تھے۔ ان کے خیال میں انگریزوں کے بغیر ملک افراتفری کا شکار ہوسکتا تھا۔ وہ انگریزوں کے احساس فرض کی تعریف کرتے تھے۔ اسی طرح انگریز بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ وہ اس بات سے خوش تھے کہ انھوں نے عوام کی بھلائی کی خاطر اپنی قیمتی اور نادر کتابیں کتب خانے کو دے دیں ہیں۔ انھیں اس بات کا افسوس تھا کہ سیاست داں اپنی صلاحیتیں برباد کر رہے ہیں۔ ان کے خیال میں سوراج اور بائیکاٹ کے باعث ملک کو نقصان پہنچتا ہے اور ہندوستان کی سیاسی شناخت میں دشواری ہوتی ہے۔ ہندوستان کے رہنماؤں کے پاس نوے لاکھ عوام کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے جو قوم کو ترقی کی راہ پر لے جاسکے۔ سیاست دانوں کے لیے بہتر ہے کہ انھیں سیاست میں وقت ضائع کرنے کی بجائے مسلمانوں اور ہندوؤں کی بہتری کے لیے سوچنا چاہیے۔ یعنی ان کی سماجی ترقی اور ذہنی نشو و نما کی طرف توجہ دینا چاہیے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ انسان کا گھر خود ہی درس گاہ ہے۔ کسی بھی قوم کے لیے دیانت داری، خود اعتمادی، مذہب کا احترام اور عورتوں کی عزت یہ سب کچھ ضروری ہے۔ انھیں سودیشی تحریک سے ہمدردی تھی اور اس بات کا احساس تھا کہ لوگوں کے دلوں میں بغاوت کی چنگاریاں سلگتی رہی ہیں جس کے لیے ضروری ہے کہ حکومت اور عوام کے درمیان جو غلط فہمیاں ہیں وہ دور کی جائیں۔ انگریزی تعلیم نے عربی اور سنسکرت سے دوری پیدا کر کے ہندوستانیوں پر یورپی تہذیب و ثقافت کے گہرے نقش مرتب کر دیے ہیں۔ انھیں یہ احساس تھا کہ عوام رفتہ رفتہ حکومت سے برگشتہ ہوتے جا رہے ہیں جس کے باعث تفرقہ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ لوگ

حکومت کے اعلی عہدوں پر فائز ہوں۔ انھیں امید تھی کہ وقت گذرنے کے ساتھ عوام کو زیادہ رعایت ملے گی۔ وہ تجارت وصنعت کی ترقی سے خوش تھے جس کے باعث امن اور خوشحالی کا دور شروع ہوا اور جس نے مستقبل پر گہرے اثرات کے امکانات پیدا کیے۔

ان کے خیال میں یہ سب کچھ خوشگوار سہی مگر یورپی تہذیب کے منفی گوشوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جن کے مضر اثرات ہندوستان کے سماجی نظام پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ مشرقی اقدار کے تحت لوگ رسم ورواج کی پابندی کرتے ہیں جس کے باعث وہ لوگ آپس میں محبت کی ڈور سے بندھے ہوئے ہیں جب کہ یورپی طرز معاشرت اس سے مختلف ہے۔ میرے والد نے مقابلے کے امتحانات کو کبھی بھی اہمیت نہیں دی۔ یہ ضروری نہیں کہ ان امتحان کے باعث کوئی خود کو اچھا منصف یا افسر ثابت کر سکے۔ کئی پشتوں کے بعد ہی ممکن ہے کہ ایثار کا جذبہ اور فرائض کا احساس ہو سکے۔ ایسے لوگوں کو جو بھی کام دیا جاتا ہے وہ پورا کرتے ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے قدیم گھرانوں کے کچھ لوگ اپنی صلاحیت، دوررنگاہی اور غیر معمولی یادداشت کے باعث مقابلوں کے امتحانات میں کامیاب رہے ہیں اور ایسے افراد کو عوام کا بھرپور اعتماد حاصل رہا ہے۔ یہی لوگ عوامی محکموں میں اپنی صلاحیت سے یقین کی فضا قائم کر لیتے ہیں جس سے ان محکموں کا معیار بلند ہوتا ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ سرسید اور محسن الملک نے اپنے تدبر اور انتظامی صلاحیت سے سبھوں کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ انھیں اس بات کا افسوس رہا کہ سرایشلے ایڈن، سرانتھونی میکڈونل اور دوسرے اصحاب جو ہندوستانی سول سروس کے ستون تھے اب معدوم ہوتے جارہے ہیں۔ ان اشخاص نے ہندوستانیوں پر اعتماد کیا اور بے شمار معاملات میں ان کی ہمت افزائی کی۔ اس کے برعکس کئی دوسرے اشخاص نے اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح کے ایک واقعہ کا میں شاہد ہوں۔ ایک مرتبہ ایک عدالت میں ایک انگریز نوجوان افسر اس طرح آیا جیسے کہ وہ کوئی وائسرائے یا لفٹیننٹ جنرل ہو۔ اس نے سب لوگوں کو نظر انداز کر کے سگار نوشی شروع کردی اور دس منٹ کے بعد کمرے سے باہر چلا گیا گویا اس کے وقار کے خلاف تھا کہ عدالت کا کام شروع کرنے سے پہلے وہ چند لمحے

ہندوستانیوں کے ساتھ اس کمرے میں گزارتا۔ والد صاحب کے خیال میں یہ ضروری تھا کہ انگریز اور ہندوستانی ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلفی کے ساتھ ملیں اور گرمجوشی کا اظہار کریں تاکہ شک وشبہات دور ہوسکیں۔ تعریفی کلمات اور خوشامدانہ رویوں سے وہ ہمیشہ شاکی رہتے تھے اور اسے عوام کی رائے جانچنے کے لیے مناسب نہیں سمجھتے تھے جو عوامی مقبولیت کے لیے نامناسب تھا۔ انھوں نے ہندوستانی آبادی کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ اول وہ لوگ جو خاموشی برقرار رکھتے ہوئے وحشیانہ رویوں کی نفی کرتے ہیں۔ دوئم وہ لوگ جو اپنی وفاداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے حکومت سے وفاداری اور لگاؤ کا اظہار کرتے ہیں۔ سوئم وہ لوگ جنھیں سوراج کے علاوہ کسی دوسری شے سے دلچسپی نہیں ہے۔

والد صاحب کے خیال میں سیاسی انتشار کی وجہ یہی ہے کہ افہام وتفہیم سے کام نہیں لیا جاتا۔ قانونی بالادستی تو عارضی ہوتی ہے، اس سے عوام کے دلوں سے اٹھتے ہوئے شعلوں کو نہیں دبایا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں لارڈ سالسبری (LORD SALISBURY) نے کیا خوب کہا ہے "سیاست میں صداقت، پاکیزگی اور انصاف سے زیادہ کچھ بھی اہم نہیں ہے"۔

بانکی پور اورینٹل پبلک لائبریری

اتنا کچھ بیان کرنے کے بعد اب میں اس کتب خانہ کی تاریخ بیان کرتا ہوں جو میرے والد کی زندگی کا ایک اہم کارنامہ ہے، جس سے ان کی شہرت ہوئی اور جو ادبی دنیا پر بہت بڑا احسان ہے۔ میرے دادا بنیادی طور پر ایک عالم تھے اور اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ مخطوطات کی خریداری پر صرف کرتے تھے جن کی تعداد ۱۸۷۶ء میں ۱۴۰۰ (چودہ سو) تھی۔ جب وہ بستر مرگ پر تھے تو انھوں نے میرے والد کو یہ ذمہ داری سونپی کہ جب بھی حالات اجازت دیں تو اس کتب خانے کو عوامی کتب خانہ بنادیں۔ اس طرح اس جہد مسلسل کا آغاز ہوا۔ اس سلسلے میں ماڈرن ریویو (MODERN REVIEW) ماہ ستمبر کے شمارے میں پروفیسر جادو ناتھ سرکار نے اپنے مضمون میں انھیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے: "دہلی میں مغلوں کے کتب

خانے میں بہت قیمتی مخطوطات تھے۔ سولھویں اور سترھویں صدی میں مشرقی خطاطی کے نادر نمونے بھی تھے جنھیں امپیریل سروس (IMPERIAL SERVICE) کے مصوروں نے بنایا تھا۔ ان میں سے کچھ تو فاتحین نے ضبط کر لیے اور امراء کی وفات کے بعد بھی کچھ ضبط کر لیے گئے۔ شہنشاہ اکبر کے درباری شاعر فیضی کے پاس چار سو جلدیں تھیں جنھیں شہنشاہ کے کتب خانے میں منتقل کر دیا گیا۔ ہم کہ سکتے ہیں کہ اس دور میں مشرق کے سب سے بڑے کتب خانے کی تشکیل ہوئی جب کہ وسط ایشیا، فارس اور عربیہ (ARABIA) جنگ کے بادل چھائے رہے۔ مغلوں کی حکومت کے دوران ہندوستان میں امن و امان رہا۔ اٹھارھویں صدی میں بھی امرا نے اپنے کتب خانوں کے لیے بہت سے مخطوطات حاصل کر لیے لیکن ۱۸۵۷ء میں جب ہندوستانی سپاہیوں نے بغاوت کر دی تو دہلی اور اودھ کا زوال ہوا جس کا اثر کتب خانوں پر ہوا۔ رامپور کے نواب نے انگریزوں کا ساتھ دیا، اسے لوٹ مار میں بہت کچھ ملا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ وہ ایک ہزار روپیہ فی مخطوطہ دے گا۔

اب میں دوبارہ کتب خانے کی طرف آتا ہوں۔ میرے والد جناب خدا بخش اور نواب رامپور کے درمیان مقابلہ شروع ہوا اور آخر کار وہ نواب پر سبقت لے گئے۔ انھوں نے محمد باقی جو ایک عرب تھا اور جس کا کتابوں کے خزانوں کو دریافت کرنے میں کوئی ثانی نہیں تھا اسے پچاس روپیہ ماہانہ اور کمیشن پر ایک سال کے لیے ملازم رکھا۔ اس کا کام ہی یہی تھا کہ وہ نادر مخطوطات کو تلاش کرے جو بیشتر عربی زبان میں تھے اور شام، عربیہ، مصر اور بیروت میں مل سکتے تھے۔ ان کی یہ عادت تھی کہ ہر وہ شخص جو مخطوطہ فروخت کرنے کے لیے بانکی پور آتا تھا اسے وہ دُگنا کرایہ دیتے تھے۔ اس طرح پورے ہندوستان میں ان کی شہرت پھیل گئی۔ یہاں ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ایک جلد ساز نے ہمارے کتب خانے سے کچھ مخطوطے چرا لئے اور ایک شخص کو جو کتابوں کا تاجر تھا اسے فروخت کر دیے۔ والد صاحب کی خوش قسمتی تھی کہ اس شخص نے وہ مخطوطے انھیں فروخت کر دیے۔ اسی طرح جناب جے۔ بی۔ ایلیٹ (J.B.ELLIOT) بھی کتابیں جمع کرنے کے شوقین تھے۔ انھوں نے والد صاحب سے ایک نادر مخطوطہ اوڈس آف

کمال الدین اسمٰعیل اصفہانی (ODES OF KAMALUDDIN ISMAIL ISPHAHANI) عاریتہً لیا اور پھر اسے واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ جب وہ اپنی ملازمت کی مدت پوری کر چکے تو انھوں نے اس مخطوطے کو صندوق میں رکھ کر انگلستان بھیج دیا اور دوسری کتابوں کو جو زیادہ اہم نہیں تھیں انھیں دوسرے صندوق میں رکھ کر پٹنہ میں چھوڑ گئے تاکہ وہ نیلام کر دی جائیں۔ والد صاحب کی خوش قسمتی تھی کہ اس صندوق میں وہ مخطوطہ مل گیا اور ساتھ ہی نیلام میں دوسرے قیمتی مخطوطے بھی ملے مثلاً مجالس خمس (MAJALIS I KHAMS) جس پر شاہ جہاں کے دستخط تھے۔ جب ایلیٹ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ ایک دن جب والد صاحب عدالت سے واپس آ رہے تھے تو انھوں نے ایک دکان میں کتابوں کی گٹھری دیکھی۔ انھوں نے اس کی قیمت دریافت کی۔ دکاندار نے جواب دیا کہ ''دوسروں کو وہ ان ردی کاغذات کو فقط تین روپوں میں فروخت کرے گا مگر چونکہ آپ دلچسپی لے رہے ہیں اس لیے آپ سے فقط بیس روپے لوں گا''۔ انھوں نے اسے بیس روپے دے کر وہ سب کچھ خرید لیا جس میں انھیں عربی زبان میں ایک نادر کتب نامہ (BIBLIOGRAPHY) ملا۔ اس کے لیے نظام حیدرآباد دکن نے چار سو (۴۰۰) روپے کی پیشکش کی جو انھوں نے نامنظور کر دی۔ ان کے پاس ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے لاتعداد مخطوطات آتے تھے جن کے لیے شائقین نے خطیر رقمیں پیش کیں مگر وہ ہمیشہ انکار کرتے رہے۔ جب ان کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا تو انھیں خیال آیا کہ کتب خانے کے لیے کسی عمارت کا انتظام کیا جائے۔ ۱۸۸۶ء میں انھوں نے اپنے عزیز دوست مسٹر کیمبل (MR. CAMPBELL) سے درخواست کی کہ وہ اس سلسلے میں حکومت کو آگاہ کریں کچھ عرصہ کے بعد جب سر چارلس لائل (SIR CHARLES LYALL) نے کتب خانے کا معائنہ کیا تو وہ بہت متاثر ہوئے اور اپنی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے حکومت بنگال کو اس کی اہمیت اور افادیت سے آگاہ کیا اور زور دیا کہ کتب خانے کی سرپرستی کی جائے۔

آخر کار اس وقت کے لفٹیننٹ گورنر سر چارلس ایلیٹ نے کتب خانے کا افتتاح کیا جس

میں چار ہزار بیش قیمت اور نادر مخطوطات تھے۔ اس کا نام خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری (KHUDA BAKHSH ORIENTAL PUBLIC LIBRARY) رکھا گیا اور اس کے دروازے عوام کے لیے کھول دیے گئے۔ اب جب کہ میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں تو مخطوطات کی تعداد پانچ ہزار سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی زبان میں دو ہزار پانچ سو (۲۵۰۰) سے زیادہ کتابیں ہیں۔ والد صاحب کتابوں کی اعلیٰ جلد بندی پر زور دیتے تھے۔ میرے لیے یہ دشوار کام ہے کہ چند صفحوں میں اس کتب خانے کا ذکر کروں جو نایاب مخطوطات اور نادر کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس سلسلے میں والد صاحب کے اس مقالے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو چند سال پہلے شائع ہوا تھا۔ وہ کہتے ہیں: ''یہ صحیح ہے کہ مغلوں نے ثقافت میں وہ امتیازی حیثیت حاصل نہیں کی جو بغداد اور قاہرہ کے مسلمانوں نے حاصل کی لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے علم و ادب کی سرپرستی کر کے خود کو اس کا اہل ثابت کر دیا۔ چنگیز خاں کی نسل نے اسلام قبول کیا اور علم و ادب حاصل کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔ ان ہی بادشاہوں کی سرپرستی میں نصیر الدین طوسی، قطب الدین شیرازی اور سعد الدین تفتازانی کو علم و ادب کی خدمت کا موقع ملا۔ ہندوستان میں سلاطین مغلیہ نے فنون لطیفہ اور سائنسی علوم کا تحفظ کیا جس کے ساتھ تہذیب و تمدن کی ترقی میں گہری دلچسپی لی۔ شہنشاہ شاہ جہاں کو کتابوں سے بہت محبت تھی۔ دکن کے بادشاہوں نے بھی علم و ادب سے وابستگی کا اظہار کیا۔ ہندوستان میں بے شمار کتب خانے تھے مگر ۱۸۵۷ء میں غدر کے بعد جب کہ ہندوستان کی تاریخ ایک کربناک دور سے گذر رہی تھی تو وہ کتب خانے تباہ ہو گئے۔ بہت سی کتابیں ہندوستان سے باہر لے جائی گئیں اور جو بچ گئیں ان کی تعداد بہت قلیل تھی جو ارزاں قیمت پر فروخت کر دی گئیں۔ جہاں تک میں جانتا ہوں اس وقت ہندوستان میں مشرقی کتابوں کا کوئی بھی کتب خانہ نہیں ہے جس کا مقابلہ مدینہ شریف، قاہرہ اور قسطنطنیہ کے کتب خانوں سے کیا جا سکے۔ یہاں میں اپنے کتب خانے کا ذکر کرنے سے گریز کر رہا ہوں جو میں نے پٹنہ شہر کو دیا ہے۔ میں اس پر مغرور نہیں ہوں بلکہ اس سے میرا یہی مقصد ہے کہ یورپ میں مشرقی علوم کے شائقین پر وہ سب کچھ واضح کر دوں جو وہ بہت کم جانتے ہیں اسی لیے میں یہ مقالہ لکھ رہا

ہوں۔ اب یہ کتب خانہ حکومت ہند کی نگرانی میں ہے۔ میری کوشش یہی ہے کہ میں اس کی حفاظت کروں۔ جب تک کسی مطبع کا مناسب انتظام نہیں ہو جاتا بہت دشواری رہے گی۔ اس کے ذریعہ ہم مخطوطات اور کتابوں کی تعداد میں اضافہ کر سکتے ہیں''۔

''والد صاحب کی یہی کوشش رہی کہ وہ قیمتی اور نادر مخطوطات حاصل کرتے رہیں جس کے لیے اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ صرف کرتے رہے۔ ان کے انتقال کے وقت ان کی تعداد چودہ سو (۱۴۰۰) تھی جنھیں انھوں نے میری تحویل میں دے دیا اور ہدایت کی کہ جب میں اس قابل ہو جاؤں تو ان کے کتب خانے کو عوامی کتب خانے میں تبدیل کر دوں۔ اس طرح وراثت میں مجھے ان کے حوصلے اور جذبے ملے جن کے باعث میں اس کتب خانے کی صحیح طور پر دیکھ بھال کرتا رہا ہوں اور کتابوں کی تعداد میں اضافہ کرتا رہا ہوں۔ انگریزی زبان میں کتابوں کی تعداد زیادہ تو نہیں ہے مگر ادبی اور سائنسی موضوعات پر مخطوطات کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے جن کے مالک معزز مشرقی ہستیاں تھیں یعنی ڈی ساسی (DE SACY)، سر جارج اوسلے (SIR GEORGE OUSLEY) اور کلکتہ مدرسہ کے جناب بلوچ مان (MR. BLOCH MANN)۔ ان ہستیوں نے ان مخطوطات کے حاشیوں پر ان کے مفہوم کو تحریر کیا ہے۔ میں نے پہلے ہی بیان کیا ہے کہ سیاسی افراتفری کے باعث کس طرح کتب خانے تباہ کر دیے گئے، اندرونی خلفشار کے علاوہ بعض قوتوں کی تنگ نظری نے کتب خانوں کو نقصان پہنچایا مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوا چونکہ کچھ مغل حکمرانوں نے علم و ادب کو بہت فروغ دیا۔ ان افسوس ناک حالات کے باعث مسلمان مصنفین دوسری سے ساتویں ہجری کے درمیان زیادہ تصنیفات نہ کر سکے۔ اب جو مصنفین کی کتابیں ہیں وہ خاص کر ان لوگوں کی ہیں جو ساتویں ہجری کے وسط سے گیارہویں ہجری تک لکھ سکے۔ یہ میری کامیابی ہے کہ میں نے اس سے پہلے کے مخطوطات حاصل کر لیے ہیں جو آسٹرونومی (ASTRONOMY)، سرجری، میڈیسن (MEDICINE)، میٹافزکس (METAPHYSICS)، مکسڈ میتھمیٹکس (MIXED MATHEMATICS) سے متعلق ہیں۔ بہت سے مخطوطات مشہور یہودی قانون دانوں کے تحریر کردہ ہیں جو بہت خوش اسلوبی اور

مہارت سے لکھے گئے ہیں۔ میں نے جو پہلے حصے کا کتاب نامہ شائع کیا ہے اس میں ان مسودات کے متعلق تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اگر مجھے وقت اور صحت نے اجازت دی تو بہت جلد اس کا دوسرا حصہ پیش کروں گا۔ ان میں سے چند مسودات کا ذکر کرتا ہوں۔ زہراوی (ZAHRAVI) نے سرجری پر جو کام کیا ہے وہ خاص توجہ کا مستحق ہے۔ اس مخطوطے میں جراحی کے آلات کی تصاویر بہت نمایاں طور پر دکھائی گئی ہیں جنھیں دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ اسپین کے مسلمان ان سے لاعلم نہیں تھے۔ دوسرا مخطوطہ میڈیسینل پلانٹس (MEDICINAL PLANTS) پر DIOSCORDIES ہے جس کا ترجمہ عربوں نے خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں کیا تھا۔ یہ وہی مخطوطہ ہے جسے چھ (۶) سو سال پہلے جلال الدین شیرواں شاہ نے شیراز میں کتب خانے کو عطا کیا تھا۔ اس کتب خانے میں ایک بہت پرانا مخطوطہ ہے جسے ابونصر فارابی اور ثابت ابن کرائی (THABIT IBNE KURRA) نے ترتیب دیا تھا۔ انگلستان میں مشرقی علوم کے ایک ماہر نے مجھے بتایا کہ خدا بخش اورینٹل لائبریری میں نحاس (NAHHAS) کے تجزیہ کی ایک کاپی جو معلقات (MOALLAKAT) پر ہے وہ یورپ کی کسی بھی لائبریری سے بہتر ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے مخطوطات ہیں جو دہلی کے حکمرانوں مثلاً مرزا کامران کی شاعرانہ صلاحیتوں سے متعلق ہیں۔ یہ تصنیفات محمد اسحاق شمی نے لکھی ہیں جو دہلی کے بادشاہوں کے پاس رہیں اور شہنشاہ اکبر سے محمد شاہ تک منتقل ہوتے رہے۔ ان پر جہانگیر، شاہ جہاں اور عبدالرحیم خان خاناں کے دستخط ہیں۔ اس کے علاوہ عادل شاہی اور قطب شاہی خاندانوں کی کتابیں بھی ہیں جو کتاب خانے کی زینت ہیں۔ جہانگیر نے اپنی خودنوشت میں ایک تصنیف زلیخا (ZULAIKHA) کے متعلق تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح کی ایک تصنیف ہمارے کتب خانے میں بھی ہے۔ جہانگیر کے اندازے کے مطابق اس کتاب کی مالیت بیس ہزار روپے (۲۰۰۰۰/-) رہی ہے۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے ہمارے کتب خانے میں اس موضوع پر چار سو (۴۰۰) مخطوطات ہیں۔ ان کی جلد بندی بہت ہی نفاست کے ساتھ مشرقی انداز میں کی گئی ہے۔ مذہبی موضوعات پر بھی بہت کتابیں ہیں جن پر

مصنف کے دستخط ہیں خاص کر سبکی (SUBKI) ذہبی (ZAHABI)، ابن حجر (HBNE HAJAR) اور دوسری کتابیں۔ تاریخ پر جو کتابیں ہیں وہ قابل توجہ ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ پر مسلمان مؤرخین کی کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے مصنفین نے حدیث اور فقہ (HADIS AND FIQH) کی کتابوں پر دستخط کیے ہیں۔ مغل بادشاہوں کی سوانح حیات ہمارے کتب خانے کا اہم حصہ ہے۔ یہ بہت ہی نادر کتابیں ہیں۔ اگر ان کی دیکھ بھال نہ کی گئی اور صحیح طور پر محفوظ نہ کی گئیں تو نصف صدی کے بعد وہ تلف ہو جائیں گی۔ کتب خانے کے منتظمین کا فرض ہے کہ وہ انھیں دوبارہ ترتیب دے کر شائع کریں۔ میں پُر امید ہوں کہ ہندوستان کی حکومت سنجیدگی کے ساتھ تاریخ وادب اور دوسرے موضوعات پر جو نادر کتابیں ہیں ان پر توجہ دے گی۔ حکومت کی توجہ اور دلچسپی کے باعث عوام ان کتابوں سے فائدہ اٹھائیں گے اور اس طرح مشرقی تہذیب وتمدن سے آگاہ ہوسکیں گے۔ اس کے علاوہ مشرقی مصوری اور ایرانی خطاطی کے بہت ہی دیدہ زیب نمونے اس کتب خانے کی زینت ہیں۔ قانون، فلسفہ، تاریخ، دینیات، سائنس اور طب پر بھی بہت ہی نادر تصنیفات ہیں۔ کچھ ایسی بھی تصنیفات ہیں جنھیں لوگ نہیں جانتے ہیں۔ حضورؐ کی سوانح حیات پر ہمارے پاس ملا کی تصنیف کتاب الوسیلہ (KITAB - UL - WASILA OF MULLA) اور ابن قیم کی تصنیف زاد المعاد (ZAD - UL - MA AD OF IBNE QAYYUM) ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس کتاب تیسیر البیان فی تخریج آیات القرآن (KITAB TAISIR - UL - BAYAN FI TAKHRIJ AYAT- IL QURAN) ہے جو موضعی (MAUZAI) نے لکھی ہے اور احکام القرآن ہے جو جصاص رازی (JASAS RAZI) کی تصنیف ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ تاریخی موضوعات پر ہمارے پاس ابن حزم کی جمھرۃ النسب (IBNE HAZIM'S JAMHARAT UL NASAB) اور ذہبی کی تصنیف دول الاسلامیہ (DAWL UL ISLAMIA) ہے اور اس کے ساتھ ایک نادر مخطوطہ کتاب رأس مال الندیم (KITAB RA'SMAL IN - NADIM) ہے۔ فقہ (FIQH) پر جو مخطوطات

ہیں ان میں سے میں فقط دو مخطوطوں کا ذکر کروں گا یعنی فخر الدین رازی کی تصنیف المحصول فی الاصول (ALMAHSUL FIL - USUL OF FAKHRUDDIN RAZI) اور مراتب الاجماع (MARATIB UL IJMA) جو ابن حزم نے لکھی ہے۔

میں نے خاص طور پر ان مخطوطات کا ذکر کیا ہے تاکہ حکومت ان کی اشاعت کا منصوبہ بنائے اب مجھے اجازت دیجیے تاکہ مشرقی علوم کے ماہروں کی توجہ نادر مخطوطات کی جانب دلاؤں جو ہمارے کتب خانے میں ہیں۔

نمبر ۱- کتاب المشجر (KITAB UL MUSHAJJAR) جس کے مصنف ابن ماسویہ (HBNE MASAWYAH) ہیں۔ یہ مخطوط طب کے موضوع پر ہے۔ مصنف کا انتقال ۲۴۳ ہجری میں بہ مقام سمرا ہوا۔

نمبر ۲- کتاب التصریف لمن عجز عن التالیف جس کے مصنف ابو القاسم ہیں۔ (KITAB UL - TASRIF OF ALBUCASIS) یہ ابو القاسم کی مکمل تصنیف ہے۔ طب کے موضوع پر جو حصے مخصوص کیے گئے ہیں وہ پرانے عربی رسم الخط میں درج ہیں اور اس پر جو تاریخ لکھی ہے وہ ۵۸۴ اے، ڈی ہے۔ اس میں جراحی کے آلات کی تصاویر بہت ہی نفاست اور خوبصورتی کے ساتھ بنائی گئی ہیں جو مختلف رنگوں میں ہیں۔

نمبر ۳- تلویح الطب (TALWIH UL - TIB) جس کے مصنف الخجندی (AL - KHUJANDI) ہیں۔ یہ ایک نادر مخطوطہ ہے جو عربوں کے طبی طریقوں سے متعلق ہے۔

نمبر ۴- کتاب الحشائش (KITAB UL - HASHAISH) جس کا پہلی مرتبہ اسٹیفن نے ترجمہ کیا تھا اور جس پر ہمایوں بن اسحاق نے نظر ثانی کی۔ یہ میٹیر یا میڈیکا (MATERIA MEDICA) ہے۔ اس کے علاوہ اسے ناتلی حسین بن ابراہیم بن حسین الناتلی (NATILI UL HUSAIN BIN IBRAHIM BIN HUSAIN AN - NATILI) نے اور بہتر بنا دیا۔ ہمارے پاس جو نسخہ ہے وہ نظر ثانی شدہ اور جدید ترین ہے۔ یہ بہت ہی نادر نسخہ ہے جس میں پودوں اور درختوں کی تصاویر ہیں۔

جغرافیہ کے موضوع پر ہمارے پاس بہت ہی خاص مخطوطات ہیں جو درج ذیل ہیں:

نمبر ۱- کتاب المؤتلف والمختلف (KITAB UL - MUTALIF WAL MUKHTALIF) جسے علی بن عمر الدارقطنی (ALI BIN OMAR AD DARQUTNI)- نے تصنیف کیا تھا، جس میں صحابیوں کی زندگی کے حالات اور اس دور کے رسم ورواج سے متعلق تحریریں ہیں۔ یہ بہت ہی قدیم اور نادر نسخہ ہے۔

نمبر ۲- طبقات الحنابلہ (TABAQAT UL HANABILAH) جسے محمد بن حسین ابویعلیٰ (MUHAMMAD BIN HUSAIN ABU YA'LA) نے تصنیف کیا ہے۔

نمبر ۳- کتاب التواریخ (KITAB UT - TAWARIKH) جو ابو اسحاق ابراہیم ابی الدم (ABU ISHAQ IBRAHIM ABID DAM) کی تصنیف ہے۔ یہ اسلام کی تاریخ ہے جو حضورؐ کے دور سے سلطان مظفر کے دور پر مشتمل ہے۔

نمبر ۴- ابوعلی الفارسی (ABU ALI UL FARISI) کی تصنیف کتاب الحجہ (KITAB UL HUJJAH) جو بہت نادر ہے۔

نمبر ۵- تفسیر بحر الحقائق (TAFSIR BAHR UL - HAQAIQ) جس کے مصنف نجم الدین عبداللہ (NAJMUDDIN ABDULLAH DAYAH) ہیں۔ اس کے متعلق بہت کم لوگ جانتے ہیں اور اس کی کاپی کسی بھی کتب خانے میں نہیں ہے۔ اس میں صوفیوں کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔

نمبر ۶- تفسیر حقائق القرآن (TAFSIRE HAQAIQ UL - QURAN) جس کے مصنف محمد بن حسین السلمی (MUHAMMAD B. HUSSAIN AS SALAMI) ہیں۔ اس کی تاریخ 823 A.H ہے۔

مخطوطات کی یہ فہرست مکمل نہیں ہے۔ اگر میں یہ بیان کروں تو یہ مضمون بہت طویل ہو جائے گا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اب تک جو کچھ بیان کیا ہے وہ کافی ہے جس سے بانکی پور کتب خانے کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ میرے دوست ڈاکٹر ڈینسن راس (DR.

(DENISON ROSS) جو کلکتہ مدرسے سے وابستہ تھے انھوں نے لارڈ کرزن (LORD CURZON) کو ہمارے کتب خانے کی طرف متوجہ کیا۔ میں خاص طور پر یہ کہوں گا کہ سر چارلس لائل اور ڈاکٹر راس کی بدولت مشرقی علوم کا خزانہ ہمارے کتب خانے کی شکل میں موجود ہے۔ میں کلکتہ مدرسے کے پرنسپل کا ممنون ہوں جن کے تعاون کے باعث میں ان حضرات کو اپنے کتب خانے تک لے جاسکا جسے دیکھ کر وہ لوگ بہت خوش ہوئے چونکہ انھوں نے اسے اپنی توقعات سے زیادہ پایا انھوں نے یہ سب کچھ لارڈ کرزن سے بیان کیا جس نے ۱۹۰۳ء میں کتب خانے کا معائنہ کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر ڈینسن راس کی نگرانی میں مطالعہ کے لیے ایک وسیع کمرے کی تعمیر اور تفصیلی کتاب ناموں کی تیاری کے لیے منظوری مل گئی۔ جناب جے۔ جی کننگ (J.G.CUNNING) جو پٹنہ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے انھوں نے بھی ہمارے کتب خانے کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ وہ ایک مایۂ ناز اسکالر، مصنف اور افسر تھے۔ انھوں نے کتب خانے کے معاملات میں بہت دلچسپی لی۔ ان ہی کے زمانے میں کتب خانے سے متصل زمین حاصل ہوئی اور مطالعہ کے لیے ایک کمرے کی تعمیر بھی ہوئی۔ اس زمین پر ایک باغ کی تعمیر کا منصوبہ بھی بنایا گیا۔ مسٹر کننگ پٹنہ سے چلے گئے اس لیے اس منصوبے کی تکمیل نہ ہوسکی"۔

میرے والد کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ مسٹر کننگ کے نام پر دارالمطالعہ ہو یعنی اسے کننگ ہال کہا جائے۔ کچھ عرصہ بعد یہ کام بھی ہوگیا اور کتاب نامہ بھی تیار ہوگیا جس کے لیے مسٹر کننگ شکریہ کے مستحق ہیں۔ کتاب نامہ کا پہلا حصہ جو فارسی شاعری پر مشتمل ہے، جس میں فردوسی سے حافظ تک کا دور ہے وہ شائع ہوگیا ہے۔ اس کتاب نامہ کو مولوی مقتدر نے ترتیب دیا ہے جس کے لیے بہت تحقیق کرنی پڑی ہے اور وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کتاب نامہ کا یہ حصہ درج ذیل تصنیفات پر مشتمل ہے:

نمبر ۱- شاہ نامہ کا ایک قابل ذکر نسخہ جسے علی مردان خان نے شہنشاہ شاہ جہاں کو پیش کیا تھا۔

نمبر ۲- سیف الدین باخرزی کی رباعیات (نمبر ۵۶) کی ایک کاپی جس کا کوئی

دوسرا نسخہ نہیں ہے۔

نمبر ۳- ہفت بند کا ایک نسخہ جو کاشی کا ہے اور بہترین خطاطی کا نمونہ ہے۔

نمبر ۴- سلمان ساوجی کی نظموں کا ایک بہت پرانا نسخہ جوان کی وفات کے ۳۳ برس کے بعد شائع ہوا (نمبر ۱۴۷)۔

نمبر ۵- رکن الدین کے دیوان (نمبر ۱۴۹) کا ایک خاص نسخہ۔

نمبر ۶- دیوان حافظ کا ایک دلچسپ اور قیمتی نسخہ جس سے شہنشاہ ہمایوں اور جہانگیر فال نکالتے تھے اور جس پر انھوں نے اپنی یادداشت قلم بند کی ہے۔ اس قیمتی نسخہ کو ہمارے کتب خانے کے لیے ثناء اللہ خاں نے دیا تھا۔

اب اس کتب خانے کا کتاب نامہ شائع ہونے کے عمل سے گذر رہا ہے گرچہ پانچ سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے جب تک کہ حکومت خود دلچسپی نہ لے نادر اور قیمتی مخطوطات کو شائع کرنے کے لیے کوئی جامع منصوبہ ترتیب نہیں پا سکتا۔ اگر دیکھا جائے تو سلطنت برطانیہ کی رعایا میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ بہ نسبت سلطنت ترکی کے۔ اگر فرانسیسی حکومت جو الجیریا کی حکمراں ہے وہ مشرقی علوم کی کتابیں شائع کر سکتی ہے تو ہم بنگال کی حکومت کو کہہ سکتے ہیں کہ وہ فرانسیسیوں کے نقش قدم پر چلے۔ سب سے پہلے تو حکومت کو چاہیے کہ وہ اس بات کی تشفی کر لے کہ وہ مخطوطات اور کتابیں جو ہمارے کتب خانے میں ہیں، کتنی نادر اور قیمتی ہیں اور ان کو شائع کرنا کتنا ضروری ہے۔ بانکی پور کا کتب خانہ عوام کے لیے اس وقت بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے ایک کمیٹی تشکیل دے جو کتابوں اور مخطوطات کے شائع کرنے کی سفارش کرے اور اس کے لیے کسی جامع منصوبہ پر عمل کیا جا سکے۔

پٹنہ کی سوسائٹی ابھی تک عملی طور پر پس ماندہ ہے اور اس علمی خزانے سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے سے قاصر ہے لیکن وہ لوگ جو تعلیم یافتہ ہیں اور پٹنہ سے باہر ہیں ان کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہے چونکہ ان کے پاس نہ تو وقت ہے اور نہ مواقع ہی ہیں کہ وہ کتب خانے میں آیا

کریں۔ ایسے لوگوں کے لیے وہ جہاں بھی ہوں بانکی پور کتاب خانے کی تصنیف کا شائع کرنا ضروری ہے چونکہ اس سے انھیں بہت زیادہ فائدہ ہوگا۔ گرچہ ہندوستان کی مشہور عربی علماء پر فخر کر سکتا ہے جو جامعہ ازہر سے فارغ التحصیل ہیں لیکن اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے کہ ہندوستان میں بھی مشرقی علوم حاصل کرنے کے زیادہ مواقع نہیں ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ یہاں غربت ہے اور کتابوں کی بھی کمی ہے خاص کر جو کتابیں یورپ میں شائع ہوتی ہیں وہ اتنی زیادہ گراں ہیں کہ عام آدمی اور خاص کر طالب علموں کی پہنچ سے باہر ہیں۔ اگر حکومت اپنے طور پر بانکی پور یا کسی دوسری جگہ مطبع لگائے جو مشرقی اسکالروں کی نگرانی میں عربی اور فارسی کی کتابیں شائع کرے تو اس سے یہ ہوگا کہ مشرقی علوم کو سیکھنے میں آسانی ہوگی ورنہ رفتہ رفتہ صورت حال یہ ہو جائے گی کہ لوگ اس سے بہت دور ہو جائیں گے۔ اگر حکومت یہ سب کچھ کرے تو مشرقی علوم کے لیے یہ بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ سیاسی طور پر بھی حکومت کو اس معاملے پر سوچنا چاہیے۔ جہاں تک مسلمانوں کا سوال ہے وہ سیاست سے الگ رہے ہیں اور اس کی بنیادی وجہ انگریزی تعلیم سے ناواقفیت ہے۔ وہم، تنگ نظری اور ناواقفیت وہ عوامل ہیں جنھوں نے مسلمانوں کو ایک طبقہ کی حیثیت سے انگریزی تعلیم سے دور رکھا ہے خواہ وہ اسے مذہب کی بنیاد پر صحیح یا غلط سمجھتے ہوں۔ انگریزی تعلیم کے بغیر انھیں اس کی امید نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ ترقی کر سکیں گے۔ انھیں عربی اور فارسی سے تو یہ توقع نہیں کرنا چاہیے کہ اس کے باعث وہ زندگی میں آگے بڑھ سکیں گے۔ چونکہ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ انھیں مکمل طور پر سیکھنے اور اس پر دسترس حاصل کرنے کے مواقع نہیں ہیں اس لیے ان سے مکمل طور پر استفادہ نہیں حاصل کیا جا سکتا، اس کے باعث نہ تو کوئی عالم بن سکتا ہے اور نہ سوسائٹی کا اہم رکن بن سکتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی بھی معزز اور ترقی پذیر پیشے میں ایسے لوگوں کا گروہ اکٹھا ہو جاتا ہے جو انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پورے ملک میں افراتفری پھیلا دیتا ہے۔ یہ لوگ پڑھے لکھے بھی ہوتے ہیں مگر انھیں علم کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی علوم کے عالموں نے عوام میں اپنی قدر کھو دی ہے۔ انھیں نہ تو عزت ملتی ہے اور نہ ان پر کوئی اعتبار ہی کرتا ہے۔ ان کا

کام یہی رہ گیا ہے کہ وہ دیہاتوں کے اسکول میں پڑھائیں یا پیدائش اور شادی کے لیے رجسٹرار کی حیثیت سے کام کریں۔ یہ بہت ضروری ہے کہ مشرقی عالموں کو ان کا صحیح مقام ملے۔ مغربی علوم کو سیکھنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم کس طرح کی قربانی دے رہے ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی زبان اور ادب کو سلیقے سے سیکھیں اور اس سے بہتر نتائج حاصل کریں اور اسے سودمند بنائیں یہ بہت ضروری ہے کہ حکومت سے کہا جائے کہ وہ بانکی پور میں عربی اور فارسی کے عالموں کی ہمت افزائی کرے تاکہ ان زبانوں کی تعلیم و تدریس بہتر طریقے سے ہو سکے جس سے طالب علم استفادہ کر سکیں اور مغرب کے تناظر میں مشرقی علوم پر تحقیق کر سکیں۔ شاید لوگوں کو میری سفارشات پر اعتراض ہو مگر میں سمجھتا ہوں کہ اگر حکومت نے اس پر عمل کیا تو پھر طالب علموں کی کوئی کمی نہ ہوگی۔ یہ بہت افسوس اور تعجب کی بات ہے کہ ہندوستانی طلباء امریکہ کی جنگِ آزادی اور انقلاب فرانس کے متعلق تو جانتے ہیں مگر اپنی تاریخ سے ناواقف اور لاعلم ہیں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ بانکی پور کے کتب خانے کو ہم مشرقی علوم کا مرکز بنا دیں؟ کم از کم صوبہ بہار کے لیے۔ اس مضمون میں، میں بہت زیادہ تو نہیں تحریر کر سکا ہوں مگر اپنے والد کی زندگی کا مختصر خاکہ پیش کیا ہے۔ یہ سب کچھ تو کئی جلدوں میں پیش کیا جا سکتا ہے جو ان کے خیالات و افکار اور علم و ادب سے وابستگی پر مشتمل ہو۔ ایس طرح یہ ایک ادبی تاریخ بھی ہوگی جس سے لوگ استفادہ کر سکیں گے۔ میرے والد اور دادا نے جو عرصہ بسر کیا ہے وہ ایک صدی پر محیط ہے اور مسلمانانِ ہند کی علمی اور ادبی تاریخ کا روشن باب ہے جسے فقط کتب خانے تک ہی محدود نہیں کیا جا سکتا بلکہ علم و ادب، مذہب اور ثقافت کے تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان سب باتوں کے پیشِ نظر ۱۸۵۷ء سے پہلے اور بعد کے حالات پر نظر ڈال کر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کیوں اور کس طرح انگریزوں کے خلاف بغاوت ہوئی اور اس کے کیا عوامل تھے اور اب اس کے کیا اثرات ہوں گے۔ ہندوستانیوں کی ایک نسل کا دور ختم ہو چکا ہے جس کے ساتھ روایات بھی ختم ہو گئی ہیں اور اب ازسرِنو سب کچھ ترتیب دینا ہے۔ میرے دادا نے براہِ راست میرے والد کی تربیت کی اور انھوں نے ان سے بہت کچھ سیکھا تھا یعنی علم کا حصول اور لگن کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی جس کے باعث وہ

ساری زندگی اپنے منصوبوں کی تکمیل کرتے رہے اور آخر کار کامیاب ہوئے۔ نواب سید فدا حسین، سید عظیم الدین خاں، سید ضیاء الدین حسن خاں اور مولوی سید وحید الدین کے ساتھ ان کی ملاقاتیں رہتی تھیں۔ یہ سب لوگ ہندوستان کے نمایاں اشخاص تھے جن سے والد صاحب نے بہت کچھ سیکھا۔ وہ لوگ ہندوستان کے اس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جو مادیت اور نئی تہذیب سے دور تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک عوام کی خدمت اور علم و ادب کی ترویج ہی سب کچھ تھا۔ ایسے ہی لوگوں کے باعث میرے والد نے اپنی جوانی میں بہت کچھ کیا۔ وکالت کے پیشے سے منسلک ہونے کے بعد وہ عوام سے زیادہ قریب ہو گئے اور ان کی خدمت کرتے رہے۔ وہ پرانے عہد کو ختم ہوتا دیکھ رہے تھے جس پر نئے عہد کی بنیاد پڑ رہی تھی اور وہ عہد ہم لوگوں کا عہد تھا۔ وہ اپنی خود نوشت ترتیب دے رہے تھے جسے انھوں نے اپنی وفات سے پیشتر لکھنا شروع کیا تھا۔ اگر وہ اسے مکمل کر لیتے تو آنے والی نسلیں بہت کچھ سیکھ سکتیں۔ میں نے اپنے اس مضمون میں ان کی شخصیت کے ان گوشوں کو نمایاں نہیں کیا ہے جن سے ان کی شاعری اور حیدرآباد دکن میں ان کے عہدے بحیثیت چیف جسٹس پر روشنی پڑ سکے۔ ان کی شاعری جس میں قصیدے، نوحے وغیرہ شامل ہیں ان کی چار جلدیں ہیں جنھیں انھوں نے اپنی زندگی کے آخری چار سالوں میں ترتیب دیا۔

اپنے پیشے میں مصروفیت کے باوجود وہ ادبی کام کرتے رہے۔ زندگی کے آخری ایام میں ان کی صحت تیزی سے انحطاط کی جانب تھی۔ ایک پُر وقار اور مصروف علمی اور سماجی زندگی بسر کرنے کے بعد آخر کار آخرت کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

۳؍اگست ۱۹۰۸ء کو اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور کے بانی اس لائبریری کے احاطے میں مدفون ہوئے۔ اس سے زیادہ بہتر کوئی مقام نہیں ہے جہاں وہ آرام کر رہے ہیں۔

نہ دے نامے کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جدائی کا

(طلوعِ افکار، فروری ۱۹۹۷ء)

☆☆☆

سید بدرالحسن

خدا بخش خاں

خدا بخش خاں صاحب وکیل مذکور الصدر نے اپنی پوری کمائی کتب خانہ میں لگائی۔ لڑکوں کو تعلیم دی۔ مسٹر شہاب الدین سپرنٹنڈنٹ پولس ان کے لڑکے ہیں، مسٹر صلاح الدین بیرسٹر کلکتہ ان کے لڑکے ہیں۔ ایک لڑکے کتب خانہ میں منیجر تھے، ایک لڑکا بخاندان ڈپٹی حشمت مرحوم بخاندان مسٹر ریاست حسین بیرسٹر بیاہے ہیں۔ ڈپٹی حشمت کا اصل وطن سبل پور میں تھا۔ ان کو تعلقات ناظر جی سبل پور کے خاندان سے تھا۔ ناظر فضل رب، مولوی فضل الرحمٰن، ناظر امیر حسن وغیرہ ساکنان مظفر پور سب اسی خاندان سے ہیں۔ حاجی فضل الرحمٰن کی سالی راقم کے سالے محمد سعید خاں ساکن بیتیا سے بیاہی گئیں ان کی لڑکی مولوی نظام الدین حیدر بی۔ اے ساکن آرہ از خاندان حافظ عبدالقادر مرحوم مولوی مصلح الدین ڈپٹی کے خاندان میں بیاہی گئی ہے اور صاحب اولاد ہے۔ مولوی حشمت علی مرگئے۔ ناظر حیدر بخش جس کے خاندان سے یہ لوگ تھے وہ بھی مرگئے۔ ناظر فضل رب بھی مرگئے۔ ان کی یادگار میں ایک بنگلہ اکزبیشن روڈ پر ہنوز ہے جو بی چھوٹن طوائف کے بنگلے کے بغل میں ہے۔ وہ بنگلہ بک گیا اور مولوی کبیر ڈمراواں کے خاندان میں چلا گیا ہے۔ خدا بخش خاں حیدرآباد میں چیف جسٹس ہو گئے تھے۔ واپس آکر پھر وکالت کرنے لگے۔ مگر بڑھاپا ایک سخت بدنصیب بیماری ہے۔ ہر بات میں کمی آجاتی ہے اقتدار کیا بڑھے گا۔ تجربہ کار کو چھوڑ کر دنیا ادھر ادھر دوڑنے لگتی ہے تجربہ کار بوڑھا بیکار جھک مارنے لگتا ہے بڑھاپے میں تندرستی کے ساتھ اقبال بھی رخصت ہوتا ہے مواقعات بدلتے ہیں صحت سے کامل اجازت نہیں دیتی۔ آخر عمر میں مالی مشکلیں ان کو بھی جھیلنا ہی پڑی۔ آخر انتقال ہو گیا۔ کتب خانہ میں مزار ہے۔

☆☆☆

(یادگار روزگار/ بدرالحسن، ۱۹۱۱ء)

حاجی معین الدین ندوی گیلانی

خدا بخش خاں بہادر

(سی۔آئی۔ای)

اگر بقائے نشان و نام حیات دوام ہے تو اس لحاظ سے خدا بخش خاں بہادر سی، آئی، ای، بانی کتب خانہ مشرقی کو زندگی جاوید حاصل ہے، دنیائے علم و ادب اپنے اس محسن کو کبھی فراموش نہیں کرے گی اور مادر وطن اپنے اس سپوت فرزند کو ہمیشہ سرمایۂ صد افتخار تصور کرے گی، وہ علم و ادب کے عاشق تھے، اس عشق نے ان کا نام نامی ہمیشہ کے لیے صفحۂ دہر پر آب زر سے ثبت کر دیا ہے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

خدا بخش خاں مرحوم کا ایثار، ان کی قومی محبت، ان کی دینی غیرت اور سب سے زیادہ ان کی علمی و ادبی خدمات اس قابل ہیں کہ افراد قوم کے سامنے انھیں بار بار پیش کیا جائے اور ان کے مخلصانہ اور بے ریا طرز زندگی کو نمونۂ عمل بنانے کی ترغیب دی جائے، ان کے معاصرین میں نواب سرسید مرحوم اور نواب محسن الملک مرحوم کو غیر معمولی شہرت حاصل ہے لیکن درحقیقت ہمارے اس بہاری قائد اعظم نے فیاضی اور ایثار کا جو نمونہ پیش کیا ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے، اگر ایک طرف انھوں نے اپنی قوم کو بام عروج تک پہنچانے کے لیے دماغی و جسمانی مشقت برداشت کی، قومی فلاح و بہبود کے افکار میں شب بیداری کو اپنا شیوہ بنایا اور تحریر و تقریر سے قوم خفتہ کو جگانے کی کوشش کی تو دوسری طرف انھوں نے اپنی ساری کائنات اور اپنی تمام عمر کا اندوختہ ''کتب خانۂ مشرقی'' کی صورت میں وقف عالم کر دیا اور اس طرح انھوں نے اہل و عیال کے حقوق کو قومی ضرورت کے مقابلہ میں پس پشت ڈال دیا، ایک بڑے فرنچ فلسفی کا مقولہ

ہے'' میں اپنی ذات سے زیادہ اپنے خاندان کو، خاندان سے زیادہ وطن کو اور وطن سے زیادہ انسانیت کو محبوب رکھتا ہوں'' خدابخش خاں مرحوم کی زندگی درحقیقت اس مقولہ کی عملی تشریح ہے، ان کی زندگی میں خوش حالی وتنعم کے دور بھی گذرے ہیں، پھر فلاکت وافلاس کے خوفناک دن بھی آئے ہیں مگر تم دیکھو گے کہ اس بلند حوصلہ انسان نے نیکی ونفع رسانی خلائق کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

بایں رواق زبر جد نوشتہ اند بزر
کہ جز نکوئی اہل کرم نخواہد ماند

خاندان

خدابخش خاں مرحوم نسبی تفاخر کو پسند نہیں کرتے تھے مگر یہ واقعہ ہے کہ ان کا خاندان علمی وادبی ذوق کے لیے ہمیشہ ممتاز رہا ہے، ان کے والد محمد بخش اپنے زمانہ کے ایک ممتاز وکیل تھے، قلمی کتابوں کے جمع کرنے کا غیر معمولی ذوق رکھتے تھے، فارسی زبان پر کافی دستگاہ حاصل تھی، عربی سے بھی نا آشنا تھے، انھوں نے اپنے خاندانی حالات کے متعلق ایک'' بیاض'' لکھی ہے، اس بیاض کا ایک قلمی نسخہ کتب خانۂ مشرقی میں موجود ہے، اس میں وہ اپنا نسب نامہ اس طرح درج فرماتے ہیں:

''نسب نامۂ بندہ محمد بخش خاں این است کہ بندہ ولد جناب علی بخش مرحوم ابن شیخ رمضان علی ابن شیخ محمد باقر ابن قاضی شیخ ہبۃ اللہ مرحوم مغفور صدیقی نسباً و دہلی وطناً از دہلی آمدہ اولاد بمقام اوکھی ضلع سارن مقیم شدند'' الخ۔

اس نسب نامہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدابخش خاں مرحوم کے مورث اعلی قاضی شیخ ہبۃ اللہ نسباً صدیقی تھے اور دہلی سے ترک وطن کر کے سب سے پہلے صوبۂ بہار تشریف لائے اور مقام اوکھی ضلع سارن میں مقیم ہوئے، سرجدو ناتھ سرکار اپنی انگریزی تصنیف'' اسٹڈیز ان مغل انڈیا''

میں لکھتے ہیں کہ یہ قاضی ہبۃ اللہ وہی ہیں جو سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے حکم سے ملا نظام کے ساتھ فتاوی عالمگیری کی تدوین پر مامور ہوئے تھے مگر مسٹر صلاح الدین مرحوم اپنی انگریزی تالیف "My father: His Life and Reminiscences" میں بجا طور پر اس خیال کی تردید فرماتے ہیں، تاریخی حیثیت سے اس کے متعلق کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔

ولادت اور تعلیم و تربیت

خدا بخش خاں مرحوم ۲؍اگست ۱۸۴۲ء میں بمقام چھپرہ تولد پذیر ہوئے، پیدائش کے تھوڑے ہی دنوں بعد ان کا خاندان بانکی پور منتقل ہو کر آ گیا، یہاں والد بزرگوار کی نگرانی میں ان کی تعلیم و تربیت شروع ہوئی، عام دستور کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر ۱۸۵۴ء میں مسٹر ٹرادرس کے مشورہ سے جو اس وقت پٹنہ میں ڈسٹرکٹ جج کے عہدہ پر فائز تھے پٹنہ ہائی اسکول میں داخل کیے گئے، ۱۸۵۹ء میں جب کہ غدر کی ہنگامہ خیزی نے پٹنہ ہائی اسکول کو صفحۂ ہستی سے معدوم کر دیا تو ہمارا یہ جواں ہمت طالب العلم تکمیل تعلیم کے خیال سے راہی کلکتہ ہوا، یہ وہ زمانہ تھا کہ اس وقت کلکتہ اور پٹنہ کے درمیان ریلوے کا سلسلہ قائم نہیں ہوا تھا، موجودہ وسائل سفر کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھے، غرض مصائب و گرانباری مصارف کے لحاظ سے اس وقت تک ''سفر صورت سقر دارد'' کا مقولہ بالکل صحیح تھا لیکن خدا بخش خاں مرحوم کے دل میں قدرت نے تحصیل علم کا غیر معمولی جذبہ ودیعت کیا تھا، شوق کامل نے رہبری کی اور عزم راسخ نے بالآخر انھیں کلکتہ پہنچایا، وہاں نواب امیر علی خاں نے حرم علم کے اس حاجی کو شفقت و محبت کے ساتھ اپنے گھر میں جگہ دی، اور سہ سالہ سعی پیہم کے بعد ۱۸۶۱ء میں انھوں نے کلکتہ یونی ورسٹی سے انٹرنس کی سند حاصل کی، دل کا تقاضا تھا کہ وادی علم کی رہ نوردی ابھی منقطع نہ ہو مگر کلکتہ کی ناموافق آب و ہوا نے آگے بڑھنے کی اجازت نہ دی، بانکی پور واپس آئے اور وکالت کی سند حاصل کرنے کے لیے لا کلاس کی شرکت اختیار کی لیکن اب آزادی اور بے فکری کا زمانہ تمام ہو چکا تھا، شفیق باپ کے قوای، دماغی و عملی مضمحل ہونے لگے اور رفتہ رفتہ تندرستی ایسی خراب ہوئی کہ بالآخر پیشۂ وکالت

سے معذور ہو گئے، چونکہ آمدنی کا اور کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تھا اس لیے بوڑھے باپ کی بیکاری سے پورے خاندان کی کفالت کا بارگراں نوجوان خدابخش کے سر پر آپڑا۔ اب ایک طرف لا کلاس کی حاضری تھی اور دوسری طرف سارے کنبہ کی پرورش کے لیے روپیہ کمانے کی فکر، ہمارے اس اولوالعزم نوجوان نے غیر معمولی تندہی، قابل تقلید ثبات واستقلال اور صبر آزما تحمل کے ساتھ کشمکش حیات کی اس پہلی وادی کو طے کرنا شروع کیا، اسی زمانہ میں انھوں نے نائب منصفی کے لیے درخواست دی مگر ناکام رہے پھر ڈسٹرکٹ جج کی پیشکاری کے لیے امیدوار ہوئے، اس میں کامیابی ہوئی مگر ڈسٹرکٹ جج مسٹر لٹور سے ناچاقی ہو جانے کے باعث اسے چھوڑنا پڑا، اس کے بعد ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول کا عہدہ ملا مگر بہت جلدی اس سے بھی دست بردار ہونا پڑا، غرض ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۸ء تک گرداب مصیبت میں گرفتار رہے، ہر طرف سے ناکامی و نامرادی کا نرغہ تھا مگر آلام ومصائب حوصلہ شکنی کی بجائے ازدیاد ہمت کا باعث ثابت ہوئے، وہ عرصۂ حیات کے تمام شدائد وعوائق کا مقابلہ کرتے ہوئے مردانہ وار آگے بڑھتے رہے، وہ اپنی خوش حالی کے زمانہ میں جب کبھی اس دور مصیبت کو، اس عہد حرماں نصیبی کو اور اس دماغی ہیجان کے زمانہ کو یاد کرتے تو آنکھیں پُرنم ہو جاتیں، بہرکیف یہ مصیبت کے دن ختم ہونے والے تھے ختم ہو گئے۔

وکالت

۱۸۶۸ء میں انھوں نے وکالت شروع کی، اس پیشۂ وکالت سے ان کے صحیفۂ حیات میں دفعۃً خوش قسمتی کا ایک نیا اور درخشاں باب کھل گیا، صرف دو سال کی قلیل مدت میں وہ پٹنہ کے نامی وکلا میں شمار کیے جانے لگے، ان کی یہ کامیابی غیر متوقع نہ تھی ان کے والد محمد بخش پٹنہ کے نامی وگرامی وکلا میں تھے، صالح فرزند کو لائق باپ کی پوری اہلیت و ذہانت وراثت میں ملی تھی، ایک کامیاب وکیل کے لیے جن اوصاف کی ضرورت تھی ان میں وہ تقریباً سب کے سب بدرجۂ اتم موجود تھے، غیر معمولی ذہانت، حاضر جوابی کے مخصوص ملکہ، عدیم النظیر قوت حافظہ، گرفت واقعات کی عجیب وغریب قدرت اور بے مثل قوت بحث نے بالآخر انھیں آسمان وکالت کا مہر

درخشاں ثابت کیا، خوش قسمتی ان پر مسکرائی، زر و جواہر کا بادل امنڈ پڑا اور عیش و تنعم کی باد بہاری سے وہ جس قدر لذت اندوز ہو سکے لذت اندوز ہوئے، اس دور اقبال میں ملک و قوم کی خدمت کا بھی کافی موقع ہاتھ آیا، ۱۸۷۷ء میں انھوں نے اسکول کمیٹی کے سلسلہ میں جو خدمت انجام دی اس کے صلہ میں حکومت کی طرف سے ایک اعزازی صداقت نامہ عطا ہوا، پھر جب لارڈ رپن نے لوکل سیلف گورننگ باڈیز کی بنیاد ڈالی تو پٹنہ میونسپلٹی اور پٹنہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے وہ پہلے چیئر مین مقرر ہوئے اس کے بعد ۱۸۸۰ء میں پٹنہ کے سرکاری وکیل بنائے گئے اور اسی سال خان بہادر کے خطاب سے مشرف ہوئے، ۱۸۹۱ء میں انھوں نے کتب خانۂ مشرقی کی بنیاد ڈالی، قومی خدمات کے سلسلہ میں انشاء اللہ اس کتب خانہ کا تفصیلی تذکرہ آئے گا۔

حیدر آباد کی ملازمت

۱۸۹۵ء میں نظام حیدر آباد نے تین سال کے لیے انھیں اپنی ریاست میں چیف جسٹس کا عہدہ عطا کیا، دوران قیام حیدر آباد میں انھوں نے اپنے کتب خانہ کے لیے مخطوطات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ فراہم کیا۔

علالت

۱۸۹۸ء میں حیدر آباد سے واپس آ کر انھوں نے پھر وکالت شروع کی مگر فالج کے ایک ناگہانی حملہ نے از کار رفتہ بنا دیا، اب اقبال کے بعد ادبار و فلاکت نے پھر اپنی منحوس صورت دکھائی مگر قومی و ملکی خدمات کے صلہ میں حکومت ہند نے دستگیری کے لیے ہاتھ بڑھایا، ۱۹۰۳ء میں سی، آئی، ای کا معزز خطاب ملا اور مبلغ دو سو روپیہ ماہانہ مشاہرہ پر کتب خانہ کی نظامت تفویض ہوئی، نیز ادائے قرض کے لیے مبلغ آٹھ ہزار روپیہ کا یکمشت عطیہ مرحمت ہوا۔

علمی مشغلہ

پیشہ وکالت کی غیر معمولی مصروفیت کے باوجود علمی مشاغل سے کبھی غافل نہیں رہے،

کچہری سے آتے ہی کھانا کھاتے اور تھوڑی استراحت کے بعد اپنے کتب خانہ میں عزلت نشیں ہو جاتے اور کتب بینی، مضمون نویسی یا ذی علم احباب سے علمی و مذہبی مباحث پر گفتگو کرنے میں اپنا وقت صرف فرماتے، انھیں فارسی زبان میں غیر معمولی دستگاہ حاصل تھی، عربی میں بھی گونہ استعداد رکھتے تھے خصوصاً اشعار اس کثرت سے یاد تھے کہ وہ عربی و فارسی اشعار گھنٹوں زبانی پڑھ سکتے تھے، فارسی میں دیوان حافظ اور مثنوی مولانا روم سے غیر معمولی شغف تھا، انھیں وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے اور مذہبی پابندی کے ساتھ روزانہ تلاوت فرماتے تھے، عام ہندوستانی فارسی دانوں کے برخلاف انھیں فارسی تحریر پر بھی کافی قدرت حاصل تھی، بے تکان لکھتے اور ایسی لکھتے کہ اس میں اہل زبان کی شان نظر آتی، ان کی مشہور آفاق فارسی تصنیف ''محبوب الالباب'' کے بعض حصے اس دعویٰ کی تائید میں پیش کئے جاسکتے ہیں، یہ درحقیقت کتب خانۂ مشرقی کے عربی و فارسی مخطوطات کی ایک تفصیلی فہرست ہے، اس میں مصنفین کے حالات دئے گئے ہیں اور ان تصنیفات پر عالمانہ انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے، خدا بخش مرحوم کو اپنی اس تصنیف پر بے انتہا ناز تھا، پہلی جلد تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے اور چھپ کر شائع ہوگئی ہے، افسوس ہے کہ وہ اس کا بقیہ حصہ مکمل نہ فرما سکے، اس محبوب الالباب کے علاوہ انہوں نے لارڈ بیکن کے مضامین کا انگریزی سے فارسی میں ترجمہ کیا ہے، پروفیسر برون سے مکاتبت و مراسلت بھی فارسی ہی میں ہوا کرتی تھی۔

اگر وہ ایک طرف عربی و فارسی کے ذی استعداد عالم تھے تو دوسری طرف انگریزی ادب سے بھی ناآشنا نہ تھے، انگریزی شعراء میں وہ سب سے زیادہ بیرن (Byron) کو پسند کرتے تھے مگر شیلے (Shelley) کے سحر آگیں تغزل، کیٹس (Keats) کے اعلیٰ تخیل، ورڈسورتھ (Wordsworth) کی شیریں کلامی اور نکتہ سنجی، ٹینیسن (Tennyson) کی دل پسند بندش اور سوئنبرن (Swinburne) کی فلسفہ آمیز جادوطرازی سے بے خبر نہ تھے، متاخر الذکر کو وہ زور کلام میں قاآنی سے تشبیہ دیا کرتے تھے، گبن (Gibbon) کو وہ صرف پسند ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اس سے گونہ محبت رکھتے تھے، اس نے عروج اسلام کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے وہ انھیں زبانی یاد تھی، انجمن اسلامیہ پٹنہ کے خطبہ صدارت میں اس کے متعلق انھوں

نے ایک مرتبہ اس طرح اپنا خیال ظاہر فرمایا تھا:

''گبن نے آیات کریمہ کے ترجمہ کو پڑھ کر یہ عبارت اپنی تاریخ میں لکھی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: رسول کی نے پرستش (اصنام) اشخاص اور سیارہ کو اس معقول دلیل پر ممتنع کر دیا کہ جس کو عروج ہے اس کو زوال بھی ہے، جس شخص کے لیے طلوع ہے اس کے لیے غروب بھی ضروری ہے، ہر متولد کے لیے موت ساتھ لگی ہوتی ہے اور ہر انقلاب پذیر چیز کا مادہ انحطاط و فنا توام ہے، اس کے بعد وہ یہ لکھتا ہے کہ مذہب اسلام وہ مذہب ہے کہ جس کو ایک موحد فلسفی بے تکلف قبول کر سکتا ہے''۔

مل (Mill) کی خودنوشتہ سرگذشت، گوئٹے (Goethe) کی صداقت وشاعری اور بینونیوٹوسلینی (Benevenuto cellini) کی آٹو بیاگرافی کو انھوں نے مسٹر صلاح الدین مرحوم سے تمام وکمال پڑھوا کر سنا تھا، انھیں مشاہیر کے حالات و سوانح سے غیر معمولی دلچسپی تھی، سرجدوناتھ سرکار لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ان سے مختلف علمی، ادبی اور تاریخی مسائل پر بہت دیر تک گفتگو رہی، کثرت معلومات کے لحاظ سے انھیں ایسا معلوم ہوا کہ گویا ان کے سامنے ایک بحر ناپیدا کنار موجزن ہے۔

سیاسی خیالات

سیاسی حیثیت سے وہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کو نعمت غیر مترقبہ تصور فرماتے تھے، انھیں یقین تھا کہ اہل ملک اس وقت حکومت خود اختیاری کے لائق نہیں ہوئے ہیں، ایسی حالت میں اگر برطانوی حکومت کا خاتمہ ہوا تو فرقہ وارانہ منافرت، طبقۂ عوام کی جہالت اور جنگجو اقوام کی حریصانہ چپقلش شعلۂ جوالہ بن کر ملک کے امن وامان کو خاک سیاہ کر ڈالے گی، ان کا یہ دلی عقیدہ تھا کہ ملک کو نام نہاد سیاسی رہنمائی سے زیادہ اخلاقی و معاشرتی اصلاح کی ضرورت ہے، انھیں یقین تھا کہ ''سوراج'' اور ''بائیکاٹ'' کی تلقین کرنے والے ملک کو نقصان پہنچا رہے

ہیں، ان کی اس معاندانہ روش سے حکمراں طبقہ ناراض ہوگا اور اس طرح ملک کی رفتار ترقی سست ہو جائے گی، وہ فرمایا کرتے تھے کہ نصف درجن خوش بیان مقررین کی آتش بیانی ملک کو اس قدر فائدہ نہیں پہنچا سکتی جس قدر وہ حکومت وقت کی ہمدردانہ توجہ سے مستفید ہو سکتا ہے، وہ انگریزوں کی فرض شناسی، بردباری، ضبط نفس، استقلال اور دوسرے عمدہ صفات کی دل سے قدر کرتے تھے، انھیں برطانوی عدل وانصاف پر بہت زیادہ بھروسہ تھا، مطالبۂ حقوق کے لیے آئینی طرز احتجاج کو پسند کرتے تھے، انھیں امید تھی کہ اگر بعنوان شائستہ حکومت کو اصلاح کی طرف توجہ دلائی جائے تو وہ ضرور خیال کرے گی، انھیں یقین تھا کہ ملک میں برطانوی حکومت کے خلاف کچھ بہت زیادہ ناراضی موجود نہیں ہے، بم کے واقعات اور بنگالہ کی مخفی انارکیل سوسائٹی کو چند نوجوانوں کی شوریدہ سری اور تلاطم دماغی تصور فرماتے تھے لیکن انھیں خوف تھا کہ اگر حکومت اور رعایا کے درمیان غلط فہمی کا سلسلہ زیادہ عرصہ تک جاری رہا تو پھر اس کا ازالہ دشوار ہوگا، جنگ روس و جاپان کے واقعات کو وہ نہایت ہی دلچسپی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے لیکن انھیں اس سے اختلاف تھا کہ جاپان کی کامیابی ہندوستانی نوجوانوں کے خیالات پر کچھ بہت زیادہ اثر انداز ہوئی ہے، وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانی جذبۂ حریت وتمرد برطانوی طرز حکومت کا نتیجہ ہے، اس نے خود ہی اس ملک میں یوروپین تہذیب وتمدن کی تخم ریزی کی ہے، جمہوریت پسندی اس تمدن کا جز و لاینفک ہے، اس بنا پر ضروری ہے کہ دائرۂ تعلیم کی توسیع کے ساتھ حقوق واختیارات کے تفویض میں بھی فراخدلی کا ثبوت دیا جائے۔

مذہبی عقائد

خدابخش خاں مرحوم ایک راسخ العقیدہ اور پابند شریعت مسلمان تھے، نماز پنجگانہ کبھی فوت نہیں ہوئی، نماز صبح کے بعد خود بھی معمولاً تھوڑی دیر تلاوت قرآن فرماتے اور بچوں کو بھی ہمیشہ تلاوت قرآن کی تاکید کرتے، ان کے دل میں قرآن پاک کی جو غیر معمولی عظمت ووقعت تھی اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ جب صلاح الدین مرحوم بغرض تحصیل علم راہی انگلینڈ ہوئے تو

شفیق باپ کے گرانقدر تحائف میں کلام مجید کا ایک نفیس نسخہ بھی تھا، اس کے ایک ورق پر حسب ذیل عبارت انھوں نے اپنے ہاتھ سے تحریر فرمائی تھی:

''بروز روانگی ولایت بغرض تلاوت فرزند عزیز مذکور بخشیدم۔
خداوند تعالی بہ برکت این مصحف شریف فرزند مدعمرہ را در امن خود نگاہ دارد و
بسلامتی ایمان فائز المرام باین حقیر ملحق سازد۔ حررہ خدا بخش عفی عنہ المرقوم
تاریخ ۱۴؍ اپریل ۱۸۹۳ء''۔

ایک سچے مومن کی طرح ان کا دل ہمیشہ خوف خدا سے لرزاں و ترساں رہتا اور وہ اکثر انتہائی خشوع وخضوع کے ساتھ حسب ذیل رباعی وردزبان رکھتے ؎

ای مطلع آفتاب ذات احدی　　　صبح ازلی چراغ شام ابدی
کس نیست بجز تو دستگیرے ما　　　یا ختم رسل خذ بیدی خذ بیدی

رسول اور آل رسول کی محبت سے ان کا خانۂ دل معمور تھا، نعتیہ غزلیں نہایت کثرت سے یاد تھیں، اور انھیں اکثر عالم وجد میں پڑھتے اور کیف بےخودی سے لذت اندوز ہوتے مگر اس سلسلہ میں جو بدعات اختراع کی گئی ہیں ان سے قطعاً متنفر تھے، عظیم آباد کے محرم کو اپنی عظمت و شوکت کے لحاظ سے غیر معمولی شہرت حاصل ہے، دسویں محرم کو شہر میں اطراف واکناف سے تماشہ بینوں کی تعداد کثیر مجتمع ہو جاتی ہے مگر خدا بخش خاں مرحوم نے کبھی اپنے بچوں کو محرمی جلوس کے دیکھنے کی اجازت نہ دی، ان کا خیال تھا کہ تاریخ اسلام کے اس سب سے بڑے روح فرسا واقعہ کو یوم جشن بنانا اور اس کا سوانگ نکالنا نہ صرف حماقت بلکہ بہت بڑی بے ادبی اور گستاخی ہے، وہ روز عموماً تلاوت قرآن اور دوسری مذہبی کتابوں کے پڑھنے میں مشغول رہتے، انھیں زیارت حرمین کا بڑا اشتیاق تھا مگر افسوس ہے کہ ان کا یہ شوق پورا نہ ہو سکا۔

خدمت اسلام کا جذبہ

مستشرقین یورپ کی طرف سے اسلام اور تاریخ اسلام پر جو معاندانہ حملے ہوتے

رہتے ہیں ان سے خدا بخش خاں مرحوم کو نہایت تکلیف پہنچی تھی، وہ فرمایا کرتے تھے کہ یوروپین اہل قلم مشرقی ممالک اور مشرقی اقوام کے دینی جذبات اور مختص المقام اطوار و خصائل کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے، مغرب میں مذہب جز و معاشرت ہے لیکن مشرق میں جز و حیات ہے، ایک مشرقی کے دل و دماغ پر مذہب کو جو اقتدار حاصل ہے ایک مغربی اس کے سمجھنے سے قاصر ہے، مشرقی خیالات، مشرقی روایات اور مشرقی جذبات مغرب کی روائی خیالات سے بالکل جداگانہ ہیں، چنانچہ اسلام اور بانی اسلام کے متعلق یوروپین مصنفین سے محض اس بنا پر غلطی ہوئی ہے کہ وہ مشرقی خیالات و جذبات کے سمجھنے سے عاجز رہے ہیں، مشرق تو مغرب سے بہت دور ہے، حقیقت یہ ہے کہ خود مغربی اقوام کے لیے بھی باہم ایک دوسرے کے قومی خصائل کا سمجھنا دشوار ہے چنانچہ بیجہاٹ (Bagehot) کہتا ہے:

قومی خصلت ایک نہایت ہی غامض اور دقیق چیز ہے، ایسے لوگوں کے سامنے جنھیں تمھاری زبان کے سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے، جن کی مجلس میں تم اپنے آپ کو اجنبی تصور کرتے ہو اور جن کے متعلق تمھارا خیال ہے کہ وہ تمھاری باتوں کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے تم اس کی صحیح نمائش سے قاصر ہو"۔

غلطی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ تاریخ اسلام کے مطالعہ میں اپنے ذاتی افکار و خیالات کو دخل انداز کیا جاتا ہے اور پھر اس پر توہمات باطلہ کی ایک عمارت کھڑی کر لی جاتی ہے، یہ کس قدر افسوسناک امر ہے کہ وان کریمر (Von Kremer) جیسا لائق مصنف عربوں کے قبول اسلام کی وجہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ دور اول کے جنگجو اسلام نے انھیں بیشمار مال غنیمت کی امید دلائی تھی، اسی طرح ڈاکٹر گولڈز یہر (Dr.Goldziher) جیسا فاضل اہل قلم محض اس بنا پر کہ بائبل اور اسلامی روایات میں جا بجا توافق پایا جاتا ہے یہ رائے قائم کی ہے کہ اسلام میں جس قدر اچھی باتیں ہیں وہ تمام تر نصرانیت سے ماخوذ ہیں، لیکن اسے یاد نہیں رہا کہ عرب میں جس قسم کی نصرانیت پھیلی ہوئی تھی، اس کی حالت نہایت زبوں تھی چنانچہ ڈیوٹش (Deotish) کہتا ہے:

"اس زمانہ میں یہ ایک عام طریقہ ہو گیا ہے کہ اسلام میں جس قسم

کی کوئی خوبی بھی نظر آئے، اس کو عیسائیت کی طرف منسوب کر دیا جائے لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ نظریہ ایماندارانہ تحقیق پر مبنی نہیں ہے کیونکہ (حضرت) محمد (ﷺ) کے زمانہ میں عرب کی عیسائیت نہایت ہی ناگفتہ بہ حالت میں تھی''۔

مذکورہ بالا وجوہ و اسباب کی بنا پر خدا بخش خاں مرحوم کی یہ دلی خواہش تھی کہ یورپین مصنفین کی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے چنانچہ جب مسٹر صلاح الدین مرحوم بغرض تکمیل تعلیم راہی انگلینڈ ہوئے تو دیندار باپ کی سب سے بڑی فرمائش یہ تھی کہ وہ جرمن اور فرنچ پڑھ کر اسلامی نقطۂ نگاہ سے اسلام کی ایک مکمل تاریخ مرتب کریں۔

مذہبی رواداری

اگر چہ خدا بخش خاں مرحوم اسلام کے ایک سچے فدائی تھے اور اس کو مذاہب عالم میں سب سے بہتر اور مکمل خیال فرماتے تھے تاہم انھیں اس سے اختلاف تھا کہ جنت صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص ہے، یہ ان کے تصور سے باہر تھا کہ خدائے پاک جو عدل و رحم کے اوصاف سے متصف ہے محض اس لیے بنی نوع انسان کے ایک بڑے حصہ کو واصل جہنم کرے گا کہ اس نے اس کی پرستش کے لیے اسلام کے مقررہ طرز عبادت سے انحراف کیا، وہ معتقد تھے کہ نیکی اور عبادت الٰہی خواہ کسی رنگ روپ میں ہو کبھی ضائع نہیں جائے گی، اس سلسلہ میں وہ اکثر سنائیؔ، دردؔ اور غالبؔ کے حسب ذیل اشعار بطور استدلال پڑھا کرتے

سخن کز بہر دین گوئی چہ عبرانی چہ سریانی مکاں کز بہر حق جوئی چہ جابلقا چہ جابلسا

شیخ کعبہ ہو کے پہنچا ہم کنشت دل میں ہو دردؔ منزل ایک تھی ٹک راہ ہی کا پھیر تھا

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

مذہبی مباحث میں نہایت ہی بردباری سے کام لیتے تھے، ۱۸۹۴ء میں جب مسٹر صلاح الدین مرحوم تعطیل گرما بسر کرنے کے لیے انگلینڈ سے ہندوستان آئے تو ان سے اکثر مذہبی گفتگو رہتی، یورپ کے ملحدانہ ماحول نے نوجوان فرزند کے خیالات میں بڑی تبدیلی پیدا کر

دی تھی، دیندار باپ کو اس سے تکلیف ضرور پہنچی مگر چیں بر جبیں ہونے کے بجائے انھیں ہدایت کی کہ انگریزی میں سرولیم میور کی ''لائف آف محمدؐ''، کوئیلے کی ''لائف آف محمدؐ'' اور ڈاڈ کی ''بڈہا، کرائسٹ اینڈ محمدؐ'' اور عربی میں ابن ہشام کی سیرت، قاضی عیاض کی کتاب الشفا، الملاء الا ربلی کی وسیلۃ المتعبدین اور ابن قیم کی زادالمعاد پڑھ کر اپنے خیالات کی اصلاح کریں۔

اس مذہبی رواداری کا اثر یہ تھا کہ غیر مسلم احباب سے ان کے تعلقات نہایت ہی مخلصانہ تھے، خصوصاً ہندوؤں کی طرف میلان طبع بہت زیادہ تھا، وہ کہا کرتے تھے کہ ان کے جسم میں برہمنی خون کی آمیزش ہے، واقعہ یہ ہے کہ ان کے والد محمد بخش مرحوم کو بچپن میں ایک برہمنی عورت نے دودھ پلایا تھا، چنانچہ اس مادر مرضعہ کے جذبات مذہبی کا احترام ملحوظ رکھنے کے لیے محمد بخش مرحوم اور ان کے لائق فرزند خدابخش مرحوم گائے کے گوشت سے ہمیشہ محترز رہے۔

خدابخش خاں مرحوم نے اپنی ہر دلعزیزی سے فرقہ وارانہ مناقشات مذہبی کے دور کرنے میں بارہا قیمتی مدد پہنچائی، خصوصاً ۱۸۹۳ء میں فسادات گاؤکشی کے سلسلہ میں ایسی گرانقدر خدمت انجام دی کہ بنگالہ اور بہار کے لفٹنٹ گورنر سر انٹونی مکڈانل نے انھیں شکریہ کا ایک مخصوص خط لکھا۔

قومی خدمات

عظیم آباد کے مسلم رہنماؤں میں خدابخش خاں مرحوم، قاضی رضا حسین مرحوم اور مولوی محمد حسن مرحوم کو امتیازی حیثیت حاصل تھی، ان تینوں میں باہم غیر معمولی اخلاص تھا، کم سے کم ہفتہ میں دو مرتبہ وہ ضرور باہم مجتمع ہوتے اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے متعلق تبادلۂ خیالات کرتے، یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمان انگریزی تعلیم سے متنفر تھے اور علمائے اسلام مسلمانوں کو اس سے باز رکھنے کے لیے انتہائی کوشش صرف کر رہے تھے، ان تینوں بزرگوں نے نہ صرف تندہی و جانفشانی کے ساتھ اس مخالفانہ سعی پیہم کا مقابلہ کیا بلکہ غریب مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کو اپنے خرچ سے تعلیم دلا کر شاد کام و فائز المرام بنایا۔

تاسیس کتب خانۂ مشرقی

قومی خدمات کے سلسلہ میں کتب خانۂ مشرقی کی تاسیس خدا بخش خاں مرحوم کا سب سے زیادہ مہتم بالشان کارنامہ ہے یہ پہلے گذر چکا ہے کہ ان کا خاندان علمی و ادبی ذوق کے لیے ہمیشہ ممتاز رہا ہے، ان کے والد محمد بخش مرحوم قلمی کتابوں کے جمع کرنے کا غیر معمولی ذوق رکھتے تھے، انھوں نے حالت نزع میں اپنے لائق فرزند خدا بخش خاں مرحوم کو وصیت کی کہ اگر زمانہ موقع دے تو خاندانی کتب خانہ کو ترقی دے کر رفاہ عام کے لیے وقف کر دیا جائے، سعادتمند فرزند نے بطیب خاطر و بکمال گرمجوشی مرنے والے باپ کی یہ آخری وصیت قبول کی، اس وقت قلمی کتابوں کی مجموعی تعداد پندرہ سو تھی، ان میں بارہ سو خود محمد بخش مرحوم کی محصولہ تھیں اور تین سو انھیں وراثت میں ملی تھیں، خدا بخش مرحوم نے اس کو ترقی دے کر پانچ ہزار تک پہنچایا، ۱۸۹۱ء میں جب کہ مخطوطات کی مجموعی تعداد صرف تین ہزار تھیں سر الفریڈ کرافٹ (Sir Alfred Craft) کی ماتحتی میں ایک ماہر مخطوطات نے اس کی قیمت کا تخمینہ ڈھائی لاکھ روپیہ کیا تھا، مخطوطات کے علاوہ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی مطبوعات کا ایک معتد بہ ذخیرہ بھی فراہم کیا گیا، مطبوعات کی قیمت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ صرف انگریزی کتابوں کی مجموعی لاگت تقریباً ایک لاکھ روپیہ ہے، پھر اس گراں بہا سرمایہ کے لیے اسی ہزار روپیہ میں ایک شاندار عمارت بنوائی گئی اور ۱۸۹۱ء میں ۲۹ را کتوبر کو پورا کتب خانہ مع زمین و عمارت ایک وقف نامہ کی رو سے حکومت وقت کی سرپرستی میں قوم و ملک کے حوالہ کر دیا گیا، بانی کتب خانہ کی بے نفسی دیکھو کہ انھیں کتب خانہ کے نام کے ساتھ اپنے نام کی آمیزش بھی پسند نہ آئی، انھوں نے اس کا نام ''اورینٹل پبلک لائبریری'' رکھا مگر پبلک نے ان کے اس زاہدانہ انکسار کو قبول نہیں کیا، ان کے والدین نے انھیں عطیۂ الٰہی تصور کر کے خدا بخش کے نام سے موسوم کیا تھا، اہل ہند اس کتب خانہ کو خداوندی بخشش سمجھ کر ''خدا بخش لائبریری'' کہتی ہے، ہندوستان میں اس کو اسی نام سے شہرت ہے اور وہ ہمیشہ اسی نام سے مشہور رہے گا۔

بانی کتب خانہ کا غیر معمولی انہماک اور تائید غیبی کی بشارت

خدابخش مرحوم کو اس کتب خانہ میں جو غیر معمولی انہماک تھا اس کے اندازہ کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ انھوں نے اپنی ساری کائنات اور تمام عمر کی کمائی اس میں صرف کر دی، واقعہ یہ ہے کہ انھیں غیر معمولی دھن تھی، انتہائی محویت تھی اور ایک ایسی وارفتگی تھی جو آخری لحظۂ حیات تک قائم رہی، سفر ہو یا حضر، خلوت ہو یا جلوت، عالم خواب ہو یا عالم بیداری، وہ ہر وقت اور ہمیشہ کتب خانہ کے افکار میں غلطاں و پیچاں رہتے، رات کو خواب بھی دیکھتے تو کتب خانہ ہی سامنے ہوتا، ۱۸۷۶ء میں جب کہ والد کی وفات کے بعد انھوں نے کتابوں کے جمع کرنے کا کام شروع کیا تو پہلے قلمی کتابیں نہایت ہی مختصر تعداد میں دستیاب ہوئی تھیں، ایک مرتبہ شب کے وقت انھوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ تشریف لائے ہیں اور فرمارہے ہیں ''اگر تم قلمی کتابوں کے متلاشی ہو تو ہمارے ساتھ آؤ'' وہ ان کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں اور ایک نہایت ہی شاندار عمارت کے پھاٹک پر پہنچ کر رک جاتے ہیں، ان کے رہنما اندر داخل ہوتے ہیں، اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آکر انھیں ایک نہایت ہی وسیع دالان میں لے جاتے ہیں، وسط دالان میں ایک نقاب پوش بزرگ تشریف فرما ہیں اور چاروں طرف ان کے احباب کا مجمع ہے، ان کے رہنما نقاب پوش سے بکمال ادب عرض کرتے ہیں'' حضرت! یہ شخص قلمی کتابوں کے لیے آیا ہے'' حکم ہوتا ہے'' کتابیں دیدی جائیں'' فرط انبساط میں آنکھیں کھل جاتی ہیں، اب نہ وہ عظیم الشان عمارت ہے، نہ وہ نقاب پوش بزرگ ہیں اور نہ وہ مجمع احباب ہے مگر اس خواب کے بعد ہی اطراف و اکناف عالم سے مخطوطات کا سیلاب عظیم امنڈ آتا ہے اور پٹنہ کی سرزمین جواہر گرانمایہ سے مالا مال ہو جاتی ہے، خدابخش خاں مرحوم کا خیال تھا کہ وہ نقاب پوش بزرگ خود حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور مجمع احباب میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے۔

کتب خانہ کی موجودہ عمارت مکمل و مرتب ہو جانے کے بعد وہ پھر ایک مرتبہ خواب

میں دیکھتے ہیں کہ کتب خانہ کے سامنے سڑک پر ایک جم غفیر مجتمع ہے، گھر سے نکل کر کتب خانہ کے دروازہ پر آتے ہیں، لوگ انھیں دیکھ کر تعجب سے کہتے ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمھارے کتاب خانہ کا معائنہ فرما رہے ہیں اور تم یہاں کھڑے ہو!!" وہ بسرعت تمام مخطوطات کے کمرہ میں داخل ہو کر دیکھتے ہیں کہ آپ تشریف لے جا چکے ہیں مگر حدیث کی دو قلمی کتابیں میز پر کھلی پڑی ہیں، محرومی زیارت پر دفور تأسف سے آنکھیں کھل جاتی ہیں، اب نہ وہ مخطوطات کا کمرہ ہے اور نہ وہ سڑک پر لوگوں کا ہجوم ہے، اس خواب کے بعد خدا بخش خاں مرحوم حدیث کی ان دونوں کتابوں کو نہایت عزیز رکھتے تھے، خیال تھا کہ شاید حضرت نے انھیں ملاحظہ فرمایا ہے، چنانچہ ان پر انھوں نے اپنے ہاتھ سے یہ لکھ دیا ہے کہ انھیں کبھی اور کسی حالت میں باہر جانے نہ دیا جائے مگر اس ممانعت کی کوئی وجہ نہیں لکھی ہے۔

خدا بخش مرحوم کو کتب خانہ سے غیر معمولی محبت تھی، ان کی عمر کا زیادہ حصہ کتب خانہ کی چار دیواری اور کتابوں کی رفاقت میں بسر ہوا، انھیں ہر کتاب کا حلیہ، اس کی قیمت اور اس کی جگہ زبانی یاد تھی، وفات سے صرف دو دن پہلے جب کہ مرض نہایت ہی اشتداد پر تھا اور حواس خمسہ جواب دے رہے تھے انھوں نے صحیح طور پر یہ بتا دیا کہ سنن ابی داؤد کا قلمی نسخہ فلاں الماری کے فلاں خانہ میں فلاں کتاب کے بعد ہے۔

ہندوستان کے اسلامی کتب خانے

اگر چہ یہ صحیح ہے کہ شاہان مغلیہ کو علم و ادب کی سرپرستی میں بغداد، قاہرہ اور قرطبہ کے حکمرانوں کی طرح عظمت و شہرت حاصل نہیں ہے تاہم یہ واقعہ ہے کہ جب ان کی بربریت کا دور ختم ہوا اور چنگیز خاں کی اولاد حلقہ بگوش اسلام ہوئی تو انھوں نے علما کی ہمت افزائی میں نہایت ہی نمایاں حصہ لیا، نصیر الدین طوسی، قطب الدین شیرازی، سعد الدین تفتازانی اور دوسرے بہت سے علما اسی مغلیہ دور حکومت میں آسمان علم پر مہر درخشاں ہو کر چمکے اور مغل بادشاہوں کی فیاضیوں سے مالا مال ہوئے ہندوستان کی مغلیہ سلطنت بھی علم و ہنر کی سرپرستی میں ہمیشہ پیش پیش رہی، بانی

سلطنت ظہیر الدین بابر ترکی اور فارسی میں ید طولی رکھتا تھا۔ اس کے ترکی دیوان کا ایک نایاب نسخہ نواب رامپور کے کتب خانہ میں موجود ہے، ہمایوں بھی اپنی پریشانیوں کے باوجود علما کی قدر افزائی میں کوتاہ دست نہ تھا، اکبر نے اگر چہ خود تعلیم نہیں پائی تھی تاہم اگر اس کی علم پروری دیکھنا ہو تو آئین اکبری کے آخری ابواب پڑھو، جہانگیر اپنے توزک میں لکھتا ہے کہ اس نے یوسف وزلیخا کا ایک نسخہ بیس ہزار روپیہ میں خریدا تھا، صرف اسی ایک واقعہ سے تم اس کی علمی قدر دانی کا اندازہ کرو، کتب خانہ مشرقی نیز ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں ایسی متعدد کتابیں موجود ہیں جن پر شاہ جہاں نے چودہ سال کی عمر میں دستخط کیے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بدو طفولیت سے بادۂ علم میں سرشار تھا، اورنگ زیب خود ذی علم تھا اور علماء کو محبوب رکھتا تھا، اس کے رقعات میں علمی قدر دانی کی متعدد شہادتیں موجود ہیں، غرض شاہان مغلیہ کی نوازش وکرم گستری سے دہلی علم وہنر کا مرکز بن گئی تھی، دہلی کے شہنشاہی کتب خانہ میں خطاطی ومصوری کے بہترین نمونے تیار کیے گئے اور چونکہ ان دنوں وسط ایشیا، ایران اور عرب میں طوائف الملوکی اور خونریز لڑائیوں کا غیر مختتم سلسلہ قائم تھا اس لیے وہاں کے علمی حزانے بھی دہلی منتقل ہوگئے پھر دکن میں قطب شاہی اور عادل شاہی حکومتیں نیست و نابود ہوئیں تو وہاں کے کتب خانے بھی دہلی کے شہنشاہی کتب خانہ سے ملحق ہوگئے، امراواہالیان منصب کے کتب خانے بھی اکثر ضبط ہوکر شہنشاہی کتب خانے سے ضم ہوجاتے تھے، چنانچہ دربار اکبری کے ملک الشعرا فیضی نے وفات پائی تو ان کی ۴۳۰۰ کتابیں شہنشاہی کتب خانہ میں منتقل ہوگئیں، خلاصہ یہ ہے کہ دہلی کا شہنشاہی کتب خانہ اپنی عظمت وندرت کے لحاظ سے عدیم النظیر تھا، اٹھارہویں صدی میں نوابان اودھ نے بھی قدر دانی کا ہاتھ بڑھایا اور لکھنؤ کے کتب خانہ کو اچھی خاصی شہرت حاصل ہوئی، ریزیڈنٹ کی ایما سے مشہور جرمن مستشرق مسٹر اسپرنگ نے اس کتب خانہ کے اردو اور فارسی مخطوطات کی ایک ضخیم فہرست مرتب کی تھی، ان دونوں کتب خانوں کے علاوہ اطراف واکناف ملک میں اور بھی بہت سے کتب خانے موجود تھے مگر لکھنؤ اور دہلی کی تباہی اور غدر کی ہنگامہ آرائیوں میں مسلمانوں کے تمام قابل ذکر علمی خزانے غارتگروں کے دست تظلم سے تباہ وبرباد ہوگئے۔

کتابیں کس طرح جمع ہوئیں

غدر کے موقع پر نواب رامپور نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا اس لیے لوٹ کا ایک معتد بہ حصہ انھیں دستیاب ہوا، انھوں نے انگریزی فوج میں اعلان کر دیا تھا کہ جو سپاہی کتابیں لاکر دے گا اسے ہر قلمی نسخہ کے معاوضہ میں ایک روپیہ ملے گا، خدا بخش خاں مرحوم نے قلمی کتابوں کے جمع کرنے کا کام بہت بعد کو شروع کیا پھر ان میں اور نواب رامپور میں ایک عرصہ تک رقابت جاری رہی مگر بالآخر پٹنہ کے ایک قلیل البضاعت وکیل کا ذوق علم والی رامپور کی دولت و امارت پر غالب آیا، انھوں نے ایک عرب متجسس کتب محمد مکی کو اٹھارہ سال تک پچاس روپیہ ماہانہ مشاہرہ پر ملازم رکھا، اس نے عرب، شام، مصر اور ایران کی خاک چھان ڈالی اور عربی کی نادر ترین قلمی کتابیں لاکر ڈھیر کر دیں، ہندوستان میں بھی ان کی فیاضی نے قلمی کتب فروشوں کو جوق در جوق ان کی طرف مائل کر دیا، وہ ہر کتب فروش کو جو پٹنہ آتا خواہ اس سے کچھ لیتے یا نہ لیتے دو چند ریلوے کرایہ دیا کرتے تھے، اس طرح ان کی شہرت تمام ہندوستان میں پھیلی اور ملک کے جس حصہ میں بھی کوئی قلمی نسخہ فروخت ہونے والا ہوتا وہ سب سے پہلے ان کے پاس لایا جاتا۔

عجیب وغریب اتفاقات

ایک مرتبہ کتب خانۂ مشرقی کے ایک سابق جلد ساز نے نقب زنی کر کے کتب خانہ کی چند نادر ترین قلمی کتابیں چرائیں اور انھیں لاہور لے جا کر ایک کتب فروش کے حوالہ کیا، موخر الذکر نے نادانستگی میں یہ خیال کر کے کہ خدا بخش خاں سے زیادہ ایسی کتابوں کا قدرداں اور کون ہے انھیں ان کے پاس بغرض فروخت پیش کیا، اس طرح چور کو سزا ملی اور حق بحقدار رسید کا مفہوم پورا ہوا۔

خدا کی انصاف کا دوسرا حیرت انگیز واقعہ سنو، ایک مرتبہ پٹنے کے ڈسٹرکٹ جج مسٹر جے، بی، ایلیٹ نے محمد بخش مرحوم سے قصائد کمال الدین اسمٰعیل اصفہانی کا ایک قلمی نسخہ مستعار لیا، صاحب بہادر کو کتاب بہت پسند آئی اور اس کو واپس دینے کی بجائے ایک بڑی رقم بطور قیمت دینے لگے، محمد بخش نے نہایت ہی ناگواری کے ساتھ اس تجویز سے انکار کیا مگر کرتے تو کیا کرتے،

صبر کر کے خاموش ہو رہے، مسٹر ایلیٹ مخطوطات کے جمع کرنے کا غیر معمولی ذوق رکھتے تھے، انھوں نے بوڈلین لائبریری میں بہت سی کتابیں دی ہیں، جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہوکر پٹنہ سے جانے لگے تو انھوں نے اپنی منتخب کتابوں کو ساتھ لے جانے کے لیے ایک صندوق میں بند کیا اور بقیہ کتابوں کو ایک دوسرے صندوق میں بند کرا کے ہدایت کی کہ انھیں اسی طرح سربمہر نیلام کر دیا جائے مگر نوکروں کی غلطی یا خدا کی قدرت سے ردی کتابوں کا صندوق صاحب کے ساتھ چلا جاتا ہے اور منتخب کتابوں کا صندوق کوڑیوں کے مول نیلام ہو جاتا ہے، محمد بخش مرحوم اسے خریدتے ہیں اور اس میں قصائد کمال الدین کے علاوہ اور بہت سے نادر و نایاب جواہر گرانمایہ پاتے ہیں، چنانچہ ''مجالس خمسہ'' کا وہ نسخہ جس پر شاہجہاں کے دستخط ہیں اسی میں ملتا ہے، خوشی سے باچھیں کھل جاتی ہیں اور فوراً از راہ تشکر سربسجود ہو جاتے ہیں، دوسری طرف صاحب بہادر جب انگلینڈ پہنچ کر کتابوں کا صندوق کھولتے ہیں تو فرط غم سے دم بخود ہو جاتے ہیں۔

ایک دن خدا بخش خاں مرحوم حیدرآباد میں ہائیکورٹ سے واپس آرہے تھے، مخطوطات کے تجسس میں ان کی نگاہیں والہانہ انداز کے ساتھ دکانوں پر ادھر اُدھر پڑ رہی تھیں، ایک دکان پر بوسیدہ قلمی کتابوں کا ایک انبار نظر آیا، فوراً گاڑی رُکوا کر اتر پڑے، اس کوڑے کو الٹ پلٹ کر کے دیکھا اور دکاندار سے قیمت دریافت کی، اس نے کہا'' حضور! اگر کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو کوڑا سمجھ کر اس کو تین روپے میں دے دیتا مگر جب حضور کو اس سے دلچسپی ہے تو اس میں یقیناً کوئی اچھی چیز ہوگی، اب میں بیس روپے قیمت لوں گا'' پورا انبار خرید کر ساتھ لے آئے، اس میں چند نہایت ہی نادر و نایاب کتابیں نکلیں، بعد کو صرف ایک کتاب کے لیے نظام حیدرآباد کی طرف سے چار سو روپے پیش کیے گئے مگر انھوں نے دینے سے انکار کیا۔

قومی نقطۂ نظر سے کتب خانہ کی اہمیت

یورپین سیاحوں کی یہ ایک مخصوص اور نہایت ہی پسندیدہ عادت ہے کہ وہ جہاں کہیں جاتے ہیں اپنے قومی میوزیم اور کتب خانوں کے لیے نادر مخطوطات، دلربا تصاویر اور دوسرے

قیمتی تحائف فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ اس طرح سے بوڈلین لائبریری، برٹش میوزیم، انڈیا آفس لائبریری اور یورپ کے دوسرے قومی اداروں میں نوادر کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے۔

اٹھارہویں صدی میں جب کہ ایک طرف انگریز مدبرین اور انگریز سپاہی ہندوستان کو اپنے دائرہ اقتدار میں لانے کی کوشش کر رہے تھے تو دوسری طرف کرکپٹرک (Kirkpatric) گلیڈوین (Gladwin) فٹز پٹرک (Fitzpatric)، جوتھن اسکاٹ (Jonathan Scat) اور دوسرے بہت سے یورپین فاضل یہاں عربی و فارسی مخطوطات کے شکار میں مصروف تھے، ان کی کوششوں سے نوادر کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہندوستان سے یورپ منتقل ہوگیا، ہمارے غیر مستطیع تشنہ کامان علم کے لیے یہ نہایت دشوار ہے کہ وہ یورپ جا کر اپنی پیاس بجھائیں، اس بنا پر خدا بخش خاں مرحوم کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے کتب خانہ مشرقی کی تاسیس سے بڑی حد تک ہماری ایک ضرورت رفع کردی ہے، صرف یہی نہیں بلکہ ہمارا جو سرمایہ یورپ پہنچ چکا تھا ان کی کوششوں سے اس کا ایک مختصر حصہ پھر ہندوستان واپس آگیا، چنانچہ اس کتب خانہ میں ڈی ساسی (De Sacy) سرگور اوسلے (Sir Goreously)، مسٹر بلاکمین (Mr. Blachmann) وغیرہم کے مملوکہ مخطوطات کی ایک کافی تعداد موجود ہے، بعض کتابوں پر فرانس کے ایک کتب خانہ کے طبق چسپاں ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بانی کتب خانہ کا دست تطاول صرف برطانیہ عظمیٰ تک محدود نہ تھا۔

اطراف و اکناف ملک میں اب تک عربی و فارسی مخطوطات کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے مگر وہ یا تو رفتہ رفتہ یورپ کے کتب خانوں میں منتقل ہو رہے ہیں یا اہل ملک کی بدمذاقی اور بے توجہی سے کیڑوں کی نذر ہوتے جاتے ہیں، خدا بخش مرحوم کی بڑی خواہش یہ تھی کہ بخیال استحفاظ و بغرض افادۂ عام اس قسم کے تمام مخطوطات کتب خانہ مشرقی کو دے دیئے جائیں، چنانچہ ان کی درخواست پر نواب ولایت علی خاں، مولوی سید عبدالمجید رئیس صدر گلی پٹنہ، سید صفدر نواب اور بعض دوسرے رؤسائے ملک کے کتب خانے منتقل ہو چکے ہیں، اسی طرح دیوان حافظ

کا وہ بیش بہا نسخہ جس کو ہمایوں اور جہانگیر نے مختلف مواقع پر فال کھولنے کے لیے استعمال کیا تھا مولوی سبحان اللہ صاحب رئیس گورکھپور کا عطیہ ہے، ضرورت ہے کہ بانی کتب خانہ کی اس خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بیش از بیش توجہ صرف کی جائے اور ملک کے منتشر علمی سرمایہ کو پٹنہ کے مرکزی کتب خانہ میں منتقل کر کے باہر جانے سے یا کیڑوں کی نذر ہونے سے بچایا جائے۔

حکومت کی فیاضانہ سرپرستی

۱۸۸۰ء میں خدا بخش مرحوم نے از راہ دور اندیشی کتب خانہ کو گورنمنٹ کی سرپرستی اور نگرانی میں دینے کے لیے سلسلۂ جنبانی شروع کی، پٹنہ کے اوپیم ایجنٹ مسٹر کیمپبل (Mr. Campbell) سے ان کے تعلقات نہایت دوستانہ تھے، ان کی تحریک پر اسی سال یا شاید دوسرے سال سر چارلس لائل نے کتب خانہ کا معائنہ فرمایا، سر چارلس عربی و فارسی کے زبردست عالم تھے، کتب خانہ کے بیش بہا نوادر نے ان کی آنکھیں کھول دیں، انھوں نے نہایت مؤثر الفاظ میں حکومت بنگالہ کو اس کتب خانہ کی سرپرستی قبول کرنے کی ترغیب دی، چنانچہ مسٹر سر چارلس ایلیٹ نے سرپرستی قبول کر کے ۱۸۹۱ء میں ملک کے لیے کتب خانہ کا باضابطہ افتتاح فرمایا، پھر ۱۸۹۳ء میں سر انٹونی میکڈانل نے ملاحظہ فرما کر غیر معمولی خوشنودی کا اظہار فرمایا، اس کے بعد ۱۹۰۳ء میں مدرسہ عالیہ کے لائق انگریز پرنسپل سر ایڈورڈ ڈینسن راس کی تحریک پر ہندوستان کے نامی و گرامی وائسرائے لارڈ کرزن نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے اس کو مفتخر کیا، جس وقت وہ کتب خانہ میں داخل ہوئے تو یہ شعر ورد زبان تھا ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

اس معائنہ کی یادگار میں ''لارڈ کرزن ریڈنگ ہال'' کی تعمیر عمل میں آئی، پٹنہ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر کنگ کو اس کتب خانہ سے غیر معمولی دلچسپی تھی انھوں نے اس کو ترقی دینے

کے لیے ایک اسکیم مرتب کی تھی مگر افسوس ہے کہ ان کے تبادلہ کے ساتھ ہی اس اسکیم کا خاتمہ ہوگیا۔

لائبریری فنڈ کے نام سے کتب خانہ کی اپنی مستقل آمدنی حسب ذیل ہے:

(۱) آمدنی موضع کوساموقوفہ میرابوصالح مرحوم رئیس گیا	۳۰۰روپیہ
(۲) نظام حیدرآباد کا سالانہ عطیہ	۶۰۰روپیہ
(۳) امپریل بنک کے حصوں کا منافع	۹۰۰روپیہ
	۱۸۰۰روپیہ

مصارف کتب خانہ کے لیے اٹھارہ سو روپیہ کی رقم نہایت ناکافی ہے اس بنا پر از راہ سرپرستی حکومت کے بجٹ میں ہر سال ایک بیش قرار رقم منظور کی جاتی ہے چنانچہ سال رواں کے بجٹ میں تقریباً دس ہزار روپیہ کی منظوری ہے۔

ترتیب وتدوین فہرست

راس صاحب کی تحریک سے ۱۹۰۴ء میں ترتیب وتدوین فہرست کی ابتدا ہوئی، خان بہادر مولوی عبدالمقتدر صاحب فارسی مخطوطات کے لیے اور ڈاکٹر کمال الدین عربی مخطوطات کے لیے تقرر کیے گئے، اول الذکر نے تقریباً چوبیس سال کی مسلسل محنت وجانفشانی کے بعد ۱۹۳۰ء میں فارسی مخطوطات کی فہرست کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا، عربی مخطوطات کے فہرست نگار ڈاکٹر کمال الدین تھوڑے ہی دنوں کے بعد بغرض تکمیل تعلیم راہی انگلینڈ ہوئے، ان کے بعد ڈاکٹر عظیم الدین احمد صاحب کا تقرر عمل میں آیا مگر فہرست کی ایک ہی جلد مرتب کرنے پائے تھے کہ وہ بھی پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے عازم یورپ ہوئے تھوڑے التوا کے بعد ۱۹۱۰ء میں ان کی جگہ مولوی عبدالحمید نے لی مگر مدونین کے تغیر وتبدل سے کام اس قدر پسماندہ ہو چکا تھا کہ صرف ایک آدمی سے عربی مخطوطات کی فہرست مکمل نہیں ہو سکتی تھی اس بنا پر فروری ۱۹۲۴ء میں خاکسار کا تقرر عمل میں آیا، درحقیقت یہی وہ وقت ہے کہ جب سے عربی مخطوطات کی فہرست کا کام پوری تیزی اور تندہی کے ساتھ شروع ہوا، ممکن تھا کہ عربی مخطوطات کی فہرست بھی مکمل ہو کر ارباب علم

کے ہاتھوں میں پہنچ گئی ہوتی مگر حکومت کی مالی دشواریوں کے باعث فروری ۱۹۳۲ء میں خاکسار کا عہدہ معرض التوا میں آ گیا، خاکسار نے اپنی ہشت سالہ مدت ملازمت میں فہرست کی چھ جلدیں مکمل کیں اور ساتویں کا ایک معتد بہ حصہ ہو چکا تھا کہ اس سے بحسرت واندوہ دستکش ہونا پڑا، چونکہ ہمارے لائق دوست مولوی عبدالحمید ہنوز سرگرم کار ہیں اس لیے امید ہے کہ اب بہت جلدی عربی مخطوطات کی فہرست بھی مکمل ہو جائے گی۔

عربی و فارسی مخطوطات کی مذکورہ صدر فہرست جدید طرز پر انگریزی زبان میں مرتب کی گئی ہے، اسے علمی تحقیقات و معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ سمجھنا چاہیے۔ مستشرقین یورپ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، یورپ اور امریکہ کے علمی و ادبی اخبارات و رسائل نے نہایت ہی وقیع الفاظ میں اس کی مدح سرائی کی ہے اور مغربی مصنفین نے اپنی تصنیفات میں اس کے حوالے دے کر مدونین کی تفتیش و تحقیق کی داد دی ہے مگر افسوس ہے کہ ہندوستان کے ارباب علم اس سے بالکل بے خبر ہیں، اس وقت تک اس فہرست کی پچیس جلدیں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں جو، جلدیں لندن میں چھپی ہیں ان کی قیمت فی جلد سولہ روپیہ ہے اور جو جلدیں کلکتہ میں چھپی ہیں وہ دس روپیہ فی جلد کے حساب سے فروخت ہوتی ہیں، انھیں زیادہ تر یورپ اور امریکہ کے اہل علم خریدتے ہیں، ہندوستان میں شاید ہی اب تک کسی نے خریدا ہو، اس فہرست کی جلدیں دنیا کے بعض ممتاز افاضل اور بڑے کتب خانوں کو مفت بھی دی جاتی ہیں۔

حکومت نے ہمیشہ بکمال فراخ حوصلگی مدونین فہرست کی عرق ریزی و جانفشانی کا معاوضہ ادا کر کے اپنی قدردانی کا ثبوت دیا ہے، مولوی عبدالمقتدر صاحب کو پروونشل پوسٹ عطا ہوا، پھر سلیکشن گریڈ میں ترقی دی گئی نیز پہلے خان صاحب کے خطاب سے سرفراز کیے گئے پھر خان بہادر بنائے گئے، ڈاکٹر کمال الدین اور ڈاکٹر عظیم الدین احمد کو اسٹیٹ اسکالرشپ دیا گیا، مولوی عبدالحمید صاحب کو بھی محکمۂ تعلیم میں ایک مستقل عہدہ ملا، جب خاکسار کا عہدہ معرض تخفیف میں آیا تھا تو بظاہر اس عام نوازش سے استفادہ کی امید باقی نہیں رہی تھی مگر مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کی پرنسپلی ملنے کے بعد اس ناچیز کی دیرینہ خدمت بھی بالآخر سعی نامشکور نہیں رہی۔

انگریزی فہرست کے علاوہ عربی و فارسی مخطوطات کی فارسی فہرستیں بھی چار جلدوں میں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں، ہر جلد پانچ روپیہ میں لائبریری کے دفتر سے مل سکتی ہے۔

تصاویر کی فہرست اور انگریزی کتابوں کا کیٹلاگ ملازمین کتب خانہ کی مدد سے مولوی ولی الدین خدا بخش نے مرتب کیا ہے، عربی، فارسی اور اردو مطبوعات کی فہرست بھی ان کے اہتمام سے چھپ رہی ہے۔

کتب خانہ کی موجودہ حالت

جنوری ۱۹۳۴ء کے زلزلہ نے صوبہ بہار میں جو قیامت برپا کی اس سے کتب خانہ بھی محفوظ نہیں رہا، اس کی عظیم الشان دومنزلہ عمارت اب صرف ایک منزلہ ہو کر رہ گئی ہے، حکومت نے اس کی مرمت پر دس ہزار روپے صرف کیے ہیں مگر پبلک کے لیے دار المطالعہ ہنوز بند ہے، اس میں بالائی منزل کی کتابیں رکھی گئی ہیں، مسٹر صلاح الدین مرحوم کی کتابیں بے ترتیبی کے ساتھ ادھر اُدھر پڑی ہیں، اب تک ان کے رکھنے کا انتظام نہیں ہوا ہے، کتب خانہ کے سامنے جو وسیع چمن ہے اس میں ایک مستحکم اور عالیشان عمارت کی تعمیر زیر غور ہے، حکومت نے اس جدید عمارت کے لیے بیس ہزار روپے کی منظوری دی ہے مگر محکمۂ تعمیرات اس کو ناکافی سمجھتا ہے، ضرورت ہے کہ جہاں تک جلدی ممکن ہو کتب خانہ کی حیثیت اور اس کی آئندہ ضروریات کو ملحوظ رکھ کر ایک شاندار عمارت تیار کرادی جائے تاکہ تشنہ کامان علم اس چشمۂ معارف سے زیادہ دنوں تک محروم نہ رہیں۔

بانی کتب خانہ کی وفات کے وقت عربی و فارسی مخطاطات کی تعداد پانچ ہزار تھی مگر اس میں معتد بہ اضافہ ہوا ہے، مسٹر صلاح الدین مرحوم کی وصیت کے مطابق ان کی ۷۳۰۰ کتابیں بھی اس کتب خانہ میں منتقل ہو گئی ہیں اور اس طرح عربی، فارسی، اردو اور انگریزی مطبوعات میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے، سردست تمام مخطوطات و مطبوعات کی مجموعی تعداد تقریباً چوبیس ہزار (۲۴۰۰۰) ہے۔

شرائط وقف نامہ کے مطابق اس کتب خانہ کی نظامت ہمیشہ خدابخش خاں مرحوم کے خاندان میں متوارث رہے گی چنانچہ سردست مولوی ولی الدین خدابخش، بی۔اے، بی۔ال، اس عہدہ پر مامور ہیں، ان کے ماتحت ملازمین میں سیدعلی رضا صاحب اسسٹنٹ لائبریرین، حاجی محمد نواب صاحب کسٹوڈین، سید عین الحق صاحب کسٹوڈین اور شیخ صاحب دین صاحب کسٹوڈین قدامت عہد اور حسن خدمت کے لحاظ سے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

چند انمول جواہر پارے

کتب خانہ کی ایک اجمالی سرگذشت کے بعد اب ہم قارئین کرام کو اس کے چند انمول جواہر پاروں سے روشناس کرانا چاہتے ہیں۔

عربی مخطوطات میں قرآن شریف کے نہایت ہی بیش بہا نسخے موجود ہیں، خط کوفی میں ایک حمائل ہے جو غالباً چوتھی صدی ہجری کا لکھا ہوا ہے، اس میں اعراب کے لیے سرخ نقطے استعمال کیے گئے ہیں، اس کے بعد بہ لحاظ قدامت تحریر جمال الدین ابوالمجد یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کا دیدہ زیب مصحف ہے، کہا جاتا ہے کہ ابن بواب (۴۲۳ھ) خط نسخ کا موجد تھا، اس کے بعد یاقوت مستعصمی ہی وہ خطاط تھا جس نے اس کو درجۂ کمال پر پہنچایا، درحقیقت اس کی تحریر فن خطاطی کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے، امین احمد رازی (متوفی ۱۰۰۲ھ) ہفت اقلیم میں لکھتا ہے کہ ان کے زمانہ میں یاقوت مستعصمی کی تحریر جواہرات کی طرح نادر و گراں قیمت متصور ہوتی تھی، موجودہ مصحف ۶۶۸ھ کا لکھا ہوا ہے، یاقوت مستعصمی نے ۶۹۸ھ میں وفات پائی۔

میرعلی تبریزی کے ہاتھ کا ایک مصحف جو ۹۸۲ھ کا لکھا ہوا ہے ایک مرتبہ معین الملک رستم ہند میر منّو کے یہاں تین ہزار روپیہ میں ہدیہ ہوا تھا، میر منّو اعتمادالدولہ قمرالدین خاں کے لڑکے تھے، ۱۱۶۱ھ میں اپنے والد کی جگہ پر لاہور کے گورنر بنائے گئے اور ۱۱۶۷ھ میں راہی دارالبقاء ہوئے، اس نسخہ کی ہنرمندانہ خطاطی، مطلا جلد اول منقش حواشی اور زرراندود بین السطور دیکھ کر ازمنہ ماضیہ کی صناعی پر انسان محوحیرت ہوتا ہے۔

عبدالباقی حداد فن خطاطی میں یگانۂ روزگار تھے، شاہ جہاں کے عہد میں ہرات سے ہندوستان آئے اور یاقوت رقم کے خطاب سے مشرف ہوئے، تذکرۂ خوشنویساں میں بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے شہزادہ محی الدین (اورنگ زیب) کی بارگاہ میں ایک مصحف، ایک تی ورقی قرآن اور صحیفۂ امام زین العابدین کا ایک نسخہ لکھ کر پیش کیا تھا، یہ تینوں گراں بہا تحائف آج تک کتب خانۂ مشرقی میں محفوظ ہیں، عبدالباقی حداد کے بعد ان کے تلامذہ نے ہندوستان میں فن خطاطی کو منتہائے کمال پر پہنچایا، ان کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے مصاحف اور مجموعے اس کتب خانہ میں بکثرت موجود ہیں۔

فن تجوید میں ابوعلی الفارسی (متوفی ۳۷۷ھ) کی کتاب ''الحجہ فی قرأت السبعہ'' عدیم الوجود سمجھی جاتی ہے اس کتاب کا ایک ناقص مگر نہایت ہی قدیم نسخہ اس کتب خانہ میں موجود ہے، اس کی قدامت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ امام تاج الدین الکندی (متوفی ۶۱۳ھ) نے اس میں درس دیا ہے اور کتاب کے آخری صفحہ پر اپنے تلامذہ کے لیے اپنے قلم سے سند سماع تحریر فرمائی ہے۔

ابوالطاہر اسمٰعیل السرقسطی (متوفی ۴۵۵ھ) کی ''کتاب العنوان'' فن قرآت کی نادر و نایاب تصنیف ہے، یہاں اس کا ایک نہایت قدیم نسخہ ۶۳۲ھ کا لکھا ہوا موجود ہے، اس کے کاتب عبدالقوی الانماطی (متوفی ۶۴۶ھ) مصر کے علمائے کبار میں تھے، ذہبی نے طبقات القراء میں ان کا حال دیا ہے۔

فن تجوید کے اکثر نسخے نہایت ہی قدیم الخط ہیں چنانچہ ابو حیان اندلسی (متوفی ۷۴۵ھ) کی دو کتابیں عقد اللآلی اور نکت الامالی ان کے ایک شاگرد شہاب الدین احمد الابیاری کے قلم سے ۷۱۶ھ میں لکھی گئی تھیں، موخرالذکر پر مشہور محدث ابراہیم قلقشندی کے ہاتھ کی ایک تحریر بھی ہے، اسی طرح ابن القاصح العذری (متوفی ۸۰۱ھ) کی ''مصطلح الاشارات'' ۷۸۷ھ کی لکھی ہوئی ہے۔

علم الدین سخاوی (متوفی ۶۴۳ھ) کی ''الوسیلہ الی کشف العقیلہ'' جو ۸۰۷ھ کی

لکھی ہوئی ہے ایک عرصہ تک ملا علی قاری (متوفی ۱۰۱۴ھ) کے مصرف میں رہی، اس کے بعد خانخاناں عبدالرحیم خاں کے کتب خانہ میں داخل ہوئی، پھر گردش ایام سے وارد عظیم آباد ہوئی۔

روضۃ الطرائف فی رسم المصاحف ابراہیم جعبری (متوفی ۷۳۲ھ) کی نادر و نایاب تصنیف ہے، اس کتب خانہ میں اس کا ایک نہایت ہی قدیم نسخہ یعنی ۷۲۶ھ کا لکھا ہوا موجود ہے، یہ مصنف کی نظر سے گذرا ہے، انھوں نے اس کے کاتب شہاب الدین احمد البعلی کے لیے اپنے قلم سے ایک سند سماع تحریر فرمائی ہے۔

تفسیر میں جار اللہ زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) کی مشہور تصنیف الکشاف عن حقائق التنزیل کا ایک نسخہ ہے جو ۸۳۴ھ میں سلطان شاہرخ کے کتب خانہ کے لیے لکھا گیا تھا، گردش زمانہ سے وہ ملک التجار خواجۂ جہاں محمود کی ملکیت میں آیا، خواجۂ جہاں نظام شاہ بہمنی کے وزیر اعظم اور ملا عبدالرحمن جامی (متوفی ۸۹۸ھ) کے معاصر تھے، ان دونوں میں باہم مکاتبت و مراسلت کا سلسلہ بھی قائم تھا، ۸۸۶ھ میں محمد شاہ ثانی کے حکم سے خواجۂ جہاں قتل کیے گئے، یہ معلوم نہیں کہ اس واقعہ کے بعد خواجۂ جہاں کا کتب خانہ کس کے تصرف میں آیا مگر ایک نوٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۰۰۳ھ میں کشاف کا زیر بحث نسخہ ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور کے کتب خانہ میں داخل ہوا، پھر جب بیجاپور مفتوح ہوا تو اورنگ زیب کے حکم سے دہلی کے شہنشاہی کتب خانہ میں منتقل ہوا، نقش و نگار نیز فن خطاطی کے لحاظ سے یہ نسخہ قابل دید ہے۔

الحجاز فی القرآن علامہ عزالدین عبدالسلام (متوفی ۶۶۰ھ) کی نادر و نایاب تصنیف ہے، موجودہ نسخہ ۶۸۷ھ کا لکھا ہوا ہے، اسی طرح ابوبکر محمد بن احمد السمر قندی (متوفی ۵۴۰ھ) کی شرح التاویلات فن تفسیر کی عدیم الوجود کتاب ہے، اس کتب خانہ میں جو نسخہ ہے وہ مصنف کے دوران حیات میں لکھا گیا ہے، انھوں نے اول صفحہ پر اپنے ایک شاگرد ابوبکر کاسانی (متوفی ۵۸۷ھ) کے لیے اپنے ہاتھ سے ایک سند سماع تحریر فرمائی ہے۔

جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) کی مشہور تصنیف الاتقان بارہا چھپ چکی ہے مگر اسی کتب خانہ میں جو نسخہ ہے وہ اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ وہ مصنف کے شاگرد رشید محمد بن علی

الداؤدی (متوفی ۹۴۵ھ) کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، یہاں الاتقان کا ایک دوسرا نسخہ بھی ہے جو کشمیر میں قوام الدین خاں عالمگیر شاہی کے لیے ۱۰۸۷ھ میں لکھا گیا تھا قوام الدین خاں عباسی ثانی شاہ ایران کے امرائے دربار میں تھے، اورنگ زیب کے عہد حکومت میں ہندوستان آئے اور سہ ہزاری منصب سے مشرف ہوکر مختلف عہدوں پر سرفراز رہے، انھوں نے ۱۰۹۲ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

حدیث میں خطیب بغدادی (متوفی ۴۶۳ھ) کی الکفایہ چھٹی صدی ہجری کی لکھی ہوئی ہے، سلطان صلاح الدین ایوبی کے ولی عہد شاہزادہ ابوالعباس احمد نے اس میں درس لیا ہے۔

مشکل الحدیث ابوبکر محمد بن حسن بن فورک (متوفی ۴۰۶ھ) کی نادر و نایاب تصنیف ہے، موجودہ نسخہ ۶۰۷ھ کا لکھا ہوا ہے۔

مقدمہ ابن الصلاح کا ایک نسخہ ۶۳۷ھ کا لکھا ہوا ہے، خود مصنف نے اس کی تصحیح کی ہے۔

ابوالحسن علی بن احمد المقدسی (متوفی ۶۹۰) کی کتاب المشیخہ عدیم الوجود سمجھی جاتی ہے، اس کتب خانہ میں اس کا ایک نہایت قدیم اور مکمل نسخہ موجود ہے۔

مغلطائی (متوفی ۷۶۲ھ) کی شرح ابن ماجہ مصنف کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے، اسی طرح احمد بن علی الحنبلی (متوفی ۸۴۰ھ) کی الاربعین مورخہ ۸۳۷ھ مؤلف کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔

ابن حجر عسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ) کی نادر تصنیف النکت الظراف مؤرخہ ۸۵۷ھ عسقلانی کے شاگرد رشید علامہ ابن فہد مکی ((متوفی ۸۵۸ھ) کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔

الجامع الصحیح البخاری (متوفی ۲۵۶ھ) کے متعدد نسخے نہایت ہی خوشخط اور گراں قیمت ہیں، ایک نسخہ ۷۹۳ھ کا لکھا ہوا ہے، دوسرا نسخہ بھی آٹھویں صدی کا لکھا ہوا ہے، علامہ موسی بن الحسین البعلی الیونینی (متوفی ۸۴۰ھ) اس کے کاتب ہیں، تیسرا نسخہ ۸۳۷ھ کا لکھا ہوا ہے اور چوتھا نسخہ بنگالہ کے دارالسلطنت ''یکدالہ'' میں شاہ بنگالہ اشرف الحسینی کے کتب خانہ کے لیے لکھا گیا تھا۔

فقہ میں علامہ ابن ابی عصرون (متوفی ۵۸۵ھ) کی مختصر النہایہ ان کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے، محی الدین النووی (متوفی ۶۷۶ھ) کی کتاب الروضہ ان کے دوران حیات یعنی ۶۶۹ھ میں لکھی گئی تھی، اس طرح علامہ ابن الرفعہ (متوفی ۷۱۰ھ) کی کفایہ التنبیہ ان کے انتقال سے دوسال پہلے لکھی گئی ہے، انھوں نے خود ہی اس کی تصحیح کی ہے۔

ابن الملقن (متوفی ۸۰۴ھ) کی نادر و نایاب تصنیف تحفۃ المحتاج کا ایک نسخہ مورخہ ۷۵۳ھ خود مولف کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

عقائد میں مطالع الانظار محمود اصفہانی (متوفی ۷۴۹ھ) کی نادر و نایاب تصنیف ہے، اس کا موجودہ نسخہ مؤرخہ ۷۴۰ھ مؤلف کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔

تصوف میں بشر الحافی (متوفی ۲۲۷ھ) کی ایک نادر الوجود تصنیف ۴۸۳ھ کی لکھی ہوئی ہے، بہ لحاظ کتابت یہ اس کتب خانہ کا قدیم ترین نسخہ ہے۔

عبدالرحمٰن جامی (متوفی ۸۹۸ھ) کی شرح فصوص الحکم نہایت ہی مشہور و معروف ہے مگر یہاں جو نسخہ ہے اس کو انھوں نے ۸۹۶ھ میں اپنے ہاتھ سے لکھا تھا، اسی طرح مواعظ میں علی المتقی (متوفی ۹۷۵ھ) کی جوامع الکلم ان کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔

حکمت میں ابن سینا (متوفی ۴۲۸ھ) کی کتاب الاشارات کا ایک نسخہ ۵۲۰ھ کا لکھا ہوا ہے، اسی طرح ہیئت میں نصیر الدین طوسی (متوفی ۶۷۲ھ) کی معرکۃ الآرا تصنیف نہایۃ الادرک کا ایک نسخہ ہے جو مؤلف کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔

نجوم میں ابومعشر جعفر البلخی (متوفی ۲۷۳ھ) کی تصنیف المدخل الی احکام النجوم نہایت ہی نادر و نایاب سمجھی جاتی ہے، یہاں اس کا ایک قدیم نسخہ موجود ہے۔

طب میں حسین ابن ابراہیم الطبری کی کتاب الحشائش، علی بن عیسیٰ کی تذکرۃ الکحالین اور زہراوی کی کتاب التصریف کے جو نسخے ہیں ان کو بہ لحاظ ندرت وقدامت غیر معمولی شہرت حاصل ہے، اردو اور انگریزی میں ان پر مستقل مضامین لکھے گئے ہیں۔

تاریخ وسیر میں متعدد کتابیں قابل ذکر ہیں، وسیلۃ المتعبدین اور کتاب الالمام پر

''بہارستان'' اور ''معارف'' میں ہم نے مستقل مضامین لکھے ہیں، ابن حزم (متوفی ۴۵۶ھ) کی نادر و نایاب تصنیف جمهرة النسب پر مسٹر صلاح الدین مرحوم نے اپنی انگریزی تصنیفCivilization to the History of Islamic civilizationمیں ایک تفصیلی تبصرہ سپرد قلم فرمایا ہے، بقیہ کتابوں میں ابن ابی الدم الحموی (متوفی ۶۴۲ھ) کی التاریخ الاسلامی، ابوالقاسم قشیری (متوفی ۴۶۰ھ) کی کتاب المعراج، سبط ابن الجوزی (متوفی ۶۵۴ھ) کی تذکرہ خواص الامہ اور الدمیاطی (متوفی ۷۰۵ھ) کی المختصر من سیرۃ سید البشر نہایت ہی نادر و نایاب ہیں۔

اگرچہ علامہ احمد القسطلانی (متوفی ۹۲۳ھ) کی المواہب اللدنیہ بار بار چھپ چکی ہے تاہم یہاں جو نسخہ ہے وہ اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ مؤلف نے ۸۹۸ھ میں اس کو اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔

اسماء الرجال میں ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ) کے الکاشف کا نسخہ مؤرخہ ۷۳۲ھ مؤلف کے انتقال سے ۱۶ سال پہلے لکھا گیا ہے۔

صوفیوں کا تذکرہ میں احمد بن سلامہ (متوفی ۷۶۹ھ) کی تصنیف اختیار الرفیق عدیم الوجود متصور ہوتی ہے مگر یہاں اس کا نسخہ ۹۱۳ھ کا لکھا ہوا ہے۔

حنبلی علماء کے حالات میں جیسا مکمل ذخیرہ یہاں ہے شاید دنیا کے کسی کتب خانہ میں نہ ہوگا۔

ابن ابی یعلی (متوفی ۵۲۶ھ) کی طبقات الحنابلہ حضرت امام احمد بن حنبل سے شروع ہو کر ۵۱۲ھ تک منتہی ہوتی ہے، اس کا موجودہ نسخہ ۷۶۳ھ کا لکھا ہوا ہے اور علمائے کبار کے مطالعہ میں رہا ہے، اس کے بعد ابن رجب حنبلی (متوفی ۷۹۵ھ) نے اس کا ایک ضمیمہ لکھا ہے جو ۷۵۱ھ میں تمام ہوتا ہے، پھر ابن حمید حنبلی نے السحب الوابلہ علی ضرائح الحنابلہ کے نام سے اس ضمیمہ کا ایک ضمیمہ لکھا ہے جس میں ۱۲۸۸ھ تک کے علماء مذکور ہیں۔

نحو میں شرح الجمل کا ایک نسخہ ۵۷۵ھ کا لکھا ہوا ہے، اسی طرح ابوعلی الفارس (متوفی

۷۷ ۳ھ) کی نادرونایاب تصنیف الایضاح ۵۹۹ھ کی لکھی ہوئی ہے۔

ابن الجنی (متوفی ۳۹۳ھ) کی کتاب اللمع ۶۳۰ھ کی لکھی ہوئی ہے اور العکبر ی (متوفی ۶۱۶ھ) نے اس کی جو شرح لکھی ہے اس کا نسخہ مورخہ ۶۱۱ھ شارح کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔

نعبیۃ الآمال مؤلفہ ابوجعفر احمد (متوفی ۶۹۱ھ) علم نحو کی نادرونایاب تصنیف ہے یہاں اس کا ایک نسخہ مؤلف کی وفات سے ایک سال پہلے کا لکھا ہوا ہے۔

رضی کی شرح کافیہ کا ایک نسخہ ۸۲۲ھ کا لکھا ہوا ہے، علامہ بدرالدین عینی (متوفی ۸۵۵ھ) اس کے کاتب ہیں۔

لغت میں ابوعبداللہ محمد بن عیسیٰ (متوفی ۶۲۰ھ) کی نادر ترین تصنیف کتاب الصفات ۶۴۸ھ کی لکھی ہوئی ہے اسی طرح ابوعبید احمد الھر وی (متوفی ۴۰۱ھ) کی الجمع بین الغریبین کا ایک نسخہ ۶۶۷ھ کا لکھا ہوا ہے۔

ضیاء الدین ابن اثیر الجزری (متوفی ۶۳۷ھ) کی تصنیف المثل السائر علم ادب کی نہایت ہی معروف و متداول کتاب ہے مگر یہاں جو نسخہ ہے وہ مصنف کے انتقال سے نو سال پہلے یعنی ۶۲۸ھ کا لکھا ہوا ہے۔

فارسی مخطوطات میں خطاطی اور مصوری کے بہترین نمونے موجود ہیں، اگر چین، وسط ایشیا، ایران اور ہندوستان کی مصوری کو تم بالمقابل دیکھنا چاہتے ہو تو تمھیں یہاں نہایت ہی وافر سامان ملے گا، ان تصاویر نے مسٹر ہویل (Mr.Huwell) جیسے نقادفن سے خراج تحسین وصول کیا ہے، اگر چہ اس مختصر مضمون میں فن مصوری کے لحاظ سے تفصیلی تبصرہ کی گنجائش نہیں ہے، تاہم چند مصور مخطوطات کا ایک اجمالی تذکرہ نامناسب نہ ہوگا۔

''تاریخ خاندان تیموریہ'' ایک نادرالوجود تاریخی کتاب ہے، اس میں صاحبقر ان امیر تیمور سے لے کر جلال الدین اکبر کی حکومت کے انیسویں سال تک کے حالات مذکور ہیں، مصنف کا نام معلوم نہیں ہے مگر کتاب کے اول صفحہ پر شاہ جہاں بادشاہ کی ایک تحریر ہے، اس میں وہ لکھتا ہے کہ'' شاہ بابا'' یعنی اکبر کے عہد میں تصنیف ہوئی، اس کتاب میں ۱۱۷ تصویریں

ہیں ہر تصویر کے نیچے مصور نے اپنا نام بھی دیا ہے، ابوالفضل نے آئین اکبری میں جن سترہ درباری مصورین کے حالات دیئے ہیں ان میں سے تیرہ کے شاہکار اس کتاب میں دیکھے جا سکتے ہیں، ان مصورین میں ''بساون'' اور ''مسکین'' خصوصیت کے ساتھ زیادہ چابکدست نظر آتے ہیں، جس صفحہ پر شاہجہاں کے ہاتھ کی تحریر ہے، اس کے ایک گوشہ میں وارن ہسٹنگس کے عہد کے مشہور انگریز مؤرخ مسٹر فرانسس گلیڈوین کا نام لکھا ہوا ہے، اسی صفحہ پر ایک اور تحریر ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ اس نسخہ کی تیاری میں آٹھ ہزار روپے صرف ہوئے ہیں۔

شاہ جہاں بادشاہ کی مشہور و معروف تاریخ بادشاہ نامہ مؤلفہ محمد قزوینی اور محمد صالح کنبوہ کا مصور نسخہ ۱۹۱۱ء میں دہلی دربار کے موقع پر شہنشاہ جارج پنجم اور ان کی ملکہ محترمہ کے سامنے ملاحظہ کے لیے پیش کیا گیا تھا، اس سے تم اس کے غیر معمولی حسن و خوبی کا اندازہ کر سکتے ہو۔

شہنشاہ نامہ سلطان محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ کی منظوم تاریخ ہے، اس کا موجودہ مصور نسخہ سلطان محمد ثالث کے لیے مؤلف نے اپنے ہاتھ سے مرتب کیا تھا، کچھ عرصہ تک قسطنطنیہ کے سلطانی کتب خانہ میں رہنے کے بعد وہ شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان پہنچا اور دہلی کے شہنشاہی کتب خانہ میں داخل کیا گیا، اس کا پہلا صفحہ مغل شاہزادوں کے دستخط اور مہروں سے بھرا ہوا ہے، ان میں سے شاہجہاں کی محبوب ترین لڑکی اور مونس الارواح کی مصنفہ شہزادی جہاں آرا بیگم خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے، اس نسخہ کی تصویریں ہندوستانی اور ایرانی طرز کی تصویروں سے بالکل جداگانہ ہیں، ان میں بازنطینی اثر نمایاں ہے۔

شاہنامۂ فردوسی کا ایک نہایت ہی گراں قیمت نسخہ مورخہ ۹۴۲ھ خوشخطی، پُر تکلف نقاشی، زریں جدول اور دیدہ زیب تصاویر کے لحاظ سے بے مثل ہے، کابل اور کشمیر کے گورنر علی مردان خان نے بوقت باریابی اس کو شاہ جہاں کے سامنے بطور نذر پیش کیا تھا، شاہنامہ کے دو اور مصور نسخے بھی قابل دید ہیں۔

جامی کی مشہور و معروف تالیف یوسف و زلیخا کا ایک نسخہ مؤرخہ ۹۳۰ھ میر علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس کی تیاری میں بیس ہزار روپے صرف ہوئے تھے اور خانخاناں عبدالرحیم

خاں نے اس کو جہانگیر کے سامنے بطور نذر پیش کیا تھا، اس کتاب کا ایک دوسرا نسخہ مؤرخہ ۱۰۱۸ھ مشہور و معروف خطاط میر عماد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس نسخہ کی اعلیٰ خطاطی بے مثل مصوری اور مطلا و مذہّب نقاشی دیکھ کر عقل انسانی متحیر ہوتی ہے۔

مصور مخطوطات کے علاوہ دوسرے قسم کے نوادر بھی بکثرت ہیں، شاہزادہ کامران (متوفی ۹٦۴ھ) کا دیوان عدیم الوجود متصور ہوتا مگر یہاں اس کا ایک نسخہ محمود بن اسحاق شہابی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس کے اول صفحہ پر جہانگیر اور شاہ جہاں کی خودنوشتہ تحریریں ہیں۔

دیوان حافظ کا ایک نسخہ ہے جس کو ہمایون بادشاہ اور جہانگیر بادشاہ نے بارہا فال کھولنے کے لیے استعمال کیا ہے اور جابجا حاشیہ پر واقعات تفاؤل کو اپنے ہاتھوں سے قلمبند کیا ہے، کتاب کے اول صفحہ پر سلطان حسین بیقرہ اور دوسرے سلاطین و امرا کے دستخط ہیں، ہمارے لائق دوست خان بہادر مولوی عبدالمقتدر نے اپنی فہرست میں غیر معمولی تحقیق و تفتیش کے ساتھ اسی نسخہ پر ایک مبسوط تبصرہ سپرد قلم فرمایا ہے۔

دیوان حافظ کے اور بھی متعدد نسخے نہایت ہی پاکیزہ اور خوشخط ہیں چنانچہ ایک مصور نسخہ مؤرخہ ۹۷۱ھ ملا میرک کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، دوسرا نسخہ ۱۰۲۳ھ میں سلطان محمد قطب شاہ کے کتب خانہ کے لیے لکھا گیا تھا اور تیسرا نسخہ مطلا جلد اول، زریں عنوان اور پاکیزہ تصاویر سے آراستہ ہے۔

کلیات جامی کی پہلی جلد مؤلف کے اپنے قلم کی لکھی ہوئی ہے، اس کی دوسری جلد سینٹ پٹرسبرگ کے کتب خانہ میں تھی، معلوم نہیں کہ جنگ عظیم کے بعد اس کا کیا انجام ہوا۔

اثیر اومانی (متوفی ۵٦٦ھ) کا ایک دیوان نہایت ہی کمیاب ہے، یہاں اس کا ایک مطلا و مذہب نسخہ ۱۰۱۵ھ کا لکھا ہوا موجود ہے، اسی طرح تاریخ ابوالخیر خانی مؤلفہ مسعودی بن عثمان کوہستانی مجمل فصیحی مؤلفہ احمد بن فصیح الخواتی، درج الدرا مؤلفہ امیر اصیل الدین شیرازی، مختار نامہ مؤلفہ سلمان بن احمد، سیرت فیروز شاہی، تذکرۃ السلاطین چغتا، تاریخ طاہری مؤلفہ طاہر محمد نسیانی، آثار الوزراء مؤلفہ سیف الدین حاجی فضلی، خلاصۃ الاشعار مؤلفہ تقی کاشی، عرفات العاشقین

مولفہ تقی اوحدی، دیوان رُکن صائن، دیوان مختاری غزنوی، دیوان قاسم ارسلان، دیوان شرف قزوینی، دیوان عجزی تبریزی، دیوان علی نقی کمرہ، دفتر چہارم مکاتبات علامی، جواہر العلوم مولفہ محمد فاضل بن علی سمرقندی اور مرآۃ المحققین مولفہ محمود شبستری کے نادر و نایاب نسخے بھی اس کتب خانہ میں موجود ہیں۔

داراشکوہ کی مشہور و معروف تالیف سفینۃ الاولیاء کا نسخہ اس کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، جہانگیر نے توزک جہانگیری کے علاوہ ایک کتاب جہانگیر نامہ کے نام سے تالیف کی ہے، اس کے نسخے نہایت ہی کمیاب ہیں، اس کتب خانہ میں اس کا وہ نسخہ ہے جس کو ۱۰۳۰ھ میں خود جہانگیر نے اپنے ایک درباری خطاط سے لکھوا کر قطب شاہ گولکنڈا کے پاس بطور تحفہ بھیجا تھا، اورنگ زیب کے عہد میں جب گولکنڈہ مفتوح ہوا تو یہ شہزادہ سلطان محمد کے قبضہ میں آیا چنانچہ اس کے اول صفحہ پر شہزادہ موصوف کے دستخط بھی موجود ہیں، غرض اس کتب خانہ میں نوادر کا اس قدر عظیم الشان ذخیرہ ہے کہ اس مختصر مضمون میں اس کی مفصل تشریح ناممکن ہے، ہمیں امید ہے کہ قارئین کرام اس اجمالی تبصرہ کو" مشتے نمونہ از خروارے" تصور فرمائیں گے۔

قوم کی بے توجہی

ایک مرتبہ ایک یورپین فاضل نے جو کتب خانہ دیکھنے کے لیے آیا تھا دارالمطالعہ کو مطالعہ کنندگان سے خالی دیکھ کر خدا بخش خاں مرحوم سے کہا تھا" واہ آپ نے کتابوں کا کیسا اچھا مقبرہ تیار کیا ہے! اگر یورپ میں ایسا کتب خانہ ہوتا تو ہر وقت طالبان علم کا ہجوم ہوتا مگر یہاں تو مجھے کوئی نظر نہیں آتا" واقعہ یہ ہے کہ اس یورپین فاضل نے جو آوازہ کسا ہے وہ بالکل صحیح ہے، ہمارے سامنے علوم و معارف کا ایک بحر ذخار موجزن ہے، دور دور سے تشنہ کامان علم آتے ہیں اور اس سے سیراب ہو کر جاتے ہیں مگر ہم تشنہ دہن اپنے لایعنی افکار و مشاغل میں مبتلا ہیں، ہم نے اپنے ہشت سالہ مدت ملازمت میں کبھی کسی بہاری کو ریسرچ کی غرض سے اس کتب خانہ میں آتے ہوئے نہیں دیکھا، افسوس!

اخلاق وعادات

خدا بخش خاں مرحوم اخلاق کریمانہ سے متمتع تھے، ترفع، خودداری اور جاہ پسندی کے ساتھ بردباری رحمدلی اور سخاوت کی آمیزش نے انھیں نہایت ہی سنجیدہ اور ہردلعزیز بنا دیا تھا، امرا کے مقابلہ میں خودداری اور غربا کے ساتھ تواضع وانکساران کا مخصوص شیوہ تھا، انھوں نے کبھی کسی کو چشم حقارت سے نہیں دیکھا، انھیں ذوق کا یہ شعر بہت پسند تھا اور وہ اس کو اکثر غیر معمولی تاثیر کے ساتھ وردزبان رکھتے تھے ؂

ہاں ذوق کس کو چشم حقارت سے دیکھیے
سب ہم سے ہیں زیادہ کوئی ہم سے کم نہیں

غریبوں کی اعانت اور مصیبت زدوں کی دستگیری کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے، مسٹر صلاح الدین مرحوم لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ خدا بخش خاں مرحوم کے ایک بچپن کے دوست فقرو فاقہ میں مبتلا ہوئے مگر چونکہ طبیعت نہایت غیور واقع ہوئی تھی اس لیے دست سوال پھیلانے میں شرم آئی، کسی معمولی کتاب کا ایک معمولی نسخہ لے کر ان کے پاس حاضر ہوئے اور اپنی ضرورت ظاہر کر کے اس کو خرید لینے کی درخواست کی، خدا بخش خاں نے اس نسخہ کو دیکھ کر کہا کہ ان کے کتب خانہ میں اس کتاب کے بہترین نسخے موجود ہیں، کتاب انھیں واپس دے دی اور اس کے ساتھ مبلغ ایک سو روپیہ کا نوٹ بھی ان کے ہاتھ میں دے دیا۔

دل آزاری سے وہ نہایت ہی خائف و ہراساں رہتے تھے اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ انسان کے لیے بدترین گناہ یہ ہے کہ اس کی مسرت، اس کے غرور، اس کی تمکنت یا اس کے کسی فعل سے دوسروں کے جذبات کو صدمہ پہنچے، اس سلسلہ میں وہ جب کبھی اپنے بچوں کو نصیحت فرماتے تو عماد، سودا اور راسخ کے حسب ذیل اشعار ان کی زبان پر ہوتے۔

گر در جہاں دلے زتو خرم نمی شود — بارے چناں مکن کہ شود خاطرے حزیں
کعبہ گیا جو ٹوٹ تو کیا جائے غم ہے شیخ — یہ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا
جو ہے تعمیر وہ عرش عظیم — سو ہے ٹوٹے ہوئے دل ہی کا مقیم

وفات

۱۹۰۸ء کی تیسری اگست کو ایک بجے شب کے وقت علم ادب کا عاشق، کتابوں کا شیدائی اور ملک وقوم کا غمگسار خدا بخش واصل بخدا ہوا، دنیائے دنی میں شور ماتم بپا ہوا، عالم برزخ میں اولیائے عظام، علمائے کرام اور صلحائے ذوی الاحترام کی ارواح مقدسہ نے خوش آمدید کے نعرے بلند کیے اور رحمت پروردگار نے "یا ایها النفس المطمئنة ارجعی الی ربک راضیة مرضیة" کی صدائے دلنواز کے ساتھ اپنے آغوش میں جگہ دی، انا لله و انا الیه راجعون۔

عیال واطفال

خدا بخش خاں مرحوم نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں کیں، پہلی بیوی لاولد فوت ہوئیں، دوسری بیوی سے ایک لڑکی اور چار لڑکے تولد پذیر ہوئے لڑکی نے کمسنی میں داغ فراق دیا، لڑکوں میں مسٹر صلاح الدین ایم۔اے، بی۔سی۔ایل (آکسفورڈ) بارایٹ لا سب سے بڑے تھے، وہ کلکتہ کے فروغ یافتہ بیرسٹروں میں تھے لا کالج کی پروفیسری اور کلکتہ یونی ورسٹی کی لکچرری پر بھی ممتاز رہے، انگریزی کے ادیب کامل تھے، فارسی میں بھی گونہ دسترس حاصل تھا، اشعار بکثرت یاد تھے، ۱۳۱۹ھ میں رہ گزیں عالم جاوداں ہوئے۔ دوسرے لڑکے مسٹر شباب الدین نے بھی انگلینڈ میں تعلیم پائی۔ وہاں سے واپس آکر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولس اور سپرنٹنڈنٹ پولس کے عہدوں پر سرفراز رہے اور اب پنشن پا رہے ہیں۔

تیسرے لڑکے غیاث الدین نے کمسنی میں داعی اجل کو لبیک کہا اور چوتھے لڑکے محی الدین اپنے والد کے بعد کتب خانہ کے ناظم مقرر ہوئے مگر صرف دو سال کے بعد راہی جنت ہوئے۔

تیسری بیوی سے کتب خانہ کے موجودہ ناظم مسٹر ولی الدین بی۔اے، بی۔ایل عالم وجود میں آئے۔



(ندیم گیا، بہار نمبر، اگست ستمبر ۱۹۳۵ء)

خان بہادر خدا بخش خاں (سی۔آئی۔ای)

دنیا میں بہت سی ایسی ہستیاں گزری ہیں، جنہیں ہم بھولے جارہے ہیں۔ گو تاریخ کا یہ تقاضا ہے کہ ہم انہیں یاد رکھیں، لیکن دنیا میں ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جنہیں یاد رکھنے کے لیے کسی خاص کوشش کی ضرورت نہیں بلکہ اگر ہم انہیں بھولنے کی کوشش بھی کریں تو انہیں اپنے دل سے نہیں بھلا سکتے۔' خان بہادر خدا بخش خاں مرحوم، ایسے ہی لوگوں میں تھے۔ دنیا میں جب تک علم کی پیاس باقی ہے اور تہذیب و تمدن کی طرف بڑھنے کی کوشش جاری ہے، ہمیں علم و ادب کے مندر'' اورینٹل پبلک لائبریری'' پٹنہ میں آکر سر جھکانا ہی پڑے گا۔ اور اس طرح اپنے محسن خدا بخش خاں کی یاد پر دو پھول چڑھانا ہی ہوگا۔

نوجوان دوستو! آج اگر تمہیں یہ باتیں یاد نہ رہیں کہ تم کس ماں باپ کی اولاد ہو، تمہارا بچپن کس طرح گذرا، تم نے اپنی زندگی میں دنیا کی کون کون سی خوشیاں حاصل کیں اور کیسی کیسی مصیبتوں سے دوچار ہوئے، کن کن چیزوں کی تعلیم پائی اور کون کون سے سبق پڑھے، تو بتاؤ تو سہی تم انسان کہے جانے کے لائق ہو؟ یہ تو جانوروں کی کیفیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے ماضی کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ انسان کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے معلوم ہو کہ وہ دنیا میں کس طرح آیا، اس پر کیسے کیسے دور گذرے، وہ ترقی کی کن منزلوں تک پہنچا اور اس نے علم اور سائنس کے ذریعہ دنیا کو کس حد تک فتح کیا۔ اگر ہمیں یہ باتیں نہ معلوم ہوں تو ہم کسی طرح ایک جانور سے کم نہیں، ہم کسی طرح اپنی راہ آگے نہیں نکال سکتے۔ آگے بڑھنے کے لیے یہ جاننے کی بھی ضرورت ہے کہ ہماری منزل میں کیا کیا دشواریاں ہیں اور ان سے بچنے کی کیا صورتیں ہیں۔ اگر ہم اپنے بزرگوں کے تجربات سے واقفیت نہیں رکھتے تو پھر ہمیں آگے بڑھنے کی جگہ پیچھے جانے کی ضرورت ہوگی اور پھر نئے

سرے سے شروع کرنا ہوگا۔ آگے کا راستہ اندھکار میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس میں سیکڑوں بلندیاں اور پستیاں، پہاڑیاں اور کھائیاں، ٹیلے اور گڈھے ہیں۔ خوب سوچ بچار کر، قدم پھونک پھونک کر اور تول تول کر رکھنا ہے۔ اس لیے جب تک بزرگوں کے تجربوں کا مشعل اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتے ،ایک قدم بھی آگے بڑھانا مشکل ہے۔

ہمارے بزرگوں کے ان تجربات ہی کا نام تاریخ ہے،لیکن آخر اس تاریخ کی واقفیت کا ذریعہ کیا ہے؟۔ ہم کس طرح جان سکتے ہیں کہ دنیا میں ہمارے بزرگوں نے کون کون سے کارنامے کیے، سچ تو یہ ہے کہ جب ہم سوچتے ہیں کہ آج ہمارے اتنے بڑے علم (یعنی تاریخ) کی بنیاد کیا ہے تو ہمیں ہنسی آتی ہے۔ چند زنگ لگے ہوئے سکے، چند ٹوٹے پھوٹے برتن، مٹی مٹی چند پتھر کی لکیریں، کچھ لنگڑی لولی مورتیاں اور کیڑا کھائی ہوئی دس بیس کتابیں۔ یہی وہ ذخیرہ ہیں جس پر اتنے بڑے علم تاریخ کی نیو ہے اور جس پر ہم نے اپنی عقل سے اتنی بڑی عمارت کھڑی کر لی ہے۔

خدابخش خاں مرحوم نے اپنے کتب خانے میں انہیں بنیادی اینٹوں کو جمع کر دیا ہے جس پر آج ہم نے ہندوستان کی تاریخ کے ایک سنہرے زمانے کی عمارت کھڑی کر دی ہے۔ گویا ''اورینٹل لائبریری'' موجودہ اور گزرے ہوئے زمانے کے درمیان ایک کڑی ہے، جس کے ذریعہ ہم اس زمانے کے حالات معلوم کر سکتے ہیں۔ خدابخش خاں اپنی لائبریری میں وہ مسالہ جمع کر گئے کہ آج اگر کوئی ہندوستان کی تاریخ لکھنے بیٹھے تو اس کے لیے اس کتب خانہ کی مدد لینا ضروری ہو جائے گا۔ موجودہ زمانہ میں ہندوستان کی جو تاریخیں بھی لکھی گئی ہیں، ان کا مواد زیادہ تر اسی لائبریری سے اکٹھا کیا گیا ہے۔ اگر آج اورینٹل پبلک لائبریری نہ ہوتی تو شاید سر جدو ناتھ سرکار مغل ہندوستان کی اتنی اچھی تاریخ نہ لکھ سکتے تھے اور انہیں مغلوں کے دور کی تاریخ کا ماہرفن نہیں مانا جا سکتا تھا۔ الہ آباد کے پنڈت ایشور نرائن اور پٹنہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر ایس سی سرکار اسی پھلواری سے پھول چن چن کر لے گئے ہیں اور اپنا گھر سجایا ہے۔ وینسنٹ اسمتھ (VENCENT SMITH) لین پول (LANE POLE) اور دوسرے انگریز

مورخوں نے دنیا میں جونام پیدا کیا ہے اور ہندوستان کے مسلم دورِحکومت پر ان کی باتیں جو آخری مانی جاتی ہیں، وہ اسی لائبریری کی دی ہوئی بھیک ہے۔

خدابخش خاں نے نہ کسی ملک کو فتح کیا، نہ کسی دیس میں انقلاب پیدا کیا، نہ کسی سائنٹفک ایجاد سے دنیا کو دنگ کیا، نہ آلپس نہ ہمالہ کو پار کیا، نہ کسی بڑی قومی سبھا کے صدر ہوئے، نہ کبھی پچیس ہزار آدمیوں نے ان کا جلوس نکالا، نہ کبھی ان کی تقریر نے ملک میں کوئی سنسنی دوڑائی۔ پھر بھی ان کا نام دنیا میں مشہور ہے اور اگر ہم اُسے بھلا دینا بھی چاہیں تو نہیں بھلا سکتے۔ وہ کبھی بھی بہت زیادہ مشہور نہ ہوئے۔ ایسا کوئی زمانہ نہیں رہا کہ خدابخش خاں کا نام گلی گلی کے بچوں کی زبان پر نہ ہو۔ انہوں نے ملک کے لیڈروں اور ڈکٹیٹروں کی طرح کبھی شہرت حاصل نہیں کی۔ شہرت کی اونچی سطح پر ممکن ہے ان کا نام نہ ہو، مگر نچلی سطح میں، جو بہت زیادہ ٹھوس ہے، ان کا نام ان کے کارنامے کے بعد ہمیشہ گونجتا رہا۔ ہزاروں قابل ہستیاں ہمیشہ ان کا نام جپتی رہیں۔ جن لوگوں کی شہرت کی آندھی بہت اونچی سطح تک اُٹھی وہ ہوا کے گرنے کے بعد نیچے بھی آتی رہی۔ لیکن خدابخش خاں کی شہرت کی نسیم کبھی آندھی بن کر آسمان پر نہ اُٹھی۔ وہ نیچی ہی رہی، لیکن ہمیشہ رہی اور اب بھی ہر روز یہ نسیم دماغوں کو تر و تازہ کرنے میں مصروف ہے۔ دنیا کے ہزاروں لیڈر غدار کہلائے، آج ہزاروں بادشاہوں کی ہڈیاں اکھاڑی جا رہی ہیں، کتنے ہی فاتحوں اور سورماؤں کے نام پر لوگ آج لعنت ملامت کر رہے ہیں۔ لیکن کیا دنیا میں ایسا کوئی آدمی ہے جو آج خدابخش خاں کے نام پر ایک حرف بھی لا سکے۔

اس کی وجہ کیا ہے؟۔ وجہ یہ ہے کہ خدابخش خاں نے جو کچھ کیا وہ کسی ایک زمانہ، ایک ملک یا ایک قوم کے لیے نہیں کیا۔ ان کا کام ہر قوم، ہر دیس اور ہر زمانے کے لیے یکساں فائدہ پہنچانے والا ہے۔ یہ وہ چشمہ ہے جس کا سوتا کبھی بند ہونے والا نہیں، یہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ اور علم کے پیاسے ہمیشہ اس سے اپنی پیاس بجھاتے رہیں گے۔ ہمارے ملک میں آج ایسے آدمیوں کے پیدا ہونے کی بہت ضرورت ہے۔ خدابخش خاں نے نہ صرف بہار بلکہ ہندوستان کا نام اونچا

کیا۔آج ہندوستان میں جو دیس بدیس کے لوگ آتے ہیں وہ اس لائبریری کو دیکھنے کے لیے ضرور آتے ہیں۔اور اس طرح وہ ہماری تہذیب کی داد دیتے ہیں اور ہماری علمی بڑائی کا اقرار کرتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ ایسے ہی بڑے لوگوں کی زندگی کے نمونے بچوں کے سامنے پیش کیے جائیں، تاکہ وہ بھی اپنے وقت کی قیمت کو سمجھیں، اور ان کے قدم کے نقش پر چلنے کی کوشش کریں۔آج ہمارے ملک میں ٹھوس کام کرنے والوں کی بڑی کمی ہے۔قوم کی سچی خدمت کس کو کہتے ہیں، بہت کم لوگ جانتے ہیں۔وقتی شہرت اور نام ونمود کے پیچھے دوڑنے والے بہت ہیں۔شہرت کوئی سستی جنس نہیں۔اس کے لیے بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔کاش ہمارے بچے بھی خدابخش خاں کی طرح۔وقتی شہرت کے لیے نہیں، چند دنوں کے نام ونمود کے لیے نہیں، چاردن کی چاندنی کے لیے نہیں، بلکہ ٹھوس خدمت کا خیال دل میں پیدا کریں اور ایسے کاموں کی یادگار اپنے پیچھے چھوڑ جانے کی کوشش کریں، جن کی بنیاد ریت پر نہیں ٹھوس چٹان پر ہو، جسے زمانے کی آندھی اور جھکڑ نہ ہلا سکے۔

خدابخش خاں نے یہ کام ایک دو دن میں نہیں کیا اور اُنہوں نے اس کے پیچھے کوئی معمولی قربانی نہیں کی۔اس کتب خانہ کے ساتھ خدابخش خاں کی پوری زندگی لگی ہوئی ہے۔اس میں ان کی کمائی ہوئی ساری پونجی دفن ہے اور ان کتابوں کے ساتھ علم کا وہ پریم اور عشق لپٹا ہوا ہے جو خدابخش خاں کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔اُنہوں نے زندگی میں ایک ہی چیز سے عشق کیا، ایک ہی چیز کی پوجا کی، ایک ہی چیز کو پیار کیا۔اور وہ کتاب ہے۔بال بچے دنیا کی سب سے پیاری چیزیں ہیں وہ بھی خدابخش کو اپنی طرف نہ کھینچ سکے۔ان کی کمائی میں بال بچوں کا بھی حصہ نہ تھا۔انھوں نے اپنے خاندان کے لیے کچھ نہ چھوڑا۔تن من، دھن اور خاندان سب کو مٹا کر بس یہی ایک مندر بنایا۔فرانس کے ایک فلسفی نے کہا ہے۔"میں اپنے سے زیادہ خاندان کو، خاندان سے زیادہ اپنی قوم کو اور قوم سے زیادہ انسانیت کو عزیز رکھتا ہوں۔" خدابخش خاں کی زندگی اس قول

کے حرف حرف کو صحیح ثابت کر رہی ہے۔

خاندان:

خدا بخش خاں صوبہ بہار کے ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ خدا بخش خاں کے والد (محمد بخش خاں) نے اپنے خاندان کے متعلق ایک چھوٹا سا رسالہ لکھا ہے۔ اُس میں وہ اپنا نسب نامہ اس طرح لکھتے ہیں:

> ''محمد بخش خاں ولد علی بخش خاں، ابن شیخ رمضان علی، ابن شیخ محمد باقر، ابن قاضی شیخ ہبۃ اللہ جو نسباً صدیقی تھے اور ان کا وطن دہلی تھا۔ قاضی شیخ ہبۃ اللہ دہلی سے وطن چھوڑ کر موضع اوکھی ضلع سارن میں آئے اور یہیں بس گئے۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا بخش خاں کے چکڑ دادا اصل میں دہلی کے رہنے والے تھے، لیکن چھپرہ میں آ کر رہ گئے۔ سر جدو ناتھ سرکار نے اپنی انگریزی تاریخ (STUDIES IN MUGHAL INDIA) میں لکھا ہے کہ یہ قاضی شیخ ہبۃ اللہ وہی ہیں جنہیں اورنگ زیب نے اپنے عہد کے فتووں کو اکٹھا کرنے کے لیے ملا نظام کے ساتھ مقرر کیا تھا۔ خدا بخش خاں کے والد محمد بخش خاں اپنے زمانہ کے نامی وکیلوں میں تھے۔ وہ فارسی زبان کے مشہور اُستاد تھے اور عربی زبان بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ انہیں قلمی کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔

پیدائش اور ابتدائی تعلیم:

خدا بخش خاں ۲ راگست ۱۸۴۲ء میں چھپرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش کے بعد محمد بخش خاں اپنے خاندان کے ساتھ پٹنہ (بانکی پور) چلے آئے اور یہیں وکالت کرنے لگے۔ خدا بخش خاں کی تعلیم بانکی پور ہی میں شروع ہوئی۔ اس زمانے میں مسلمان خاندانوں میں یہ دستور تھا، جیسا کہ اب بھی بعض جگہ ہے کہ بچوں کی شروع کی تعلیم گھر ہی پر ہوتی تھی اور جب لڑکا قرآن شریف وغیرہ ختم کرنے کے بعد عربی فارسی اچھی طرح پڑھ لیتا تھا تو پھر اسے اسکول میں داخل کیا جاتا تھا۔ اس لیے خدا بخش خاں نے گھر ہی پر اپنے والد کی نگرانی میں لکھنا پڑھنا شروع کیا۔ ان کے والد

نے انہیں نہ صرف فارسی عربی میں مضبوط کر دیا بلکہ ان کے دل میں علم کا وہ شوق بھی ڈال دیا جو خود باپ کے دل میں تڑپ رہا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس ذہین اور ہونہار بچے نے کتابیں جمع کرنے کا شوق اپنے لائق باپ سے ترکہ میں لیا۔ خدا بخش خاں یقینی اپنے والد کی جمع کی ہوئی عمدہ عمدہ قلمی کتابوں کو بچپن ہی سے الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے ہوں گے اور قلمی کتابوں کی قدر اور قیمت ان کو اپنے والد ہی سے معلوم ہوئی ہوگی۔

مسٹر ٹراورس، جو اس وقت پٹنہ کے ڈسٹرکٹ جج تھے اور محمد بخش خاں صاحب سے وکالت کے سلسلے میں بڑی راہ ورسم تھی۔ ایک دن خاں صاحب اپنے ہونہار صاحبزادے کو ساتھ لیکر ان کے پاس گئے۔ صاحب بہادر کی نظروں نے دیکھ لیا کہ اس بچے میں کیسے کیسے جوہر چھپے ہوئے ہیں۔ وہ ان کی ذہانت سے بہت خوش ہوئے اور پٹنہ ہائی اسکول میں (جسے آجکل پٹنہ کالجیئیٹ اسکول کہا جاتا ہے) داخل کر دینے کی رائے دی۔ چنانچہ ۱۸۵۴ء میں انہیں اسکول میں بھرتی کر دیا گیا۔ لیکن ابھی انہوں نے تین چار ہی سال اس اسکول میں پڑھا ہوگا کہ ہندوستان میں وہ ہنگامہ برپا ہوا جو تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا۔ ۵۷ء کے غدر کا طوفان پٹنہ میں بھی آیا اور اس لیے جس طرح دنیا کا سارا کاروبار تہس نہس کر دیا، اسی طرح پٹنہ ہائی اسکول کو بھی کچھ دنوں کے لیے دنیا سے نیست و نابود کر دیا۔

یہ نوعمر طالب العلم بڑی مشکل میں پڑ گیا۔ تعلیم حاصل کرنے کے لیے کوئی جگہ نہ رہی۔ اور خدا بخش خاں کسی طرح تعلیم ترک نہ کرنا چاہتے تھے۔ آخر کار انہیں تعلیم پوری کرنے کے لیے کلکتہ بھیج دینے کی رائے ٹھہری۔ اُس زمانے میں کلکتہ جانا اتنا آسان نہ تھا جتنا آج کل ہے۔ ریلوے اس وقت بنی ہی نہ تھی۔ مہینوں میں کہیں یہ راستہ خشکی راستے کے ذریعہ طے ہوتا تھا۔ اور اس سفر میں جو کثیر خرچ اور خطرات تھے وہ اس کے علاوہ ہیں۔ کعبۂ علم کا یہ حاجی کلکتہ پہنچا۔ نواب امیر علی خاں نے، جو ان کے رشتہ مند تھے، اپنے گھر میں جگہ دی اور اسکول میں نام لکھوا دیا۔ تین سال کی مسلسل اور انتھک کوششوں کے بعد ۱۸۶۱ء میں اُنہوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔

کالج کی تعلیم:

خدابخش خاں بغیر بی اے پاس کئے کلکتہ کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔لیکن کلکتہ کی مرطوب آب وہوا نے ان کی صحت کو چوپٹ کر دیا۔اس لیے چارو ناچار اسی (۱۸٦۱ء) سال بانکی پور واپس آئے۔یہاں آکر اُنہوں نے لا کالج میں نام لکھوالیا۔اس زمانے میں قانون پڑھنے کے لیے بی اے پاس کرنے کی شرط نہ تھی۔خدابخش خاں نے پورے دھیان اور دلچسپی کے ساتھ قانون پڑھنا شروع کر دیا۔

اسی زمانے میں خدابخش خاں کی زندگی میں ایک کٹھن دور آیا۔محمد بخش خاں کا دل و دماغ بڑھاپے کی وجہ سے بیکار ہونے لگا تھا۔ان کو طرح طرح کی بیماریوں نے آگھیرا اور رفتہ رفتہ تندرستی ایسی خراب ہوگئی کہ کچہری کی حاضری سے بھی مجبور ہو گئے۔سوائے وکالت کے آمدنی کا دوسرا کوئی ذریعہ نہ تھا۔اس لیے سارا خاندان ایک عجیب مصیبت میں گرفتار ہوگیا۔اس خاندان کا سہارا صرف خدابخش خاں کی ذات تھی۔ان سے بوڑھے باپ اور گھر کی مصیبت دیکھی نہ جاتی تھی۔لیکن کرتے تو کیا کرتے۔ابھی تعلیم بھی ختم نہ ہوئی تھی۔تعلیم کو ادھورا چھوڑ دینا بھی بہت تباہ کن تھا۔غرضکہ اس نوجوان کی جان عجیب کشمکش میں پھنسی ہوئی تھی۔یہی وقت ان کی جانچ کا تھا۔وہ اس مصیبت سے بالکل نہ گھبرائے۔منہ پر ذرا بھی میل نہ آنے دیا۔جیسے کالج میں پڑھنے جایا کرتے تھے، جاتے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ خاندان کی پرورش کے لیے روپے بھی کماتے رہے۔اسی درمیان میں نائب منصفی کی جگہ خالی ہوئی۔خدابخش خاں نے موقع کو غنیمت سمجھ کر درخواست دی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔اس کے بعد ڈسٹرکٹ جج کے اجلاس کی پیشکاری کے لیے کوشش کی۔بارے ان کی یہ کوشش کامیاب ہوئی اور انہیں پیشکاری کی جگہ مل گئی۔لیکن قدرت کو تو ان سے دوسرا کام لینا تھا۔پھر یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ خدابخش خاں نرے پیشکار ہی رہ جاتے۔مسٹر لٹور، نامی ایک انگریز ڈسٹرکٹ جج ہو کر پٹنہ آیا۔اس سے ان کی کچھ نا چاقی ہوگئی اور پیشکاری سے الگ ہونا پڑا۔کچھ دنوں کے بعد ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز کا عہدہ ملا لیکن قدرت کی جانچ ابھی ختم نہ ہوئی تھی۔تھوڑے ہی دنوں بعد اس نوکری کو بھی سلام کرنا پڑا۔

یہ چند سال خدابخش خاں پر اس مصیبت اور بے پناہی کے گزرے کہ اگر کسی دوسری فطرت کا انسان ہوتا تو گھبرا کر نہ جانے کیا کر بیٹھتا۔ تکلیف و مصیبت کا یہ زمانہ خدابخش خاں زندگی بھر نہ بھول سکے۔ جب کبھی وہ اپنے اس دور کو یاد کرتے تو اُن کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے۔ لیکن وہ جو مثل مشہور ہے کہ '' آدم کے بچے پر جو پڑتی ہے وہ گذر ہی جاتی ہے۔'' یہ دُکھ کی گھڑیاں بھی گزر ہی گئیں۔ قدرت کی طرف سے خدابخش خاں کا امتحان لیا گیا، اس میں وہ سو فیصدی کامیاب ہوئے۔ دُنیا کے ہر بڑے آدمی کو اسی طرح کی، بلکہ اس سے بھی زیادہ تکلیفیں اُٹھانی پڑی ہیں۔ اس سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی تکلیف اور مصیبت بڑاپے کی کسوٹی ہے۔ دنیا میں ہر چیز کی کچھ نہ کچھ قیمت مقرر ہے۔ عظمت کی دیوی نے بھی اپنے پجاریوں پر بھینٹ فرض کی ہے۔ وہ بھینٹ یہی دُکھ اور مصیبت ہے جو شخص دنیا کی ہر قسم کی ناکامیوں اور خطرات کے نرغے میں بھی کھڑا مسکراتا ہے اور منہ پر میل نہیں آنے دیتا اسے عظمت کی دیوی فوراً گلے لگالیتی ہے، لیکن وہ کمزور دل اور ارادے کا کچا انسان جو مصیبتوں میں گھر کر بے پناہی میں بلبلا اُٹھتا ہے، عظمت کی دیوی اُس سے ہمیشہ کے لیے منہ موڑ لیتی ہے۔

وکالت:

اندھیرے کے بعد چاندنی، خزاں کے بعد بہار اور خشک سالی کے بعد سیرابی یہ قانون قدرت ہے۔ انسان کی زندگی میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ اگر آدمی کے دل میں تکلیف کے بعد آرام کی اُمید روشن نہ رہے تو آدمی گھبرا کر مر جائے۔ خدابخش خاں کا بھی اب ستارہ گردش سے نکل چکا تھا۔ وہ مصیبت کی بھٹی سے تپ تپا کر اور پختہ ہو کے نکلے تھے۔ جب خزانے کے سانپ کو مار لیا تو خزانہ خود بخود قدموں پر آ گرا۔

۱۸۶۸ء میں خدابخش خاں نے وکالت شروع کی۔ دو چار ہی مقدموں میں اُنھوں نے کام کیا ہوگا کہ ان کی قابلیت نکھر آئی۔ رفتہ رفتہ ان کی قابلیت اور ذہانت کے چرچے ہونے لگے۔ صرف دو سال کی معمولی مدت میں وہ پٹنہ کے اچھے وکیلوں میں گنے جانے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ غضب کے محنتی تھے۔ جس مقدمے کو وہ ہاتھ میں لیتے تھے، اُس میں جان لڑا دیتے تھے۔ اُن

کے جوہر پر جو میل جما ہوا تھا وہ محنت کے گھسوں سے فوراً دمک اُٹھا۔ نام نکل چلا۔ دولت کی دیوی مسکرائی اور زر و جواہر کا بادل اُمنڈ پڑا۔

وکالت کے پیشے کے لیے ان کی طبیعت بہت مناسب تھی، کیونکہ بچپن ہی سے ان کانوں نے سوائے کچہری اور مقدمات کے اور کوئی بات سنی ہی نہیں۔ باپ نامی گرامی وکیلوں میں تھے۔ لہٰذا اُن کے دل میں بھی یہ تمنا پیدا ہوئی کہ میں بھی ایک دن نامی گرامی وکیل کہلاؤں۔ غرضکہ شروع ہی سے ان کی طبیعت کا جھکاؤ اسی طرف تھا۔ حقیقت میں پیشہ تو وہی ہے جس کی طرف انسان کی طبیعت کا میلان ہو۔ موجودہ زمانہ میں ہمارے نوجوانوں کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ بے جوڑ رشتہ ہے۔ ہندوستانی والدین نے آج تک اس بات پر سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا کہ ان کے کس بچے کی طبیعت کس کی طرف راغب ہے۔ اس کا نتیجہ یہی ہو رہا ہے کہ آج بے میل پیشہ اختیار کرنے کے سبب سے ۷۵ رفیصدی نوجوانوں کی زندگی ناکام ہے اور انہیں اپنی زندگی میں کوئی خوشی حاصل نہیں۔ ایک ناکامیاب بیرسٹر سے ایک کامیاب ٹائپسٹ کہیں بہتر ہے۔

خدا بخش خاں نے اپنی خوشی سے اپنے والد کا پیشہ اختیار کیا۔ ان پر کسی طرح کا جبر و دباؤ نہیں ڈالا گیا۔ بلکہ انہوں نے خود سے اپنی پسندیدہ راہ نکالی اور آگے چل کر اپنی زندگی سے یہ ثابت کر دیا کہ قدرت نے انہیں اسی کام کے لیے بنایا تھا۔ اور اگر وہ کسی دوسری لائن کی طرف جاتے تو یقینی ناکام رہتے۔ پیشۂ وکالت کے لیے جن جن خوبیوں کی ضرورت ہے وہ سب ان میں موجود تھیں محنتی تو وہ بچپن ہی سے تھے۔ مقدمے کی مسل کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھتے۔ اس سلسلے میں جتنی اور قانونی کتابوں کے دیکھنے کی ضرورت ہوتی، ان سب کو پڑھتے اور پھر اُن سبھوں کو اپنی غیر معمولی تقریر کی قوت سے اس طرح حاکم کے سامنے پیش کرتے کہ مقدمہ کا رنگ ہی بدل جاتا۔ کمزور سے کمزور مقدمے کے خلاف بھی حاکم کو قلم اُٹھانا دشوار ہو جاتا۔ خدا بخش خاں ایک بے پناہ ذہانت اور حاضر جوابی کے بھی مالک تھے، بات منھ سے نکلی نہیں کہ جواب موجود۔ اور ایسا جواب کہ اُسے روکرنا مشکل! جو لوگ پیشۂ وکالت سے کچھ بھی واسطہ رکھتے ہیں اُنہیں خوب معلوم ہے کہ حاضر جوابی مقدمے کے لیے کس طرح امرت کا کام کرتی ہے۔ حافظہ بھی اُنہوں نے

غضب کا پایا تھا۔ جس قانونی دفعہ یا نظیر کو ایک مرتبہ دیکھ لیا۔ کیا مجال کہ وہ دماغ سے نکل سکے۔ صرف قانون ہی نہیں بلکہ انہیں تو یہاں تک یاد رہتا تھا کہ کون سا مضمون کتاب کے کس ورق اور کس پیراگراف میں ہے۔

وکیلوں کے لیے واقعات کو پوری طرح سمجھنا اور اس کی گہرائی تک پہنچنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ موجودہ زمانہ میں مقدمات میں واقعات کے ساتھ اس قدر جھوٹی باتیں ملادی جاتی ہیں کہ حقیقت کا پتہ لگانا دشوار ہو جاتا ہے۔ لیکن خدابخش خاں قدرت کی طرف سے ایسا ذہن لے کر آئے تھے کہ وہ مؤکل کا بیان سنتے ہی فوراً اس کی تہ کو پہنچ جاتے تھے۔ اجلاس پر بھی اُن کی قانونی پکڑ ایسی ہوتی تھی کہ ناممکن تھا کہ دوسرے فریق کا وکیل اُنہیں کوئی جھانسا دے کر نکل جائے۔ پھر ان سب پر بالا ان کی بحث کی قوت اور بولنے کی طاقت تھی، جو ہر جگہ بازی لیجاتی تھی۔ الغرض خدابخش خاں میں وکیل کی حیثیت سے وہ تمام خوبیاں موجود تھیں، جو ایک کامیاب وکیل کے لیے ضروری ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ خدابخش خاں اس پیشے میں خوب پھولے پھلے۔ میدان بھی خالی ملا۔ بس آتے ہی پالا مار لیا۔ روپیوں کی تھیلیاں برسنے لگیں۔ ایک ایک دن میں پانچ پانچ سو روپیہ کما لیتے۔ اس دولت کا انہوں نے جو مصرف لیا وہ تو کتب خانہ کی شکل میں اب بھی جیتا جاگتا ہے۔ لیکن دنیا کے عیش و آرام بھی اُنہوں نے خوب اُٹھائے۔ جتنی مصیبتیں اٹھائی تھیں، ان کی دوگونہ اور تین گونہ کسر نکال لی۔ وہ اس ٹھاٹھ باٹ سے رہتے کہ پٹنہ میں خدابخش خاں کا شمار رئیسوں میں ہونے لگا۔ سرکاری حلقے میں بھی کافی آؤ بھگت بڑھی اور حکام ان پر بھروسہ کرنے لگے۔ ۱۸۸۰ء میں انہیں پٹنہ کا سرکاری وکیل مقرر کیا گیا اور پھر اسی سال خان بہادر کے خطاب سے سرفراز کیا گیا، جو اس زمانے میں ہندوستانیوں کے لیے بہت عزت اور فخر کی چیز سمجھی جاتی تھی۔

ریاست حیدرآباد میں عہدہ:

خدابخش خاں نے ۲۷ سال دھواں دھار وکالت کی۔ بے شمار دولت حاصل کی، لیکن ایک ہاتھ سے کمایا اور دوسرے ہاتھ سے لٹایا۔ سارا دھن کتابوں کی خریداری میں لگا دیا۔ خان

صاحب کی وکالت اور قانون دانی کا چرچا دور دور پھیل گیا تھا۔اُن کی قابلیت کا شہرہ سن کر نظام حیدرآباد نے اُنہیں اپنی ریاست کے چیف جسٹس کا عہدہ دیا۔ خدابخش خاں کو ناچار وکالت کا پیشہ چھوڑ کر ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد جانا پڑا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۲۷ رسال کی مسلسل محنت نے اُن کے دل و دماغ کو تھکا بھی دیا تھا، اس لیے وہ بھی کچھ آرام لینا چاہتے تھے۔ تین سال اُنہوں نے حیدرآباد میں نہایت کامیاب طریقے سے ججی کی اور پھر ۱۸۹۸ء میں پٹنہ واپس آ گئے۔ حیدرآباد میں تین سال کے قیام میں انہوں نے قلمی کتابوں اور تصویروں کا ایک بیش قیمت ذخیرہ جمع کر لیا ۔ وہاں ان کو ایسی انمول چیزیں ملیں، جن پر وہ زندگی بھر خوش ہوتے رہے۔

۱۸۹۸ء میں پٹنہ آ کر اُنہوں نے دوبارہ وکالت شروع کی۔ لیکن سن کے تقاضے سے مجبور ہو گئے۔ جوانی کے وہ کس بل جاتے رہے تھے۔ محنت کرتے کرتے دل و دماغ کھوکھلا ہو چکا تھا۔ اب وہ ہمت اور امنگ بھی رخصت ہو چکی تھی۔ آخر کار تھکے ہارے بستر پر گر پڑے اچانک فالج کا حملہ ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں بے کار ہو گئے۔ آمدنی بند ہو گئی۔ کتابوں کا وہ عشق تھا کہ آخر عمر کے لیے کچھ بچا بھی نہ رکھا تھا۔ آخر کار مصیبت نے پھر ایک بار اپنی بھیانک شکل دکھائی۔ وہ جوانی کا جوش اور ارادے کی مضبوطی اب اس بڑھاپے میں تو رہی نہ تھی کہ ان کا مقابلہ کر کے اپنا راستہ ڈھونڈ ھ نکالتے۔ سخت ناچار و مجبور ہوئے۔ دوستوں نے حکومت کے حاکموں کو یہ خبر پہنچائی ۔ خدابخش خاں نے ملک کی جو خدمت کی تھی اس کی قدردانی ہر شخص کے دل پر نقش تھی۔ لہٰذا حکومت نے فوراً مدد کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ دو سو روپیہ ماہوار اور ''اورینٹل پبلک لائبریری'' کی سکریٹری شپ دی گئی۔ ساتھ ہی ساتھ قرض اور دین کی ادائیگی کے لیے ۸ ر ہزار روپیہ یک مشت دیا گیا۔ یہیں تک نہیں، خدابخش خاں کو سرکار نے ۱۹۰۳ء میں سی۔ آئی۔ ای کا بھی خطاب دیا، جو اُس زمانہ میں بہت کم ہندوستانیوں کو دیا جاتا تھا۔

انتقال:

اس طرح خدابخش خاں کے آخیر دن دُکھ کے پنجے سے نکل کر، عزت و قدردانی اور انعام و اکرام کے بیچ میں گزرنے لگے۔ پھرنا چلنا قریب قریب ناممکن ہو گیا تھا۔ زیادہ وقت بستر

ہی پر پڑے پڑے گزرتا۔ لیٹے لیٹے کتابیں دیکھا کرتے یا ملنے والے دوستوں سے علمی بحث مباحثہ کرتے رہتے۔ اس طرح پانچ سال اُنہوں نے اور گزارے اور بالآخر ۱۹۰۸ء کی تیسری اگست کو ایک بجے رات کے وقت یہ علم وفن کا عاشق اپنی اصلیت کی طرف لوٹ گیا۔ خدا اُس کی روح کو امن دے۔ اور جنت فردوس میں جگہ دے۔ آمین!

کتب خانہ سے خدابخش خاں مرحوم کو اس قدر پریم تھا کہ مرنے کے بعد بھی اس کی جدائی پسند نہ ہوئی۔ زندگی ہی میں اُنہوں نے قبر کے لیے ریڈنگ روم اور کتب خانہ کی دومنزلہ عمارت کے درمیان کی جگہ پسند کرلی تھی اور اپنے بیٹوں کو وصیت کردی تھی کہ مجھے اسی جگہ دفن کرنا۔ لہذا ان کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ خانصاحب مرحوم اسی مقام پر آج بھی قیامت کی گہری نیند میں سوئے ہوئے ہیں اور اپنے خزانہ کی رکھوالی کررہے ہیں۔

بال بچے:

خاں بہادر خدابخش خاں نے تین شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اُن کے مرنے کے بعد جو شادی کی، اُن سے ایک لڑکی اور چار لڑکے ہوئے۔ لڑکی کمسنی ہی میں چل بسی۔ لڑکوں میں مسٹر صلاح الدین خدابخش، ایم۔اے۔، بی۔سی۔ایل (آکسفورڈ) بارایٹ لا، سب سے بڑے تھے۔ کلکتہ میں بیرسٹری کرتے تھے۔ لا کالج میں پروفیسری کی اور کلکتہ یونیورسٹی میں لکچرر رہے، لیکن جس چیز نے ان کی شہرت کا ڈنکا دنیا میں بجادیا وہ ان کی تاریخ دانی تھی۔ وہ بلند پایہ مورخ (HISTORIAN) تھے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اُن کے لکھنے کا طرز کارلائل (CARLYLE) سے ملتا ہے۔ اسی لیے لوگ انہیں ہندوستان کا کارلائل کہتے ہیں۔ وہ فارسی اور عربی زبان پر بھی پوری قدرت رکھتے تھے۔ تاریخ کی بیس سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ دوسرے لڑکے مسٹر شہاب الدین خدابخش نے بھی انگلستان میں تعلیم پائی۔ صوبۂ بہار کی پولس میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر کام کرتے رہے۔ اب ریٹائر ہو کر سکون واطمینان کے دن گزار رہے ہیں۔ دوسری بیوی کے انتقال پر پھر شادی کی، جن سے مسٹر ولی الدین خدابخش بی۔اے۔، بی۔ایل ہیں۔ آپ پٹنہ میں وکالت

کرتے ہیں اور لائبریری کے سکریٹری بھی ہیں۔ بہت نیک طبیعت انسان ہیں۔ زندہ دلی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ غرضکہ اپنے لائق باپ کے لائق بیٹے ہیں۔

عادت واخلاق:

خدابخش خاں نے گرچہ انگریزی علم کا کافی مطالعہ کیا تھا اور پٹنہ کے مشہور وکیل ہونے کی حیثیت سے انگریزوں سے کافی میل جول تھا، پھر بھی انگریزی تہذیب اور چال ڈھال ان کے دامن کو بھی نہ چھو سکی۔ وہ اپنے کیرکٹر، رہن سہن، وضع قطع، چال ڈھال، میل جول اور اپنے خیالات کے لحاظ سے ایک خالص ہندوستانی تھے۔ وہ صوبۂ بہار کے پُرانے شریف خاندان کی تہذیب کے ایک نمونہ تھے۔ مذہب کے وہ بہت زیادہ پابند تھے اور ان کے مذہبی ہونے کی جھلک اُن کی زندگی کے ہر فعل سے ظاہر ہوتی تھی۔ وضع اور لباس کے بھی بہت پابند تھے زندگی بھر انہوں نے اپنی یکساں وضع رکھی۔ جو لوگ ملنے آتے۔ خواہ وہ امیر ہوں یا غریب، سب سے بہت اخلاق سے پیش آتے۔ اپنے دوستوں کے ساتھ انہوں نے ہمیشہ یکساں برتاؤ رکھا۔ جس سے جس طرح ملے اور جو ربط بڑھایا اُسے اپنی زندگی تک نبھادیا۔ پٹنہ کے اُس وقت کے سماج میں ان کا مرتبہ بہت اونچا تھا۔ شہر کے رئیس اور بڑے لوگ انہیں بڑی قدر کی نظر سے دیکھتے تھے۔

گرچہ خدابخش بڑے ٹھاٹ باٹ کے آدمی تھے اور کبھی کسی رئیس یا افسر سے گر کر نہ ملے، لیکن اپنے سے نیچے درجے کے لوگوں کے ساتھ ان کا دوسرا ہی سلوک تھا۔ غریب لوگوں کے لیے ان کے دل میں خاص جگہ تھی۔ کسی شخص کو مصیبت میں دیکھ کر اُن سے رہا نہ جاتا تھا اور جہاں تک اُن سے ممکن ہوتا، اس کی مدد ضرور کردیتے۔ مسٹر صلاح الدین بیرسٹر (خدابخش خاں کے بڑے بیٹے) لکھتے ہیں کہ "ایک مرتبہ کا واقعہ یہ ہے کہ خدابخش خاں کے ایک بچپن کے دوست بہت مصیبت میں پڑ گئے۔ یہاں تک کہ بھوک مرنے کی نوبت آپہنچی۔ شرافت کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے روکتی تھی۔ کوئی معمولی قلمی کتاب لے کر خدابخش خاں کے پاس آئے اور اپنا دُکھ سکھ بیان کرنے کے بعد اس کو خرید لینے کے لیے کہا۔ خدابخش خاں نے کہا کہ اس کتاب کی کئی قلمی جلدیں میرے پاس موجود ہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے اپنے دوست کو کتاب واپس کردی اور

اس کے ساتھ ہی چپکے سے ایک سو روپیہ کا نوٹ بھی دیدیا۔"

وہ کسی کے دل دکھانے کو دنیا کا سب سے بڑا پاپ سمجھتے تھے۔ اُن کا دل اتنا کومل تھا کہ ذرا سی بات میں اُسے ٹھیس لگ جاتی تھی۔ وہ دوسروں کی تکلیف کو دیکھ کر بلبلا اُٹھتے تھے۔ انہوں نے آج تک کسی کو سخت بات نہ کہی۔ یہاں تک کہ نوکر چاکر سے بھی بہت نرمی اور محبت سے پیش آتے تھے۔ وہ اپنے بچوں کو سب سے زیادہ اس بات کی نصیحت کرتے تھے کہ وہ کسی کی دل آزاری نہ کریں۔ خان صاحب اکثر یہ شعر پڑھا کرتے:

کعبہ گیا جو ٹوٹ، تو کیا جائے غم ہے شیخ
یہ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

لکھنے پڑھنے کا شغل:

خدا بخش خاں ایک بڑے وکیل ہونے پر بھی پڑھنے لکھنے کے لیے روزانہ وقت نکالتے تھے۔ دُنیا کی ہزاروں بہترین کتابیں اُن کی نظر سے گزر چکی تھیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جس طرح دوسرے کاموں کو ضروری سمجھتے ویسے ہی روزانہ کچھ نہ کچھ پڑھنے لکھنے کو بھی ضروری سمجھتے۔ کچہری سے آ کر رات کا کھانا شام ہی کو کھا لیتے اور پھر تھوڑا آرام کرنے کے بعد اپنے کتابوں کے کمرے میں چلے جاتے اور رات گئے دیر تک وہیں یا تو پڑھتے لکھتے رہتے یا علمی قابلیت رکھنے والے دوستوں سے گہرے اور پیچیدہ علمی اور مذہبی سوالات پر بحث مباحثہ کرتے رہتے۔ انہوں نے انگریزی، فارسی اور عربی کے قریب قریب تمام نامور لکھنے والوں کی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ فارسی زبان میں خدا بخش خاں کو اچھی خاصی قابلیت پیدا ہو گئی تھی۔ ان کی سب سے مشہور کتاب "محبوب الالباب" ایسی اچھی فارسی میں لکھی ہوئی ہے کہ دنیا کے بہترین فارسی لکھنے والوں کی ٹکر میں اسے پیش کیا جا سکتا ہے۔ خدا بخش خاں سے اور انگلینڈ کے پروفیسر براؤن سے برابر خط و کتابت رہتی تھی، جو فارسی زبان میں ہوا کرتی تھی۔ آپ نے انگلینڈ کے مشہور فلسفی لارڈ بیکن کی کتاب کا انگریزی سے فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔

وہ یورپ کی ان تمام کتابوں کو پڑھتے تھے، جو انگریزی زبان میں ان کو ملتی تھیں۔ وہ یورپ کے اکثر ادیبوں اور شاعروں کو پسند کرتے تھے۔ لیکن ان لوگوں کی کتابوں سے، جو اسلام پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے اور اسلام پر حملہ کرتے تھے، ان کو بڑی تکلیف پہنچتی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ یورپ والے ایشیا کی قوموں کے مذہبی خیالات کو نہیں سمجھ سکتے۔ یورپ میں مذہب، اُن کے رہن سہن میں، فیشن کی طرح شامل ہے۔ لیکن ایشیا میں مذہب تو زندگی کی اصل جڑ ہے۔ جس قوم کی وہ زبان نہیں سمجھ سکتے اور جس سماج میں وہ اپنے کو اجنبی دکھائی پڑتے ہیں، اس کے متعلق ان کا فیصلہ کس طرح مانا جاسکتا ہے۔ اس لیے خدا بخش خاں یورپین لکھنے والوں کی اُن کی کتابوں کو ناپسند ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کا جواب دینا چاہتے تھے۔ اسی لیے جب انہوں نے اپنے بڑے بیٹے صلاح الدین کو انگلینڈ بھیجا تو یہ فرمائش بھی کی کہ وہ جرمن اور فرنچ زبان پڑھ کر لوٹیں اور اسلام کی ایک عمدہ تاریخ لکھیں، تاکہ ان لوگوں کو اس سے پورا پورا جواب مل جائے۔

انگریزی مصنفین میں وہ گبن (GIBBON) کو بہت زیادہ پسند کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ دنیا میں گبن سے بڑھ کر تاریخ لکھنے والا کوئی دوسرا پیدا نہیں ہوا۔ سیاست پر لکھنے والوں میں مل (JOHN STUART MILL) کے اور فلسفہ میں گیٹے (GOETHE) کے بہت زیادہ قائل تھے۔ شاعری خواہ کسی زبان کی ہو اس سے بہت دلچسپی لیتے تھے۔ عربی اور فارسی کے تو ہزاروں شعر زبانی یاد تھے۔ جب ایک بار سنانا شروع کر دیتے تو گھنٹوں سلسلہ رہتا۔ انگریزی شاعری کی بعض خوبیوں کی بہت تعریف کرتے تھے۔ لارڈ بائرن (LORD BYRON) کے شعروں کو سب زیادہ پسند کرتے تھے۔ اس کے بعد شیلے (SHELLEY) اور کیٹس (KEATS) کی جادوبھری زبان اور اونچے خیال کی بہت زیادہ داد دیتے تھے۔ ورڈس ورتھ (WORDS WORTH) کی میٹھی اور کومل بھاشا اور ٹینی سن (TENNYSON) کے شاندار طرز کے بہت قدرداں تھے۔

غرضکہ یہ کئی زبانوں کے ادیب تھے اور بے شمار کتابیں پڑھی تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر مضمون پر، خواہ وہ تاریخ ہو، فلسفہ ہو، شاعری ہو، ادب ہو، مذہب ہو، اس طرح بولتے تھے کہ

معلوم ہوتا تھا، وہ اسی مضمون کے استاد ہیں۔ ہندوستان کے مشہور مورخ سر جدو ناتھ سرکار ایک بار آپ سے ملنے آئے۔ بہت سے مضامین پر آپ سے بات چیت رہی۔ سر جدو ناتھ کے گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ پرانی وضع کا مولوی دُنیا کی اس قدر باتیں جانتا ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں۔ ''خدا بخش خاں کی معلومات اس قدر تھی کہ جب مجھ سے گفتگو ہوئی تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ایک اتھاہ سمندر موجیں مار رہا ہے۔''

مذہبی خیالات:

خدا بخش خاں ایک بہت سچے اور سیدھے سادے مسلمان تھے۔ اُن کا تعلق سنّی فرقے سے تھا اور اپنے عقیدے کے بہت پکے تھے۔ روزانہ پانچ وقت کی نماز اُن کی ناغہ نہیں ہوتی۔ صبح کی نماز کے بعد تھوڑی دیر قرآن ضرور پڑھا کرتے اور اپنے لڑکوں کو بھی قرآن پڑھنے کی تاکید کرتے رہتے۔ جب آپ کے بڑے بیٹے مسٹر صلاح الدین تعلیم کے لیے انگلینڈ جانے لگے تو آپ نے ایک قرآن اُن کو تحفہ دیا اور تاکید کردی کہ روزانہ ایک دو آیت بھی ضرور پڑھ لینا۔ خدا بخش خاں کا مذہبی خیال دیکھئے کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو قرآن صرف پڑھنے کے لیے نہیں دیا، بلکہ اس لیے بھی اُنھوں نے خدا کا کلام ساتھ کردیا کہ وہ اس کی بزرگی سے صحیح سلامت جائیں اور واپس آجائیں۔

پیغمبر اسلام حضرت محمد صلعم اور ان کے خاندان سے خانصاحب کو دلی محبت تھی۔ جب جوش میں آتے تو حضرت کی تعریف میں سیکڑوں شعر لَے کے ساتھ پڑھنے لگتے۔ حضرت حسینؓ کی اُن کے دل میں بڑی قدر تھی اور اُن کے ظالمانہ قتل پر اُن کا دل ہمیشہ روتا تھا۔

لیکن مذہبی خیال میں اس قدر پختہ ہونے پر بھی وہ ان فضول چیزوں سے ہمیشہ الگ رہے جو آج مذہب کے نام پر کی جاتی ہیں۔ قبروں پر چادریں چڑھانا اور ان کی پوجا کرنا بہت برا سمجھتے تھے۔ اسی طرح محرم کے اکھاڑوں اور تعزیہ کے جلوس کو اسلام سے الگ چیزیں سمجھتے تھے۔ وہ تعزیہ اور اکھاڑوں کو کس قدر برا سمجھتے تھے یہ اسی واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے اپنے بچوں کو کبھی محرمی جلوس دیکھنے نہ دیا۔ حالانکہ پٹنہ کا محرم مشہور ہے اور دسویں تاریخ کو لوگ دور دور سے ''پہلام'' دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ اس بارے میں ان کا یہ خیال تھا کہ اسلام کی تاریخ

میں کربلا کا واقعہ سب سے دردناک واقعہ ہے۔ لیکن اس کا غم منانے کے عوض مسلمانوں نے اس کو کھیل تماشہ بنا دیا ہے۔ محرم میں جلوس نکالنا اور سوانگ بھرنا نہ صرف حرام ہے بلکہ حضرت حسینؓ کے ساتھ بے ادبی ہے۔

خان صاحب کو حج کا بڑا شوق تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ مرحوم کی یہ دلی مراد پوری نہ ہو سکی۔

آج کل مذہبی ہونے کا مطلب دوسرے مذہبوں سے نفرت کرنا ان کو گالیاں دینا ہے، لیکن خدابخش خاں ایک پکے مذہبی آدمی ہونے پر بھی تعصب سے بالکل پاک تھے۔ وہ کسی مذہب کو بُری نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ عبادت خواہ کسی رنگ روپ میں ہو، وہ اچھی چیز ہے اور خدا تک پہنچاتی ہے۔ جب اس طرح کی ہندو مسلمان کی باتیں ہوتیں تو وہ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے:

شیخ کعبہ ہو کے پہنچا، ہم کنشتِ دل میں ہیں
گو کہ منزل ایک تھی ٹک راہ ہی کا پھیر تھا

خدابخش خاں کے بےتعصب ہونے کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ وہ یہ نہیں مانتے تھے کہ جنت صرف مسلمانوں کے لیے ہے۔ وہ کہتے کہ اللہ جو بہت رحم اور انصاف والا ہے کیا اتنے انسانوں کو صرف اس لئے جہنم میں بھیج دیگا کہ انہوں نے اسلام کے بتائے ہوئے طریقے سے اس کی عبادت نہ کی؟ ان کا خیال تھا کہ خدا کی عبادت کسی ڈھنگ سے بھی ہو، وہ اسے منظور کرتا ہے، وہ راستے کے لیے نہیں جھگڑتا۔

خدابخش خاں مذہبی معاملے میں کس قدر بڑے دل کے مالک تھے، وہ اس واقعہ سے پتہ ملتا ہے کہ جب ان کے صاحبزادے مسٹر صلاح الدین یورپ سے واپس آئے تو اپنے ساتھ نئے نئے خیالات بھی لائے۔ یورپ کے غیر مذہبی خیالوں کا ان پر بہت اثر پڑا تھا۔ باپ بیٹے میں اکثر بحث مباحثہ ہوتا رہتا۔ اپنے لائق بیٹے کی یہ لامذہبیت دیکھ کر دیندار باپ کے دل میں بڑی چوٹ پہنچی۔ دوسرا ہوتا تو عمر بھر بیٹے کا منہ نہ دیکھتا، لیکن وہ رنج نہ ہوئے اور بہت صلح اور رواداری سے سمجھاتے رہے اور اس سلسلے میں چند کتابوں کے پڑھنے کی ہدایت کی۔ اس مذہبی رواداری کا یہ

اثر تھا کہ مسلمانوں سے زیادہ ان کے دوستوں کی تعداد ہندوؤں میں تھی۔ ہندوؤں کی طرف ان کی طبیعت کا جھکاؤ بہت زیادہ تھا۔ کہا کرتے تھے کہ میرے بدن میں برہمنی خون کی ملاوٹ ہے۔ اس کی اصلیت یہ ہے کہ خدا بخش خاں کے والد محمد بخش خاں کو ایک برہمنی عورت نے دودھ پلایا تھا۔ اس برہمنی کی خاں صاحب اپنی دادی کی طرح عزت کرتے تھے اور اس خیال سے کہ ان کا دل نہ دُکھے، محمد بخش خاں اور خدا بخش خاں نے کبھی گائے کا گوشت نہیں کھایا۔

آج کل کے زمانہ میں جبکہ ہر جگہ فرقہ بندی کا بادل چھایا ہوا ہے، اگر کوئی بڑا آدمی اس طرح کی بات بولے تو وہ بے چارہ ہندو پرست، کافر، غدار قوم اور خدا معلوم کیا کیا نہ کہلائے۔ لیکن چند سال قبل ہمارے ملک کی کیا حالت تھی اور کس طرح ہندو مسلمان بھائی بھائی کی طرح رہتے تھے۔ یہ خدا بخش کے اسی واقعے سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ خدا بخش خاں پر کوئی یہ بھی حرف لگانے کی ہمت نہیں کرسکتا کہ اسلام کی محبت اور عظمت اُن کے دل میں نہ تھی اور وہ ایک پکے مسلمان نہ تھے۔

جب کبھی ہندو مسلمانوں کے درمیان کوئی بلوہ وفساد ہو جاتا تو اُن کے دل کو بہت دکھ پہنچتا۔ وہ کہتے کہ یہ لڑنے والے نہ ہندو ہیں نہ مسلمان۔ ان کو اپنے مذہب سے کوئی واسطہ نہیں، بلکہ وہ مذہبی دیوانے ہیں۔ لوگ ان کے پاس اس طرح کے لڑائی جھگڑے کے مقدمات لے کر آتے، لیکن وہ ان کو بیرنگ واپس کردیتے۔ خدا بخش خاں نے اپنی اسی ہردلعزیزی کی وجہ سے مذہبی فساد کے دور کرنے میں کئی بار بہت قیمتی مدد پہنچائی۔ ۱۸۹۳ء میں گاؤکشی کے بلوے کے سلسلے میں اُنہوں نے ایسا کام کیا کہ بنگال اور بہار (اسوقت بہار الگ نہ ہوا تھا) کے گورنر سرانتونی مکڈانل نے انہیں شکریہ کا خط لکھا۔

سیاسی خیالات:

خدا بخش خاں جس زمانے میں (۱۸۴۲ء سے ۱۹۰۸ء) زندہ تھے، سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان میں اس وقت تک کسی سیاسی خیال نے کوئی خاص شکل اختیار نہ کی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر اور اس کے نتیجے کے طور پر ہندوستان پر جو تباہی اور بربادی آئی تھی، اُس سے دیس نے اُس

وقت تک سر نہ اُٹھایا تھا۔ پھر ملک میں اتنی تعلیم بھی نہ تھی۔ چند گنے چنے امیروں کے لڑکے انگریزی تعلیم پاتے تھے اور انہیں اچھی اچھی سرکاری نوکریاں مل جاتی تھیں۔ دوسرے پڑھے لکھے لوگوں ،مثلاً وکیلوں اور بیرسٹروں کا دماغ اپنے پیشے کی طرف لگا رہتا تھا۔ غریبوں کے مسئلوں پر کم لوگ دھیان دیتے تھے اور یہ بات بھی ہے کہ اس وقت ملک کی حالت اتنی گئی گزری بھی نہ تھی۔ کھیتی میں کافی نفع تھا، کسان خوشحال تھے، مزدوروں کا کوئی بڑا دل نہ تھا، کیونکہ اُس وقت اتنے کل کارخانے نہ کھلے تھے۔ اس زمانے میں بیروزگاری کا جو مسئلہ ہے وہ بھی اس وقت اتنا نہ تھا۔ جو لوگ تعلیم پاتے تھے اُنہیں آسانی سے سرکار میں ملازمت مل جاتی تھی۔ اس طرح پڑھے لکھوں کی فوج بیکار نہ ماری پھرتی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کو آج جو مصیبتیں اور دُکھ زوروں پر ہلا رہے ہیں، اُنہوں نے اس قدر بھیانک روپ اسوقت تک اختیار نہ کیا تھا۔

چونکہ ملک میں تعلیم عام نہ ہوئی تھی اس لیے لوگوں کو اپنی حالت کے سمجھنے کا بھی موقع نہ تھا۔ کچھ پڑھے لکھے اور اوپر کے طبقے کے لوگ تھے جو ملک کی بدحالی پر غور کرتے تھے اور اس کے سدھار کی تدبیریں سوچا کرتے تھے۔ انہیں لوگوں نے ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے ایک جماعت قائم کی، لیکن اس زمانے میں کانگریس نے زور نہیں پکڑا تھا۔ علاوہ اس کے اُس کانگریس کا مقصد اور اس کی پالیسی بھی بہت نرم اور مدھم تھی۔ محکموں میں ہندوستانیوں کے لیے نوکریاں مانگنی، سرکار کی طرف سے کہیں کوئی زیادتی ہو تو بہت نرمی سے سرکار کو اس کی طرف دھیان دلانا وغیرہ یہی سب کام اس وقت کی کانگریس کے تھے۔

مختصر یہ کہ اُس زمانے کے لوگ جس حال میں تھے اُسی کو غنیمت سمجھتے تھے۔ کچھ لوگ تھوڑا بہت سدھار چاہتے تھے۔ لیکن زیادہ تر لوگ امن چین سے زندگی گذارنا چاہتے تھے۔ زمانے کے مطابق خدابخش خاں کے سیاسی خیالات بھی یہی تھے۔ وہ برطانوی سلطنت کو ملک کے لیے ایک نعمت سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں میں ابھی اتنی قابلیت اور لیاقت نہیں آئی ہے کہ وہ خود حکومت چلاسکیں۔ ایسی صورت میں اگر سلطنت برطانیہ کا راج ہندوستان سے اُٹھ گیا تو ہر طرف خلفشار مچ جائے گا۔ ایک قوم دوسری قوم پر چڑھ دوڑے گی۔ خون خرابہ ہوگا اور اس

طرح ملک کا امن برباد ہو جائے گا۔ ان کو انگریزوں کی انصاف پسندی پر بہت بھروسہ تھا، اس لیے وہ بائیکاٹ اور 'سوراج' کی باتوں کو پسند نہ کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایک درجن جادو بیان تقریر کرنے والوں سے دیس کو اتنا فائدہ نہیں پہنچ سکتا، جتنا سرکار کی توجہ اور ہمدردی سے پہنچ سکتا ہے۔ بنگال میں ''بم'' کی آواز اُسی وقت سے گونجنے لگی تھی اور انارکسٹ پارٹی کا چرچا شروع ہو گیا تھا۔ خدا بخش خاں کو جب یہ خبریں پہنچتیں تو وہ ان نوجوانوں کو دیوانہ کہتے اور ان کی حرکتوں کو ملک کے لیے نقصان دہ بتاتے۔

لیکن ایسا نہ تھا کہ خان صاحب سرکار سے اپنے حقوق کے لیے لڑنے کو برا سمجھتے ہوں، وہ اس لڑائی کو پسند کرتے تھے۔ بشرطیکہ وہ قانون کی حد کے اندر ہو۔ ان کو یقین تھا کہ اگر صلح و آشتی کے ساتھ سرکار کو سدھار کی طرف دھیان دلایا گیا تو وہ ضرور ہماری مانگیں پورا کرے گی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہندوستان میں آزادی کی جو کچھ بھی لہر دوڑی ہے اور یہاں جمہوری حکومت کا جو کچھ بھی خیال پھیلا ہے یہ انگریزی حکومت ہی کا نتیجہ ہے۔ جمہوریت انگریزوں کی سیاست کی بنیاد ہے، اسی لیے اس نے ہندوستان میں بھی اپنی حکومت کا وہی طرز رکھا ہے۔ اس زمانہ میں چین اور جاپان کے درمیان گھمسان جنگ ہو رہی تھی۔ خدا بخش خاں اس جنگ سے بہت دلچسپی لیتے تھے اور روزانہ اس کی خبریں پڑھا کرتے۔

قومی خدمت:

خدا بخش خاں کی سب سے بڑی قومی خدمت اُن کا کتب خانہ ہے، جس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔ لیکن اس خدمت کے علاوہ انہوں نے بہت سی دوسری پبلک خدمتیں بھی انجام دی ہیں۔ ۱۸۷۷ء میں سرکار کی طرف سے ایک ''اسکول کمیٹی'' مقرر کی گئی تھی، تاکہ وہ اسکولوں کی تعلیمی حالت کی جانچ کر کے سرکار کے سامنے رپورٹ پیش کرے۔ خدا بخش خاں کو بھی سرکار نے اس کمیٹی کے لیے نامزد کیا۔ خدا بخش خاں نے اپنی علمی قابلیت اور تجربے سے زبردست خدمت انجام دی، جس کے انعام میں انہیں سرکار سے ایک ''صداقت نامہ'' ملا۔ لارڈ رپن کے وقت میں ہندوستان میں لوکل سلف گورنمنٹ بنی اور میونسپلٹی اور پٹنہ ڈسٹرکٹ بورڈ کا چناؤ ہوا۔ خدا بخش خاں

پٹنہ میونسپلٹی اور پٹنہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے پہلے چیر مین ہوئے ہیں۔اس حیثیت سے ایک زمانے تک انہوں نے اپنے قیمتی وقت کو قربان کر کے پبلک کی خدمت کی ہے،جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، ہندو مسلمانوں کے جھگڑوں کو چکانے میں بھی سرکار کو خدا بخش خاں کو ہمیشہ مدد ملتی رہی۔

اس زمانے میں بہار کے مسلمانوں کے تین لیڈر تھے۔مولوی محمد محسن، قاضی رضا حسین (جن کی دی ہوئی اسکالرشپ سے اب تک مسلمان لڑکے تعلیم پا رہے ہیں)اور خدا بخش خاں،ان تینوں لیڈروں میں ایک دوسرے سے بے حد محبت تھی۔وہ برابر مسلمانوں کی ترقی کا راستہ سوچتے رہتے۔بہت سوچ بچار کے بعد انہوں نے مسلمانوں کی ترقی کے لیے انگریزی تعلیم حاصل کرنا لازمی خیال کیا۔لیکن اُس زمانے میں مسلمان مولویوں کا بڑا دورہ تھا،جو مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے باز رکھنے کے لیے اپنی پوری طاقت خرچ کر رہے تھے۔خدا بخش خاں اور اُن کے ساتھیوں نے اس مخالفت کی مطلق پروانہ کر کے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف رغبت دلائی۔اُنہوں نے مولویوں کا بہت کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا اور غریب مسلمان لڑکوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی طرف سے خرچ دے دے کر تعلیم دلوائی۔

خدا بخش خاں کا کتب خانہ: مغل بادشاہوں کا علمی خزانہ

ہندوستان میں جو مسلمانوں کا دور شروع ہوا تو یہاں کی ہندو تہذیب میں ایک نئی چیز آ گئی۔نئے لوگ،نئی زبان،نئی تہذیب،نیا ڈھنگ،نیا لباس،نئی عمارتیں،غرضکہ ہندو تہذیب کے ساتھ ساتھ ایک نئی خاص الگ تہذیب ہی چل پڑی،جو ہندوستان کے لیے بالکل نئی چیز تھی۔بادشاہی راج کے طریقے میں ہزار خرابیاں سہی،لیکن اس کے ساتھ یہ خوبی ضرور ہے کہ کسی راجہ یا بادشاہ کے راج میں علم اور تہذیب،مصوری اور نقاشی اور دوسری دوسری خوبصورت کاریگریاں،بہت ترقی کر جاتی ہیں۔لیکن اس میں شرط یہی ہے کہ بادشاہ خود بھی شوقین ہو۔پھر تو سارے ملک کے عالم فاضل،شاعر اور مصور اور دوسرے کاریگر بادشاہ کے سائے میں پنپنے اور پھلنے پھولنے کے لیے اُمڈ آتے ہیں۔مسلمانوں کے آنے کے قبل ہندوستان سیکڑوں چھوٹی چھوٹی ریاست میں بٹا ہوا تھا۔لیکن مسلمان آئے تو ہندوستان نے پہلی مرتبہ دہلی میں اتنا بڑا شاہی دربار

دیکھا، جس کے ماتحت ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے کی سرزمین تھی۔ دہلی میں ہندوستان کی یہ مرکزی حیثیت پہلی بار دکھائی دی۔ اسی لیے سارے ہندوستان کا علم وفن دہلی میں سمٹ گیا تھا اور ہندوستان کی اسلامی شہنشاہیت کے سائے میں ایک نئی تہذیب پرورش پانے لگی۔

محمود غزنوی سے لیکر ابراہیم لودی کے زمانے تک ہندوستان کی جو ہیجانی حالت تھی اس میں یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی تہذیب اور علم وفن اچھی طرح پنپ سکتا۔ لیکن جب مغلوں کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور آئی تو پھر یہ ہیجانی حالت، کم از کم تین سو برس کے لیے بالکل تحیر ہوگئی اور بادشاہوں کو یہ موقع ملا کہ وہ سلطنت کے کاموں کے علاوہ علم اور آرٹ کی طرف توجہ کریں مغل دربار ہر فن کے استادوں سے بھر گیا اور ان کی کاریگری کے نمونوں سے مغل بادشاہوں کا خزانہ بھر گیا۔ مغلوں کے وقت میں ہندوستان میں ایک خاص قسم کی مصوری جسے 'مغل آرٹ' کہتے ہیں، عمارتوں کی ایک بناوٹ۔ خاص قسم کے لباس اور خاص طرز کے ادب وشاعری کے چشمے پھوٹ پڑے۔ بادشاہوں نے بھی ایسی سرپرستی کی کہ جس نے بھی کوئی جوہر دکھایا اُسے مالا مال کر دیا۔ مختصر یہ ہے کہ بابر سے لے کر اورنگزیب عالمگیر کے زمانے تک مغل راجدھانی میں علم وفن اور آرٹ کا ایک نادر ذخیرہ جمع ہوگیا۔

ٹھیک اُسی زمانے میں جب اتر ہندوستان میں مغلوں کی دریادلی ہندوستان کی تہذیب اور خوبصورتی میں اتنا بڑا اضافہ کر رہی تھی، دکھن ہندوستان میں قطب شاہی اور عادل شاہی حکومتیں بھی علم کے دریا بہا رہی تھیں۔ ہزاروں اہل علم وفن ان کے درباروں میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھا رہے تھے اور اس طرح وہاں بھی ایک انمول ذخیرہ جمع ہوگیا تھا۔ یہ لوگ علم وہنر کے کتنے قدرداں تھے، یہ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبری دربار کے شاعر فیضی نے جب انتقال کیا تو ۴۳۰۰ لاجواب کتابیں اس کے کتب خانہ سے نکلیں۔ جہانگیر اپنے تزک میں لکھتا ہے کہ اس نے یوسف زلیخا کو خوشخط لکھنے کی، ایک کاتب کو بیس ہزار روپے مزدوری دی۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں کئی کتابیں ایسی موجود ہیں جن پر شاہجہاں نے چودہ سال کی عمر میں دستخط کئے ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ بچپن ہی سے مغل شاہزادے علم سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ غرضکہ ہندوستان میں

دو جگہیں ایسی تھیں، یعنی اتر ہندوستان میں دہلی اور دکھن میں بیجا پور اور گولکنڈہ، جہاں بہترین کتابیں اور تصویریں جمع ہوگئی تھیں۔

جب اورنگ زیب نے دکن کی قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کو فتح کیا تو اُن کے کتب خانوں کے تمام انمول خزانوں کو بھی اپنے ساتھ لیتا آیا اور دہلی کے شاہی کتب خانے میں ملا دیا۔ فیضی نے جو ۴۳۰۰ کتابیں چھوڑی تھیں وہ بھی دہلی کے شاہی کتب خانے کو مل گئیں۔ اسی طرح اور بھی درباریوں کے کتب خانے ضبط ہو کر شاہی کتب خانے میں ملا لیے جاتے تھے۔ اس طرح دہلی کے شاہی کتب خانے میں رفتہ رفتہ ایسی ایسی چیزیں جمع ہوگئیں کہ شائد ہی پردۂ زمین پر کسی ایک جگہ اتنی لاجواب چیزیں جمع ہوئی ہوں۔ لیکن ہائے افسوس! یہ سارا خزانہ اور ہماری تہذیب و تمدن کی ساری پونجی ۱۸۵۷ء کے غدر کے خلفشار میں غارتگروں کے بے درد ہاتھوں سے تباہ ہوگئیں۔ وہ سارا خزانہ کہاں گیا، کن ہاتھوں میں پڑا کچھ معلوم نہیں یہ وہ قومی نقصان ہے جو قیامت تک پورا نہیں ہوسکتا۔

اٹھارہویں صدی میں اودھ کے تاجداروں نے بھی ایک زبردست علمی خزانہ اکٹھا کرلیا تھا۔ آصف جاہی دربار کے ریزیڈنٹ مسٹر اسپرنگ نے، جو جرمنی کے رہنے والے تھے لکھنؤ کے شاہی کتب خانے کی ایک فہرست بھی تیار کی تھی، جس میں پانچ ہزار سے زیادہ کتابوں، تصویروں اور نقاشیوں کے نمونوں کے نام تھے لیکن جواہرات کا یہ خزانہ بھی غدر کی بھاگ دوڑ میں لٹ گیا۔

مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں تھیں وہ ضائع ہوچکی تھیں اور پھر ان کے ملنے کی کوئی اُمید نہ تھی، لیکن خوشی کی بات ہے کہ چند شخصوں کی کوشش سے اس کھوئی ہوئی دولت کا کچھ حصہ مل سکا۔ ان لوگوں میں خدابخش خاں کا نام خاص طور پر ذکر کے قابل ہے، جو دہلی کے شاہی کتب خانے کے بڑے بڑے نادر رتن اکٹھا کرنے میں کامیاب ہوئے۔

کتابیں کس طرح جمع ہوئیں؟

جب غدر (۱۸۵۷ء) میں دلی دربار تہس نہس ہوگیا تو اُس کے ساتھ ہی ساتھ شاہی کتب خانہ بھی غتربود ہوگیا۔ شاہی محل والوں کو بھاگنے کا راستہ تو ملتا نہ تھا، وہ کتابیں کہاں کہاں ڈھونڈھتے

پھرتے۔ اس لوٹ اور بھگدڑ میں جس کو جو چیز ہاتھ لگی وہ لے اُڑا۔ لیکن اس وقت ایک رئیس ایسا تھا جسے ان نادر جواہر پاروں کو جمع کرنے کی فکر ہوئی۔ یہ نواب رام پور تھا۔ نواب نے غدر میں انگریزوں کا ساتھ دیا۔ اس لیے لوٹ کا ایک بڑا حصہ ان کے پلّے پڑا۔ انہوں نے انگریزی فوج میں اعلان کرا دیا کہ جو سپاہی کتابیں لا کر دے گا، اسے ہر قلمی کتاب کی قیمت ایک روپیہ ملے گی۔ غور کرنے کی بات ہے، جس انمول کتب خانہ کی ایک ایک کتاب پر کاتب سال دو سال کی جگر سوزی اور محنت کرتے اور دریا دل بادشاہ اس کے لیے بیس بیس ہزار روپیہ ادا کرتا، وہ لال، نواب رام پور کے یہاں کوڑیوں کے مول بکتا۔ بہر حال نواب رام پور شاہی کتب خانے کی چند نادر چیزیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے، جو اب تک اُن کے کتب خانے میں ُرامپور' میں موجود ہے۔ اسی لیے رام پور کا کتب خانہ خدا بخش خاں کے کتب خانے کے بعد ہندوستان کا دوسرا عالی شان کتب خانہ ہے۔

جس زمانے میں نواب صاحب رام پور اس علمی خزانے کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اسی زمانے میں پٹنہ کا ایک غریب وکیل بھی جو نواب رام پور کے پاسنگ کے برابر بھی نہ تھا، اسی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ خدا بخش خاں نے قلمی کتابوں کو جمع کرنے کا کام بعد کو شروع کیا، پھر بھی نواب رام پور اور خدا بخش خاں میں قلمی کتابوں کے لیے لاگ ڈانٹ جاری رہی۔ وہ چاہتے تھے کہ میرا کتب خانہ بڑھ جائے اور خدا بخش خاں الگ کمر ہمت کسے بیٹھے تھے کہ ہم اپنے کتب خانے کو بڑھا لے جائیں۔ کہاں نواب رامپور اور کہاں خدا بخش خاں۔ لیکن خدا کی شان کہ خدا بخش خاں نے پاسا مار لیا۔ ایک چھوٹی حیثیت کے وکیل کا علمی شوق نواب صاحب رام پور کی دولت و ریاست پر بازی لے گیا، اور آج خدا بخش خاں کا کتب خانہ ایسا ہے کہ رام پور کا کتب خانہ اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔

خدا بخش خاں نے کس کس طرح یہ کتابیں جمع کیں یہ بھی ایک پر لطف قصہ ہے۔ ایک عرب محمد مکی نامی تھے، جنہیں ان چیزوں کا بڑا شوق تھا، خدا بخش خاں سے کہیں ان کی ملاقات ہو گئی۔ خان صاحب نے فوراً انہیں ۵۰ روپیہ ماہوار پر رکھ لیا، تاکہ وہ ہندوستان سے باہر ملکوں کا

سفر کریں اور کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائیں۔ ۱۸ سال تک محمد مکی صاحب عرب، شام، مصر اور ایران کی خاک چھانتے پھرے اور اس اٹھارہ سال کے اندر انہوں نے عربی کی نادر نادر قلمی کتابیں تمام سے اکٹھا کر کے خدا بخش خاں کے سامنے لاکر ڈھیر کر دیں۔ علاوہ اس کے ہندوستان میں بھی خدا بخش خاں کا نام مشہور ہوگیا تھا۔ جس کے پاس جو چیز تھی اس نے لاکر خدا بخش خاں کے حوالہ کی اور کافی رقم حاصل کی۔ کتب فروش جوق در جوق آنے لگے۔ خدا بخش خاں اُن کا اس قدر خیال کرتے تھے کہ خواہ اُن سے کتاب خریدیں یا نہ خریدیں اُنہیں ریل کا آمدورفت کا کرایہ دے دیا کرتے تھے۔ اس طرح خدا بخش خاں کی قدردانی کی تمام ملک میں ایسی شہرت ہوئی کہ جہاں کہیں بھی کوئی عمدہ چیز ہوئی وہ ان کے پاس کھنچ کر چلی آئی۔

دلچسپ واقعات

ایک دن خدا بخش خاں اپنی ججی کے زمانہ میں، حیدرآباد ہائی کورٹ سے واپس آرہے تھے، ایک دوکان پر اُنہیں پُرانی اور بوسیدہ کتابوں کا ایک ڈھیر نظر آیا۔ فوراً دوکان پر آگئے۔ کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو عجیب وغریب چیزیں اس ڈھیر میں نظر آئیں۔ دوکاندار سے دام پوچھا، اس نے کہا "حضور! اگر کوئی دوسرا ہوتا تو اسے ردی سمجھ کر تین روپیہ میں پھینک دیتا، لیکن جب حضور کا اس پر دل آگیا ہے تو یقیناً اس میں کوئی اچھی چیز ہے اس لیے بیس روپے لوں گا۔" خدا بخش خاں اس ڈھیر کو خرید کر لے آئے۔ اس میں نہایت عمدہ اور نایاب کتابیں نکلیں۔ کچھ دنوں کے بعد اُسی ڈھیر کی ایک کتاب کے لیے نظام کے کتب خانے سے چار سو روپیہ پیش کیا گیا، لیکن خان صاحب نے نہ دیا۔

اسی طرح ایک بار پٹنہ کے ڈسٹرکٹ جج مسٹر ایلیٹ نے خان صاحب سے "قصائد کمال الدین اصفہانی" کی ایک قلمی کتاب پڑھنے کے لیے لی۔ یہ کتاب صاحب کو پسند آگئی اور ہضم کر جانے کی نیت ہوئی۔ خانصاحب سے کہا یہ کتاب واپس نہ لیجئے۔ میں اس کے لیے ہزار دو ہزار روپے دینے کو تیار ہوں۔ خدا بخش خاں کو صاحب کی یہ حرکت بہت ناگوار گزری۔ قیمت لینے سے انکار کر دیا، لیکن کتاب بھی انہیں واپس نہ ملی۔ بیچارے کیا کرتے، ڈسٹرکٹ جج کا معاملہ

تھا۔ ناچار صبر کر کے بیٹھ گئے۔ مسٹر ایلیٹ نے اس طرح کی بہت سی قلمی کتابیں جمع کی تھیں۔ جب وہ اپنے عہدے سے الگ ہو کر انگلینڈ جانے لگے تو قیمتی کتابوں کو ایک صندوق میں بند کیا اور دوسری معمولی کتابوں کو دوسرے صندوق میں۔ عجب اتفاق کہ جس صندوق میں معمولی کتابیں تھیں اسے تو صاحب ساتھ لیتے گئے اور اپنا بیش قیمت خزانہ والا صندوق یہیں چھوڑ گئے۔ نوکروں کے ذریعہ ساری کتابیں خدابخش خاں کے ہاتھ لگیں۔ وہ قصائد کمال الدین کی کتاب بھی واپس مل گئی اور سود کے ساتھ واپس ملی۔ ''مجالس خمسہ'' کا وہ قیمتی نسخہ جس پر شاہجہاں کے دستخط ہیں اسی صندوق میں ملا۔ خدابخش خاں تو خوشی میں جامے سے باہر ہو گئے لیکن جب صاحب نے اپنے وطن پہنچ کر صندوق کھولا تو سر پیٹ لیا۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ کتب خانے کے ایک جلد ساز نے کتب خانے میں نقب لگا کر چند نادر قلمی کتابیں چرا لیں۔ اُن کتابوں کو لے کر وہ پنجاب چلا گیا اور لاہور میں ایک کتب فروش کے ہاتھ بیچ دیا۔ لیکن خدا کی شان دیکھئے۔ اُس کتب فروش کو خدابخش خاں کی قدر دانی کا حال معلوم ہو چکا تھا۔ اُس نے سوچا، ان کتابوں کا ان کے سوا کون قدر داں ہوگا۔ لہٰذا اُنہیں لے کر پٹنہ آیا اور خدابخش خاں کے سامنے پیش کیا۔ لیکن خدابخش خاں کی شرافت دیکھئے کہ اُنہوں نے اس کتب فروش کو محروم نہ کیا، بلکہ کافی رقم دی اور چور کو سزا دلوائی۔ اس طرح ''حق بہ حقدار رسید'' جو مثل ہے وہ سچی ثابت ہوئی۔

ہماری ناقدردانی کا نتیجہ

ہم ہزار اپنی پرانی تہذیب کے دعویدار ہوں، لیکن اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ علم وفن کی جو قدردانی یورپین قوموں میں ہے، وہ ہم میں موجود نہیں۔ وہ لوگ صرف اپنے علم اور تہذیب ہی کی حفاظت نہیں کرتے، بلکہ آج ہمارے علمی خزانے کے بھی دربان اور محافظ وہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی اور ہندو تہذیب کی پونجی اور نادر یادگاریں ایشیا سے زیادہ یورپ کے عجائب خانوں میں ہیں۔ آج ہم اگر عربی یا سنسکرت زبان میں مہارت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں برٹش میوزیم یا برلن میں پناہ لینی پڑتی ہے۔ اور برس دو برس اُن کی چوکھٹ پر سر رگڑنے کے بعد ہم اس قابل

ہوتے ہیں کہ دنیا میں ہمیں عربی یا سنسکرت کا ڈاکٹر کہے۔

یورپین لوگوں کا ہمیشہ اصول رہا ہے کہ وہ جس ملک میں جاتے ہیں وہاں کی نادر اور عجوبہ چیزیں حاصل کر کے اپنے ملک کے میوزیم کو دیدیتے ہیں۔اسی کو آپ غور کیجئے کہ جب سارا اتر ہندوستان غدر کے شعلوں میں دھک رہا تھا اور ایک طرف انگریز اس ملک کو اپنے اقتدار میں لانے کے لیے جان کی بازی لگائے ہوئے تھے دوسری طرف کرکپیٹرک (KIRKPATRIC) گلیڈون (GLAD WIN)، فزپیٹرک (FITZPATRIC) جوتھن اسکاٹ (JOHNTHAN SCOTT) اور دوسرے بہتیرے یورپین یہاں کے علمی خزانے کو لوٹ رہے تھے۔ہندوستان کی نادر قلمی کتابوں کے شکار میں اُنہیں کامیابی ہوئی اور ہمارے ملک کا یہ خزانہ یورپ کی لائبریریوں کی زینت بن گیا۔ایشیا اور ہندوستان کے پُرانے اونچے خاندانوں میں اب بھی نادر زمانہ کتابوں کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔لیکن یا تو ان کے کنجوس پن اور غفلت سے کیڑوں کی نذر ہو رہا ہے، یا یورپ کے کتب خانوں میں پہنچ رہا ہے۔

بہر حال اگر خدابخش خاں، اس کام کے لیے نہ اُٹھ کھڑے ہوتے تو آج جو چیزیں ہمارے پاس ہیں وہ بھی یورپ کے کتب خانوں میں نظر آتیں۔خدابخش خاں ہندوستان کے پُرانے خاندانوں سے بھی چند نایاب چیزیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔خدابخش خاں لوگوں سے یہ عام طور پر اپیل کرتے تھے کہ ان کے پاس جو نادر کتابیں ہوں وہ عام فائدے کے لیے لائبریری کو دیدیں۔چنانچہ ان کی درخواست پر مولوی سید عبدالمجید رئیس صدر گلی پٹنہ، نواب ولایت علی خاں (پٹنہ)، سید صفدر نواب (پٹنہ) نے اپنی اپنی کتابیں کتب خانے کو دے دیں۔دیوان حافظ کا وہ بیش قیمت نسخہ جسے ہمایوں اور جہانگیر فال کھولنے کے لیے استعمال کرتے تھے اور جس کے حاشیے پر ان کے قلم کی تحریریں ہیں، وہ مولوی سبحان اللہ صاحب رئیس گورکھ پور کا دیا ہوا ہے۔خدابخش خاں نہ صرف اپنے ملکی بھائیوں سے یہ نادر چیزیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے، بلکہ چند وہ چیزیں جو یورپ جا چکی تھیں۔انہیں بھی واپس لانے میں کامیاب ہوئے ،خدابخش خاں کے کتب خانہ میں کئی کتابیں ہیں جو ڈی ساسی (DE SACY)، سرگور اوسلے

(SIR GORE OUSLY) اور بلاکمین (BLOCHMANN) سے حاصل کی گئی ہیں۔بعض کتابوں پر فرانس کے کتب خانہ کی چٹیں سٹی ہوئی ہیں۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خان صاحب انگلینڈ ہی سے نہیں، بلکہ فرانس سے بھی چند چیزیں واپس کھینچ لائے۔

کتب خانے کا قیام

یہ تو پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ خدا بخش خاں کے والد محمد بخش خاں قلمی کتابوں کے جمع کرنے کا غیر معمولی شوق رکھتے تھے۔اُنہوں نے خود اپنی زندگی میں بارہ سو قلمی کتابیں جمع کر لی تھیں۔ انتقال کے قبل آپ نے اپنے لائق بیٹے خدا بخش خاں کو بلا کر وصیت کی۔اگر ممکن ہو تو اس خاندانی کتب خانہ کو ترقی دے کر عام فائدے کے لیے وقف کر دیا جائے۔خدا بخش خاں نے مرنے والے باپ کی یہ آخری وصیت قبول کی اور اسی وقت سے اس کوشش میں لگ گئے۔اس وقت کل کتابوں کی تعداد پندرہ سو تھی۔یعنی جو ذخیرہ خانصاحب کو اپنے والد سے ملا تھا، اُس میں اُنہوں نے تین سو کا اضافہ کیا تھا۔خدا بخش خاں اس ذخیرے کو آہستہ آہستہ ترقی دیتے رہے۔یہاں تک کہ قلمی کتابوں کی تعداد پانچ ہزار تک پہنچ گئی۔ان میں صرف تین ہزار کتابوں پر ڈھائی لاکھ روپے صرف ہوئے تھے۔اس کے علاوہ چھپی ہوئی اردو، انگریزی، فارسی اور عربی کتابیں بھی کافی تھیں۔ان چھپی ہوئی کتابوں کی قیمت کا اندازہ صرف اس بات سے ہو جائے گا کہ صرف انگریزی کتابوں کی لاگت ایک لاکھ روپیہ سے بالا تھی۔

اس انمول خزانے کو رکھنے کے لیے خدا بخش خاں نے اسی ہزار روپے کی ایک عالیشان عمارت بنوائی۔۱۸۹۱ء میں یہ تمام کتابیں اس عمارت میں پہنچا دی گئیں۔اسی سال ۲۹ راکتوبر کو وقف نامے کا ایک وثیقہ لکھا گیا، جس کی رو سے یہ پورا کتب خانہ مع عمارت و زمین حکومت کی سرپرستی میں ملک و قوم کے حوالے کر دیا گیا۔

خدا بخش خاں کس قدر بے غرض اور اونچے انسان تھے کہ انہوں نے اس کتب خانے کا نام اپنے نام پر نہیں رکھا۔عام طور سے یہ ایک قاعدہ سا ہو گیا ہے کہ جب کوئی فیاض کوئی پبلک عمارت اپنے روپے سے بنواتا ہے تو اُس عمارت کا نام اپنے نام پر رکھتا ہے۔خدا بخش خاں کے

دوستوں اور اُس وقت کے حکام نے بھی زور دیا کہ آپ کی یہ ایک یادگار رہ جائے گی، اپنے نام پر کتب خانے کو موسوم کیجئے۔ لیکن وہ نام و نمود کے پیچھے جانے والے انسان نہ تھے۔ انھوں نے صاف انکار کر دیا اور اس کا نام ''اورینٹل پبلک لائبریری'' رکھا۔ یہاں پر اگر بھومیہار برہمن کالج مظفر پور کے بانی ''بابولنگٹ سنگھ'' کا نام لیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس دیالو اور بے غرض انسان نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کے بعد بھی اس کالج کو انہوں نے اپنے نام پر موسوم نہ کیا، بلکہ اپنی ذات ''بھومیہار برہمن'' کے نام پر رکھا۔ وہ اپنے سے زیادہ اپنی ذات سے محبت رکھتے تھے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ دنیا کے تمام بڑے آدمی یکساں ہوتے ہیں۔

سرکاری امداد

ہماری بہت سی بدقسمتیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم اپنی قومی چیزوں کو بھی خود سے نہیں چلا سکتے۔ جتنی چیزیں قائم ہوئیں خواہ وہ قومی چندے سے ہوں یا کسی ایک دولت مند آدمی کے دان کا نتیجہ ہو، آج وہ کس حال میں ہیں یہ سبھی جانتے ہیں ہمارے تمام قومی کام آج بے عملی اور بدانتظامی کا شکار ہو رہے ہیں اور مالی امداد کے بغیر سسک سسک کر دام توڑتے جاتے ہیں۔ خدابخش خاں بہت عقلمند اور دور تک سوچنے والے انسان تھے۔ انہوں نے سوچا کہ'' جب تک ہم زندہ ہیں کسی طرح کتب خانے کو اپنی زندگی تک گھسیٹ کر لے جائیں گے لیکن پھر میرے بعد کیا ہوگا۔ اپنی قوم کی قدردانی کا حال معلوم ہی معلوم ہے، ناممکن ہے کہ ان کے ہاتھ میں یہ چیز سونپ کر جائیں اور وہ چلالیں۔'' یہ باتیں سوچ کر خانصاحب نے کتب خانے کو سرکار کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ پٹنہ کے افیون ایجنٹ مسٹر کیمپ بل سے اُن کی بڑی دوستی تھی۔ اُن سے اس بات کا ذکر کیا۔ مسٹر کیمپ بل نے سر چارلس لائل کو بلا کر کتب خانے کا ملاحظہ کرایا۔ سر چارلس عربی و فارسی کے بڑے فاضل تھے۔ کتب خانے دیکھ کر اُن کی آنکھیں کھل گئیں۔ چنانچہ انہوں نے حکومت بنگال سے پرزور سفارش کی وہ اس لائبریری کو حکومت کی سرپرستی میں لے لے۔ سر چارلس ایلیٹ گورنر بنگال نے ان کی سفارش منظور کر لی اور ۱۸۹۱ء میں خود پٹنہ آ کر اس کو باضابطہ اپنے ہاتھوں سے کھولا۔ اس کے بعد ۱۹۰۳ء میں ہندوستان کے مشہور وائسرائے لارڈ

کرزن، جو علم وفن کے عاشقوں میں تھے، اس کتب خانے کے ملاحظہ کے لیے آئے اور بڑی تعریف کی۔ ان کی آمد کی یادگار میں "لارڈ کرزن ریڈنگ ہال" بنا جواب تک موجود ہے۔

کتب خانے کے خرچ کے لیے حسب ذیل مستقل آمدنی لائبریری فنڈ کے نام سے مقرر ہے:

(۱)	نظام حیدرآباد	سالانہ	۶۰۰/روپیہ
(۲)	امپیریل بینک کے حصوں کا سود	ایضاً	۹۰۰/روپیہ
(۳)	آمدنی موضع کوٹا (جسے میر ابوصالح رئیس گیا نے وقف کیا)	ایضاً	۳۰۰/روپیہ

لیکن کتب خانے کے لیے یہ ۱۸سو سالانہ کی رقم بالکل ناکافی ہے، اس لیے اس کام کے لیے ہر سال حکومت کچھ نہ کچھ رقم نکالتی ہے، جس کی مقدار دس بارہ ہزار تک ہوتی ہے۔

جنوری ۱۹۳۴ء میں جو بے پناہ زلزلہ آیا اُس نے کتب خانے کو بھی معاف نہ کیا۔ لائبریری کی عالیشان دومنزلہ عمارت کی اوپر کی منزل بالکل چور ہوگئی۔ چنانچہ اس منزل کو اُتار دیا گیا اور اب یہ عمارت ایک منزلہ ہی ہے۔ اوپر کی منزل کی کتابیں کرزن ریڈنگ ہال میں رکھ دی گئی تھیں۔ اب سامنے احاطہ کے چمن میں ایک نہایت خوبصورت عمارت لائبریری کی بنائی گئی ہے۔ سرکار نے اس عمارت کے لیے ایک بڑی رقم دی تھی۔

وقف نامہ کی شرطوں کے مطابق اس کتب خانہ کا انتظام ہمیشہ خدابخش خاں کے خاندان کے کسی فرد کے سپرد رہے گا۔ چنانچہ آج کل خان بہادر خدابخش خاں کے چھوٹے صاحبزادے مولوی ولی الدین خدابخش بی۔اے۔بی۔ایل اس کے سکریٹری ہیں۔

خان بہادر صاحب کے انتقال کے وقت اس کتب خانہ کی تمام قلمی کتابوں کی تعداد پانچ ہزار تھی۔ مگر اب اس میں اور بھی اضافہ ہوا ہے۔ کتب خانے میں جو اعلیٰ تصویریں اور آرٹ کے نمونے ہیں وہ ان کے علاوہ ہیں۔ پُرانے وقت کے ہتھیار، بندوقیں اور عرب کی گلوب نما گھڑی وغیرہ بھی ہے جو اپنی قدامت کی وجہ سے نایاب چیزیں ہیں۔ چھپی ہوئی کتابوں کی کافی تعداد موجود ہے۔ مسٹر صلاح الدین خدابخش خاں کی وصیت کے مطابق اُن کی ۷۰۰۰ کتابیں بھی اسی

کتب خانے میں آ گئی ہیں۔ بہرحال کتب خانے کی جملہ کتابوں کی تعداد جس میں قلمی اور چھپی ہوئی دونوں شامل ہیں، اس وقت ۲۴ ہزار سے کچھ اوپر ہے۔

کتب خانے کے چند انمول رتن

کتب خانے میں پانچ چھ ہزار نادر اور انمول قلمی کتابیں ہیں۔ اور اگر ہم اُن کی خوبیاں بیان کرنے بیٹھیں تو ایک بھاری بھرکم کتاب ہو جائے، لیکن نمونے کے طور پر یہاں ہم چند کتابوں کا ذکر کر دیتے ہیں تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ یہاں کیسی کیسی چیزیں ہیں۔

پہلے قرآن مجید سے شروع کیجئے:

(۱) اس لائبریری میں حضرت محمد صلعم کے چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی قرآن کی آیتیں ہیں، جو اس زمانہ کے طرز میں لکھی ہوئی ہیں۔

(۲) ایک قرآن ہے جو چوتھی صدی ہجری کا لکھا ہوا ہے۔ یعنی یہ قرآن نو سو برس کا پرانا ہے۔ لیکن کاتب کا کمال یہ ہے کہ روشنائی اب تک چمک رہی ہے۔

(۳) ایک مشہور کاتب میر علی تبریزی کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن ہے، جو رستم ہند میر منور نے تین ہزار روپیہ میں لیا تھا۔ یہ وہی میر منور ہیں، جو ۱۶۱۱ء میں لاہور کے گورنر بنائے گئے تھے۔ یہ قرآن اتنا خوبصورت ہے کہ پچھلے لوگوں کی کاریگری دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔

(۴) ہرات سے ایک شخص 'عبدالباقی' شاہ جہاں کے دربار میں آئے۔ وہ خوشنویسی کے فن کے اُستاد تھے۔ شاہجہاں نے انہیں ''یاقوت رقم'' کا خطاب دیا۔ ایک قرآن اور دو اور کتابیں لکھ کر انھوں نے اورنگ زیب کو تحفہ پیش کیا۔ یہ تینوں کتابیں اس کتب خانہ میں موجود ہیں۔

(۵) ۸۰۷ھ کی ایک کتاب علیم الدین سخاوی کی لکھی ہوئی ہے۔ یہ مغلیہ دربار میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا یہ کتاب عرصہ تک عبدالرحیم خان خاناں کے کتب خانہ میں رہی اور سیکڑوں برس تک گھومتی پھرتی پٹنہ پہنچی ہے۔

(۶) نظام شاہ بہمنی کے وزیر اعظم خواجہ جہاں ایک بہت بڑے کتب خانہ کے مالک تھے۔ ان کے کتب خانہ میں جاراللہ زمخشری کی لکھی ہوئی ایک کتاب تھی جسے سلطان شاہرخ کے لیے لکھا گیا تھا۔خواجہ جہاں جب قتل کر دیئے گئے تو ان کا کتب خانہ بھی برباد ہوگیا۔لیکن یہ کتاب بچ رہی۔اس پر ایک نوٹ لکھا ہوا ہے،جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب زمانے تک ابراہیم عادل شاہ (جو بیجاپور کا بادشاہ تھا) کے کتب خانے میں رہی۔ پھر جب اورنگ زیب نے بیجاپور کو فتح کیا تو ان کے ساتھ دہلی کے شاہی کتب خانے میں پہنچ گئی اور اب خدابخش خاں کے کتب خانے میں موجود ہے۔

(۷) فارسی زبان کی قلمی کتابوں میں ایرانی اور مغل آرٹ کے لاجواب اور یگانہ روزگار تصویریں ہیں۔ جو لوگ چین، بیچ ایشیا کے ملکوں اور ہندوستان کی مصوری کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں، انہیں ان تینوں ملکوں کے آرٹ کی بہترین تصویریں اس کتب خانے میں مل سکتی ہیں۔

(۸) "تاریخ خاندان تیموریہ" یہ کتاب تاریخی نقطۂ نظر سے بہت بیش قیمت ہے۔اس میں تیمور سے لے کر اکبر کی حکومت کے انیسویں سال تک پوری حالت لکھی ہوئی ہے۔اس کتاب کے پہلے ورق پر شاہجہاں نے اپنے ہاتھ سے یہ لکھا ہے کہ یہ کتاب شاہ بابا (یعنی اکبر) کے وقت میں لکھی گئی۔اس کتاب میں ۱۱۷ لاجواب تصویریں ہیں اور ایک تصویر کو صرف ایک ہی مصور نے بنایا ہے۔ان ۱۱۷ مصوروں میں مقابلہ کرنے سے یہ پتہ ملتا ہے کہ "بساون" اور "مسکین" یہ دونوں مصور اپنا ثانی نہیں رکھتے۔اس کتاب کی صرف کتابت کرنے میں ۸ ہزار روپے خرچ ہوئے۔

(۹) "بادشاہ نامہ" شاہجہاں کے دور حکومت کی تاریخ ہے۔ یہ ایسی ہی نادر ہے کہ ۱۹۱۱ء میں دہلی دربار میں شہنشاہ جارج پنجم کے ملاحظہ کے لیے اسے پیش کیا گیا تھا۔

(۱۰) سلطان محمد ثانی جنہوں نے قسطنطنیہ (CONSTANTINOPLE) فتح کیا تھا، انکی تاریخ "شہنشاہ نامہ" ہے۔قسطنطنیہ کے شاہی کتب خانے میں رہنے کے بعد

شاہجہاں کے وقت میں یہ کتاب ہندوستان پہنچی۔اس کے پہلے صفحے پر مغل بادشاہوں اور شاہزادوں کے اس قدر دستخط ہیں کہ یہ صفحہ بھر گیا ہے۔ان دستخطوں میں شاہجہاں کی چہیتی بیٹی جہاں آرا بیگم کا دستخط بہت خوبصورت ہے۔اس کتاب میں جو تصویریں ہیں وہ نہ ہندوستانی تصویروں کی طرح ہیں اور نہ ایرانی کی مانند، بلکہ ان کا طرز ہی جدا ہے، جو یقینی ترکی طرز ہے۔

(۱۱) محمود غزنوی کی تعریف میں فردوسی نے جو ''شاہنامہ'' لکھا تھا، اس کا ایک بہت خوبصورت قلمی نسخہ یہاں موجود ہے۔اس میں بہترین نقاشی اور نہایت اعلیٰ درجے کی تصویریں ہیں۔علی مراد خاں، گورنر کابل وکشمیر جب شاہجہاں کے دربار میں آئے تھے تو بادشاہ کے سامنے اسے تحفہ کے طور پر پیش کیا تھا۔

(۱۲) جامی کی مشہور کتاب ''یوسف زلیخا'' ہے' جسے عبدالرحیم خانِ خاناں نے بیس ہزار روپے خرچ کر کے جہانگیر کے لیے تیار کرایا تھا۔یہ کتاب لائبریری میں موجود ہے۔

(۱۳) شاہ زادہ کامران ہمایوں کے بھائی بڑے اچھے شاعر تھے لیکن ان کا دیوان نایاب تھا۔کتب خانہ میں یہ دیوان موجود ہے جس پر جہاں گیر اور شاہجہاں نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔

(۱۴) ایران کے مشہور شاعر حافظ کا دیوان نہایت خوبصورت لکھا ہوا ہے۔اسے ہمایوں اور جہانگیر نے اکثر فال کھولنے کے لیے استعمال کیا ہے اور ورقوں کے کنارے پر اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔کتاب کے پہلے صفحہ پر سلطان بیقرہ کا بھی دستخط ہے۔اور بھی کئی بادشاہوں کے دستخط ہیں۔

(۱۵) اورنگ زیب کے بڑے بھائی داراشکوہ کی کتاب ''سفینۃ الاولیا'' ہے جو داراشکوہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔

(۱۶) جہانگیر نے ''تزک جہانگیری'' لکھی تھی، جس میں اپنے دورِحکومت کے حالات بیان کئے تھے۔یہ کتاب تو چھپ چکی ہے اور سب ہی جانتے ہیں، لیکن جہانگیر نے ایک اور کتاب ''جہانگیر نامہ'' بھی لکھی جو نایاب ہے۔خدابخش خاں کے کتب خانہ میں اس

کتاب کی وہ کاپی ہے جسے جہانگیر نے اپنے دربار کے سب سے بڑے کاتب سے لکھوا کر گولکنڈہ کے بادشاہ قطب شاہ کو تحفۃً بھیجا تھا۔ اورنگزیب کے وقت میں جب گولکنڈہ فتح ہوا تو یہ کتاب اورنگ زیب کے بیٹے شہزادہ سلطان محمد کے قبضے میں آئی۔ اس کتاب کے پہلے صفحے پر شہزادہ سلطان محمد کے دستخط ہیں۔

اوپر میں نے سرسری طور پر چند کتابوں کے نام گنائے ہیں۔ اسی طرح کی نادر کتابوں سے یہ کتب خانہ بھرا پڑا ہے۔

ہماری ناقدری

لیکن افسوس! ہندوستان میں ہم ان نادر علمی اور تاریخی کتابوں کو پڑھنے سے چار چار پیسے کے بیہودہ ناولوں اور رسالوں کا پڑھنا اچھا سمجھتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ نسل کا دماغ بالکل چھچھلا اور سطحی ہوتا جا رہا ہے۔ نہ انہیں اپنی تہذیب، کلچر اور تاریخ سے واقفیت ہے اور نہ ان کے دماغ میں کوئی گہری بات سوچنے کی لیاقت۔ ہم علم اور آرٹ سے دور ہوتے ہوتے بالکل سٹھیا کر رہ گئے ہیں۔ آج کتنے ہندوستانی افسر ہیں جن کی مسہریوں کے سرہانے علم اور ادب کی ایک الماری کتابیں ہیں۔

ایک بار ایک یورپین کتب خانہ دیکھنے آیا۔ خاں بہادر خدابخش خاں نے تمام نادر چیزیں دکھلائیں۔ وہ اتنی اعلیٰ اور بیش قیمت چیزیں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ لیکن جب دیکھا کہ ریڈنگ روم میں ان کتابوں کا پڑھنے والا ایک بھی نہیں تو خدابخش خاں سے کہا "واہ خاں بہادر صاحب، آپ نے یہ کتب خانہ نہیں بنایا ہے، بلکہ کتابوں کا قبرستان بنایا ہے۔ اگر یورپ میں ایسا کتب خانہ ہوتا تو پڑھنے والوں کا جمگھٹ رہتا۔

پیارے دوستو! کیا تم اس مرتبہ پٹنہ جاؤ گے تو اس لائبریری میں چند گھنٹے گزارو گے؟

(خدابخش خاں جیون کہانی/انیس الرحمٰن)

۱۹۳۵ء

☆☆☆

نقی احمد ارشاد
پٹنہ

خان بہادر خدا بخش خاں

ان کے والد سارن کے رہنے والے تھے۔ انگریزی تعلیم حاصل کی۔ وکالت پڑھی اور چوہٹہ پٹنہ میں عالی شان کوٹھی بنوائی۔ باپ بیٹے دونوں کتابوں کے عاشق تھے۔ عظیم آباد تباہ ہو رہا تھا۔ یہ تمام سے کتابیں ہر جتن اور ہر قیمت پر حاصل کر رہے تھے تعلیم سے بھی غافل نہ تھے۔ دو بیٹوں کو بیرسٹری پڑھائی۔ صلاح الدین خدا بخش جن کا قطعہ تاریخ عقد، شاؔد نے نظم کیا۔

''عقد با مہر و مشتری بستند''

۱۸۹۴ء

دوسرے شہاب الدین خدا بخش جن کی اہلیہ ایلس خدا بخش انگلستان کی رہنے والی تھیں اور راقم ان کے اکزبیشن روڈ والے مکان میں اکثر جایا کرتا تھا۔ یہ ۱۹۳۴ء کی بات ہے تیسرے ولی الدین خدا بخش مرحوم۔ افسوس کہ سلسلۂ نسب منقطع ہو گیا۔ مگر وہ کتب خانہ جس کا شاؔد نے قطعہ تاریخ نظم کیا تھا:

''جاوداں ماند این کتب خانہ''

۱۲۹۹ھ

آج شاؔد کی مطبوعہ کتابیں مول لیتا ہے اور تمام دنیا کے اسکالر آج یہاں آتے ہیں۔

☆☆

(شاد کا عہد اور فن۔ از نقی احمد ارشاد)

۱۹۸۲ء

عطاء اللہ پالوی

خدا بخش خاں

دنیا کے شہروں اور دیہاتوں میں، محلوں اور جھونپڑوں میں، جنگلوں اور پہاڑوں میں، دن رات بشری زندگیاں جنم لیتی ہی رہتی ہیں۔ یورپ کی بلّوریں شفاف سرزمین پر، افریقہ کے اسودی سنسار میں اور ایشیا کی سانولی فضا کے اندر، بچّے شب و روز پیدا ہوتے رہتے ہیں، مگر دیش رتن ڈاکٹر راجندر پرشاد اور مسٹر مظہر الحق کے چھپرہ میں، اب سے تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے، ۲راگست ۱۸۴۲ء مطابق ۲۳رجمادی الثانی ۱۲۵۸ھ، مطابق ۱۸رساون ۱۲۴۹ فصلی، مطابق ساون بدی ۱۸رسمبت ۱۸۹۹ کو منگل کے دن شخصے محمد بخش خاں وکیل چھپرہ کے گھر اور بی بی فاطمہ کی گود میں، ایک گورا چِٹا نومولود بچہ دیکھا گیا۔

یہ بچّہ، نہ شاعر تھا نہ ادیب، نہ جنرل تھا نہ طبیب، نہ مصنف تھا نہ خطیب، مگر وہ مشرق سے مغرب تک مشہور ہوا اور رہتی دنیا تک مشہور ہوتا رہے گا۔ وہ ایشیا سے یورپ تک جانا گیا اور جانا جاتا رہے گا۔

اس بچّے کا باپ ''محمد بخش'' مرگیا، اس لئے کہ اپنے نام کے ساتھ رفیع المرتبت اور عظیم الشان نسبت رکھتے ہوئے بھی، بشری فنائیت سے مبرّا نہ تھا۔ مگر — خدا بخش — کیسے مرتا؟ کیسے مرے گا؟ جبکہ وہ — خدا بخش تھا — غیر فانی — زندہ جاوید۔

بڑے آدمیوں کا ہر معاملہ بڑا ہوتا ہے۔ خدا بخش خاں کے آبائی مکان اور وطن کے سلسلے میں بڑا اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ دلّی میں رہنے والے اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ ہیبت اللہ خاں، جو مغلیہ شاہی دربار میں ''فتاویٰ عالمگیری'' کے اسٹاف میں تھے، دلی کی سکونت ترک کرکے بہار چلے آئے تھے اور سارن ضلع کے ایک گاؤں ''اوکھی'' میں بس گئے تھے۔ کوئی کہتا ہے کہ ہیبت اللہ خاں نزدیکی مورثِ اعلیٰ نہیں اور خدا بخش خاں

اوکھن پور کے تھے۔

خدا بخش خاں کے بڑے بیٹے مسٹر صلاح الدین خدا بخش نے، ایک لائق بیٹے کی طرح، اپنے فائق باپ کی بارگاہ میں جو تحریری خراج عقیدت، انگریزی زبان میں پیش کی ہے، اس میں انھوں نے ان موضوعات پر اپنی طرف سے کوئی روشنی نہیں ڈالی، البتہ اپنے مضمون کے فوٹ نوٹ میں، اپنے دادا محمد بخش خاں کی ایک ادھوری فارسی بیاض کا اقتباس پیش کر کے گویا اپنے والد اور خاندان کا وطن ''اوکھی'' قرار دیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

''میرے دادا کی ایک بیاض سے میرے خاندان کا کچھ پتہ چلتا ہے۔
اس بیاض کا قلمی نسخہ جو عمدہ شکستہ خط میں لکھا ہوا ہے، بانکی پور لائبریری میں
ہے۔ اس کے علاوہ، اس سلسلے میں، اب تک کوئی سند مجھے نہیں ملی ہے۔''

پھر کچھ اور آگے بڑھ کر فرمایا ہے کہ:

''اتنا تو ضرور صاف ہے کہ ہمارا خاندان، ابتداءً، دہلی سے آکر چھپرہ
میں بس گیا (Settled down) تھا۔''

محمد بخش خاں ایک وکیل تھے، اور وکیل ہمیشہ دوسروں کے الجھے ہوئے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے کر سلجھاتے رہے ہیں، مگر آج تک نہیں دیکھا گیا کہ کسی مشرقی وکیل نے خود اپنے معاملات کو بھی سلجھائے رکھنے کی کوشش کی ہو۔ محمد بخش خاں نے اپنی بیاض میں اپنے خاندان کا حال لکھنے کے لئے قلم اٹھایا، مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد، کسی وجہ سے قلم رکھ دیا اور ہمیشہ کے لئے رکھ دیا۔ اور غلط فہمیوں کا دروازہ کھول گئے۔

میں نے اصل بیاض دیکھی ہے۔ اس اندراج کا صرف آخری جملہ چھوڑ کر، باقی جو کچھ اس میں ہے، اس کو مسٹر صلاح الدین خدا بخش نے اپنے انگریزی مضمون کے حاشیۂ زیریں میں نقل کر دیا ہے۔ بیاض کے اندراج کی ابتداء یوں ہوئی ہے:

''نسب نامۂ بندہ محمد بخش خاں این ست کہ بندہ ولد جناب علی بخش

مرحوم، ابن شیخ رمضان علی، ابن شیخ محمد باقر، ابن قاضی ہیبت اللہ مرحوم مغفور، صدیقی نسباً و دہلی وطناً، از دہلی آمدہ اوّلاً بمقام اوکھی ضلع سارن مقیم شدند۔ شادی دختر شان بی بی جنگلی از ملا بھتو صاحب کہ از اولادِ مولانا مجدالدین، ساکن دربھنگہ ضلع ترہت بودند،شد۔ وشادی جدّ مرحوم از دختر برادرِ خرد موسومہ بی بی عاصمہ نمودند......''

محمد بخش خاں کے ''جدّ مرحوم'' یعنی دادا، شیخ رمضان علی تھے۔ اور ان کی حقیقی بہن بی بی جنگلی تھیں، جن کی شادی مُلا بھتو سے ہوئی تھی۔ اس عبارت میں لفظ ''شاں'' کی ضمیر محمد باقر کی طرف راجع ہے، کیونکہ بی بی جنگلی، محمد باقر کی بیٹی تھیں، نہ ہیبت اللہ کی؟ اور ''جدّ مرحوم'' سے مراد رمضان علی ہیں، جو محمد باقر کے بیٹے تھے نہ کہ ہیبت اللہ کے؟ بی بی جنگلی اور رمضان علی، دونوں حقیقی بہن بھائی تھے اور محمد باقر کی بیٹی، بیٹا تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ دلی سے ترکِ وطن کر کے آنے والے محمد باقر تھے، نہ کہ ہیبت اللہ؟ عقلاً بھی یہ بات مہمل معلوم ہوتی ہے کہ قاضی ہیبت اللہ، شاہی ملازمت، خواہ مخواہ چھوڑ کے، یہاں بہار آئے اور ''اوکھی'' میں مقیم ہوئے۔ دراصل بات یہ ہے کہ قاضی ہیبت اللہ خاں، شاہی دربار سے تعلق رکھنے کی وجہ سے مشہور تھے، اس لئے محمد بخش خاں نے اپنا نسبی سلسلہ وہاں تک بتایا اور دکھایا ہے، ورنہ قاضی ہیبت اللہ، دلی ہی میں رہے اور وہیں مرے گڑے۔

محمد بخش خاں کا گھر ''اوکھی'' ہونے کا مسئلہ بھی اس لئے الجھ گیا ہے کہ ان کی بیاض کے اندراج کے الفاظ پر کبھی غور نہیں کیا گیا، یا نہیں کیا جاتا۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں:

''از دہلی آمدہ اوّلاً بمقام اوکھی ضلع سارن مقیم شدند۔''

ایک تو لفظ ''اوّلاً'' ہی سے یہ بخوبی ظاہر ہو رہا ہے کہ ''آخراً'' وہاں سے لوگ دوسری جگہ چلے گئے تھے۔ اگر مستقلاً یہ خاندان وہاں رہ اور بس گیا ہوتا تو لفظ ''اوّلاً'' کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ دوسرے لفظ ''مقیم'' کے معنی، کہیں مستقلاً بس جانے والے اور گھر بنا کے رہ جانے کے نہیں ہیں، بلکہ وقتی طور پر فروکش ہونے والے، اقامت اختیار کرنے والے اور عارضی

طور سے ٹھہر جانے والے کے ہیں۔ محشر لکھنوی کا شعر ہے ع

زمیں تپتی ہو جس روز مثل تانبے کے

مقیم آ کے سوا نیزے پہ ہو، مہرِ منیر

تیسرے جو شخص یا جو خاندان، کسی جگہ مستقل رہ جانے کا ارادہ کر لیتا ہے، وہاں بڑا ہو یا چھوٹا، پختہ ہو یا خام، اپنا ایک بُرا بھلا گھر ضرور بنا لیتا ہے۔ کسی شخص کے مکان میں وقتی طور پر تو آدمی ٹھہر سکتا ہے، مستقل نہیں رہ سکتا۔ اور باقر خاں نے اپنا وہاں کوئی گھر نہیں بنایا تھا۔ لہٰذا اس عبارت سے یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ وہ خاندان دلّی سے آ کر اوکھی میں آباد ہوا تھا اور وہیں رہ بس گیا تھا۔ بلکہ عارضی طور پر اوکھی میں ضرور قیام پذیر ہوا تھا۔

یوں تو ہندوستان میں افغانی پٹھان قبائل بالخصوص خلجی اور ان کی کچھ ذیلی شاخیں پہلے سے پٹھان حکومتوں کی خدمتیں انجام دے رہی تھیں، مگر جب لودی شاخ کو اقتدار حاصل ہوا تو سلطان بہلول لودی نے باضابطہ ایک فرمان کے ذریعہ افغانی قبائل کو ہندوستان آ کر آباد ہونے اور حکومت کی خدمات انجام دینے کی دعوت دی۔ اس لئے بے شمار افغانی خلجی قبائل ہندوستان میں درآمد ہوئے، جن میں لودی اور سوری قبائل کی تعداد زیادہ تھی یہاں تک کہ سوری قبیلے کا شیر شاہ ہندوستان کا حکمراں بن گیا تھا۔

شاہ حسین غوری کو دوسری بیوی سے جولڑکا پیدا ہوا تھا، اس کا نام سروانی تھا۔ ان کا مسکن شہر در بند عرف درابھن تھا۔ یہ علاقہ تختِ سلیمان کے دامن میں واقع ہے۔ سروانی قبیلہ اپنے علاقہ میں حکمراں تھا اور ایک مدت تک سروانیوں کی حکومت درابھن پر قائم رہی۔ مگر جب مغلوں کی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی تو خلجیوں پر زوال آ گیا۔ بابر نے جب ہندوستان پر قبضہ کیا تو پٹھانوں کا زور ٹوٹ گیا اور مغلوں کا عمل دخل ہو گیا۔ کچھ خلجی قبائل تو مغل حکومت کی خدمات انجام دیتے رہے، مگر سروانی قبیلہ، فوجی خدمات سے الگ ہو گیا اور اس قبیلے کے لوگ پڑھنے لکھنے میں مصروف ہو گئے۔

شیر شاہ نے جب خروج کیا اور ہمایوں کو شکست دے کر تختِ دہلی پر قبضہ کر لیا تو

سروانی قبیلہ کے لوگ دلی آنے جانے لگے۔ چنانچہ شیر شاہ کے عہد میں سروانی قبیلہ کے ایک صاحبِ علم بزرگ پٹھان شیخ بایزید سروانی دلی آکر شیر شاہ سے ملے تو اس نے بڑے تپاک سے ان کو خوش آمدید کہا اور انہیں علمی خدمات سپُرد کیا جس وجہ سے اور بھی سروانی پٹھان علمی دنیا میں داخل ہوئے۔ اس طور پر سروانی قبیلہ فوجی فضا سے نکل کر علمی دنیا میں داخل ہوگیا۔

ہمایوں نے جب دوبارہ قسمت آزمائی کی اور شیر شاہ کو شکست دے کر، ہندوستان کی حکمرانی حاصل کرلی تو پھر مغلوں کا چراغ جلنے لگا۔ مگر ہمایوں نے، پٹھان سروانی علماء سے کچھ تعرض نہ کیا اور انہیں بدستور اپنی جگہ پر کام کرنے دیا۔ ان ہی علمی پٹھان شیخ بایزید سروانی کی نسل میں، آگے چل کر، عہد عالمگیری میں، ایک صاحبِ علم پٹھان قاضی ہیبت اللہ خاں ہوئے جو خدا بخش خاں کے مورثِ اعلیٰ تھے اور جو ''فتاویٰ عالمگیری'' کی ترتیب و تدوین میں معاون رہے تھے اور تاریخ میں اپنا نام زندہ و پائندہ چھوڑ گئے ہیں۔ اس طور پر خدا بخش خاں، سروانی پٹھان ہیں۔

قاضی ہیبت اللہ خاں کے انتقال کے بعد، محمد باقر خاں کو باپ والی جگہ نہیں ملی۔ کیونکہ جیسا کہ عام طور پر سابق میں دستور تھا، خوشحال خاندان کے لڑکے بالعموم ناخواندہ اور ناکارہ ہوا کرتے تھے، محمد باقر خاں کوئی علمی صلاحیت نہیں رکھتے تھے، لہٰذا شاہی ملازمت کا سلسلہ ختم ہوگیا اور ساتھ ساتھ خوشحالی بھی رخصت ہوگئی۔ ایسی حالت میں کچھ دنوں کے بعد، محمد باقر خاں کے لئے دہلی میں سکونت اختیار کئے رہنا مشکل ہوگیا اور آخرا انہوں نے دہلی چھوڑ کر کسی دیہات میں بود و باش اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

جس جگہ محمد باقر خاں کا قیام تھا، وہیں ایک صاحب بدرالزماں خاں رہتے تھے، محمد باقر خاں سے ان کے اچھے مراسم تھے۔ ان کو جب محمد باقر خاں کا یہ ارادہ معلوم ہوا تو انہوں نے محمد باقر خاں کو، اوکھی چل کر رہنے کا مشورہ دیا، کیوں کہ ان کا گھر ''اوکھی'' تھا۔ یہ سہارا ایسا غنیمت تھا، اس لئے محمد باقر خاں اپنے بیٹا رمضان علی خاں اور بیٹی جنگلی کو لے کر

دلی سے بہار چلے آئے اور ''اوکھی'' میں مقیم ہوئے۔ بدرالزماں خاں خوشحال آدمی تھے، اس لئے انہوں نے، ان کے رہن سہن کا معقول انتظام کردیا۔ اور اس طور پر محمد باقر خاں ''اوکھی'' میں رہنے لگے۔ زمینداری ختم ہونے سے پہلے، یہ علاقہ سیوان کے مشہور رئیس راجہ اسمٰعیل علی خاں کے والد بابو علی بخش خاں کی زمینداری میں تھا۔

گاؤں کا نام ''اوکھی'' (Ukhi) نہیں، بلکہ ''اوکھئی'' (Ukhaie) ہے، جو عرف عام میں ''اوکھیں'' کہلاتا ہے۔ اوکھئی بہت بڑا محال ہے اور وہ بائیس مضافاتی ٹولوں میں منقسم ہے۔ پروپر اوکھئی جو ہے اس میں مسلمان نہیں ہیں، زیادہ تر وہاں اودھیا کورمی اور کمتر دوسری ذاتوں کے ہندو بستے ہیں۔ مسلمانوں کا صرف ایک ٹولہ یا گاؤں ہے جو ''ٹولہ مشرقی معیز الدین حاطہ'' کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں کی ساری آبادی مسلمان ہے۔ اس کا ضلع پہلے چھپرہ تھا، اب سیوان ہے۔

سیوان ٹاؤن کے اوتر سرکاری اسپتال کی طرف سے ایک پختہ سڑک بڑہڑیا جاتی ہے۔ اس روڈ پر سیوان سے چار کیلو میٹر کے بعد ایک سڑک پورب طرف مڑتی ہے، اس سڑک کے نکڑ پر ''مہواری دھام'' کا بورڈ آویزاں ہے۔ ایک کیلو میٹر تک سڑک پر کھڑی اینٹ بچھی ہوئی ہے۔ اس کے اختتام پر ایک خام سڑک بجانب اوتر مختلف ٹولوں سے ہوتی ہوئی اوکھئی جاتی ہے جس کا فاصلہ وہاں سے ۴، ۵ کیلو میٹر ہے۔ اوکھئی کا آخری شمالی ٹولہ ''مشرقی معیز الدین حاطہ'' کہلاتا ہے۔

میں اپنے دوست سید غلام غوث قادری، ریٹائرڈ ہیڈ کلرک رجسٹری آفس سیوان کے ساتھ وہاں گیا۔ بوڑھے لوگ بہت کم ہیں اور زیادہ تر وہ حالات سے بے خبر ہیں۔ تاہم انہوں نے اتنا بتایا کہ خدا بخش خاں کا خاندان دلّی سے آکر یہاں آباد ہوا تھا، مگر جب محمد بخش خاں کی شادی ''اولہن پور'' ہوگئی تو یہ خاندان وہیں چلا گیا۔ وہ لوگ اس سلسلے کی درمیانی کڑیوں کی کوئی واقفیت نہیں رکھتے۔

اوکھئی کے قیام کے دوران شیخ رمضان علی خاں اور اُن کی بہن، بی بی جنگلی کی

شادی دربھنگہ میں یوں ہوئی کہ بڑے بھائی اکبر خاں کے بیٹے ملاّ بھتو سے بی بی جنگلی کی شادی ہوئی اور اکبر خاں کے چھوٹے بھائی احمد خاں کی بیٹی عاصمہ سے رمضان علی خاں کی شادی ہوئی۔ بی بی جنگلی تو سسرال چلی گئیں مگر رمضان علی خاں بدستور اودھئی میں رہے۔

۱۷۸۸ء میں شیخ رمضان علی خاں کا انتقال ہوگیا تو ان کے بیٹے علی بخش خاں نے اودھئی کی سکونت ترک کردی اور ۱۷۹۰ء میں وہ چھپرہ چلے آئے۔ اور دہیانواں محلہ میں مولوی نجم الحسن صاحب کے مکان میں سکونت پذیر ہوئے۔ اس وقت دہیانواں محلہ، شرفائے چھپرہ اور امرائے سارن کا محلہ سمجھا جاتا تھا۔

چھپرہ آکر، علی بخش خاں نے ٹھیکہ داری شروع کی۔ انگریزی عہد میں جو ایک مرتبہ کسی سرکاری محکمہ سے وابستہ ہوجاتا تھا، وہ وہاں مستقل جگہ بنالیتا تھا —— علی بخش خاں کو خوش قسمتی سے سرکاری کام ملنے لگا جس میں ان کو بڑا فروغ حاصل ہوا اور اسی خوش حالی کی وجہ سے ۱۸۰۷ء میں ان کی شادی محمد عوض کی بیٹی حلیمہ سے ہوئی، جو مانجھی کے تھے۔

چھپرہ ٹاؤن سے جو پختہ سڑک پچھم جاتی ہے، وہ شہر سے نکلنے پر دو حصوں میں منقسم ہوجاتی ہے۔ پچھم والی سڑک بنیاپور چلی جاتی ہے اور دوسری دکھن مڑکر آگے بڑھتی ہے۔ اس سے پھر ایک سڑک پچھم نکل کر سیوان چلی جاتی ہے اور دوسری ریول گنج اور مانجھی ہوتی ہوئی یکما جاتی ہے۔ چھپرہ ٹاؤن سے مانجھی ۱۹ کیلومیٹر پچھم دکھن ہے۔

عہد قدیم میں مانجھی کو ''مانجھی گڑھ'' کہا جاتا تھا۔ گڑھ اب بھی موجود ہے جس پر پہلے اس علاقہ کے راجہ کا قلعہ تھا۔ قلعہ کے ختم ہونے کے بعد، اس گڑھ پر گاؤں بس گیا تھا اور گڑھ سے نیچے کاشتکاری ہوتی تھی۔ جب وہاں سڑک بن گئی تو آبادی نیچے چلی گئی اور گڑھ پر کاشتکاری ہونے لگی۔ مانجھی کے اوتری پچھمی حصہ میں مسلمان شرفا کی آبادی تھی اور وہ حصہ ''میاں پٹی'' کے نام سے مشہور تھا اور اب بھی اسے یہی کہا جاتا ہے۔ یہیں شیخ محمد عوض رہتے تھے۔ مگر علی بخش خاں بدستور مستقلاً چھپرہ ہی میں رہتے تھے۔ یہیں ۱۸۱۱ء

میں ان کے بڑے بیٹے احمد بخش خاں اور ۱۸۱۵ء میں ان کے چھوٹے بیٹے محمد بخش خاں پیدا ہوئے جو خدا بخش خاں کے والد تھے۔

خدا بخش خاں نے اکتوبر ۱۸۹۱ء کی رپورٹ میں اپنے والد محمد بخش خاں کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''ولادت ان کی ۱۸۱۰ء میں بقصبہ چھپرہ واقع ہوئی۔''

مگر خود محمد بخش خاں نے اپنی بیاض میں اپنی ولادت کا ذکر یوں کیا ہے:

''تاریخ ولادت محمد بخش خاں ۲۹ رمحرم ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۶ رپوس ۱۲۲۲ فصلی بروز چہارشنبہ مطابق ۱۱ رجنوری ۱۸۱۵ء''

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ محمد باقر کی بیٹی بی بی جنگلی کی شادی ملا بھتو سے ہوئی تھی جو دربھنگہ کے رہنے والے تھے۔ یہ ملا بھتو اپنے آبائی وطن ہی میں رہے مگر ان کے بیٹے ولی اللہ خاں کی شادی موضع کوٹھیا میں شمس الدین خاں کی بیٹی رفیعہ سے ہوئی۔ محمد بخش خاں نے اپنی متذکرہ ادھوری بیاض میں اپنی شادی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ:

''از ملا بھتو صاحب شیخ ولی اللہ پسر بوجود آمدند و شادی شاں بہ موضع کوٹھیا از دختر شیخ شمس الدین صاحب......گردید۔ وشادی کمترین از دختر شیخ ولی اللہ صاحب مرحوم ومغفور است۔''

اس سے ظاہر ہوتا ہے ملا بھتو کے بیٹے شیخ ولی اللہ کی شادی موضع کوٹھیا میں ہوئی تھی جو محمد بخش خاں کے سسر تھے۔

بیاض میں لفظ ''کوھٹا'' لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مگر سارن ضلع کے کسی علاقہ میں بھی ''کوھٹا'' نام کا کوئی گاؤں نہیں ہے۔ چھپرہ میں چالیس برس تک رہا ہوں اور ہر علاقہ و طبقہ کے لوگوں سے میری ملاقات رہی ہے اور میں نے پھر چھپرہ جا کر بطور خاص ہر علاقہ کے لوگوں سے تحقیق کی مگر کسی علاقہ میں کسی گاؤں ''کوھٹا'' کی کسی شخص نے نشاندہی نہیں کی۔ اس لئے یہ قطعی ہے کہ ''کوھٹا'' سارن ضلع میں کوئی گاؤں نہیں ہے۔ اصل حقیقت یہ

ہے کہ مسٹر صلاح الدین خدابخش کے مقالہ میں کاتنٹے کے حرف میں ''کوھتا'' چھپا ہے۔ یہ چھپائی کی غلطی ہے۔ میں نے خود اصل بیاض دیکھی ہے اور میں اس پر متیقن ہوں کہ وہ کوٹھیا ہی ہے جو واقعی پٹھانوں کا ایک مشہور گاؤں ہے۔

اگلے لوگ مرکب حروف، بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ وغیرہ کو دوچشمی ''ھ'' سے نہیں لکھتے تھے۔ خود محمد بخش خاں نے اپنی مذکرہ بیاض میں ''ملاّ بھتو'' کو ''ملاّ بہتو''، ''دربھنگہ'' کو ''دربہنگہ'' اور ''مانجھی'' کو ''مانجہی'' لکھا ہے۔ اسی طرح ہمارے بزرگان ''ی'' پر نقطہ لگانا ضروری سمجھتے تھے۔ ''ٹ'' کے بعد ''ۂ'' تھی مگر ٹائپ میں ''ٹ'' کے پہلے ''ۂ'' فرض کرلی گئی۔ چنانچہ چھپائی میں ''کوٹھیا'' جو بیاض میں ''کوٹہا'' تھا، ''کوھتا'' ہوگیا۔ ورنہ ''کوھتا'' نام کا کوئی گاؤں پورے سارن ضلع میں نہیں ہے۔

چھپرہ ٹاؤن سے اتر، سانڑھا ڈھالا پار کرکے ایک سڑک پچھم بنیاپور جاتی ہے۔ اسی سڑک پر چھپرہ ٹاؤن سے ۱۴ کیلومیٹر پر ''کوٹھیا'' ہے۔ خود کوٹھیا اور اس کے مضافات میں خان برادری کے دو موضع مان پور اور جلال پور ہیں —— جلال پور بہت بڑا گاؤں ہے اس وجہ سے کوٹھیا کو ''کوٹھیا جلال پور'' بھی بولا جاتا ہے۔ کوٹھیا میں اب بھی کافی مسلمان ہیں۔ ولی اللہ خاں، یہیں کوٹھیا میں شادی ہونے کے بعد رہ گئے تھے۔ بعد میں ولی اللہ خاں کی ساس یعنی شمس الدین خاں کی بیوی اپنے میکہ اولہن پور میں رہنے لگی تھیں۔ اور ان کی نواسی یعنی ولی اللہ خاں کی بیٹی ناظمہ اپنی نانی کے ساتھ اولہن پور ہی میں رہتی تھی۔

محمد بخش خاں کی شادی تو کوٹھیا میں ہوئی، مگر چونکہ ان کی بیوی ناظمہ اپنی نانی کے ساتھ اولہن پور میں رہتی تھی اس لئے محمد بخش خاں اولہن پور باشی ہوگئے۔ یہاں تک کہ انھوں نے وہاں اپنا خاص مکان بھی بنا ڈالا تھا۔ اور جب انھوں نے اولہن پور میں اپنا مستقل مکان بنالیا تو اس خاندان کے باقی لوگ بھی اولہن پور آگئے اور یوں خدابخش خاں کا خاندان اولہن پور میں مستقلاً آباد ہوگیا —— یہ بات کہ محمد بخش خاں اور ان کا پورا خاندان اولہن پور میں مستقلاً بس اور آباد ہوگیا تھا، خود خدابخش خاں کی متذکرہ بیاض سے

ثابت ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے منجھلے بیٹے یوسف علی خاں عرف محمد اسمٰعیل خاں کے بیٹے امیرالحسن خاں یعنی اپنے پوتے کی پیدائش کا ذکر اپنی بیاض میں یوں درج کیا ہے:

"تاریخ ولادت با سعادت نورالعین امیرالحسن ابن محمد اسمٰعیل مدعمرہا نوازدہم رجب المرجب ۱۲۸۲ھ مطابق ہشتم دسمبر ۱۸۶۵ء روز جمعہ مطابق ششم پوس ۱۲۷۳ فصلی، و پوس سمبت ۱۹۲۲، بمقام اولہن پور وقت نواخت دو گھنٹہ روز بعد نماز جمعہ۔"

یہ قطعی ثبوت ہے اس امر کا کہ خاندان خدا بخش خاں اولہن پوری تھا اور اولہن پور والوں کا یہ فخر غلط نہیں ہے کہ خدا بخش خاں ہمارے اولہن پور کے تھے۔

چھپرہ ٹاؤن سے اتر، سانڑھا ڈھالا پار کرنے کے بعد جو سڑک سیدھے اتر مڑوڑھا ہوتی ہوئی سیوان جاتی ہے اس پر چھپرہ ٹاؤن سے ۱۵ کیلومیٹر کی دوری پر ایک گاؤں پٹیرا ہے جہاں سے ایک پختہ سڑک پورب مڑ جاتی ہے، جو خدائی باغ ہوتی ہوئی گرکھا جاتی ہے۔ خدائی باغ کے اتر "گنڈکی ندی" بہتی ہے۔ خدائی باغ کی بازاری آبادی ختم کر کے اتر جانب ایک راستہ نیچے ندی میں اُتر جاتا ہے اور ندی پر بندھا ہوا بانس کا پُل پار کر کے اولہن پور شروع ہو جاتا ہے۔ اولہن پور تقریباً سات-آٹھ سو گھروں کا قصبہ ہے جس میں تقریباً دو تہائی مسلمان اور ایک تہائی ہندو آبادی ہے۔ چونکہ میرے متذکرہ بالا دوست سید غلام غوث قادری کی شادی اولہن پور میں ہوئی ہے اس لئے میں ان کے منجھلے لڑکے محمد طفیل قادری کو ساتھ لے کر اولہن پور گیا۔ اولہن پور پرگنہ گوا، تھانہ مڑوڑھا ضلع سارن میں پڑتا ہے۔

میں نے ماسٹر نجم الہدیٰ قادری کی معیت میں بہت سے لوگوں سے ملاقات کی۔ عندالدریافت، پتہ چلا کہ خدا بخش خاں کے خاندان کی آخری یادگار عورت خدیجہ بی بی تھیں، جنہیں گاؤں کے سارے لوگ "خدیجہ دادی" کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اور حال میں یعنی چند برس ہوئے کہ انھوں نے انتقال کیا ہے۔ میں نے وہاں خدا بخش خاں کے

خاندان کا وہ افتادہ مکان بھی دیکھا جو گاؤں کے دکھن ندی کے بالکل کنارے اب بھی موجود ہے۔ خدیجہ بی بی اسی مکان میں رہتی تھیں، اور جس سے وہ اپنا کام دھام کراتی تھیں وہ اسی مکان میں دکھن جانب ایک خام کوٹھری بنا کے اب بھی رہتا ہے۔

محمد بخش خاں نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی تھی۔ پھر وہ کلکتہ چلے گئے تھے اور زیادہ تر وہیں رہتے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے وکالت کا امتحان بھی کلکتہ سے پاس کیا تھا۔ ۱۸۴۰ء میں ان کی شادی ولی اللہ خاں کی بیٹی ناظمہ سے ہوگئی۔ جو اپنی نانی کے ساتھ اولہن پور میں رہتی تھیں۔ شادی کے بعد انہیں مستقل ذریعۂ معاش کی فکر ہوئی۔ موصوف وکالت کا امتحان پاس کئے ہی ہوئے تھے، لہٰذا انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ چھپرہ میں پریکٹس کریں گے، جو صدر مقام بھی تھا اور اولہن پور سے محض ۱۶-۱۷ کیلومیٹر کی دوری پر بھی تھا۔

چھپرہ کا محلّہ دہیانواں ٹاؤن کا سب سے بڑا محلّہ ہے جو دکھن گنگا ندی سے اتر چنور تک، اتر دکھن پھیلا ہوا ہے۔ اس عہد میں دہیانواں (اور کریم چک) معزز شرفائے شہر اور اکابرین چھپرہ کا محلّہ تھا اور سول کورٹ محلّہ دہیانواں میں ہی تھا اور اب بھی ہے۔ محمد بخش خاں نے چھپرہ میں پریکٹس کرنے کا فیصلہ کیا تو دہیانواں میں مولوی الٰہی بخش صاحب کا ایک مکان کرایہ پر لے لیا اور وہیں رہائش اختیار کی۔

اتری اور دکھنی دہیانواں کے درمیان میں شاہراہ اور ریلوے لائن دونوں واقع ہے۔ شاہراہ کے اوتر ایک وسیع قطعۂ زمین ہتھوا مہاراج کی تھی جس میں لب سڑک چند مکان بنے ہوئے تھے جو کرایے پر چلتے تھے۔ ان میں سے بھی ایک مکان جس میں دو کمرہ اور ایک سائبان تھا محمد بخش خاں نے کرایہ پر لے رکھا تھا۔ یہ مکان وہاں پر تھا جہاں پر ۱۹۳۵ میں موجودہ گرجا بنا اور اب تک قائم ہے۔ اس مکان کی خوبی یہ تھی کہ وہ نہ صرف لب سڑک تھا بلکہ کچہری سے بالکل قریب چند قدم پر تھا۔ ایک کمرہ میں وہ چیمبر پریکٹس کرتے تھے۔ یعنی دہیانواں والی رہائش گاہ سے صبح اور شام کو وہ اس مکان میں چلے آتے

تھے اور کام کرتے تھے۔ اور رات کو رہائشی مکان میں جاکر آرام کرتے تھے۔ سنیچر کی شام کو وہ ادلہن پور چلے جاتے تھے اور سمبار کی صبح کو وہ چھپرہ چلے آتے تھے۔

دوسرے کمرہ میں محمد بخش خاں نے اپنی ایک لائبریری قائم کررکھی تھی۔ جس کا نام ''محمدیہ کتب خانہ'' تھا جس میں انگریزی اور فارسی کی کتابیں تھیں۔ اس لئے اس لائبریری میں ہندوستانی بھی آتے تھے اور انگریز بھی۔ محمد بخش خاں نے چھپرہ اور مضافاتِ چھپرہ سے بہت سی کتابیں حاصل کی تھیں۔ اور اپنی لائبریری میں برابر اضافہ کرتے رہے تھے۔ یہ کتابیں قلمی اور مطبوعہ دونوں تھیں۔

محمد بخش خاں بڑی اعلیٰ درجہ کی ذہانت، فطانت اور طلاقت کے مالک تھے اس لئے چھپرہ میں وہ بحیثیت وکیل بہت جلد معروف و مقبول ہوگئے۔ ان کی قانونی صلاحیت کی اس درجہ شہرت ہوئی کہ وہ چھپرہ میں ''بارسٹر صاحب'' کے نام سے مشہور تھے۔ محمد بخش خاں کے اور خاندان والے تو بدستور اولہن پور میں رہتے تھے مگر ان کی اہلیہ دہیانواں میں ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ یہیں ۱۸۴۲ء میں خدا بخش خاں پیدا ہوئے۔

محمد بخش خاں چونکہ اے گریڈ کے وکیل سمجھے جانے لگے تھے، اس لئے کچھ ہی برسوں کے بعد ان کے دوستوں بالخصوص انگریز دوستوں نے انہیں مشورہ دینا شروع کردیا کہ انہیں پٹنہ میں وکالت کرنی چاہیے۔ مسلسل ترغیب وتحریک کی وجہ سے بالآخر محمد بخش خاں نے فیصلہ کرلیا کہ واقعی انہیں پٹنہ چلا جانا چاہیے۔ چنانچہ ۱۸۵۳ء میں انھوں نے چھپرہ چھوڑ دیا اور اپنی لائبریری اور فیملی کو لے کر پٹنہ چلے آئے۔ اس وقت تک ان کے باقی دونوں بیٹے یوسف علی خاں عرف محمد اسمٰعیل علی خاں اور جعفرعلی خاں عرف ابوالحسن خاں بھی پیدا ہوچکے تھے۔

اب قبل اس کے کہ آگے کی بات بیان کی جائے یہاں ضمنی طور پر میں ایک غیر ضروری بات عرض کرنی ضروری سمجھتا ہوں۔ محمد بخش خاں کے بڑے بیٹے خدا بخش خاں تھے۔ اور یوسف علی خاں عرف اسمٰعیل علی خاں منجھلے۔ اور جعفرعلی خاں عرف ابوالحسن خاں

سب سے چھوٹے تھے۔ محمد بخش خاں کو اپنے منجھلے بیٹے یوسف علی خاں سے اسی طرح زیادہ محبت تھی جس طرح حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنے بارہ بیٹوں میں سے یوسف علیہ السلام سے تھی۔ کیونکہ محمد بخش خاں نے اپنے تینوں بیٹوں کی تاریخ ولادت اپنی بیاض میں درج کی ہے، مگر عجیب بات یہ ہے کہ صرف منجھلے بیٹے یوسف علی خاں کی تاریخِ ولادت کے اندراج کے ساتھ ساتھ انہوں نے خواجہ فیض اللہ فرحت کا کہا ہوا دو، دو فارسی قطعۂ تاریخ ولادت بھی درج کیا ہے۔

(۱)

آں فاضل متین کہ ناش محمد است — درعالمانِ کشورِ ہند، افسرآمدہ
از یاوریِ طالع فرخندہ دربرش — طفل خجستہ پے، چو مہ انور آمدہ
رقصیدہ زہرا برفلک از فرطِ خرّمی — تا در کنار دایۂ دہر، اختر آمدہ
شدحاصلش زباغ تمنا، گل مراد — مانند لالہ درکفِ دستش، زر آمدہ
سالِ ولادتش ز، زبانم، بہ بزم فکر
"دلبند بے نظیر" بدیہی بر آمدہ
۱۲۶۲ھ

(۲)

آں گرامی منش، محمد بخش — کہ بہ علم است بے نظیر و عدیل
بست و ہفتم بماہ ذی الحجہ — طفل پیدا شدہ، حسین و جمیل
شرفے یافت مادرِ ایام — شمس گویا برآمد از تحویل
کرد اُو را عطا چو از کفِ جود — گوہر شب چراغ، ربّ جلیل
شصت و دو زاید از ہزار دو صد — بود سالِ تولدش، بے قیل

خواستم گوہرے بہ کف آرم   کہ برم ہدیہ پیش خلیل
گفت فرحت بدیہہ تاریخش
''شوخ دل جوے محمد اسمٰعیل''
۱۲۶۲ھ

کہا جاتا ہے کہ ہر شخص کو سب سے پہلی، یا سب سے آخری اولاد سے زیادہ پُر شفقت انسیت ہوتی ہے مگر محمد بخش خاں کی انسیت منجھلے بیٹے سے زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ قطعۂ تاریخ سے بھی اور خود نام سے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علی خاں، غیر معمولی خوبصورت تھے۔ اس لئے ممکن ہے اسی وجہ سے محمد بخش کا رجحان اس بیٹے کی طرف زیادہ رہا ہو۔ مگر یہ بھی کرشمۂ قدرت ہے، یا قدرت کی ستم ظریفی کہ جو بیٹا ان کے دل کے قریب تھا، اس کو یا اس کی اولاد کو ان کی لائبریری کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیا گیا۔ جس بیٹے کو وہ سب سے زیادہ مانتے تھے اس بیٹے اور اس کی اولاد کا ان کی لائبریری سے آج تک کوئی علاقہ وسروکار نہ رہا۔ جو کچھ تعلق ہوا وہ ان کے بڑے بیٹے یا چھوٹے بیٹے یا ان دونوں کی اولاد سے۔ واقعی کسی شخص کی اپنی خواہش قدرت کے انتظام میں دخیل نہیں ہوا کرتی۔

محمد بخش خاں اپنی ''محمد یہ لائبریری'' کو چھپرہ سے پٹنہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ انھیں چھپرہ کے مشرقی گاؤں، گھگھٹا سے بھی، جو شرفاء اور علماء کا مسلّمہ گاؤں تھا، بہت سی قلمی عمدہ کتابیں حاصل ہوئی تھیں۔ اور کچھ کتابیں انھیں دہیانواں میں مولوی صالح حسین صاحب چھپروی (شاگرد حضرت شادؔ عظیم آبادی) کے دادا، سید مبارک حسین صاحب رئیس چھپرہ سے بھی ملی تھیں جو چھپرہ ٹاؤن کی بارہ آنہ زمینداری کے مالک تھے اور بڑے صاحب علم رئیس تھے۔

محمد بخش خاں نے پٹنہ آنے کے بعد محلّہ مراد پور چوہٹہ میں دریا کے کنارے ایک مکان لے لیا اور پریکٹس کرنے لگے۔ شاید اُن کو دریا کا کنارہ بہت پسند تھا کیونکہ اولہن پور میں بھی انھوں نے لب دریا اپنا مکان بنوایا تھا۔

موجودہ خدا بخش لائبریری اور گورنمنٹ اردو لائبریری کے درمیان جو اس وقت پختہ سڑک، اتر دریا کے کنارے تک گئی ہے وہی راستہ ان کے مکان میں جانے کا تھا۔ اس وقت یہ سڑک خام تھی۔ اور جہاں اس وقت خدا بخش لائبریری کا پورا احاطہ واقع ہے، وہاں پر ایک غیر آباد کٹہل کا گھنا باغ تھا۔

پٹنہ آنے کے بعد واقعی محمد بخش خاں کی پریکٹس فوراً جم گئی۔ اور جیسے جیسے ان کی پریکٹس بڑھتی گئی ویسے ویسے ان کا کتابوں کے جمع کرنے کا شوق بھی بڑھتا گیا۔ یہاں بھی انھوں نے اپنے رہائشی مکان کے ایک کمرے میں اپنا ''محمدیہ کتب خانہ'' بدستور قائم رکھا تھا اور کتابوں کی فراہمی بھی کرتے رہے تھے۔ پٹنہ کے تمام بڑے چھوٹے انگریز اور ہندوستانی افسروں سے ان کے مراسم گہرے ہوگئے تھے۔

جب محمد بخش خاں نے چھپرہ کی پریکٹس چھوڑ دی اور پٹنہ آکر وکالت کرنے لگے تو اپنی بیوی بچوں کو ساتھ لیتے آئے تھے۔ اس وقت خدا بخش خاں دس، گیارہ برس کے لڑکے تھے اور باپ ہی سے تعلیم حاصل کررہے تھے۔ پھر جب ان کی پریکٹس جم گئی اور ذریعہ آمدنی قائم ہوگیا تو انھوں نے اپنے بیٹوں کو دوسرے صاحب علموں سے پڑھوانا شروع کیا۔ حضرت شاد عظیم آبادی کے پوتے جناب نقی احمد ارشاد نے ''شاد کا عہد اور فن'' میں شاد کی ایک عبارت نقل کی ہے، جس میں ہے کہ:

> ''بعد کو سید صاحب نے مولوی لطف علی صاحب سے پڑھنا شروع کیا، یہ بزرگ، فرنگی محل سے تازہ تحصیل کرکے آئے تھے۔ اور خان بہادر مولوی خدا بخش خاں وکیل اور ان کے بھائی مسٹر ابوالحسن خاں کے پڑھانے کو، بعد کو چوہٹہ میں رہنے لگے۔''

انگریز بڑے دور بیں واقع ہوئے تھے اور وہ ہندوستانیوں کو انگریزی زبان اور مروجہ مغربی علوم وفنون کی طرف زیادہ سے زیادہ راغب کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ چونکہ خدا بخش خاں کو انگریز افسر برابر دیکھتے تھے اس لئے ان کی ذہانت وفطانت کی

بنا پر انھوں نے محمد بخش خاں کو مشورہ دیا کہ وہ خدا بخش خاں کو انگریزی اسکول میں داخل کرادیں۔ اِس ترغیب وتحریک کے سب سے بڑے علَم بردار مسٹر ٹراورس(Travers) تھے، جو پٹنہ میں ڈسٹرکٹ جج تھے۔ چنانچہ محمد بخش خاں نے، خدا بخش خاں کو پٹنہ کالجیٹ اسکول میں داخل کرادیا جو بعد میں ضلع اسکول کہلاتا تھا۔ مگر جب ۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں کے لفظوں میں پہلی جنگِ آزادی چھڑ گئی اور انگریزوں کے مطابق غدر برپا ہوگیا تو پٹنہ پر بھی اس کا اثر پڑا اور وہ اسکول ختم ہوگیا۔

انگریزی اسکول کے ختم ہوجانے کی وجہ سے محمد بخش خاں نے بیٹے کو انگریزی تعلیم کے لئے اپنے رشتہ مند، خان بہادر نواب امیر علی خاں کے پاس کلکتہ بھجوادیا جو وہاں وکالت کرتے تھے۔ ۱۸۶۱ء میں خدا بخش خاں نے کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک پاس کرلیا اور پٹنہ آکر قانون کا مطالعہ شروع کردیا۔ اس زمانے میں پٹنہ میں کوئی ''لا کالج'' نہیں تھا بلکہ لوگ قانون کی کتابیں از خود پڑھ کر تیاری کرتے رہتے تھے۔ ہر سال کلکتہ سے ماہرین قانون کی ایک ٹیم آتی تھی اور اس کا اجلاس پٹنہ میں منعقد ہوتا تھا اور وکالت پڑھنے والوں کا امتحان لیا جاتا تھا جو لوگ پاس کرجاتے تھے ان کو وکالت کا سرٹیفکیٹ مل جایا کرتا تھا۔ خدا بخش خاں نے بھی امتحان دیا اور پاس کرگئے اور اس کے بعد انہوں نے پریکٹس شروع کردی۔

محمد بخش خاں کا وکالت کے سوا کوئی اور ذریعہ معاش نہ تھا اس لئے وہ اپنی بساط سے زیادہ اس پیشے میں محنت کرتے تھے اور چونکہ کامیاب وکیل تھے اس لئے مرجوعہ بھی کافی تھا۔ نتیجتاً اس محنتِ شاقہ کا ان کی صحت پر برا اثر پڑا اور وہ پریکٹس کرنے سے معذور ہوگئے۔ ابھی ان کی زبان قابو میں تھی اس لئے انھوں نے خدا بخش خاں کو وصیت یا ہدایت کی اور ان سے وعدہ لیا کہ وہ ان کی قائم کردہ لائبریری کو نہ صرف باقی رکھیں گے بلکہ جہاں تک ممکن ہوگا اس میں اضافہ کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ وہ اس لائبریری کو پبلک لائبریری کے روپ میں لے آئیں گے تاکہ عوام اس سے مستفیض ہوسکیں —— آخر میں

ان پر فالج کا حملہ ہوگیا اور چلنا پھرنا تو الگ رہا، وہ بولنے سے بھی محروم ہوگئے اور بڑی تکلیف و معذوری کی زندگی کئی برس گزار کے ۲۰/ اکتوبر ۱۸۷۶ء کو انتقال کر گئے۔

اس گھر کے چلنے کا دارومدار، محمد بخش خاں کی وکالت کی کمائی پر تھا۔ جب وہ باقی نہ رہی تو ناچار خدا بخش خاں نے مطالعہ قانون بھی جاری رکھا اور سول کورٹ میں نوکری بھی کرلی۔ مسٹر لٹور (Latour) ڈسٹرکٹ جج سے نہ بنی اور کچھ دنوں کے بعد انھوں نے استعفاء دے دیا۔ اور محکمہ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوگئے، مگر ابھی پندرہ ماہ ہی ملازمت کئے ہوئے بیتے تھے کہ اس درمیان میں کلکتہ کی وکالت کا امتحان لینے والی ٹیم پٹنہ آگئی۔ خدا بخش خاں نے بھی امتحان دیا اور پاس کرگئے۔ اور جنوری ۱۸۶۸ء سے انھوں نے وکالت شروع کردی۔ مشہور وکیل کے بیٹے، خدا داد صلاحیتوں کے مالک اور اس عہد کے اگزیکیوٹو اور جوڈیشیری افسروں سے روشناس تھے۔ اس لئے وکالت فوراً چل گئی اور جب چلی تو خوب ہی چلی۔

محمد بخش خاں کے ایک گہرے انگریز دوست سر لوئس جیکسن (Sir Louis Jackson) تھے، جو پٹنہ میں ڈسٹرکٹ جج رہ چکے تھے، اب وہ کلکتہ ہائی کورٹ کے جج ہو چکے تھے۔ جب انسپکشن میں وہ پٹنہ آئے اور ایک مقدمہ میں، ان کی موجودگی میں، خدا بخش خاں نے بحیثیت وکیل، اپنے مؤکل کا کیس بڑی خوبی اور خوبصورتی سے حاکم کے سامنے پیش کیا، تو وہ خدا بخش خاں کی ذہانت، قانونی موشگافی اور دلائل کی مضبوطی سے بڑا متاثر ہوا اور جب بعد میں اس کو معلوم ہوا کہ وہ اس کے دوست محمد بخش خاں کے بیٹے ہیں، تو وہ ان سے ذاتی طور پر ملا اور اس نے ان کو ججی کا عہدہ، اس شرط کے ساتھ پیش کیا کہ وہ بعد میں وضعِ آئین کے محکمہ سول سروس میں لے لیے جائیں گے۔ مگر خدا بخش خاں نے ملازمت کرنے سے ہی انکار کردیا۔

۱۸۷۵ء میں خدا بخش کو اسکول کمیٹی کا سکریٹری بنا دیا گیا۔ تو انھوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں اور انگریز افسران اس قدر خوش ہوئے کہ ۱۸۷۷ء میں، دہلی دربار کے

موقع پر، انھیں دعوت دی گئی اور ''سندِ عزت'' (Certificate of Honour) عطا ہوا۔

۱۸۸۰ء میں لارڈ رپن (Rippon) ساتویں وائسرائے کی حیثیت سے ہندوستان تشریف لائے۔ انھوں نے ملک میں کچھ اصلاحات نافذ کیں اور ہندوستانیوں کو، انتظامی امور میں دخیل بنا کے، ان کی انتظامی اہلیت کا اندازہ کرنے کے لیے لوکل سلف گورنمنٹ کے محکمے، یعنی ڈسٹرکٹ بورڈ، لوکل بورڈ اور میونسپل بورڈ قائم کیے۔ پٹنہ ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل بورڈ کے وائس چیئرمین کا عہدہ خدا بخش خاں کو تفویض ہوا۔ اور چونکہ خدا بخش خاں کی، بحیثیت وکیل، عظمت و شہرت مسلّم ہو چکی تھی، اس لیے انھیں سرکاری وکیل مقرر کیا گیا۔

لارڈ رپن کا عہدِ حکومت ۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۴ء تک رہا۔ وہ خدا بخش خاں کے بڑے قدردان تھے۔ وہ دور، وہ تھا جب کم ہی ہندوستانی، بالخصوص مسلمان، انگریزوں کے ہوا خواہ اور برطانوی حکومت کے سچے ہمدرد سمجھے جاتے تھے۔ بہاری مسلمانوں میں خدا بخش خاں بھی خیرخواہِ گورنمنٹ انگلشیہ متصوّر ہوتے تھے، اس لیے لارڈ رپن ان کے بڑے قدرداں تھے اور انھی کی سفارش پر خدا بخش خاں کو ۱۸۸۳ء میں ''خان بہادر'' کا خطاب عطا ہوا تھا۔

۱۸۹۴ء میں، خدا بخش خاں کی شہرت بحیثیت وکیل، دور دور تک پھیل چکی تھی۔ مسٹر سید ہمایوں مرزا نے اپنی خودنوشت سوانح حیات ''میری کہانی میری زبانی'' میں لکھا ہے کہ:

> ''مولوی زین الدین خاں مرحوم کے بڑے فرزند مولوی سید حسین صاحب مخاطب بہ نواب عماد الملک، حیدرآباد پہلے سے آچکے تھے۔ مختار الملک مرحوم، ان کو لکھنؤ سے اپنے ہمراہ لائے تھے۔ اور پہلے اپنا پرائیوٹ سکریٹری بنایا اور سفرِ یورپ میں اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ مولوی سید حسین صاحب سے بھی خدا بخش خاں صاحب نے مجھے لے جا کر ملایا تھا اور جب میں نے ان سے یہ کہا کہ آپ میرے والد کے دوستوں میں ہیں، تو بولے کہ میں، آپ کے والد کا

خُرد تھا۔ میں جب کلکتہ کے پریسڈنسی کالج میں پڑھتا تھا تو حضرت کے حضور میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ وہ میرے بزرگوں کے ملنے والوں میں تھے۔

سید علی صاحب، خدا بخش خاں صاحب کے ہاں اکثر آیا کرتے تھے اور سید علی صاحب سے بھی، جب کہ بی۔اے پاس کرنے کے بعد پٹنہ کالج میں پروفیسر تھے تو خدا بخش خاں صاحب اور سید علی صاحب کے کُل خاندان والوں سے بہت ربط تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خدا بخش خاں صاحب کے حیدرآباد آنے کے سبب وہی ہوئے تھے۔

ایک مقدمہ فاروق یار جنگ تاجر چرم بمقابلہ عالم علی خاں دلاور نواز جنگ جمعدار نظم جمعیت سے ایک کمیشن کے آگے زیرِ تحقیقات تھا اور سید علی صاحب اس کمیشن کے ایک رُکن تھے۔ دلاور نواز جنگ سے کہہ کر، ان کی جانب سے پیروی کرنے کے لیے خدا بخش خاں صاحب کو دس ہزار فیس پر بلایا تھا۔ اب سید علی صاحب کو اور خدا بخش خاں صاحب کو یہ فکر ہوئی کہ حیدرآباد میں رہ جائیں۔ ایک زمانہ میں خدا بخش خاں صاحب کو بحیثیت ایک لائق اور قانون داں ہونے کے وکالت میں بہت فروغ پٹنہ میں ہوا تھا اور بہت دولت بھی کمائی تھی۔ مگر اخیر زمانہ میں ان کی وکالت بیٹھ گئی تھی، اس لیے چاہتے تھے کہ بغیر جانفشانی کے کافی مستقل آمدنی ہو جائے اور یہی صورت اس کی نکالی گئی کہ حیدرآباد ہائی کورٹ کے میر مجلس جو اس زمانہ میں تقرر طلب تھی، ان کو مل جائے۔

مولوی سید افضل حسین مرحوم منصرم میر مجلس تھے۔ سید علی صاحب نے، خان صاحب کی سفارش، آغا مرزا بیگ مخاطب بہ سرور الملک جو غفران مکان مرحوم کے استاد بھی رہ چکے تھے اور اس زمانہ میں معتمد پیش ہی کیا، مختارِ کل تھے۔ سابق حضور نظام محبوب علی خاں مرحوم و مغفور ان پر بہت بھروسہ کرتے تھے اور نواب سرور الملک مرحوم بھی بڑے ہی خواہ و جاں نثار اپنے آقا کے تھے۔ غرض،

سرور الملک مرحوم نے ریذیڈنسی کو لکھا کہ کلکتہ ہائی کورٹ کو لکھ کر چند نام، نامی گرامی مسلمان وکلا اور جوڈیشیل عہدہ داروں کے طلب کیے جائیں۔ کلکتہ ہائی کورٹ کے ججوں میں جسٹس، لعنی میر مجلس، خدا بخش خاں صاحب کا بڑا مربی تھا۔ دکھانے کے لیے چند نام آئے۔ حالانکہ خدا بخش خاں صاحب کلکتہ ہائی کورٹ کے وکیل نہ تھے بلکہ پٹنہ ہائی کورٹ میں مدت العمر وکالت کی۔ لیکن ان کا نام بھی کلکتہ ہائی کورٹ سے آ گیا۔

چونکہ سرور الملک بہادر نے خدا بخش خاں صاحب کو دیکھ لیا تھا اور مقدمہ کی پیروی جس قابلیت سے کی، اس سے بھی واقف ہو چکے تھے اور سید علی صاحب نے، جو اس زمانہ میں سرور الملک مرحوم کے بڑے دوست تھے، پُرزور سفارش کی تھی، خدا بخش خاں صاحب کا تقرر تین سال کے لیے کر لیا گیا۔ اگر سرور الملک مرحوم حیدر آباد سے علیحدہ نہ ہو جاتے تو خدا بخش خاں صاحب مستقل چیف جسٹس ہو جاتے۔ بہر حال تین برس رہے اور مدتِ ملازمت میں توسیع بھی نہ ملی۔ بعد انقضائے مدتِ سہ سالہ، خدا بخش خاں صاحب، پٹنہ واپس چلے گئے"۔

مسٹر ہمایوں مرزا بار ایٹ لا، کا آبائی مکان محلہ ببوا گنج پٹنہ میں تھا۔ وہ دسمبر ۱۸۷۰ء/۱۲۸۶ھ میں، پٹنہ ہی میں پیدا ہوئے اور ۲۱ر رمضان ۱۳۵۷ھ/ ۱۹۳۸ء کو انتقال فرما گئے۔ انھوں نے انگلستان اور جرمنی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ بڑے قابل آدمی تھے۔ وہ جب حیدر آباد گئے تو وہاں خدا بخش خاں کے ساتھ ہی ٹھہرے تھے۔ اور انھیں وہاں خدا بخش خاں نے ہی لوگوں سے ملایا تھا۔ انھوں نے ۱۹۳۴ء میں خودنوشت سوانح حیات اردو میں لکھی تھی، جس میں انھوں نے سر سید علی امام، سید حسن امام، سر فخر الدین اور سر سید سلطان احمد، سب کا ذکر کیا ہے اور اپنے وطن پٹنہ کی بڑے والہانہ انداز میں تعریف کی ہے۔ چونکہ خدا بخش خاں کے حیدر آباد جانے کا موصوف نے تفصیل سے ذکر کیا تھا، اس لیے میں نے یہاں ان کی تحریر نقل کی ہے جو سند کی حیثیت رکھتی ہے۔

بہار کے بے نظیر شاعر، سید عبدالغفور شہبازؔ بھی پٹنہ ہی کے تھے۔ اس لیے شہبازؔ اور خدابخش خاں میں دوستانہ راہ و رسم قائم تھے۔ ۱۸۸۳ء میں شہبازؔ کلکتہ چلے گئے تھے اور وہاں سے ''دارالسلطنت'' اور ''اردو گائیڈ'' کے بعد، ۱۸۸۴ء سے ایک ادبی ماہوار رسالہ ''نور بصیرت'' کے نام سے نکالنے لگے تھے۔ ''نور بصیرت'' مکمل طور پر نثر میں شائع ہونے والا اردو زبان کا سب سے پہلا ماہنامہ تھا۔ حیرت ہے کہ خدابخش خاں کی لائبریری میں اس رسالہ کی کوئی کاپی موجود نہیں ہے۔ ۱۸۹۲ء میں، شہبازؔ، اورنگ آباد کالج میں طبیعیات کے پروفیسر ہوکر دکن چلے گئے تھے۔ ۱۸۹۴ء میں جب خدابخش خاں، حیدرآباد گئے اور وہاں چیف جسٹس کے عہدے پر فائز ہوگئے تو پھر شہباز سے ربط و ضبط پیدا ہوگیا۔

جس طرح دلّی کی ادبی فضا میں، نظیرؔ اکبرآبادی، سب شاعروں سے الگ اپنا ایک خاص رنگ اور خاص مقام رکھتے تھے، اسی طرح شہبازؔ، پٹنہ کے غزل گویوں میں، اپنی ایک مخصوص جگہ بنائے ہوئے تھے۔ شہبازؔ، نظیرؔ اکبرآبادی کو، اردو زبان کا سب سے بڑا شاعر گردانتے تھے۔ شہبازؔ، نظیرؔ ہی کی طرح پیش افتادہ عنوانات پر طبع آزمائی کرتے تھے اور جس موضوع پر قلم اٹھاتے تھے، نظیرؔ ہی کی طرح، اس کے کسی رُخ اور کسی پہلو کو نظرانداز نہیں کرتے تھے۔ دونوں کا رُجحان طبع ایک تھا۔ اس لیے شہبازؔ، نظیرؔ کے پرستار بھی تھے اور مقلد بھی۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح دلّی کے غزل گویوں نے نظیرؔ کو کوئی مقام نہیں دیا تھا، اسی طرح پٹنہ کے غزل سراؤں کو، شہبازؔ، عوامی شاعر معلوم ہوئے اور انھوں نے ان کو گنوار قرار دے کر، ان کی پذیرائی نہیں کی۔ جس طرح نظیرؔ، دلی کے شعرا میں مردود قرار پا گئے تھے، اسی طرح شہبازؔ، عظیم آبادی غزل گویوں کے نزدیک ناقابل اعتنا قرار پا گئے تھے۔ شہبازؔ، اردو زبان کا تنہا شاعر یا ادیب ہے، جس نے سب سے پہلے نظیرؔ کی عظمت کو تسلیم کر کے ان کی ضخیم سوانح عمری ''زندگانیٔ بے نظیر'' کے نام سے لکھی تھی۔ انھوں نے نظیرؔ کی طرف سے شرفا اور شعرا کی کبیدگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نظیرؔ، اردو زبان کا ایسا مردود شاعر قرار پایا ہوا تھا اور اس قدر بدنام و رسوا تھا کہ جب میں نے اپنے دوستوں سے نظیرؔ کی

سوانح عمری لکھنے کا ذکر کیا تو انھوں نے بھی تبسّم زیرِلبی فرمایا۔ بہرحال! شہبازؔ نے کسی کی پروا نہ کی اور نظیر کی سوانح عمری لکھ کر ہی دم لیا۔

دکن ہائی کورٹ کا سابق چیف جسٹس، نہایت ظالم اور بے ایمان مشہور تھا، جس وجہ سے وہاں کے عوام اس سے بے حد ناخوش تھے۔ اس کی برطرفی کے بعد وہ جگہ خالی تھی اور خدا بخش خاں چیف جسٹس بحال کیے گئے۔ اس موقع پر شہبازؔ نے ۲۷ بند کا ایک مخمس لکھا تھا جس میں انسانی سرسبزی پر، نباتاتی دنیا کی مسرت و شادمانی کو ظاہر کیا گیا تھا۔

سبزی اور پھل، وہ اشیاء ہیں، جو انسانی خوراک ہونے کی وجہ سے انسانی سنگدلی، بے رحمی اور چیرہ دستی کا شکار ہوا کرتی ہیں۔ شہبازؔ نے شاعرانہ انداز میں دکھایا ہے کہ خدا بخش خاں کا عدل و انصاف، اس پایے کا تھا کہ انسان کا ظلم و ستم انسان پر سے تو ختم ہی ہوا تھا، پھلوں اور ترکاریوں کو بھی خوشی تھی کہ خدا بخش خاں کے سے انصاف ور چیف جسٹس کے بحال ہونے سے، وہ بھی انسانی جَور و تعدی سے محفوظ ہو گئے ہیں۔ دراصل شہبازؔ نے، خدا بخش خاں کی عام انصاف وری سے دکن کے لوگوں کے مسرور اور خوش ہونے کا نقشہ، شاعرانہ حیثیت سے یوں پیش کیا ہے۔ اس نظم کا چھبیسواں بند خوب ہے۔ خدا بخش خاں چیف جسٹس کیسے ہوئے؟ اس کو وہ یوں بیان کرتے ہیں:

جب ایما سے دہقانِ تقدیر کے　　　چقندر نے "چ" دی، کریلے نے "ے"
دیا "ج" گاجر نے، خرفے نے "ف"　　　دیئے "س" کسیرو نے، بھٹے نے "ٹ"

ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

شہبازؔ کی یہ طویل نظم، شہبازؔ کے مختصر مجموعۂ نظم "فرحت القلوب" میں شامل اور موجود ہے، جس کو شہبازؔ کے نواسہ سید اختر حسن نے ۱۹۴۱ء/ ۶۱ ۱۳ھ میں ستارۂ ہند پریس کلکتہ سے نہایت پاکیزہ طور پر شائع کرایا تھا۔ اس کتاب کا دیباچہ سر عبدالقادر نے اور قطعۂ تاریخ خان بہادر رضا علی وحشتؔ نے لکھا تھا۔

خدا بخش خاں کی معدلت گستری کو، اس اندازِ بیان سے زیادہ خوبصورت بنا کے، نہیں پیش

کیا جا سکتا تھا۔ شہباز، فلسفۂ انسانی کی باریکیوں کو نظم کرنے میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے۔ اور جو کوئی بھی، خدا بخش خاں کی عدالت و انصاف وری کو پیش کرتا تو وہی، پیش پا افتادہ مُرا، پٹا انداز اختیار کرتا، یا پھر ایسا مبالغہ کرتا، جس کو پڑھ کر ذرا خوشی نہ ہو۔

۱۸۹۸ء میں، خدا بخش خاں، حیدرآباد سے ریٹائر ہو کر پٹنہ آ گئے اور انھوں نے وکالت شروع کر دی۔ ۱۹۰۳ء میں انھیں حکومت نے C.I.E. (Companion of Indian Empire) کا خطاب عطا کیا، جو اس وقت شاذ و نادر ہی ہندوستانیوں کو ملا کرتا تھا۔ اسی سال انھیں کلکتہ یونیورسٹی کی ''فیلوشپ'' بھی ملی۔

خدا بخش خاں، کے مذہبی معتقدات کے بارے میں، ان کے بیٹے مسٹر صلاح الدین خدا بخش نے بھی، اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں، مگر وہ مذہبی آدمی نہ تھے۔ اس بارے میں ایک مذہبی آدمی ہی کی رائے زیادہ باوقعت ہوگی۔ علامہ معین الدین ندوی نے لکھا ہے:

''خدا بخش خاں مرحوم، ایک راسخ العقیدہ اور پابند شریعت مسلمان تھے۔ نماز پنجگانہ کبھی فوت نہیں ہوئی۔ نماز صبح کے بعد خود بھی معمولاً تھوڑی دیر تلاوت قرآن فرماتے۔ اور بچوں کو بھی ہمیشہ تلاوت قرآن کی تاکید کرتے۔ ان کے دل میں قرآن پاک کی جو غیر معمولی عظمت و وقعت تھی، اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ جب صلاح الدین مرحوم، بغرض تحصیل علم راہی انگلینڈ ہوئے تو شفیق باپ کے گرانقدر تحائف میں کلام مجید کا ایک نفیس نسخہ بھی تھا۔ اس کے ایک ورق پر حسب ذیل عبارت انھوں نے اپنے ہاتھ سے تحریر فرمائی:

''بروز روانگی ولایت، بغرض تلاوت فرزند عزیز مذبور بخشیدم۔ خداوند تعالیٰ بہ برکت ایں مصحف شریف، فرزند مذعمرۂ را در امن خود نگاہ دارد و بہ سلامتی ایمان فائز المرام بہ ایں حقیر ملحق سازد''۔

حررۂ خدا بخش عفی عنہ المرقوم بتاریخ ۱۴ اپریل ۱۸۹۳ء

خدا بخش خاں مرحوم اخلاق، کریمانہ سے متمتع تھے۔ ترفع، خودداری اور

جاہ پسندی کے ساتھ بُردباری، رحم دلی اور سخاوت کی آمیزش نے انھیں نہایت سنجیدہ اور ہر دل عزیز بنا دیا تھا۔ امراء کے مقابلے میں خودداری اور غرباء کے ساتھ تواضع اور ان کا انکسار، ان کا طرۂ امتیاز تھا''۔

خدابخش خاں کے علمی ذوق اور اعلیٰ صلاحیت کے سلسلے میں حسب روایت مسٹر صلاح الدین خدابخش، ندوی صاحب نے لکھا ہے:

''عام ہندوستانی، فارسی دانوں کے برخلاف، انھیں فارسی تحریر پر بھی کافی قدرت حاصل تھی۔ بے تکان لکھتے اور ایسی لکھتے کہ اس میں اہل زبان کی شان نظر آتی۔ ان کی مشہور آفاق فارسی تصنیف ''محبوب الالباب'' کے بعض حصے، اس دعویٰ کی تائید میں پیش کیے جا سکتے ہیں —— یہ درحقیقت کتب خانہ مشرقی کے عربی و فارسی مخطوطات کی ایک تفصیلی فہرست ہے۔ اس میں مصنفین کے حالات دیئے گئے ہیں اور ان کی تصانیف پر عالمانہ انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ خدابخش مرحوم کو اپنی اس تصنیف پر بے انتہا ناز تھا۔ پہلی جلد تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے اور چھپ کر شائع ہو گئی ہے۔ افسوس ہے کہ وہ اس کا بقیہ حصہ مکمل نہ فرما سکے۔ اس ''محبوب الالباب'' کے علاوہ انھوں نے لارڈ بیکن (Lord Bacon) کے مضامین کا انگریزی سے فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ پروفیسر براؤن (Browne) سے مکاتبت و مراسلت بھی فارسی ہی میں ہوا کرتی تھی۔

اگر وہ ایک طرف عربی و فارسی کے ذی استعداد عالم تھے، تو دوسری طرف انگریزی ادب سے بھی ناآشنا نہ تھے۔ انگریزی شعرا میں وہ سب سے زیادہ بائرن (Byron) کو پسند کرتے تھے۔ مگر شیلے (Shelley) کے سحر آگیں تغزل، کیٹس (Keats) کے اعلیٰ تخیل، ورڈسورتھ (Wordsworth) کی شیریں کلامی اور نکتہ سنجی، ٹینی سن (Tennyson) کی دل پسند بندش اور سوئبرن (Swinburne) کی فلسفہ آمیز جادو طرازی سے بے خبر نہ تھے۔ متاخر الذکر کو وہ

زورِ کلام میں قاآنی سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔ گبن (Gibon) کو وہ صرف پسند ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ اس سے گونہ محبت بھی رکھتے تھے۔ اس نے ''روحِ اسلام'' کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے، وہ انھیں زبانی یاد تھی۔ مِل (Mill) کی خود نوشت سرگزشت، گوئٹے (Goethe) کی صداقت مآب شاعری، اور بنی وینٹسلنی (Benevenotscelleni) کی آٹو بیاگرافی (Auto Biography) کو انھوں نے مسٹر صلاح الدین مرحوم سے تمام و کمال پڑھوا کر سنا تھا۔ انھیں مشاہیر کے حالات و سوانح سے غیر معمولی دلچسپی تھی''۔

خدا بخش خاں، اپنی شہرت، علمیت اور اپنی لائبریری کی وجہ سے پٹنہ اور گیا کے ایک ممتاز فرد شمار ہوتے تھے اور اکابرینِ پٹنہ و گیا سے ان کے گہرے مراسم تھے جناب شاد کے لائق پوتے نقی احمد ارشاد نے اپنی کتاب ''شاد کا عہد اور فن'' میں کئی جگہ خدا بخش خاں اور ان کے دوستوں کا نام لیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حضرات، باہم گہرے دوست بھی تھے:

(۱) ''انفرادی طور سے شاد کے دوستوں میں، امداد امام اثر، مولوی یحییٰ، مولوی خیرات احمد محبّ اور خدا بخش خاں نے، انگریزی تعلیم حاصل کی۔ اور آخر الذکر تین صاحبوں نے وکالت کر کے دولت جمع کی''۔ (صفحہ ۱۳۸)

(۲) ''اتفاق سے شاد کو اس زمانے میں باعمل دوست بھی مل گئے تھے۔ سلطان مرزا وغیرہ کی صحبتیں ''نہیں'' کے برابر ہو گئی تھیں۔ شاد کی زندگی میں ڈاکٹر حکیم سید جواد مرحوم، قاضی رضا حسین، مولوی یحییٰ، مولوی خدا بخش، مولوی خیرات احمد کے علاوہ سید احمد حسین مؤلف ''مجمع البحرین''، مولوی عبدالعلی ہیڈ ماسٹر نارمل اسکول، مسٹر جوزف، یورشین نارمل اسکول اور مولوی حسن علی مسلم مشنری بھاگلپور آ گئے تھے''۔ (صفحہ ۱۴۴)

ان میں مولوی یحییٰ اور مولوی خیرات احمد کا بھی نام آیا ہے۔ یہ دونوں حضرات، علی الترتیب، سر سلطان احمد کے سسر اور والد اور میرے ہم وطن تھے۔

خدا بخش خاں نے، باپ ہی کا پیشۂ وکالت اختیار کیا تھا۔ باپ ہی کی طرح نادر و نایاب قلمی نسخوں اور اعلیٰ درجہ کی کتابوں کا ذخیرہ اکٹھا کیا تھا، اس لیے ان کو باپ ہی کی بیماری بھی لگی۔ ان پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ کمائی سے محروم ہو گئے۔ گھر میں کوئی اندوختہ تو تھا نہیں، آمدنی کا اور کوئی مستقل ذریعہ تو انھوں نے قائم نہیں کیا تھا۔ جائداد تو کوئی حاصل نہیں کی تھی۔ وہ ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کے بعد، اپنی ساری کمائی، لائبریری کی نذر کیے جاتے تھے، اس لیے ان کا گھر، مالی پریشانیوں میں مبتلا ہو گیا۔ ہوسکتا تھا کہ فقر و فاقہ کی بھی نوبت آ جاتی۔ مگر وہ انگریزی حکومت کا دور تھا جو عوام و خواص کی طرف سے غافل نہ رہتی تھی، اس لیے حکومت نے فوراً توجہ کی اور ان کی عوامی خدمات کا صلہ یوں دیا کہ انھیں آٹھ ہزار روپے نقد یکمشت دیئے اور ادبی خدمت کا معاوضہ یوں دیا کہ لائبریری کے ''سکریٹری'' اور ''لائبریرین'' کی حیثیت سے ان کا دو سو روپے ماہانہ مشاہرہ مقرر کر دیا۔ اس عہد میں دو سو روپے بڑی چیز ہوتے تھے۔

انگریزی حکومت نے خدا بخش خاں کو مالی دقتوں کا سامنا تو نہیں کرنے دیا اور ان کی وقتی پریشانیوں کا ازالہ بخوبی کر دیا، مگر وہ مرض سے شفا اور موت سے تو نجات نہ دلا سکتی تھی۔ چنانچہ کئی سال بستر علالت پر حیات و موت کی درمیانی کشمکش میں مبتلا رہ کر ۳ ر اگست ۱۹۰۸ء کو ایک بجے رات میں، علم و عمل کا یہ گہنایا ہوا آفتاب، بالآخر غروب ہو گیا۔

خدا بخش تھا ـــــ خدا سے جا ملا۔

علامہ معین الدین ندوی نے فرمایا ہے:

> ''اگر بقائے نشان و نام، حیات دوام ہے، تو اس لحاظ سے خدا بخش خاں سی۔ آئی۔ ای، بانی کتب خانہ مشرقی کو زندگی جاوید حاصل ہے۔ دنیائے علم و ادب، اپنے اس محسن کو کبھی فراموش نہیں کرے گی۔ اور مادرِ وطن اپنے اس سپوت کو ہمیشہ سرمایۂ افتخار تصور کرے گی۔ وہ علم و ادب کے عاشق تھے۔ اس عشق نے ان کا نام نامی ہمیشہ کے لیے صفحۂ دہر پر، آب زر سے ثبت کر دیا ہے۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم، دوامِ ما
(حافظ)

خدا بخش مرحوم کا ایثار، ان کی قومی محبت، ان کی دینی غیرت اور سب سے زیادہ ان کی علمی و ادبی خدمات اس قابل ہے کہ افرادِ قوم کے سامنے انھیں بار بار پیش کیا جائے اور ان کی مخلصانہ اور بے ریا طرزِ زندگی کو نمونۂ عمل بنانے کی ترغیب دی جائے۔ ان کے معاصرین میں، سرسید مرحوم اور نواب محسن الملک کو غیر معمولی شہرت حاصل ہے، لیکن درحقیقت ہمارے اس ''بہاری'' قائدِ اعظم نے فیاضی اور ایثار کا جو نمونہ پیش کیا ہے، وہ اپنی آپ نظیر ہے''۔

پٹنہ میں بڑے بڑے امراء اور نوابوں کی کمی نہ تھی، وہ دولت و ثروت کے سنہرے رُوپہلے انباروں سے کھیلتے تھے۔ انھوں نے اپنے بعد، ورثا کے لیے جو کچھ چھوڑا، یقیناً اس سے ان کے ورثا اور خاندان والوں نے فائدہ اٹھایا، مگر کیا آج ان کا، یا ان کی دولت کا، کوئی پتہ و نشان باقی ہے؟ وہ زوال پذیر دولت تھی، اس لیے ان کے ورثا نے لُٹا ڈالی اور آج ان کا نام تک لینے والا کوئی نہیں ہے۔

خدا بخش خاں نے بھی بہت کمایا تھا، اور اگر وہ اپنے معاصرین دولتمندوں اور ہم نشیں رئیسوں کی ریس کرتے، تو یقیناً وہ بھی خاصی دولت چھوڑ جاتے، مگر اس سے صرف ان کے ورثا فائدہ اٹھاتے اور چند برسوں میں وہ اس دولت کو گنوا بیٹھتے۔ خدا بخش خاں نے اپنے ورثا کے لیے جو دولت چھوڑ دی، وہ ان کے ورثا کے لیے بھی تھی، کیونکہ انھوں نے وقف نامہ میں لازمی یہ شرط لکھ دی تھی کہ ان کے بعد، ان کے کتب خانہ کا ''لائبریرین'' ہمیشہ ان کے خاندان کا ہی آدمی ہوا کرے گا اور حکومت کو اس کا مطلق اختیار حاصل نہ ہوگا کہ وہ اس عہدہ پر، میرے خاندان سے باہر کے کسی شخص کو بحال و مقرر کرے —— خدا بخش خاں نے اس سے بھی آگے بڑھ کر، اپنی دولت، پٹنہ والوں ہی کے لیے نہیں، بلکہ تمام

بنی نوع انسان کے لیے اور رہتی دنیا تک کے لیے چھوڑی اور وقف کر کے اس کو عوامی اور قومی سرمایہ قرار دے دیا۔ یہ وہ دولت ہے جس کو زوال نہیں، یہ وہ قیمتی سرمایہ ہے جو خرچ سے کبھی کم نہ ہوگا، بلکہ بڑھتا ہی جائے گا اور دنیا دیکھ رہی ہے کہ ان کی یہ دولت ہر سال ہی نہیں، ہر روز کچھ نہ کچھ ضرور بڑھ رہی ہے۔

خدا بخش خاں کی، کتابوں سے محبت، ان کی وفات کے بعد بھی نہ گئی۔ انھوں نے دنیا کو چھوڑ دیا، گھر بار کو چھوڑ دیا، آل اولاد اور اعزہ و اقربا کو چھوڑ دیا، مگر اپنی لائبریری کو نہ چھوڑا۔ موجودہ لائبریری آفس والی عمارت اور کرزن ریڈنگ روم کے درمیان، کچھ جگہ خالی تھی، قدرت نے شاید اسی لیے خالی چھوڑ دائی تھی، اسی خالی جگہ میں خدا بخش خاں ۴/اگست ۱۹۰۸ء کو سپردِ خاک کر دیئے گئے، جہاں وہ بقول مسٹر صلاح الدین خدا بخش:

> ''اپنی زندگی کے سفر کے ختم پر، اسلام کے بڑے بڑے مصنفوں کی یادگار کے جوار میں، آرام کی نیند سو رہے ہیں''۔

اور جہاں، بقول مسٹر اسکاٹ اوکونر:

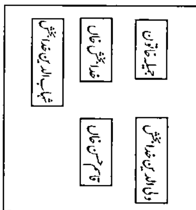
> ''ان کی سیدھی سادی قبر کے اطراف، ہری بھری گھاس کا ایک تختہ ہے اور مشرق کی تیز دھوپ میں، نظریں اس تختہ پر بس ٹھٹھک کر رہ جاتی ہیں۔ رنگ برنگی پھول چڑھائے جاتے ہیں''۔

مسٹر اوکونر نے مزید لکھا ہے کہ:

> ''کتب خانہ کے بانی کی وصیت ہے کہ کسی حالت میں بھی، یہ کتب خانہ اس کے موجودہ مقام سے نہ ہٹایا جائے۔ ان کتابوں کے رکھنے کے لیے یہ کتب خانہ بے بھی نہایت موزوں مقام ـــــ لیکن اس وصیت میں اس سے زیادہ معنی پوشیدہ تھے ـــــ ہندوستان کی تاریخ میں، جتنے بھی انقلابات آئے ہیں، ان میں یہ بات بار بار دہرائی جاتی رہی ہے اور شاید پھر دہرائی جائے، کہ لوگ صرف ایک بات پر بھروسہ کرتے تھے ـــــ اگر چہ بار ہا اس میں انھیں ناکامی کا

بھی منہ دیکھنا پڑا ہے —— اور وہ ہے گوشۂ قبر کے آرام کا یقین۔ ہندوستان
میں یکے بعد دیگرے حکمراں خاندانوں کے جاہ وجلال کا آفتاب جس عام تباہی
میں گہنا تا رہا،مسلمانوں کی حد تک، ان کی کچھ عبادت گاہیں باقی رہ گئیں، جہاں
وہ اپنے خدا کی عبادت کرتے تھے —— اس لحاظ سے، خدابخش خاں مرحوم کی
قبر، یہاں آنے والے لوگوں کے لیے ایک خاموش درخواست ہے، ایک بے
زبان التجا ہے کہ مرحوم کی یہ تمنا پوری ہوتی رہے —— ہمیں امید ہے ——
امید ہے کہ مرحوم کی درخواست،قبول ہوتی رہے گی"۔

قبروں پر کتبے، زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں، خدابخش خاں کی قبر پر کتبہ لگا رہتا
تو بڑا اچھا ہوتا، کیونکہ یہاں پر، بروقت پانچ قبریں ہیں اور یہ جاننا مشکل ہے کہ کون قبران
کی ہے؟ اور دوسری قبریں کن کی ہے؟



اس گلزارِ مزار میں، جیسا کہ نقشہ سے ظاہر ہے، پچھم جانب، جنوبی گوشے میں، ایک قبر کی جگہ خالی ہے ـــــ اس خالی جگہ کو بھرنے کے دو اُمیدوار ہیں۔ ایک خان بہادر عبدالغفور خاں، جو خدا بخش خاں کے بیٹے ہیں۔ دوسرے محبوب حسن صاحب۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک تو انھوں نے خود عرصہ دراز تک اس لائبریری کی خدمت کی ہے، دوسرے اس لائبریری کے کتابی سرمایے میں، ان کے مورثوں نے اضافہ کیا ہے۔ یوں کہ ۱۹۴۷ء میں، ان کے نانا جناب حکیم محمد ادریس صاحب (ڈیانواں) نے اپنے والد علامہ شمس الحق صاحب گیاوی کی پوری ذاتی لائبریری، جو تقریباً پچاس ہزار روپے سے زیادہ قیمت کی کتابوں پر مشتمل تھی، خدا بخش لائبریری کی نذر کر دیا تھا، جسے قاسم حسن خاں، جو اس وقت ''سکریٹری'' اور ''لائبریری'' کے عہدے پر فائز تھے، کئی گاڑیوں پر بار کر کے، پٹنہ لائے تھے ـــــ ممکن ہے کہ اس جگہ کے خواہاں، کوئی اور صاحب بھی، کسی مضبوط دعوے کی بنا پر، پیدا ہو جائیں۔ ایسی حالت میں سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ:

یہ بزم مے ہے، یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے
(شادؔ عظیم آبادی)

علامہ معین الدین ندوی، پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی (پٹنہ)، نے شہادت دی ہے، کہ خدا بخش خاں، ملتِ ابراہیمی کے پابند، صوم وصلوٰۃ کے عادی، ورد و وظائف کے خوگر اور فجر کی نماز کے بعد تلاوتِ قرآن پر عامل تھے۔ اس وجہ سے وہ اس ابراہیمی دعاء کے شاغل بھی رہے ہوں گے:

رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ. وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِيْنَ. وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ.
(شعرا ۵. ۲۶: ۸۳–۸۵)

''اے میرے پروردگار! مجھے حکمت و دانائی عطا فرمائیے۔ اور میرا شمار اپنے صالح بندوں میں کر لیجیے۔ اور میرا ذکر آئندہ آنے والوں میں جاری رکھیے۔ اور مجھ کو جنت نعیم کے مستحقین میں سے قرار دیجیے''۔

دعاء کے آخری حصہ کی قبولیت کے بارے میں تو حتمی طور سے کچھ کہا نہیں جا سکتا، مگر دعاء کے ابتدائی دونوں حصوں نے تو یقیناً شرفِ قبولیت حاصل کر لیا تھا کیونکہ انھیں لائبریری کو وقف کر دینے کی حکمت و دانائی عطا ہوئی اور یہ بھی کہ:

وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِيْنَ.

''میرا ذکر، آئندہ آنے والوں میں جاری رکھیے''۔

کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ '' آخرین'' کی زبانوں پر ان کا نام مسلسل جاری رہے اور انشاء اللہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ سارے آباد برّ اعظموں میں ان کا نام پڑھے لکھوں کی زبانوں پر، رواں دواں ہے۔ اور اس وجہ سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ موصوف کی پوری دعاء مستجاب ہوئی ہوگی۔

☆☆☆

(مشرقی بوڑلے)

۱۹۸۵ء

محمد بدیع الزماں

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کے بانی

خان بہادر خدا بخش

حیات اور کارنامے

اگر حیدرآباد کے نواب سالار جنگ کو تاریخ میں یہ فضیلت حاصل ہے کہ انھوں نے خود اپنی ذاتی سعی سے ایک ایسا میوزیم قائم کیا جو دنیا میں اپنی نوعیت کے چند میوزیم میں شمار کیا جاتا ہے تو اسی طرح پٹنہ کے جناب خدا بخش نے جو پیشہ کے لحاظ سے وکیل تھے اور بہت متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، اپنی اکیلی سعی سے مشرقی علوم کے ہر شعبہ میں ایسے نادر اور نایاب قلمی نسخے اور خطاطی اور مصوری کی ایسی ایسی کتابیں جمع کیں کہ آج اورینٹل علوم پر پٹنہ کی خدا بخش لائبریری دنیا کے چند اورینٹل لائبریریوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اگر حیدرآباد کے سالار جنگ میوزیم میں روزانہ سینکڑوں ملکی و غیر ملکی سیاح اس کی عجائب چیزوں کو دیکھنے جاتے ہیں تو اسی طرح ساری دنیا خصوصاً مشرق وسطی کے ادیب، محقق اور تاریخ داں روزانہ علم کی پیاس بجھانے درجنوں میں اس لائبریری میں دیر رات تک مطالعہ میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ان کی عالمی شہرت ہی کی وجہ سے حکومت ہند کی تحویل میں ہیں۔

اس لائبریری کے بانی جناب خدا بخش کی مختصر سوانح حیات اور ان کے کارناموں پر ہندوستان کے مشہور مؤرخ ڈاکٹر جدو ناتھ سرکار کا مضمون کلکتہ سے شائع ہونے والا مشہور روزنامہ انگریزی جریدہ ''ماڈرن ریویو'' بابت ستمبر ۱۹۰۸ء میں خدا بخش کے انتقال کے دوسرے ہی ماہ شائع ہوا۔ بالکل اسی طرح کا دوسرا مضمون خدا بخش کے لائق فرزند صلاح الدین بیرسٹر

ایٹ لا نے ۱۹۱۲ء میں شائع کیا۔ فرق صرف یہ ہے کہ موخر الذکر مضمون میں خدا بخش کے خاندانی حالات اوران کی ذاتی خوبیوں پر اچھی خاصی، گر چہ مختصر ہی طور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس لائبریری نے ان دونوں مضامین کو ایک ساتھ کتابی شکل میں ۱۹۸۱ء میں شائع کیا جس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا ہے۔ افسوس ہے کہ اردو رسالوں میں اس عظیم بین الاقوامی شہرت رکھنے والی لائبریری پر پچھلے دس پندرہ برسوں سے کوئی مضمون نظر سے نہیں گذرا جب کہ اسی عرصہ میں ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے ڈائرکٹرشپ میں یہ لائبریری بھرپور طریقہ پر عالمی نقشہ پر آئی اوراس کے ہر شعبہ میں بہت زیادہ ترقی ہوئی

صلاح الدین کا کہنا ہے کہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے آباواجداد ہندوستان میں پہلے کہاں سے آئے ان کے خاندان کے متعلق چند معلومات خدا بخش کے والد محمد بخش (۱۸۱۵ء-۱۸۷۶ء) کی بیاض میں ملتی ہیں جن میں محمد بخش نے پانچ پشت کا نسب نامہ دیا ہے اور وطن دہلی بتایا ہے۔ دہلی سے یہ خاندان پہلے شمالی بہار کے ضلع سارن کے موضع اوکھی میں سکونت پذیر ہوا جس کے ضلعی ہیڈکوارٹر چھپرہ میں خدا بخش کی ولادت ۲/اگست ۱۸۴۲ء کو ہوئی۔ ان کی پیدائش کے فوراً ہی بعد یہ خاندان بانکی پور (موجودہ پٹنہ) چلا آیا۔ یہاں ان کی پرورش ان کے دادا نے کی جو بہت بڑے عالم اور پٹنہ کے مشہور وکیلوں میں تھے۔ خدا بخش نے ۱۸۵۹ء تک پٹنہ ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کی مگر غدر کی وجہ سے یہ اسکول بند ہوگیا اس لیے انھوں نے ۱۸۶۱ء میں کلکتہ سے انٹرنس امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد بانکی پور آ کر وکالت کی تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد انھوں نے پٹنہ میں وکالت شروع کردی۔

اس بیچ ان کے دادا کا انتقال ہوگیا اور خاندان کا سارا بوجھ خدا بخش کے کاندھوں پر پڑ گیا۔ انھی پریشانیوں میں انھوں نے پٹنہ منصفی میں نائب کے عہدہ کے لیے عرضی دی مگر ناکام رہے۔ بعدہ انھیں پٹنہ کے ڈسٹرکٹ جج کے پیشکار کا عہدہ مل گیا۔ مگر ڈسٹرکٹ جج سے ان کی ان بن ہوگئی اس لیے انھوں نے استعفی دے دیا۔ پھر ان کی تقرری صرف پندرہ ماہ کے لیے اسکول کے ڈپٹی انسپکٹر کے عہدہ پر ہوئی۔ اس طرح خدا بخش زندگی کی بقا کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔

انھوں نے اس کے بعد ۱۸۶۸ء میں پٹنہ میں باضابطہ وکالت شروع کردی اور اسی زمانہ میں پٹنہ میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے پہلے چیئر مین ہوئے۔ وکالت میں دیوانی میں انھوں نے کافی نام پیدا کیا۔ ۱۸۸۰ء میں پٹنہ کے سرکاری وکیل ہوئے اور ۱۸۸۱ء میں انھیں حکومت برطانیہ کی طرف سے خان بہادر کے خطاب سے نوازا گیا۔ انھوں نے اورینٹل لائبریری ۱۸۹۱ء میں قائم کی۔ ۱۸۹۵ء میں ان کی تقرری نظام حیدرآباد کے ہائی کورٹ میں تین سال کے لیے چیف جسٹس کے عہدہ پر ہوئی۔ ۱۸۹۸ء میں حیدرآباد سے واپس آنے پر انھیں فالج کا دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ ۱۹۰۳ء میں حکومت برطانیہ نے انھیں سی۔آئی۔ای کے خطاب سے نوازا اور حکومت ہند نے انھیں دوسو روپیہ ماہوار پر اس لائبریری کا سکریٹری مقرر کردیا اور ان کے قرضوں کی ادائیگی کے لیے بطور عطیہ دس ہزار روپیہ دیا۔ خدا بخش کا انتقال ۳؍اگست ۱۹۰۸ء کو ایک بجے دن میں ہوا انتقال کے ایک دن قبل ان کی عمر ۶۶ سال ہو چکی تھی۔

خان بہادر کے چار صاحبزادے تھے۔ سب سے بڑے صلاح الدین جنھوں نے بھی علوم مشرقی میں کافی نام پیدا کیا۔ دوسرے شہاب الدین جو پولس میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تھے۔ تیسرا جوانی میں انتقال کر گیا تھا اور چوتھا کالج میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

خان بہادر کے والد خود ہی بہت ستھرا ادبی ذوق رکھتے تھے اور اکثر نظمیں بھی کہا کرتے تھے۔ جو زیادہ تر دین سے متعلق ہوتی تھی مگر ان کی بیاض میں زمانہ قدیم سے لے کر غالب تک کے فارسی اشعار موجود ہیں۔ انھوں نے مرتے وقت خدا بخش کو وصیت کی تھی کہ وہ ایک پبلک لائبریری قائم کریں اور یہ شعر پڑھا تھا۔

زندہ ست کسی کہ ذربتارش   ماند   خلفے   بیادگارش

قبل اس کے کہ اس لائبریری کے قلمی نسخوں اور کتابوں کو جمع کرنے کے سلسلہ میں خدا بخش کے کارناموں کا ذکر کیا جائے یہ ضروری ہے کہ دین، علم، سیاست اور دیگر موضوعات پر ان کے خیالات پیش نظر رکھے جائیں۔ کیونکہ کوئی شخص دوامیت اور ابدیت یونہی حاصل نہیں کر لیتا بلکہ اس کی نیک نیتی، بلند اخلاقی، پاکیزگی خیال اور دنیوی زندگی میں مثبت راہوں کے اختیار

کرنے ہی سے اسے اپنے مقصد کے حصول میں کامیابی ملتی ہے۔ صلاح الدین نے ان موضوعات پر خان بہادر کے ذاتی خیالات کا اپنے مضمون میں جابجا ذکر کیا ہے جن کا مختصر تذکرہ ان کی شخصیت کو گرفت میں لانے کے لیے ضروری ہے۔

ان کی سوانح حیات سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ کہ گرچہ خدا بخش دینی معاملوں میں قدامت پرست نہ تھے مگر وہ سچے اور پکے مسلمان تھے۔ رسولؐ اور اہل بیت سے انھیں قلبی لگاؤ تھا اور اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک انھوں نے پانچ وقت کی نماز کبھی قضا نہ کی۔ فجر کی نماز کے بعد وہ آدھ گھنٹہ روزانہ قرآن مجید کی تلاوت ضرور کرتے۔ قرآن نے ان کے دل پر اس کی عظمت کی ایسی شان بٹھادی تھی کہ جب ان کے فرزند صلاح الدین تعلیم کے سلسلہ میں ولایت جانے لگے تو خان بہادر نے اپنے لائق فرزند کو قرآن مجید کا ایک نسخہ دیا جس کے سرورق پر انھوں نے خود اپنے ہاتھ سے یہ عبارت لکھی:

> "قرآن مجید زاداللہ شرفہ وعظمتہ بہ فرزندار جمند خود صلاح الدین مدعمرہ بروز روانگی ولایت بغرض تلاوت فرزند عزیز مذبور بخشیدم۔ خداوند تعالیٰ بہ برکت این مصحف شریف فرزند مدعمرہ را در امن نگاہ دارد و بسلامتی ایمان فائز المرام باین حقیر ملحق سازد حررہ خدا بخش عفی عنہ المرقوم تاریخ ۱۴، اپریل سنہ ۱۸۸۳"۔

وہ وجد انگیز اور والہانہ انداز میں ہمیشہ یہ رباعی پڑھا کرتے تھے:

ای مطلع آفتاب ذات احدی　　صبح ازلی چراغ شام ابدی
کس نیست بجز تو دستگیرے ما　　یا ختم رسل خذ بیدی خذ بیدی

صلاح الدین کہتے ہیں کہ ان کے والد نے کبھی اپنے بچوں کو محرم کا جلوس دیکھنے کی اجازت نہیں دی کیونکہ وہ اسے تمسخر اور دین اسلام کا مذاق اڑانا قرار دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اسلامی تاریخ کے اتنے سنگین المیہ کو بجائے سوگ اور ماتم کے طریقے پر منانے کے جشن اور رنگ رلیوں کے طور پر منانا دین اسلام کی توہین ہے۔

مذہب کے معاملے میں تنگ نظری اور تعصب سے خدا بخش بہت پرے تھے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کے ہمیشہ داعی رہے۔ ان کے لائق فرزند اس سلسلہ میں دو واقعوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ۱۸۹۳ء میں مہاراجہ دربھنگہ کے کسی حکم سے گائے کا ذبح کیا جانا ممنوع قرار دے دیا گیا کیونکہ یہ دونوں فرقوں میں فساد کا باعث بن جاتا ہے۔ چنانچہ اس حکم پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں کچھ تنازعات کھڑے ہوگئے۔ جسے خدا بخش نے اس عمدگی سے سلجھایا کہ بنگال کے لیفٹیننٹ گورنر ماک ڈونل نے اپنے خط مؤرخہ ۱۷ اراگست ۱۸۹۳ء میں انھیں مبارکباد دیا۔

دوسرا واقعہ جو صلاح الدین بیان کرتے ہیں وہ یہ کہ ہمارے والد کے خون میں برہمن کی نسل کا بھی کچھ حصہ تھا جس کی وجہ سے وہ ساری زندگی کھلم کھلا ہندوؤں کی طرفداری بھی کیا کرتے تھے اور اسی لیے ان کے بہترین اور مخلص دوستوں میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ قصہ یوں بیان کرتے ہیں کہ خدا بخش جب بہت بچہ تھے تو ایک برہمن عورت کا دودھ پیا تھا اور اپنی اس رضائی ماں کی یاد میں خدا بخش اور صلاح الدین نے کبھی گائے کا گوشت نہیں کھایا اور آج تک اس خاندان میں یہ گوشت کھانا ممنوع ہے۔

خان بہادر باوجود اپنی محدود آمدنی کے بہت غریب پرور تھے۔ ان کی سوانح حیات میں صلاح الدین ایک چھوٹا سا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار ایک غریب نوجوان جو انتہائی مالی مشکلات میں تھا، یہ جان کر کہ خدا بخش قلمی نسخے خریدتے ہیں کہیں سے فارسی کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش کے پاس بیچنے کے لیے لایا۔ یہ سعدی یا جامی کا تھا۔ خدا بخش نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور اس نوجوان سے کہا کہ ہمارے پاس اس سے بہتر نسخے ہیں۔ انھوں نے اسے ان نوجوان کو لوٹا دیا مگر اس کے حال پر ترس کھا کر اسے سو روپیہ کا ایک نوٹ بھی دے دیا۔

خدا بخش صرف یہی نہیں کہ عربی اور فارسی میں عالمانہ اور فاضلانہ دسترس رکھتے تھے بلکہ انگریزی کتابوں سے بھی انھیں کافی شغف تھا۔ فارسی میں تو ان کو ایسی مہارت تھی کہ ان کے کلام کی چار ضخیم جلدیں لائبریری میں ہیں۔ انگریزی زبان میں ان کے پسندیدہ شعراء بائرن،

کیٹس، شیلی، ورڈسورتھ اور ٹینی سن تھے۔ وہ سوئن برن کو قاآنی کا درجہ دیتے تھے۔ گبن کی کتاب ''اسلام کا عروج'' کو انھوں نے حفظ کر لیا تھا کیونکہ گبن نے بحیثیت مذہب اسلام کی بہت تعریف کی ہے۔ وہ اسٹوورٹ مل اور گوئٹے کے بھی بہت دلدادہ تھے۔

سیاست میں وہ انگریزوں سے مخاصمانہ نہیں بلکہ دوستانہ تعلق رکھنے کے قائل تھے کیونکہ غدر کے بعد وقت ہی کچھ ایسا آ گیا تھا۔

اورینٹل پبلک لائبریری کا قیام کس طرح ممکن ہو سکا اس پر خدا بخش نے خود ایک مضمون انگریزی جریدہ انیسویں صدی میں سپرد قلم کیا جس میں تفصیل سے تو نہیں مگر پھر بھی اس کی شروعات کے متعلق اچھی خاصی واقفیت دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس لائبریری کے قائم کرنے کی وصیت میرے والد نے مجھے کی تھی جن کا انتقال جولائی ۱۸۷۶ء میں ہوا۔ انھوں نے اس وقت چودہ سو قلمی نسخے میرے حوالے کئے تھے۔ خدا بخش نے ۲۹ راکتوبر ۱۹۸۱ء کو ایک وقف قائم کر کے اس لائبریری کو عام پبلک کے لیے کھول دیا اور اس وقت اس لائبریری میں چار ہزار قلمی نسخے تھے۔ مگر شرط یہ رکھی کہ اس لائبریری کا کوئی قلمی نسخہ یا کتاب لائبریری کے باہر نہیں جا سکتی۔ مگر اس عطیہ دینے والے نے اس لائبریری کے ساتھ اپنا نام شامل کیا جانا مناسب نہ سمجھا اور اس وقت کے دستاویز میں اسے صرف اورینٹل پبلک لائبریری ہی کہا گیا ہے۔ مگر وقت کے گزرنے کے ساتھ عوام اس سپوت کو جس نے ملک اور قوم کو مشرقی علوم و ادب کا اتنا بڑا خزانہ عوام کو وراثت میں دے رکھا تھا بھلا کب اسے پسند کرتی کہ خدا بخش کا نام اس لائبریری کے ساتھ نہ لگا ہو۔ اس لیے بعد میں اس کا نام خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری میں بدل دیا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں اس میں پانچ ہزار قلمی نسخے اور پچیس سو انگریزی کتابیں تھیں۔

خدا بخش نے جو متوسط طبقے کے وکیل تھے اس لائبریری کی بلڈنگ پر مبلغ اسی ہزار روپیہ صرف کیے ڈاکٹر سر جدو ناتھ سرکار اپنے مضمون میں کہتے ہیں کہ خدا بخش کے ذریعے لائبریری قائم کیے جانے کے خلوص کا اندازہ اس سے نہیں لگایا جا سکتا کہ انھوں نے اپنی آمدنی کا قریب پورا ہی حصہ اس کی نذر کر دیا بلکہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جاگتے اور سوتے ہر وقت ان

کے ذہن میں لائبریری ہی رہا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ خواب بھی اسی کا دیکھا کرتے تھے ڈاکٹر سرکار نے خواب کے دو واقعے اپنے مضمون میں شامل کیے ہیں جو خود خدا بخش کی زبانی ہیں جو مضمون میں اس طرح بیان کیے گئے ہیں۔

> "شروع میں قلمی نسخے بہت دھیرے دھیرے آتے تھے۔ لیکن ایک رات ایک اجنبی خواب میں میرے پاس آیا اور بولا کہ اگر تم کتابیں چاہتے ہو تو میرے ساتھ آؤ۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلا اور لکھنؤ کے امام باڑہ کی طرح ایک پُرشکوہ عمارت تک پہنچ گیا مگر پھاٹک پر اس اجنبی کا انتظار کرنے لگا جو میرے ساتھ آیا تھا اور اندر چلا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اجنبی باہر آیا اور مجھے اندر ایک بڑے کمرے میں لے گیا جس میں ایک نقاب پوش اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ اس اجنبی نے ان لوگوں سے میری طرف اشارہ کر کے کہا یہ شخص قلمی نسخے لینے آیا ہے ان نقاب پوش نے جواب دیا انھیں سب دے دو، اس کے کچھ ہی عرصہ بعد میری لائبریری میں قلمی نسخے بے تحاشہ آنے لگے"۔

اس خواب کو خدا بخش کی زبان سے بیان کر چکنے پر ڈاکٹر سرکار نے قوسین میں لکھا ہے کہ رویت پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی تھی۔

خواب کا دوسرا واقعہ بھی جو خدا بخش کا بیان کردہ ہے ڈاکٹر سرکار کے مضمون میں اس طرح ہے:

> "ایک شب میں نے خواب دیکھا کہ میری لائبریری کے بغل کی گلی میں بہت سارے لوگ جمع ہیں۔ جب میں اپنے گھر سے باہر آیا تو لوگ مجھے دیکھ کر چلانے لگے کہ 'حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی لائبریری میں تشریف لائے ہیں اور آپ انھیں لائبریری دکھانے کے لیے وہاں گئے بھی نہیں' میں جلدی سے قلمی نسخوں کے کمرے میں گیا۔ میں جب وہاں پہنچا تو آپ تشریف لے جا چکے تھے۔ لیکن حدیث کے دو قلمی نسخے ٹیبل پر کھلے پڑے تھے۔ لوگوں

نے مجھ سے کہا کہ حضورؐ یہی حدیثیں مطالعہ فرما رہے تھے''۔

اس خواب کو خدا بخش کے الفاظ میں بیان کر چکنے کے بعد ڈاکٹر سرکار توسین میں لکھتے ہیں کہ حدیث کی ان دونوں جلدوں پر خدا بخش کی یہ تحریر ہے کہ ان حدیثوں کو لائبریری سے باہر جانے نہ دیا جائے گرچہ اس ممانعت کی وجہ خدا بخش نے نہیں لکھی ہے۔

خدا بخش کے کتابوں اور قلمی نسخوں کے جمع کرنے کی داستان بھی انتہائی دلچسپ اور رومانی ہے۔ ہندوستان میں مشرقی علوم کے قلمی نسخے اور مصوری اور خطاطی کی سب سے قیمتی اور سب سے بڑی لائبریری دہلی میں مغلوں کی لائبریری تھی۔ مگر مغل حکومت کے زوال پذیر ہونے پر ان میں سے زیادہ تر نسخے اٹھارہویں صدی میں اودھ کے نوابوں کے پاس چلے گئے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد دہلی کی مغل لائبریری اور اودھ کے نوابوں کے یہ سارے بیش بہا خزانے تتر بتر ہو گئے اور اس کا زیادہ تر حصہ رامپور کے نواب کے ہاتھ آیا جنھوں نے غدر میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا نواب رامپور نے اپنے وفادار سپاہیوں میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ جو سپاہی بھی قلمی نسخے یا کتاب لائے گا اسے فی نسخہ یا کتاب ایک روپیہ دیا جائے گا۔ خدا بخش نے بہت بعد میں انھیں جمع کرنا شروع کیا تھا مگر پھر بھی خدا بخش اور نواب رامپور میں اس کو لے کر زبردست رقابت ہو گئی۔ آخر کار خدا بخش نواب کے ایک کارندے کو جو کتابوں کا شکاری تھا اور جس کا نام محمد مکی تھا اپنی طرف کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ خدا بخش اس مکی کو اٹھارہ سال تک کمیشن کے علاوہ ہر ماہ اس کام کے لیے پچاس روپیہ ماہانہ مشاہرہ دیتے رہے اور انھیں شام، عرب، مصر اور ایران خاص کر قاہرہ اور بیروت تک ان نسخوں اور کتابوں کی تلاش میں بھیجا۔ خدا بخش ہر اس شخص کو جو ایسے قلمی نسخے یا کتابیں فروخت کرتا تھا۔ بانکی پور آنے اور واپس جانے کا ریل کرایہ دیا کرتے تھے خواہ وہ ان کے لیے کوئی نسخہ یا کتاب لائے یا نہ لائے۔ اس طرح خدا بخش کی شہرت سارے ہندوستان میں پھیل گئی اور ایسے نسخے اور کتابیں خریدنے والوں میں ان کا نام سرفہرست آگیا۔

اتفاق کی بات ہے کہ ایک بار ایک جلد ساز نے خدا بخش کی لائبریری کا تالا توڑ کر چند

قیمتی قلمی نسخے اور کتابیں چرالیں اور لاہور کے ایک تاجر کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ اس تاجر کو یہ پتہ نہ تھا کہ یہ خدا بخش کی ہیں۔ اس تاجر نے اسے خدا بخش کے ہاتھوں بیچنا مناسب سمجھا۔ اس طرح یہ ساری کتابیں اور نسخے خدا بخش کو اس سے خریدنی پڑیں اور چور کو سزا دی گئی۔

ایک دوسرا دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ پٹنہ کا صوبائی جج ایک انگریز جے۔ وی۔ ایلیٹ تھا جسے خود بھی ایسے نسخے جمع کرنے کا شوق تھا۔ اس نے خدا بخش کے والد محمد بخش سے کمال الدین اسماعیل اصفہانی کی نظموں کا ایک مجموعہ پڑھنے کو لیا اور بعد میں اسے واپس کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی جگہ اس کی قیمت دینے پر آمادہ ہو گیا۔ مگر محمد بخش قیمت لینے پر راضی نہ ہوئے اور کتاب ہی واپس مانگا۔ جب ایلیٹ ریٹائر ہو گیا تو انگلینڈ واپس جاتے وقت اس نے اپنی ساری کتابوں کو دو بکسوں میں بند کیا جن میں ایک بکس میں بیکار کتابیں تھیں جسے وہ پٹنہ میں نیلامی کے لیے چھوڑ گیا۔ خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جس بکس کو وہ پٹنہ چھوڑ گیا تھا اس میں محمد بخش کی وہ کتاب تھی جسے ایلیٹ نے واپس کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس بکس میں شاہ جہاں کا دستخط کنندہ ''مجالس خمسہ'' بھی تھا۔ محمد بخش نے دونوں کتابیں خرید لیں۔

ایک بار جب خدا بخش حیدر آباد میں چیف جسٹس تھے اور وہ ہائی کورٹ سے واپس لوٹ رہے تھے کہ راستہ میں ان کی نظر ایک پنساری کی دکان پر کتابوں کی بہت سی جلدوں پر پڑی۔ دو ایک آنا کے بورے پر پڑی ہوئی تھیں۔ وہ رکے اور کتابوں کو دیکھا اور اس کی قیمت پوچھا۔ دوکاندار نے چالاکی سے جواب دیا کہ اگر ان ردی کتابوں کے ڈھیر کا کوئی اور خریدار ہوتا تو میں اسے تین روپئے میں دے دیتا مگر چونکہ آنجناب اس کی خریداری میں دلچسپی رکھتے ہیں اس لیے یہ ضرور کارآمد کتابیں ہوں گی اس لیے آپ سے بیس روپے لوں گا۔ خدا بخش نے بیس روپیہ میں خرید لیا۔ انھی کتابوں کی قیمت نظام حیدر آباد نے بعد میں چار سو روپیہ تک دینے کی پیشکش خدا بخش کو کی مگر یہ کوشش بے سود رہی۔

اس طرح کتابوں اور نسخے خود جمع کرنے کے علاوہ ہندوستان کے بہت سے اہل علم نے خود ایسے نسخے اور ایسی کتابیں خدا بخش کو لا کر دیں جو آج اس لائبریری کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

اس لائبریری کی انمول موتیوں کی تفصیل بیان کرنا کسی بھی مضمون نگار کے بس میں نہیں کیونکہ صرف عربی اور فارسی قلمی نسخوں اور کتابوں کی کتاب الفہرس چوبیس جلدوں میں ہے جب کہ ہر جلد کی ضخامت دوسو سے ڈھائی سوصفحات ہے۔البتہ نفس مضمون کی خاطر چند موتیوں کا ذکر لایا جارہا ہے جن کے نام یہ ہیں:

(۱) جہانگیر کی کتاب فال۔ جس طرح قرون وسطی میں یورپ کے لوگ ورجل کی نظموں سے فال نکالتے تھے اسی طرح جہانگیر حافظ کی غزلیہ نظموں سے فال نکالا کرتا تھا۔اس کے حاشیہ پر جہانگیر کے لکھے ہوئے تشریحات ہیں۔

(۲) عنایت اللہ خاں کی ''احکام عالمگیری'' جس میں اورنگزیب کے آخری سالوں کے خطوط ہیں جس میں سلطنت مغلیہ کے زوال کی داستان شرح وبسط سے بیان کی گئی ہے اس کا دوسرا نسخہ دنیا میں اور کہیں نہیں ہے۔

(۳) ''شہنشاہ نامہ''۔ یہ سلطان محمود سوم (فاتح قسطنطنیہ کی فتح پر رزمیہ نظموں کا مجموعہ ہے)۔

(۴) جامی کی نظمیں موسوم بہ ''یوسف وزلیخا'' جسے فارسی کے خوش نویس میر علی نے نقل کیا ہے اور جس کی قیمت جہانگیر نے ایک ہزار سونے کی اشرفیاں دی تھیں۔

(۵) داراشکوہ کی تصنیف کردہ ''سفینۃ الاولیا'' جس پر داراشکوہ کے دستخط ہیں۔

(۶) حافظ کی غزلیہ نظمیں۔

(۷) امیر خسرو کی مثنوی جسے نور علی نے بخارا کے سلطان عبدالعزیز کو دینے کے لیے نقل کیا اور جس کے نقل کرنے کے لیے اسے تین سال نظر بند رکھا گیا تھا۔

(۸) ''شاہ نامہ فردوسی'' جسے علی مردان خاں نے ۱۶۴۰ء میں شاہ جہاں کو تحفتاً پیش کیا تھا۔

(۹) بیجاپور کے سلطان ابراہیم عادل شاہ کے لیے حاتمی کی لکھی ''شیریں وخسرو''۔

(۱۰) جہانگیر کی خودنوشت سوانح عمری جسے جہانگیر نے گولکنڈہ کے بادشاہ کو تحفتاً پیش

کیا تھا مگر جب اورنگ زیب نے گولکنڈہ فتح کیا تو اسے دہلی واپس لے آیا۔

(۱۱) تاریخ خاندان تیموریہ جس میں اکبر کے عہد کے بائیسویں سال تک کے حالات ہیں۔

(۱۲) پادشاہ نامہ جو شاہ جہاں کی تاریخ ہے۔

(۱۳) ملا جامی کا دستخط کنندہ تصنیف کا پہلا حصہ۔ اس کا دوسرا حصہ روس میں ہے۔

عربی زبان میں جو انمول موتیاں اس لائبریری میں ہیں ان میں چند کے نام یہ ہیں:

(۱) ''تفسیر کبیر'' کی تین ضخیم جلدیں جو ایک طرح سے بہت چھوٹے حروف میں ہیں۔

(۲) ''کتاب الحشائش'' جسے بغداد کے خلیفہ مامون کے عہد میں یونانی زبان سے عربی میں ترجمہ کیا گیا۔

(۳) علم جراحی پر غرناطہ کے زہراوی کی تحریر کردہ تشریحی تصویر کے ساتھ نادر قلمی نسخہ جس پر ۴۸۴ھ ثبت ہے۔ اس میں جراحی کے سارے اوزار کے نقشے بنے ہوئے ہیں۔ یہ کتاب خلیفہ ہارون الرشید کے وقت میں ترجمہ کی گئی تھی۔

(۴) پوری قرآن مجید جو صرف ایک چرمی کاغذ پر بہت خوبصورت حروف میں نقل کئے گئے ہیں۔

علاوہ ازیں ایک تاریخی اور دلچسپ کتاب ''داستان مسیح'' ہے جسے اکبر کی درخواست پر ایک پرتگالی پادری زیویئر نے بائبل سے فارسی میں ترجمہ کیا اور جسے ۱۶۰۴ء میں عبدالرزاق قندھاری نے نقل کیا۔ تواریخ میں ابواسحٰق ابراہیم کی ''کتاب التواریخ'' (تاریخ اسلام) بھی ہے۔ سوانح میں کتاب ''المختلف والمختلف'' (سیرت صحابہ) مصنفہ علی بن عمر الدار قطنی۔ محمد بن حسین ابوالاعلیٰ کی ''طبقات الحنابلہ'' اور محمد عبداللہ النجدی کی ''الصویل وبیلہ'' بھی ہے۔

اس لائبریری میں صرف شعری مجموعوں کے چار سو سے زیادہ قلمی نسخے ہیں۔ علاوہ ازیں رسول اللہؐ کی سیرت پر ملا کی ''کتاب الوسیلہ'' ابن قیم کی ''زاد المعاد'' بھی ہے۔

علم طب میں ''کتاب المشجر'' (سنہ تالیف ۷ ۲۳ ھ)، ''کتاب التصرف لمن عجز عن التالیف'' اور ''تلویح الطب'' بھی ہے۔ دیگر اصناف میں ابوعلی فارسی کی ''کتاب الحجۃ'' نجم الدین عبداللہ کی ''تفسیر بحرالحقائق'' اور محمد بن حبس السلامی کی ''حقائق القرآن'' قابل ذکر ہیں۔

اس لائبریری نے ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے دور میں پچھلے دس بارہ سالوں میں ہر اس شعبہ میں نمایاں ترقی کی ہے اس شعبہ نشر و اشاعت تحقیقی کتابوں کی اشاعت میں خاص دلچسپی رکھتا ہے اور پچھلے چند سالوں میں بہت بڑے بڑے دانشوروں کی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

علاوہ ازیں اس لائبریری میں میموریل لکچر الگ اہمیت کا حامل ہے جس میں ہر چند مہینوں پر بلا تفریق مذہب و ملت ملک کے نامور دانشوروں کو اسلام، اسلامی تاریخ مختلف مذاہب پر لکچر کے لیے مدعو کیا جاتا ہے۔

خان بہادر خدا بخش کی مزار اس لائبریری کے احاطہ میں ہے۔ علم و ادب کے ایسے شیدائی کے لیے مغفرت کی دعا کے ساتھ اقبالؔ کا یہ دعائیہ شعر زبان پر آتا ہے ۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے



(پیش رفت۔ دہلی، اپریل ۱۹۹۶ء)

جمشید احمد ندوی

خان بہادر خدا بخش

تاریخ اپنے دامن میں صرف انھیں شخصیات کو جگہ دیتی ہے جو اولوالعزمی، بلند ہمتی اور کردار کی پختگی کا اعلیٰ نمونہ ہوتی ہیں بلکہ ایسی ہی شخصیات اپنے کردار وعمل سے تاریخ مرتب کرتی ہیں جن کے زندہ وتابندہ نقش کہن کسی بھی قوم کے لیے سرمایہ افتخار اور باعث عزت ہونے کے ساتھ ساتھ آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے نمونہ عمل اور مشعل راہ ہوتے ہیں۔ مشہور ومعروف لائبریری خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کے مؤسس کا شمار بھی انھیں شخصیات میں کیا جاسکتا ہے جنہیں تاریخ اپنے دامن میں جگہ دینے پر یوں مجبور ہوئی کہ انھوں نے اپنے کردار وعمل، صبر وضبط، محنت ومشقت سے ایک تاریخ مرتب کی ہے، جہد مسلسل اور بہترین سعی وکاوش کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہوئے اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے علم کا ایک ایسا ذخیرہ جمع کر گئے، جس کی مثال اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

خدابخش کے والد محمد بخش (۱۸۱۵ء۔ جولائی ۱۸۷۶ء) کا شمار پٹنہ کے معتبر ترین وکلاء میں ہوتا تھا اور ان کی پیشہ وارانہ ذہانت وقابلیت کا اس زمانہ میں طوطی بولتا تھا۔ انھیں کتب بینی اور مطالعہ کے ساتھ ساتھ کتابیں جمع کرنے کا بھی بے حد شوق تھا جس کا منھ بولتا ثبوت ان کا کتب خانہ ''کتب خانہ محمدیہ'' تھا جسے وہ اپنے ساتھ چھپرہ سے پٹنہ لے کر آئے تھے۔ وہ کتابوں کو متعدد ذرائع ووسائل سے حاصل کرنے کے علاوہ اپنے ہاتھوں سے کتب کی نقول تیار کرتے تھے کیونکہ بہترین خوشنویس تھے۔ وہ اتنی محنت صرف اس لیے کرتے تھے کہ ان کا خواب ایک پبلک لائبریری بنانے کا تھا جس سے جویان علم وفن اپنی تشنگی بجھا سکیں لیکن قبل اس کے کہ انکا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا ان کا وقت موعود آپہنچا اور اپنی کل متاع حیات اور سرمایہ زندگی کتابوں کی شکل میں اپنے لائق فرزند خدابخش کے حوالے کر کے اپنے رب کے حضور حاضر ہوگئے۔ خدابخش مرحوم

نے اپنے والد کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ان کے لگائے ہوئے پودے کی اپنے خونِ جگر سے یوں آبیاری کی کہ وہ جلد ہی تناور درخت بن گیا جس کی ٹھنڈی چھاؤں میں علم کے متوالے اور میدانِ تحقیق و تدوین کے صحرانورد پناہ لینے لگے جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

خدا بخش کی پیدائش ضلع چھپرہ بہار کے موضع اوکھی کے محلّہ دہیاواں میں ۲راگست ۱۸۴۲ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اس زمانے کی رسم ورواج کے مطابق والد کی نگرانی میں گھر پر ہی ہوئی اور جب ۱۸۵۳ء میں ان کے والد پٹنہ منتقل ہوگئے اور پیشہ وارانہ مصروفیات بڑھ گئیں تو دیگر اساتذہ کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا۔ لیکن مصادر سے صرف مولوی لطف علی فرنگی محلی اور سید ہمایوں مرزا کے والد سید شاہ الفت حسین کا پتہ چلتا ہے، جن سے انھوں نے پڑھا تھا تاہم اس کی تفصیل دستیاب نہیں ہوتی کہ انھوں نے ان سے کیا کیا پڑھا تھا، جب وہ کچھ سمجھ دار ہوگئے تو محمد بخش نے اپنے انگریز دوستوں و آفیسران کے مشورہ سے انھیں اس زمانہ کے مشہور اسکول پٹنہ کالجیٹ اسکول میں داخل کروادیا لیکن ابھی انھوں نے اسکول سے ٹھیک سے فائدہ بھی نہیں اٹھایا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب برپا ہوگیا جس نے سارے ہندوستان کے ساتھ ساتھ پٹنہ کے نظام زندگی کو بھی تہ وبالا کردیا اور وقتی طور پر اسکول بند ہوگیا جس کے نتیجے میں ان کی تعلیم کا سلسلہ بھی بند ہوگیا۔ جب حالات کچھ سنبھلے تو ان کے والد نے انھیں خان بہادر نواب امیر علی کے پاس کلکتہ بھیجوادیا تاکہ ان کی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ جاری ہوسکے، وہاں انھوں نے ۱۸۶۱ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک (بعض مصادر کے مطابق انٹرنس) پاس کیا۔ وہ مزید تعلیم جاری رکھنا چاہتے تھے کہ والد کی بیماری کی وجہ سے مالی حالات خستہ ہوگئے اور انھیں بادلِ نخواستہ واپس آنا پڑا۔

صد آفریں اس نوجوان خدا بخش پر جوان حالات سے بھی ذرا بھی دل برداشتہ نہیں ہوا بلکہ حالات کا پامردی سے مقابلہ کیا اور اپنے سارے خاندان کا بوجھ اپنے نازک کاندھوں پر اٹھا لیا۔ فکرِ معاش کے ساتھ ساتھ انھوں نے قانون کا مطالعہ شروع کردیا اور اتنی محنت کی کہ انھوں نے اس مشکل امتحان کو بھی پاس کرلیا جوان کا آخری امتحان بھی ثابت ہوا کہ اس کے بعد ان کی خوشحالی کا وہ دور آیا جس کی مدد سے انھوں نے اپنے والد کے خواب کو بحسن وخوبی شرمندۂ تعبیر کیا۔

حیات خدابخش کے اوراق پریشاں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشیت الٰہی جس سے جو کام لینا چاہتی ہے اسی حساب سے اس کی نشونما و تربیت کا انتظام کرتی ہے تاکہ مستقبل میں دی جانے والی ذمہ داریوں سے کما حقہ عہدہ برآ ہو سکے۔ ان کی زندگی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تربیت بھی ایک خاص ڈھنگ سے کی جارہی تھی۔ انھیں پے در پے مصائب و مشکلات سے دوچار ہونا پڑا، تاکہ مصائب کی بھٹی میں پک کردہ کندن ہو جائیں اور سخت سے سخت مراحل سے ہنستے کھیلتے گذر جائیں، حالات کا پامردی سے مقابلہ کرسکیں اور دی جانے والی ذمہ داریوں کو اچھی طرح نبھاسکیں، وہ قدرت کے اس امتحان کی کسوٹی پر پورے اترے اور نتیجہ میں قدرت نے اتنا نوازا کہ وہ نہال ہو گئے۔

خدابخش نے ابھی نوجوانی کے مرحلہ میں قدم ہی رکھا تھا کہ والد کی بیماری کی وجہ سے فکر معاش دامن گیر ہوگئی۔ اور والد کے انتقال کے بعد گھر کی ساری ذمہ داری ان کے سر پر آگئی لہٰذا قانون کی تعلیم حاصل کرتے ہوئے وہ رزق کے لیے بھی سرگرداں ہو گئے تھے اولا انھوں نے سول کورٹ میں بحیثیت پیش کار ملازمت اختیار کی لیکن ان کی ڈسٹرکٹ جج مسٹر لیٹور (Latour) سے نہ نبھ سکی اور بہت جلد ملازمت سے استعفیٰ دے دیا، اس کے بعد رزق کی تلاش کرتے کرتے محکمہ تعلیم میں پہنچ گئے اور ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے لیکن چونکہ قدرت کو ان سے ایک اعلیٰ کام لینا تھا لہٰذا ابھی اس ملازمت کو پندرہ ماہ ہی ہوئے تھے کہ انھوں نے قانون کا امتحان پاس کرلیا اور ملازمت سے استعفاد ے کر نجی پریکٹس شروع کی۔ بہت جلد کامیابی و کامرانی نے ان کے قدم چومے اور ان کا شمار قابل ترین وکلاء میں ہونے لگا۔ ممکن ہے اس کامیابی میں ان کے بچپن و نوجوانی کے ماحول کا بھی دخل رہا ہو کہ وہ اپنے والد کو کامیاب وکیل کی حیثیت سے دیکھتے آئے تھے اور بچپن سے ہی ان کے کان قانون کی موشگافیوں سے آشنا تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اللہ نے انھیں ذہن رسا سے بھی نوازا تھا جس کی وجہ سے ان کی وکالت خوب چمکی اور دولت کی دیوی نے ان کا گھر دیکھ لیا کہ ان کے ہاتھوں ان کے والد کا وہ خواب شرمندہ تعبیر ہونا تھا جس کی آرزو دل میں ہی لیے وہ اس دنیا سے سدھار گئے تھے۔

وہ اپنی پیشہ وارانہ قابلیت، صلاحیت اور مہارت کی وجہ سے بہت جلد لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بن گئے اور ان کی توجہ خدا بخش کی طرف مبذول ہوگئی بقول سرسید اندسنہا وہ ۲۶ رسال کی عمر میں ہی ایک قابل توجہ اور جاذب نظر شخصیت بن گئے تھے۔ ان کی شہرت و مقبولیت انگریز آفیسران تک پہنچی اور جب انھیں یہ پتہ چلا کہ وہ محمد بخش جیسے لائق و فائق وکیل کے فرزند ارجمند ہیں تو ان آفیسران کی نگاہوں میں ان کا قد اور اونچا ہو گیا حتیٰ کہ انکے والد کے ایک دوست سرلوئس جیکسن (Sir Louis Jackson) نے انھیں جج کے عہدہ کی پیشکش اس وعدہ کے ساتھ کی کہ بعد میں انھیں سول سروس کے محکمہ وضع آئین کا ممبر بھی نامزد کر دیا جائے گا لیکن انھوں نے انکار کر دیا جب کہ اس زمانہ میں مسلمان جج کا تقرر بہت کم ہوتا تھا۔

خدا بخش خاں نے بحیثیت وکیل اپنی صلاحیت و قابلیت کا سکہ جما دیا نتیجتاً ان کی شہرت و مقبولیت نے آخری منازل بھی طے کر لی، جوں جوں ان کی قابلیت کا سکہ بیٹھتا گیا اسی حساب سے دولت کی فراوانی بھی ہوتی چلی گئی لیکن دوسرے اشخاص کی طرح انھوں نے ذخیرہ اندوزی یا جائداد بنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ایک فرمانبردار بیٹے کی طرح اپنے والد کی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے اپنی ساری آمدنی دونوں ہاتھوں سے لٹاتے ہوئے علم و فن کے وہ آبدار موتی اور قیمتی شہ پارے خریدتے رہے جس کے مقابلے میں خرچ کی جانے والی رقم سنگریزوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

نامعلوم اسباب کی بنا پر ان کی وکالت کو آخری عمر میں گہن سا لگ گیا اور آمدنی دھیرے دھیرے گھٹنے لگی لہٰذا وہ کسی مستقل آمدنی کے خواہش مند ہوئے کہ زیادہ آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے ان کے منصوبہ کی تکمیل میں رکاوٹ آنے لگی ہوگی ورنہ وہ اتنا ضرور کما لیتے ہوں گے کہ اپنی اور اہل خانہ کی کفالت کر سکیں۔ ان کی مستقل آمدنی کی خواہش وقتی طور پر یوں پوری ہوئی کہ انھیں آغا مرزا بیگ سرور الملک کی کوششوں سے حیدرآباد ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بنا دیا گیا۔ اس اہم عہدہ پر تین سال فائز رہنے کے بعد ۱۸۹۸ء کو وہ پٹنہ واپس آگئے اور وکالت دوبارہ شروع کر دی۔ بقول سید ہمایوں مرزا اگر سرور الملک حیدرآباد سے الگ نہ ہوتے تو خدا بخش اس عہدہ پر مستقل طور پر فائز رہتے۔

آخری عمر میں وہ بھی اپنے والد کی طرح فالج کا شکار ہو کر صاحب فراش ہو گئے، آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا چنانچہ بات قرضوں اور فاقوں تک پہنچ گئی کیونکہ انھوں نے جو کچھ بھی کمایا تھا وہ سب اپنے والد مرحوم کی خواہش کی تکمیل کی خاطر صرف کر دیا تھا۔ حکومت کو جب اس افتاد کی خبر ملی تو اس نے فوراً ان کی خبر گیری کی اور ان کی اعلیٰ خدمات کے نتیجہ میں آٹھ ہزار روپے کی یکمشت مدد کی اور دوسو روپے ماہانہ مشاہرہ پر لائبریرین اور لائبریری کی سکریٹری شپ کے عہدہ پر فائز کیا۔

زندگی کے آخری ایام انھوں نے بستر پر ہی گزارے لیکن ذہن و دماغ آخر وقت تک مستحضر رہا لہٰذا لیٹے لیٹے ہی لائبریری کے انتظام وانصرام میں مصروف رہنے کے علاوہ مطالعہ میں مشغول رہتے تھے حتیٰ کہ کتابوں کا یہ سچا عاشق اپنے رب کے حضور ۳؍اگست ۱۹۰۸ کو حاضر ہو گیا لیکن جانے سے پہلے وہ چشمۂ فیض جاری کر گیا جسکے سوتے آج بھی ابل رہے ہیں اور علم کی وہ شمع روشن کر گیا جس کی ضیاء پاشیوں سے آج بھی چہار سو روشنی پھیل رہی ہے۔

خدابخش خاں نے بحیثیت وکیل کافی کامیاب زندگی گزاری تھی۔ اس پیشہ سے منسلک ہونے کی وجہ سے عوام سے ان کا بہت مضبوط رشتہ قائم ہو گیا تھا جس کی وجہ سے سماجی کاموں میں ان کی دلچسپی مزید گہری ہوئی، وہ معاشرہ کی ترقی کے لیے حتی الامکان کوشش کرتے اور سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، ایک اہم لائبریری کا مالک ہونے کی وجہ سے ان کا قد مزید اونچا ہو گیا تھا، انگریز سرکار نے ان کی علمی وسماجی خدمات کا اعتراف کھلے دل سے کیا۔ چنانچہ جب ۱۸۷۷ء میں انھیں اسکول کمیٹی کا سکریٹری بنایا گیا تو انھوں نے اس ضمن میں بیش بہا خدمات انجام دیں جس سے انگریز آفیسران اس قدر خوش ہوئے کہ ۱۸۷۷ء میں دہلی دربار کے موقع پر انھیں دعوت دی گئی اور'' سندعزت''(Certificate of Honour) سے سرفراز کیا گیا۔

لارڈ رپن (Ripon) کا عہد وائسرائی ۱۸۸۰ء۔ ۱۸۸۴ء خدابخش کے لیے بہت اہم دور ثابت ہوا کہ وہ اس زمانہ میں انگریز سرکار کے بہت قریب ہو گئے اور اس کی نظروں میں انھیں ایک خاص وقعت اور مقام و مرتبہ حاصل ہو گیا۔ لارڈ رپن (Ripon) نے ملک کے انتظام وانصرام کے ضمن میں کچھ اصلاحات نافذ کی تھیں جس کی رو سے ملک کے انتظامی ڈھانچے میں

ہندوستانی عوام کی شمولیت بھی ضروری قرار پائی، پٹنہ میں یہ قرعہ فال خدابخش خاں کے نام نکلا اور انھیں ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل بورڈ کا وائس چیرمین مقرر کیا گیا، اس کے علاوہ ان کی پیشہ وارانہ قابلیت کو تسلیم کرتے ہوئے ۱۸۸۰ء میں سرکاری وکیل بھی مقرر کیا گیا۔ خدابخش خاں مرحوم ان تمام عہدوں کے معیار پر کھرے اترے اور اپنی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی پورا کیا جس کی وجہ سے لارڈ رپن (Ripon) ان کا بہت قدرداں بن گیا تھا جس کی سفارش پر ۱۸۸۳ء میں انھیں" خان بہادر " کے خطاب سے نوازا گیا۔ انگریز حکومت نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی مجموعی سماجی و علمی خدمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ۱۹۰۳ء میں انھیں (Companion of Indian Empire) جیسے معزز اور اہم اعزاز سے نوازا گیا۔ اسی سال انھیں کلکتہ یونیورسٹی سے فیلوشپ بھی ملی اور گورنمنٹ بنگال کی جانب سے انھیں تاحیات دوسو روپیہ کی پینشن بھی عطا کی گئی۔

خدابخش خاں اپنی پیشہ وارانہ مصروفیات کے باوجود مطالعہ کا وقت نکال لیتے تھے، ممکن ہے اس کا شوق انھیں بچپن ہی سے ہو چلا ہو کہ وہ اپنے والد کو ہمہ وقت مطالعہ میں مصروف دیکھتے تھے، عمر کے ساتھ ساتھ یہ شوق بڑھتا ہی چلا گیا، پھر والد کی خواہش کی تکمیل کی خاطر کتب خانہ کے لیے کتب جمع کرنے میں مصروف ہونے کی وجہ سے متعدد کتب ان کی نگاہوں سے گزرتی تھیں جس سے ان کے مطالعہ میں روز بروز گہرائی و گیرائی پیدا ہوتی جارہی تھی جس کا نچوڑ انھوں نے" محبوب الالباب" (فارسی) کی شکل میں پیش کیا ہے۔

ان کا مطالعہ کتنا وسیع اور حالات حاضرہ سے وہ کتنے باخبر تھے اس کا اندازہ ان کی اس تقریر سے ہوتا ہے جو انھوں نے ۵ راکتوبر ۱۸۹۰ء کو اس جلسہ میں کی تھی جس میں انھوں نے لائبریری کا انتظام سنبھالنے کے لیے معززین کو مدعو کیا تھا اور اسی جلسہ میں اس کا دروازہ پبلک کے لیے کھول دینے کا اعلان کیا تھا۔ ان کی یہ تقریر سلاست و روانی کا نمونہ بھی ہے اور ان کی زبان و بیان پر قدرت رکھنے کی شاہد بھی۔ اس تقریر میں انھوں نے مختصراً کتب خانہ کی اہمیت وضرورت کو واضح کرتے ہوئے ان کتب خانوں کا نوحہ بھی کیا ہے جو اغیار کے ہاتھوں تباہ وبرباد ہوئے تھے، اس کے بعد عالم اسلام میں اس وقت کے موجودہ کتب خانوں اور ان میں موجود کتب کی تعداد کا

ذکر کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا ہے کہ ''کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون'' دراصل اس وقت قسطنطنیہ میں موجود ساٹھ چھوٹے بڑے کتب خانوں کی کتابوں کی مجموعی فہرست ہے۔

انھوں نے اپنی علمی یادگار ''محبوب الالباب'' کی شکل میں چھوڑی ہے جس میں انھوں نے تقریباً ۱۸۹۸ مصنفین کی ۱۳۸۹ عربی و فارسی کتب کا تعارف کرایا ہے اور ان کتب کے مصنفین کے مختصراً حالات ذکر کیے ہیں۔ ہمارا قیاس ہے کہ یہ دراصل ان کتب کی فہرست ہے جو اس وقت لائبریری میں موجود تھیں گویا اسے لائبریری کا پہلا کیٹلاگ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ محبوب الالباب میں مذکور کتب کی تعداد اتنی کم کیونکر ہے جبکہ لائبریری کی مجموعی کتب کی تعداد ۱۸۹۱ء میں تقریباً چار ہزار تھی جس کا اعلان انھوں نے خود ہی لائبریری کو عوام کے لیے کھولتے ہوئے کیا تھا۔

اس سوال کا حتمی جواب دینا تو بہت مشکل ہے لیکن قیاس یہ کہتا ہے وہ دیگر کتب کا تعارف اس کی دوسری جلد یا باقی ماندہ جلدوں میں کرانا چاہتے تھے لیکن حالات نے انھیں اس کی تکمیل کی اجازت یا مہلت نہیں دی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انھوں نے یہ فہرست بہت پہلے ہی تیار کر لی ہو اور بعد میں آئیں نئی کتب کا اندراج نہ کر سکے ہوں اور قیام حیدرآباد کے دوران نظرثانی کیے بغیر ہی ۱۳۱۴ھ/ ۱۸۹۶ء میں اسے طباعت کے مراحل سے گزار دیا ہو کہ کم از کم اتنی کتب کی فہرست منظر عام پر آ سکے جس سے علم و فن کے تشنگان کو اندازہ ہو سکے کہ کتنے آبدار موتی اور قیمتی جواہر انھوں نے جمع کر لیے ہیں۔

اس کتاب میں انھوں نے یہ طریقہ کار اختیار کیا ہے کہ ایک حرف کے تحت آنے والی کتب کا ذکر ایک ساتھ تو کیا ہے لیکن اس حرف کی الفبائی ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا ہے اور بغیر کسی ترتیب کے اس حرف سے شروع ہونے والی تمام کتب کو یکجا کر دیا ہے۔ کتاب کا نام ذکر کرنے کے بعد اس کا مختصراً تعارف کراتے ہیں اور اس کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں اور اس کے بعد مصنف کے حالات مختصراً بیان کرتے ہیں۔

اس کتاب کے علاوہ ان کا ایک رسالہ بھی ہے جو ''تفسیر سورۂ فاتحہ و سورۂ اخلاص'' کے

نام سے اولاً حیدرآباد سے چھپا تھا جس کا عکسی ایڈیشن لائبریری نے ۱۹۹۶ء میں چھاپا ہے۔ یہ رسالہ دراصل ان کے دو خطبات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے قیام حیدرآباد کے دوران اسی مقام پر دیا تھا جہاں بقول ان کے چند روز قبل علامہ شبلی (۱۸۵۷ء۔ ۱۹۱۴ء) نے ''بعض مضامین عالیہ قرآنی پر ایک خطبہ بلیغ فرمایا تھا'' ان کے یہ خطبے علامہ شبلی کی تقریر کا گویا تتمہ ہیں جو انھوں نے احباب کی فرمائش پر دیئے تھے۔

ان کے یہ خطبات دراصل توحید اور توحید بالمعبودیت کے موضوع کا احاطہ کرتے ہیں جن سے ان کا مقصد قرآن کا معجزہ باعتبار مضامین ومعانی بیان کرنا ہے۔ انھوں نے سورۂ اخلاص اور سورۂ حشر کی آیات ھو اللہ الذی لا الہ الا ھو .... وھو العزیز الحکیم'' (الحشر: ۲۲۔ ۲۴) کو توحید کے مضامین کو واضح کرنے والی نمائندہ آیات قرار دیتے ہوئے پہلے سورۂ اخلاص کے معانی ومفہوم بیان کیے ہیں۔ اس کے بعد سورۂ حشر کی مذکورہ آیات کی تفسیر بیان کی ہے۔ چونکہ خطبہ کا اکثر حصہ سورۂ اخلاص کے معانی ومفہوم کو بیان کرتا ہے شاید اسی لیے رسالہ کے نام میں صرف سورۂ اخلاص کا ذکر ہے۔

توحید بالمعبودیت کے مضامین کو واضح کرنے کے لیے سورۂ فاتحہ کو نمائندہ سورہ قرار دیتے ہوئے اس کے مفہوم ومعانی کو ایک نئے پیرایے میں بیان کیا ہے'' اسم 'اللہ' منبع خلق وایجاد وتکوین وابداع اور لفظ 'رب' بہ لحاظ تربیت مصالحہ دنیا اور 'رحمان' بغرض مصالحہ مبداور 'رحیم' بلحاظ معاد اور 'مالك' دال اوپر اس قوت کے جس کا نمود بعد انتقال طرف دار جزاء کے ہے اس لیے 'الحمد لله رب العالمین الرحمن الرحیم مالك یوم الدین' فرمایا گیا اور نستعین کی توضیح 'اھد نا الصراط المستقیم' سے فرمائی۔ صراط کی تخصیص 'صراط الذین انعمت علیهم غیر المغضوب علیهم و لاالضالین' سے کردی۔''

قرآن کا معجزہ بالمعنی واضح کرنے کے لیے انھوں نے بعض مزامیر داؤد اور فقرات اسماعیل ذکر کیے ہیں جو یہودیوں اور عیسائیوں کی عبادت میں سورہ فاتحہ کی طرح ہر عبادت کے شروع میں پڑھے جاتے تھے اور یہ واضح کیا ہے کہ وہ مزامیر کسی درجے میں بھی توحید بالمعبودیت

کی وضاحت مکمل طور پرنہیں کرتے ہیں۔

طباعت کے وقت ان خطبات کی ترتیب شاید اس لیے بدل دی گئی ہے کہ سورہ فاتحہ کو اولیت حاصل ہے ورنہ اس رسالہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے انھوں نے سورہٗ اخلاص و دیگر آیات کی روشنی میں توحید کے موضوع پر خطبہ دیا تھا اس کے بعد دوسرے خطبہ میں'' توحید بالمعبودیت'' کو سورہ فاتحہ کی روشنی میں پیش کیا تھا۔اس نظریہ کی دلیل یہ ہے کہ سورہ اخلاص کی تفسیر بیان کرنے سے پہلے انھوں نے مختصراً تمہید ذکر کی ہے۔جس میں ان خطبات کے دیئے جانے کا پس منظر بیان کیا ہے جبکہ اسی خطبہ کے آخر میں '' توحید بالمعبودیت '' کے موضوع پر دوسرے خطبہ میں گفتگو کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

ان خطبات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ کتنا وسیع تھا اور کتنی گیرائی و گہرائی سے متقدمین کی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔اس کی زبان اس زمانہ کے اعتبار سے بہت سادہ، سلیس اور صاف ستھری ہے اور انھوں نے بہترین پیرایہ بیان میں اپنی بات سامعین کے گوش گزار کی ہے۔

علم وفن کے نادرترین موتی جمع کرنے والے خدابخش زاہد خشک نہیں تھے بلکہ انھوں نے کوچہ شاعری کی بھی سیر کی ہے جمیل ان کا تخلص تھا اور ان کے اشعار اس اخبار میں چھپے تھے جس میں اس مشاعرہ کی روداد چھپی تھی جس میں خدابخش شریک ہوئے تھے اور سامعین کو اپنے کلام سے محظوظ کیا تھا۔صلاح الدین خدابخش نے بھی وضاحت کی ہے کہ آخری عمر میں وہ شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوگئے تھے اور اشعار کے چار ضخیم مجموعے بطور یادگار چھوڑے ہیں۔ان کے اس بیان کے اولین حصہ سے تو سابق ڈائرکٹر عابد رضا بیدار صاحب اتفاق کرتے ہیں اور ان کے اشعار پڑھنے کا اعتراف بھی کرتے ہیں لیکن دوسرے حصہ سے کلی طور پر اختلاف کرتے ہوئے لکھاہے'' کتب خانہ میں ۴ ضخیم جلدیں تو درکنار ان کی کوئی مختصر بیاض اشعار بھی موجود نہیں ہے۔'' ممکن ہے کہ اس ضمن میں صلاح الدین خدابخش کو غلط فہمی ہوگئی ہو اور تسامح کی وجہ سے اپنی والدہ جمیلہ (م ۱۹۲۱ء) کے دیوان کو اپنے والد کی طرف منسوب کردیا ہو کیونکہ خدابخش کی بیگم جمیلہ کی شاعری کے آٹھ ضخیم دیوان/مجموعے لائبریری میں موجود ہیں۔

خدابخش مرحوم عربی فارسی اور انگریزی سے کما حقہ واقف تھے ،خصوصاً فارسی زبان پر انھیں دسترس حاصل تھی اور تقریر وتحریر پر یکساں قدرت --محبوب الالباب کے بعض حصے شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔انگریزی سے واقفیت کا عالم یہ تھا کہ انھوں نے لارڈ بیکن (Lord Bacon) کے مضامین کا انگریزی سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا،انگریز شعراء وادباء کی تخلیقات کا نہ صرف مطالعہ کیا تھا بلکہ ان کی درجہ بندی بھی کی تھی ۔لہذا زور کلام میں وہ سوئنبرن (Swinburne) کو قاآنی کا مدمقابل قرار دیا کرتے تھے۔

جب دولت وعہدہ کی دیوی کسی گھر پر مہربان ہوتی ہے تو اہل خانہ کو تکبر و گھمنڈ ،غرور و نخوت سے بھی نوازتی ہے۔دولت اور ان ناپسندیدہ صفات کا بالعموم چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔تاہم کچھ لوگ دولت کی ان حشر سامانیوں سے محفوظ رہ جاتے ہیں اور ثمر دار درخت کی طرح ہمہ وقت جھکے رہتے ہیں ان میں سے ایک خدابخش خاں مرحوم بھی تھے جو نہ صرف ان اخلاقی عوارض سے محفوظ رہے بلکہ اس کے برعکس ان میں انکساری ،خوش خلقی اور نرم گفتاری کے اوصاف نمایاں ہو گئے بقول معین الدین ندوی'' خدابخش خاں مرحوم اخلاق کریمانہ سے متمتع تھے۔ترفع ، خودداری اور جاہ پسندی کے ساتھ بردباری ،رحم دلی اور سخاوت کی آمیزش نے انھیں نہایت سنجیدہ اور ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔امراء کے مقابلے میں خودداری اور غرباء کے ساتھ تواضع اور انکساری ان کا طرۂ امتیاز تھا۔''

اس زمانہ کے عام انگریزی تعلیم یافتہ افراد کی طرح خدابخش دین و مذہب سے بیزار نہیں تھے بلکہ دین شریعت کے پابند اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے بقول معین الدین ندوی '' خدابخش خاں مرحوم ایک راسخ العقیدہ اور پابند شریعت مسلمان تھے ۔نماز پنجگانہ کبھی فوت نہیں ہوئی۔نماز صبح کے بعد خود بھی معمولاً تھوڑی تلاوت فرماتے اور بچوں کو بھی ہمیشہ تلاوت قرآن کی تاکید کرتے۔''

ان باطنی خوبیوں کے ساتھ اللہ نے انھیں ظاہری حسن و جمال سے بھی نوازا تھا وہ خوبصورت خد و خال اور پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔وہ میانہ قد ،خوبصورت چہرہ ،کشادہ

پیشانی، ستواں ناک، ذہانت سے بھرپور اور روشن چھوٹی چھوٹی مگر خوبصورت آنکھیں، پتلے پتلے ہونٹ اور دبلے جسم کے مالک تھے ان کے چہرے کی خوبصورتی میں سلیقہ سے ترشی ہوئی داڑھی مزید اضافہ کرتی تھی، انھیں دیکھ کر یقیناً ہر شخص متاثر ہوتا رہا ہوگا کہ یہ نحیف الجثہ شخص کتنے راسخ عزم اور پختہ ارادہ کا مالک ہے کہ اس نے محض اپنی دھن و لگن سے علم و فن کا وہ تاج محل تیار کر دیا جسے تخت و سلطنت کے مالک اشخاص بھی نہ بنا سکے تھے۔

مرحوم خدا بخش نے تین شادیاں کی تھیں اور اللہ نے انھیں صالح اولاد سے نوازا تھا۔

(الف) پہلی شادی انھوں نے طاہرہ خاتون سے کی تھی ان کے بطن سے چار صاحبزادے اور ایک لڑکی تھی جس کا کمسنی میں ہی انتقال ہوگیا تھا۔ اس بیوی کے بطن سے پیدا ہونے والے صاحبزادوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور اہم عہدوں پر فائز ہوئے تھے۔

(۱) صلاح الدین خدا بخش (م ۱۹۳۱ء): وہ علم و فضل کے لحاظ سے اپنے والد کے صحیح جانشین تھے، پٹنہ اور کلکتہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد آکسفورڈ سے تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے وہاں سے ایم اے، بی سی ایل کی ڈگری اور بار ایٹ لا کی سند حاصل کی۔ پہلے ڈھاکہ میں پریکٹس کی، پھر کلکتہ میں پریکٹس کرنے لگے۔ ان کا شمار مشہور اور قابل بیرسٹروں میں ہوتا تھا۔ ایک زمانہ تک لا کالج اور کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ سے بھی منسلک رہے۔ انھوں نے متعدد کتب یادگار چھوڑی ہیں۔ والد کی وفات کے بعد انھوں نے لائبریری کا انتظام بھی کچھ دنوں سنبھالا لیکن دل نہ لگا لہذا وہ کلکتہ واپس چلے گئے اور ساری زندگی وہیں گزار دی۔

(۲) شہاب الدین خدا بخش (م ۱۹۴۰ء): انھوں نے بھی کلکتہ اور لندن میں تعلیم حاصل کی تھی اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد محکمہ پولیس سے وابستہ ہوئے اور ایس پی کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ انھوں نے بھی محکمہ کی ذمہ دارانہ مشغولیات کی وجہ سے لائبریری کی ذمہ داری قبول کرنے سے معذرت کر دی تھی۔

(۳) غیاث الدین خدا بخش: ان کا انتقال کمسنی میں ہی دس سال کی عمر میں ہوگیا۔ خدا بخش انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔

(۳) محی الدین خدابخش (م ۱۹۱۰ء): ان کی تعلیم پٹنہ اور کلکتہ میں ہوئی تھی، بڑے بھائیوں نے اپنی اپنی مصروفیات کی وجہ سے لائبریری کی ذمہ داری قبول کرنے سے معذرت کردی تھی لہذا اس کی ذمہ داری کا بوجھ خدابخش کے سب سے چھوٹے صاحبزادے محی الدین کے کاندھوں پر آ گیا۔ انھوں نے بھی مکمل لگن اور پوری تندہی کے ساتھ اپنے دادا اور والد کے سرمایہ حیات کی حفاظت اور نگہداشت ۲۸ر ستمبر ۱۹۰۸ء سے شروع کی کہ لوگوں کو یہ خیال ہو چلا کہ وہ دوسرے خدابخش ہوں گے لیکن عمر نے وفا نہیں کی اور ۳۰ر اگست ۱۹۱۰ء کو اپنے حقیقی رب سے جا ملے۔

(ب) خدابخش نے پہلی بیوی کی موجودگی میں ہی دوسرا نکاح کیا تھا ان کا نام خدیجہ بیگم تھا۔ خدابخش نے دونوں بیویوں کو الگ الگ مکان میں رکھا اور دونوں کے پاس آنے جانے کا وقت مقرر کر رکھا تھا۔ دونوں بیویوں میں آپس میں بہت محبت تھی اور ہنسی خوشی اپنی اپنی زندگی انھوں نے گزاری تھی۔

اس بیوی کے بطن سے خان بہادر عبدالغفور (۱۸۹۳ء۔ ۳۰ر دسمبر ۱۹۸۴ء) تھے جو والد سے ناراض ہو کر گھر سے ایسا گئے کہ پھر پلٹ کر باپ کا منہ تک نہ دیکھا۔ یہ ناراضگی صرف اس لیے پیدا ہوئی تھی کہ خدابخش مرحوم نے انھیں سبق یاد نہ کرنے پر مارا تھا اور کھانا پانی دینے سے منع کر دیا تھا، اس بات سے ناراض ہو کر انھوں نے قسم کھائی کہ میرے لیے اس گھر کا کھانا پینا حرام ہے اور گھر چھوڑ کر چلے گئے اور دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد فوج میں داخل ہو گئے جہاں انھوں نے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ انھیں بھی ''خان بہادر'' کا لقب عطا کیا گیا۔ انھوں نے بھی تین شادیاں کی تھیں۔ اللہ نے صالح اولاد سے نوازا جو اچھے عہدوں پر فائز ہیں اور بعض تجارت میں مصروف ہیں۔

مذکورہ بیوی کے بطن سے عبدالغفور مرحوم کے علاوہ ایک لڑکا اور ایک لڑکی تولد ہوئے تھے جن کا کم سنی میں ہی انتقال ہو گیا۔

(ج) خدابخش نے تیسری شادی پہلی بیوی کی وفات کے بعد ایک بنگالی خاتون رانیہ بیگم (۱۸۶۸-۱۹۲۱ء) سے کی۔ یہ خدابخش کی سب سے فائق بیوی تھیں۔ وہ ایک قادرالکلام

شاعرہ بھی تھیں۔جمیلہؔ ان کا تخلص تھا،ان کے دیوان کے آٹھ ضخیم مجموعے لائبریری میں موجود ہیں اوراشاعت کا انتظار کررہے ہیں۔

ان کے بطن سے ولی الدین خدابخش پیدا ہوئے،انھوں نے بھی وکالت کی تعلیم حاصل کی لیکن زبان میں لکنت ہونے کی وجہ سے ان کی وکالت کامیاب نہ ہوسکی۔وہ اپنے بھائی محی الدین خدابخش کے بعد لائبریری کے ذمہ دار مقرر ہوئے اورتقریباً ۲۲رسال تک لائبریری کے انتظام وانصرام کوسنبھالتے رہےاور آخری عمرتک باپ دادا کے ورثہ کی نہ صرف حفاظت کرتے رہے بلکہ اس میں گرانقدر اضافہ بھی کیا۔ان کا انتقال ۱۹۴۰ء میں ہوا۔

ولی الدین خدابخش ایک ادبی ذوق کے مالک تھے۔ممکن ہے کہ یہ اثرات ان کی والدہ کی جانب سے ان میں منتقل ہوئے ہوں تاہم انھوں نے شاعری نہیں کی بلکہ اردو فارسی کے اہم شعراء کا انتخاب کیا تھا اور''کشکول'' نامی کتاب تیار کی تھی۔اس کا قلمی نسخہ بھی لائبریری میں موجود ہے۔

انیسویں،بیسویں صدی ہندوستانی مسلمانوں کی ہمہ جہت ترقی کے لیے سنگ میل ثابت ہوئی۔ان صدیوں میں متعدد شخصیات منصۂ شہود پر آئیں اوراپنے لازوال کارناموں کی وجہ سے حیات جاوداں اختیار کرگئیں،انھیں صدیوں میں کچھ ایسے ادارے قائم ہوئے جن کی ضیاء پاشیوں سے آج بھی ایک عالم منور ہے۔ان میں سے ایک سرزمین بہار میں ایستادہ ہے جو بقول رضا علی عابدی'' آج بھی وہ خدابخش لائبریری کے نام سے ماضی کی عظمتوں کا مینارہ بنی کھڑی ہےاوراس کی کرنیں کہاں کہاں نہیں بکھری ہیں''۔جواپنے نوادرات اورعلم وفن کے سچے حسین اور خوبصورت موتیوں کی وجہ سے بجا طور پر''علم وفن کا تاج محل'' قرار دی جاسکتی ہے۔اس کی معنوی خوبصورتی حسن وجمال اورآرائش وزیبائش خدابخش کی مرہون منت ہے۔بقول رضا علی عابدی،''علم وادب پران کے اتنے احسانات ہیں کہ دل سے ان کے لیے یہی صدا نکلتی ہے خدابخشے''۔

خدابخش لائبریری دراصل ایک داستان ہے یقین محکم اور عمل پیہم کی،ایک کہانی ہے عزم راسخ اور بلندی حوصلہ کی اوراس حقیقت کی شاہد ہے کہ انسان جب کسی چیز کوانجام دینے کا پختہ ارادہ کرلیتا ہے تو منزلیں خود ہی آگے بڑھ کرقدم چوم لیتی ہیں اورکامیابیاں اس کے ہمرکاب

ہو جاتی ہیں۔

آج کی خدابخش لائبریری دراصل کئی نسلوں کی محنت وکاوش کا نتیجہ ہے۔ اس کی خشت اول خدابخش مرحوم کے والد محترم محمد بخش (۱۸۱۵ء۔۱۸۷۶ء) نے کچھ اس خلوص نیت سے رکھی تھی کہ بہت جلد وہ نگاہوں کی توجہات کا مرکز بن گئی۔

محمد بخش نے اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز ۱۸۴۰ء کے بعد چھپرہ سے کیا اور بہت جلد وہاں کے حلقہ میں اتنے مشہور و معروف ہو گئے کہ ''برسٹر صاحب'' کہلانے لگے۔ انھیں مطالعہ کے شوق کے ساتھ ساتھ کتابوں کے جمع کرنے کا بھی شوق تھا لہٰذا انھوں نے مضافات سے کتابیں جمع کر کے ۱۸۴۸ء میں ایک کتب خانہ بنایا تھا جس کا نام ''محمدیہ کتب خانہ'' تھا۔ اس میں انگریزی و فارسی کی عمدہ کتابیں تھیں جس کے مطالعے کے لیے ہندوستانیوں کے علاوہ انگریز بھی آتے تھے جس کی وجہ سے محمد بخش کے گہرے تعلقات انگریز آفیسران سے قائم ہو گئے تھے اور پیشہ وکالت سے منسلک ہونے کی وجہ سے وہ تعلقات مزید خوشگوار ہوتے چلے گئے۔ ان کی پیشہ وارانہ قابلیت و مہارت دیکھ کر انکے انگریز و ہندوستانی دوستوں نے مشورہ دیا کہ وہ پٹنہ جا کر پریکٹس کریں جہاں ترقی کے مزید مواقع حاصل ہوں گے۔ انکے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے ۱۸۵۳ء میں اپنی فیملی کے ساتھ پٹنہ منتقل ہو گئے لیکن اپنے ساتھ دل و جان سے عزیز اپنی لائبریری لانا نہیں بھولے اور پٹنہ پہنچ کر چوہٹہ میں کرائے کا ایک مکان لیا اور اس کے کمرہ میں لائبریری کو از سر نو ترتیب دیا اور استفادہ کے لیے اسکا دروازہ اپنے دوستوں کے لیے کھول دیا۔

محمد بخش کی خواہش تھی کہ کتابوں کا معتدبہ ذخیرہ جمع کر کے اسے عوام کے استفادہ کے لیے کھول دیا جائے لہٰذا وہ کتابوں کے حصول کے لیے اپنی سی کوشش کر رہے تھے لیکن شاید قدرت نے اس فیض عام کو جاری کرنے کے لیے خدابخش کا انتخاب کیا تھا لہٰذا وہ اپنی خواہش دل میں لیے ہوئے اس دنیا سے سدھار گئے لیکن جانے سے پہلے اپنے جمع کردہ ۱۴۰۰ مخطوطات اور دیگر کتب اپنے لائق فرزند کے حوالے کرتے ہوئے یہ وصیت کی کہ یہ میرا سرمایہ حیات ہے اس کی حفاظت کرنا اور اس میں معتدبہ اضافہ کر کے اس کو عوام کے لیے وقف کر دینا تا کہ وہ اس سے

زیادہ سے زیادہ مستفید ہوسکیں۔

محمد بخش کی اس وصیت کو ان کے لائق بیٹے نے گرہ سے باندھ لیا اور کتابوں کے حصول میں اپنی ساری دولت صرف کر دی اور جب کتابوں کا کچھ قابل ذکر ذخیرہ جمع ہو گیا تو ۱۸۸۲ء میں اس کے دروازے عوام کے لیے وا کر دیئے، ۱۸۸۸ء میں تقریباً ۸۰ر ہزار روپے خرچ کر کے ایک دو منزلہ عمارت بنوائی اور اس میں سلیقہ سے کتابیں ترتیب دیں کہ دیکھنے والا حیرت زدہ رہ جاتا تھا کہ اے خدایا! یہ ایک شخص کی تن تنہا محنت ہے۔ اس وقت تک مخطوطات کی تعداد ۴۰۰۰ اور مطبوعات کی تعداد تقریباً ڈھائی ہزار ہوگی جن میں فارسی، عربی اور انگریزی کی کتابیں شامل تھیں۔ اس کا انتظام کرنا جب تن تنہا ان کے بس میں نہ رہا تو ۵ر اکتوبر ۱۸۹۰ء کو عمائدین شہر کی ایک میٹنگ بلائی اور کتب خانوں کی ضرورت و اہمیت کو واضح کرتے ہوئے اپنا عندیہ ظاہر کیا کہ اس کتب خانہ کا انتظام کرنا اب تن تنہا ان کے بس میں نہیں ہے لہٰذا انھوں نے اسے حکومت کی تحویل میں دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ بشرطیکہ وہ اسے پندرہ ہزار روپے کی امداد دے۔ ان کے اس خیال کی تائید جلسہ کے صدر اور دیگر عمائدین نے کی۔

۲۴ر نومبر ۱۸۹۰ء کو خدا بخش نے دوسرا جلسہ عام کیا اور کتب خانہ کے انتظام سے متعلق سرکار سے ہوئی مراسلت سے عمائدین شہر کو مطلع کیا کہ حکومت نے ان کی شرطیں قبول کر لی ہیں۔

۱۴ر جنوری ۱۸۹۱ء میں انگریزی زبان میں ایک وقف نامہ تیار کر کے اسے رجسٹرڈ کیا اور اس لائبریری کو عوام کے لیے باضابطہ طور پر وقف کر دیا۔ لیکن اس میں دو شرطیں تھیں کہ کتب خانہ ہمیشہ پٹنہ میں ہی رہے گا کیونکہ اس وقت بہار الگ سے صوبہ نہیں بنا تھا بلکہ بنگال کا ایک حصہ تھا اور انھیں ڈر تھا کہ کہیں حکومت اپنی سرپرستی میں لینے کے بعد اسے کلکتہ منتقل نہ کر دے۔ دوسری شرط یہ تھی کہ لائبریرین وہ خود تا حیات رہیں گے، ان کے بعد ان کے بیٹے ہوں گے۔ ان کے بعد ان کے بھائی کی اولاد یا دیگر افراد خانہ ہوں گے۔

حکومت بنگال اس کتب خانہ کی اہمیت و افادیت سے واقف تھی لہٰذا اس نے ان کی شرائط کو مانتے ہوئے اسے اپنی تحویل میں لے لیا اور ۲۶ر جون ۱۸۹۱ء کو لائبریری چلانے کے

لیے ۶۰۰ روپے سالانہ مدد اور ۳۰ ر جولائی ۱۸۹۱ء کو لائبریری کا نظم ونسق چلانے کے لیے ۲۵ ر آدمیوں پر مشتمل ایک مینجنگ کمیٹی بنائی جس میں ان کے علاوہ سرکاری اور غیر سرکاری ہندو و مسلمان اس کے ممبر منتخب ہوں گے۔

۵ ر اکتوبر ۱۸۹۱ء بمطابق یکم ربیع الاول ۱۳۰۹ھ کو اورینٹل پبلک لائبریری کا افتتاح کلکتہ کے اس وقت کے گورنر سر چارلس ایلیٹ (Sir Charles Elliot) کے ہاتھوں ہوا اور اس کا نام خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری قرار پایا۔ حالانکہ بانی کتب خانہ نے اسے ''اورینٹل پبلک لائبریری'' کے نام سے وقف کیا تھا لیکن ان کے احسانات کو عوام کیسے نظر انداز کر سکتے تھے۔ لہٰذا اس کے ساتھ'' خدابخش'' کا لاحقہ جوڑ دیا گیا اور یہ آج بھی خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری کے نام سے ہمیں اپنے آباء واجداد کے اس لازوال کارنامے کی یاد دلاتی رہتی ہے اور سارے عالم کو اپنی ضیاء پاشیوں سے منور کر رہی ہے۔

خدابخش لائبریری اپنے کشادہ دامن میں وہ وہ نوادرات لیے ہوئے ہے جن کی کوئی قیمت نہیں، وہ بیش بہا اور بے بدل ہیں۔ جن کی زیارت کے لیے گوشہ گوشہ سے افراد آتے ہیں اور یہاں جاری رہنے والے چشمہ فیض سے سیراب ہو کر واپس جاتے ہیں۔ وہ یقیناً خدابخش کو دعائیں دیتے ہوں گے کہ ان کی بدولت آباء واجداد کی کتابیں محفوظ رہ گئیں جو کشادگی دماغ اور آنکھوں کی ٹھنڈک کا سبب ہیں۔

خدابخش لائبریری دراصل عربی وفارسی مخطوطات کی لائبریری ہے جو اس کی بنیادی خصوصیت اور دیگر لائبریریوں سے اس کے امتیاز کا سبب ہے اس کی دیگر خصوصیات میں مغل عہد کی نایاب ونادر تصاویر، گزرے وقتوں کے تقریباً ایک ہزار سے زائد مختلف اردو رسالوں کے کئی لاکھ شماروں اور ہندوستان کی تحریک آزادی کی اردو دستاویزوں کے بڑے حصہ کا یہاں محفوظ ہونا ہے۔ آج یہاں تقریباً ۲۱۱۰۱ (اکیس ہزار ایک سو ایک) مخطوطات تقریباً دو لاکھ عربی، اردو، فارسی انگریزی اور دیگر زبانوں کی مطبوعات کے علاوہ تقریباً آٹھ سو نادر سکے محفوظ ہیں۔

خدابخش لائبریری کی شہرت وعظمت میں کئی نسلوں کا خون جگر شامل ہے، متعدد افراد کی

کاوشوں کی دن رات محنت کا دخل ہے کہ وہ اس کی گیسوئے دراز کو ہمیشہ سنوارتے رہے اور اس طرح سنوارتے رہے کہ اس نے مشرقی علوم وفنون کی دلہن کا روپ اختیار کرلیا ہے کہ ہر شخص اس کے حسن وخوبصورتی سے نہ صرف متاثر ہوتا نظر آتا ہے بلکہ وہ اس پر ہر وقت فدا ہونے اور متاع دل وجان لٹانے کے لیے تیار بیٹھا ہے۔

(فکر ونظر علیگڑھ ۷/۳-۹-۲۰۰۰ء)

(نوٹ: لائبریری کے نوادرات، تعداد مخطوطات وکتب کے متعلق معلومات لائبریری کے ڈائرکٹر جناب حبیب الرحمن چغانی صاحب کے مضمون سے ماخوذ ہیں جس کے لیے ہم ان کے تہ دل سے مشکور وممنون ہیں۔)



توقیت خدابخش خاں

- ۲؍اگست ۱۸۴۲ء۔ پیدائش بمقام چھپرہ (بہار)۔ (والدہ بی بی ناظمہ، شادی ۱۸۴۰ء)
- ۱۷؍دسمبر ۱۸۴۲ء- خدابخش خاں کے منجھلے بھائی یوسف علی خاں عرف اسمٰعیل خاں کی ولادت۔
- ۱۸۴۸ء- محمد بخش نے چھپرہ میں وکالت شروع کی۔ اور ایک ذاتی لائبریری "محمدیہ کتب خانہ" کے نام سے قایم کی۔
- ۲۵؍اکتوبر ۱۸۵۱ء- خدابخش خاں کے چھوٹے بھائی جعفر علی خاں عرف ابوالحسن خاں کی ولادت۔
- ۱۸۵۳ء- محمد بخش خاں چھپرہ سے اپنے اہل و عیال کے ساتھ پٹنہ چلے آئے اور محلہ چوہٹہ میں ایک مکان کرایہ کا لے کر ایک کمرہ "محمدیہ کتب خانہ" کے لیے مخصوص کر دیا۔
- ۱۸۵۴ء- مسٹر ٹراورس کے مشورہ سے جو اُس وقت پٹنہ کے ڈسٹرکٹ جج تھے، خدابخش خاں پٹنہ ہائی اسکول میں داخل کیے گیے۔
- ۱۸۵۷ء- ہندستان کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کا اثر سارے ہندستان پر ہوا اور دیگر علمی و تعلیمی اداروں کی مانند پٹنہ ہائی اسکول بھی صفحۂ ہستی سے معدوم ہو گیا۔
- ۱۸۵۹ء- تکمیل تعلیم کے خیال سے خدابخش خاں راہی کلکتہ ہوئے۔
- ۱۸۶۱ء- کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پٹنہ آکر قانون کا مطالعہ کرنے لگے۔
- ۱۷؍اگست ۱۸۶۲ء- خدابخش خاں کے چچا احمد بخش خاں (۱۸۱۱ء- ۱۸۶۲ء) کی وفات۔
- جنوری ۱۸۶۸ء- خدابخش خاں نے پٹنہ میں وکالت شروع کی۔
- ۱۸۷۵ء- خدابخش خاں پٹنہ اسکول کمیٹی کے سکریٹری بنائے گیے۔
- ۲؍اکتوبر ۱۸۷۶ء- خدابخش خاں کے والد محمد بخش خاں (پیدائش ۱۸۱۵ء) کی وفات اور

"محمدیہ کتب خانہ" وراثتاً خدابخش خاں کو ملا۔

- ۱۸۷۷ء- حکومت نے خدابخش خاں کو Certificate of Honour سے نوازا۔
- ۱۸۸۰ء- لارڈ رپن (Ripon) نے خدابخش خاں کو سرکاری وکیل مقرر کیا۔ ساتھ ہی پٹنہ ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل بورڈ کے وائس چیرمین کا عہدہ تفویض ہوا، خاں بہادر کا خطاب ملا۔
- دسمبر ۱۸۸۱ء- خدابخش خاں نے عمائدین شہر کی ایک میٹنگ بلائی اور محمدیہ کتب خانہ کو عوامی کتب خانہ بنادینے کا اعلان کیا۔
- ۱۸۸۸ء- خدابخش خاں نے لائبریری کے لیے ایک دو منزلہ عمارت بنوائی اور محمدیہ کتب خانہ کو اورینٹل پبلک لائبریری کا نام دیا گیا۔
- ۲۳ر اگست ۱۸۹۰ء- لائبریری کو حکومت کے انتظام میں دے دینے کی پیش کش کی۔
- ۱۵ر اکتوبر ۱۸۹۰ء- سید بادشاہ نواب صاحب کی صدارت میں عمائدین شہر کی ایک میٹنگ بسلسلہ اورینٹل پبلک لائبریری ہوئی۔
- ۲۷ر اکتوبر ۱۸۹۰ء- کمشنر پٹنہ کو حکومت بنگال کی ایک چٹھی موصول ہوئی جس میں خدابخش خاں کی فیاضی اور جذبۂ خدمت کو سراہا گیا کہ انھوں نے علوم مشرقیہ کے قلمی نسخوں کا شاندار ذخیرہ جس کی مالیت دولاکھ روپے ہے اور ایک عمارت جس کی قیمت ۳۵ ہزار روپے ہے، پٹنہ میں پبلک لائبریری کے لیے پیش کیا ہے۔
- ۲۴ر نومبر ۱۸۹۰ء- خدابخش خاں نے پھر ایک عام جلسہ کیا اور اپنی رپورٹ پیش کی۔
- ۱۸۹۰ء- علامہ شبلی نعمانی (متوفی ۱۹۱۴ء) کی خدابخش لائبریری میں آمد۔ یہاں کے علمی وادبی نوادرات وجواہرات سے متاثر ہو کر انہوں نے اس لائبریری پر ایک مضمون لکھا جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ۲۳ر فروری ۱۸۹۱ء اور دبدبہ سکندری رامپور کے ۱۸۹۱ء کے شمارے میں شائع ہوا۔
- ۱۴ر جنوری ۱۸۹۱ء- خدابخش خاں نے انگریزی زبان میں ایک وقف نامہ رجسٹری سے تکمیل کر کے اس لائبریری کو عوام کے لیے باضابطہ وقف کر دیا۔

- ۲۶ر جون ۱۸۹۱ء- حکومت نے لائبریری کا خرچ چلانے کے لیے ۶۰۰ روپے سالانہ ایڈ دینا منظور کیا۔
- ۳۰ر جون ۱۸۹۱ء- لائبریری کا نظم و نسق چلانے کے لیے ۲۵ آدمیوں پر مشتمل ایک مینیجنگ کمیٹی بنائی گئی جس کے سرپرست لفٹنٹ گورنر بنگال قرار پائے۔ کمیٹی کے صدر کلکٹر پٹنہ مقرر ہوئے۔ خدا بخش خاں بھی اس کے ایک ممبر تھے۔
- ۵ر اکتوبر ۱۸۹۱ء- اورینٹل پبلک لائبریری کے باضابطہ افتتاح کا انتظام ہوا۔ سرچارلس ایلیٹ نے لائبریری کا افتتاح کیا۔
- اکتوبر ۱۸۹۱ء- لائبریری کی میٹنگ ہوئی۔
- ۱۸۹۲ء- خدا بخش خاں کی دوسری بیوی خدیجہ بیگم کو ایک بیٹا پیدا ہوا، جن کا نام عبدالغفور رکھا گیا۔
- ۱۸۹۳ء- سرانتونی میکڈانل نے اس لائبریری کو ملاحظہ فرما کر غیرمعمولی خوشی کا اظہار فرمایا۔
- ۱۸۹۴ء- بحیثیت وکیل خدا بخش خاں کی کافی شہرت ہوئی۔ صلاح الدین خدا بخش تعطیل گزارنے کے لیے انگلینڈ سے ہندستان آئے۔
- ۱۱ر اپریل ۱۸۹۴ء- صلاح الدین خدا بخش خاں کی شادی ابوالحسن خاں بارایٹ لا کی دوسری بیوی کی دوسری بیٹی آصفہ خاتون عرف مشتری سے پٹنہ میں ہوئی۔
- ۱۸۹۵ء- نظام حیدرآباد نے خدا بخش خاں کو تین سال کے لیے اپنی ریاست میں چیف جسٹس کا عہدہ عطا کیا۔
- اسی زمانے میں انھوں نے " تاریخ عظیم آباد " کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ یہ مضمون خدا بخش لائبریری جرنل ۱۰۹ میں شائع ہو چکا ہے۔
- اسی وقت " تفسیر سورہ فاتحہ و اخلاص " پر ایک لکچر بھی دیا جو اسی زمانے میں شائع ہوا۔ دوبارہ خدا بخش لائبریری جرنل ۱۰۳ میں طبع ہوا۔
- ۳ر اپریل ۱۸۹۵ء- لارڈ ایلگن کی لائبریری میں تشریف آوری۔

- ۱۸۹۷ء- خدا بخش خاں کی تیسری بیوی راضیہ خاتون جمیلہ کی کتاب "سیف مسلول فی غزوۃ الرسول" انجمن اسلامیہ بانکی پور سے شائع ہوئی۔
- فرقۂ اثناعشریہ کی مشہور فقہ "شرائع الاسلام" کا اردو ترجمہ "روائع الاحکام ترجمہ شرائع الاسلام" کے نام سے خدا بخش کی سرپرستی میں حیدر آباد سے شائع ہوا۔
- ۱۸۹۸ء- حیدر آباد سے ریٹائر ہو کر خدا بخش خاں پٹنہ آئے اور وکالت شروع کی۔
- خدا بخش خاں کی کتاب "محبوب الالباب فی تعریف الکتب والکتاب" حیدر آباد سے شائع ہوئی۔
- ۱۹۰۱ء- حکیم اجمل خاں کی لائبریری تشریف آوری۔
- ۱۹۰۲ء- افتخار عالم مارہروی اور عبدالسلام ندوی کی لائبریری آمد۔
- ۱۸/اکتوبر ۱۹۰۲ء- عظیم آباد کے ایک عظیم الشان اور یادگار مشاعرہ میں خدا بخش کی شرکت، جو ۱۸/ اکتوبر سے ۲۴/اکتوبر تک جاری رہا۔ اس موقعہ پر انھوں نے فن شاعری پر عالمانہ تقریر کی اور بحیثیت شاعر اپنا کلام سنایا۔ خدا بخش خاں جمیلؔ تخلص کرتے تھے۔ اس یادگار مشاعرہ کی رپورٹ الپنچ، بانکی پور کے ۲۵/اکتوبر ۱۹۰۲ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔
- ۲/نومبر ۱۹۰۲ء- انجمن اسلامیہ بانکی پور کا ایک جلسہ عام منعقد ہوا، جس میں پٹنہ کے رؤسا اور سربرآوردہ لوگ شریک ہوئے۔ خدا بخش خاں بھی اس جلسہ میں شریک ہوئے اور لوگوں سے خطاب بھی کیا۔ لوگوں کو خدا بخش خاں کے بارے میں یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی کہ وہ نہیں چاہتے ہیں کہ انجمن اسلامیہ کی عمارت بنے۔ خدا بخش نے اپنے خطاب میں یہ کہتے ہوئے لوگوں کی غلط فہمی دور کی کہ "ہماری طرف سے جو لوگوں کو شبہ ہے کہ ہم اس کے بننے میں مخل ہیں، بالکل غلط ہے۔ ہمیں نے اس انجمن کو جگہ دی اور ہمیں نے حکام کو اس پر راضی کیا اور یہاں تک مستعد کیا ہے کہ اگر آپ لوگ چاہیں تو حکام وقت بہت کچھ اعانت کریں گے۔ ہم عام جلسہ میں بیان کرتے ہیں کہ ہم ہرگز اس

کے مخالف نہیں ہیں یا اس زمین کے متعلق کبھی حکام وقت یا کوئی بھی کوئی بات نکالے تو ہم اس کے ذمہ دار ہوں گے اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ سو روپے تعمیر مکان کے لیے بھی دیں گے"۔(الپنچ، بانکی پور، ۸ر نومبر ۱۹۰۲ء)

- جنوری ۱۹۰۳ء- لارڈ کرزن لائبریری کا معائنہ کرنے پٹنہ آئے۔
- ۱۹۰۳ء- حکومت نے خدا بخش خاں کو C.I.E.(Companian of Indian Empire) کا خطاب عطا کیا۔
- دو سو روپے ماہانہ مشاہرہ پر کتب خانہ کی نظامت تفویض ہوئی۔
- ۲۴ر ستمبر ۱۹۰۳- مہاراجہ دربھنگہ رامیشور سنگھ لائبریری آئے۔
- ۱۹۰۴- خدا بخش خاں کو یونس خاں والی زمین حاصل ہوئی، جس پر انہوں نے پختہ دو منزلہ مکان بنوایا۔ اس میں تقریباً ۸۰ ہزار روپے خرچ ہوئے۔
- لارڈ کرزن کے اشارہ پر مشہور مستشرق سر ڈینی سن راس نے اس کے نوادر کی توضیحی فہرست بنوانے کا کام شروع کیا۔
- ۱۹۰۵- خدا بخش خاں نے لارڈ کرزن کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اپنی نشست گاہ یا آفس کو لائبریری کا جزو بنادیا اور اس کو کرزن ریڈنگ روم کے نام سے موسوم کردیا۔
- علامہ سید سلیمان ندوی لائبریری تشریف لائے۔
- ستمبر ۱۹۰۵ء- حکیم عبدالحمید پریشاںؔ کے جلسہ تعزیت میں خدابخش خاں کی شرکت اور تعزیتی کلمات۔ اس کی رپورٹ الپنچ، بانکی پور، ۱۴ر ستمبر ۱۹۰۵ء میں ص ۸ پر شائع ہوئی۔
- ۸ر فروری ۱۹۰۶ء- لارڈ منٹو لائبریری آئے۔
- ۲ر اپریل ۱۹۰۷ء- علامہ شبلی نعمانی دوبارہ لائبریری آئے۔
- ۳ر اگست ۱۹۰۸ء- خدا بخش خاں رات ایک بجے انتقال کرگئے۔
- ۴ر اگست ۱۹۰۸- لائبریری کے احاطے میں بڑے احترام کے ساتھ سپرد خاک کردیا گیا۔

جمع وترتیب: ڈاکٹر محمد ذاکر حسین

شجرۂ خدا بخش خاں

قاضی ہیبت اللہ خاں

محمد باقر خاں

رمضان علی خاں
زوج بی بی عاصمہ (دربھنگہ)

علی بخش خاں
زوج حلیمہ دختر محمد عیوض (مانجھی)

احمد بخش خاں – وفات ۱۷/دسمبر ۱۸۶۲ء
= ۱۴/جمادی الثانی ۱۲۷۹ھ

محمد بخش خاں – وفات ۲۰/اکتوبر ۱۸۷۶ء
= ۲/شوال ۱۲۹۳ھ

بو علی خاں عرف خدا بخش خاں (ولادت – ۲/اگست
۱۸۴۲ء = ۲۳/جمادی الثانی ۱۲۵۸ھ)

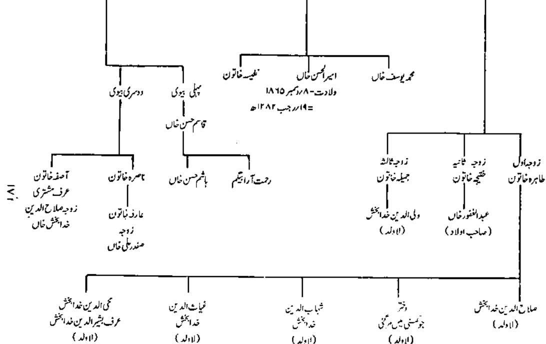
یوسف علی خاں عرف اسمٰعیل خاں (ولادت –
۱۷/دسمبر ۱۸۴۶ء = ۲۷/ذی الحجہ ۱۲۶۲ھ)

جعفر علی خاں عرف ابوالحسن خاں
(ولادت – ۲۵/اکتوبر ۱۸۵۱ء = ۲۹/ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ)

بی بی جنگلی
زوجہ ملا بھتو (دربھنگہ)

ولی اللہ خاں
زوج رقیعہ دختر شمس الدین (کوٹھیا)

فاطمہ (ادہن پور)
زوجہ محمد بخش خاں


محمد یوسف خاں
امیر الحسن خاں
ولادت - ۸ ر دسمبر ۱۸۶۵
= ۱۹ ر رجب ۱۲۸۲ھ
نفیسہ خاتون
پہلی بیوی
قاسم حسن خاں
رحمت آرا بیگم
ہاشم حسن خاں
دوسری بیوی
ناصرہ خاتون
عارف خاتون
زوجہ
صفدر علی خاں
آصفہ خاتون
عرف مشتری
زوجہ صلاح الدین
خدا بخش خاں
زوجہ اول
طاہرہ خاتون
زوجہ ثانیہ
خدیجہ خاتون
عبد الغفور خاں
(صاحب اولاد)
زوجہ ثالثہ
جمیلہ خاتون
ولی الدین خدا بخش
(لاولد)
صلاح الدین خدا بخش
(لاولد)
دختر
جو کمسنی میں مر گئی
(لاولد)
شہاب الدین
خدا بخش
(لاولد)
غیاث الدین
خدا بخش
(لاولد)
محی الدین خدا بخش
عرف بشیر الدین خدا بخش
(لاولد)

عہدہ داران خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

سکریٹری اور لائبریرین

۱۔	خدابخش خاں	۲؍اگست ۱۸۹۱ء	۳؍اگست ۱۹۰۸ء
۲۔	شہاب الدین خدابخش	۳۰؍اگست ۱۹۰۸ء	۲؍ستمبر ۱۹۰۸ء
۳۔	محی الدین خدابخش	۲۸؍ستمبر ۱۹۰۸ء	۲۹؍اگست ۱۹۱۰ء
۴۔	صلاح الدین خدابخش	۳۰؍اگست ۱۹۱۰ء	۳؍اکتوبر ۱۹۱۰ء
۵۔	ابوالحسن خاں	یکم نومبر ۱۹۱۰ء	۲۵؍جنوری ۱۹۱۷ء
۶۔	شہاب الدین خدابخش	۴؍فروری ۱۹۱۷	۵؍اکتوبر ۱۹۱۸ء
۷۔	ولی الدین خدابخش	یکم جنوری ۱۹۱۹ء	۹؍اگست ۱۹۴۰ء
۸۔	قاسم حسن خاں	۱۹۴۱ء	۱۹۵۰ء

سکریٹری

۱۔	نواب زادہ سید محمد مہدی	۱۹۵۱ء	۱۹۵۳ء
۲۔	عبدالصمد خاں	۱۹۵۳ء	۱۹۵۷ء
۳۔	سید احسن شیر	۱۹۵۷ء	۱۹۶۲ء
۴۔	پروفیسر سید حسن	۱۹۶۲ء	۱۹۶۳ء
۵۔	پروفیسر سید شاہ عطاالرحمٰن عطا کاکوی	۱۹۶۴ء	۱۹۶۹ء
۶۔	ڈاکٹر علی حیدر نیّر	۱۹۶۹ء	۱۹۷۰ء

لائبریرین

۱۔ قاسم حسن خاں	۱۹۵۱ء	—	۱۹۶۳ء
۲۔ رحمت آرا بیگم	۱۹۶۳ء	—	۱۹۶۴ء

ڈائرکٹر

۱۔ سید اقبال حسین	۱۹۶۵ء	—	۱۹۶۷ء
۲۔ پروفیسر کلیم الدین احمد	۱۹۷۰ء	—	۱۹۷۲ء
۳۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار	۲؍ستمبر ۱۹۷۲ء	—	اپریل ۱۹۹۶ء
۴۔ حبیب الرحمٰن چغانی	اپریل ۱۹۹۶ء	—	۳۱؍جنوری ۲۰۰۱ء
۵۔ ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری	یکم فروری ۲۰۰۱ء	—	

خدابخش لائبریری کی تازہ مطبوعات

اردو

* اردو شعراء: انتخاب رسالہ الناظر لکھنؤ (۱۹۰۹-۱۹۳۷ء) ۲۰۰۱ء ۴۷۳ص ۱۵۰/-
* اشاریہ نیا دور (کراچی) ۲۰۰۱ء ۲۲۶ص ۸۰/-
* انسانی کردار-ایک نفسیاتی و معاشرتی تجزیہ/ پروفیسر شمشاد حسین؛ ترجمہ ذکیہ مشہدی ۲۰۰۰ء ۲۸۲ص ۱۵۰/-
* تذکرے: سلسلہ انتخاب الناظر لکھنؤ (۱۹۰۹-۱۹۳۷ء)-۳ ۲۰۰۱ء ۳۶۲ص ۱۲۰/-
* طلسم ہوشربا جلد پنجم، حصہ اول/ سید محمد حسین جاہ ۲۰۰۰ء ۲۶۸ص ۸۰/-
* مشاہیر اردو ادب: رسالہ ندیم گیا (۱۹۳۱-۱۹۴۹ء) سے انتخاب-۱۱ ۲۰۰۰ء ۵۸۳ص ۱۵۰/-
* مشاہیر بہار-۲: رسالہ ندیم گیا (۱۹۳۱-۱۹۴۹ء) سے انتخاب-۸ ۲۰۰۱ء ۳۰۹ص ۱۰۰/-
* مقالات تاریخ ہند: سلسلہ انتخاب الناظر لکھنؤ (۱۹۰۹-۱۹۳۷ء)-۲ ۲۰۰۱ء ۳۱۰ص ۱۰۰/-
* فیض کی شاعری/ عبدالمغنی ۲۰۰۱ء ۸۸ص ۴۰/-
* میر کا تغزل/ عبدالمغنی ۲۰۰۱ء ۴۰ص ۲۰/-
* تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ فکر اقبال کی روشنی میں/ ڈاکٹر عبدالمغنی ۲۰۰۱ء ۴۲ص ۳۰/-
* ہفتہ وار پنچ کا توضیحی اشاریہ/ عبدالعلیم قدوائی ۲۰۰۰ء ۵۹۰ص ۱۶۰/-
* بی اماں کا دورہ بہار-۱۹۲۲ء/ سری کانت؛ ترجمہ ڈاکٹر انجمن آرا انجم ۲۰۰۱ء ۲۰۸ص ۱۵۰/-
* علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت مورخ ۲۰۰۱ء ۸۸ص ۵۰/-
* دیوانِ آہ: ابوالنصر غلام یٰسین آہ دہلوی کے اردو و فارسی کلام کا مجموعہ مع ضمیمہ کلام آرزو و آبرو/ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری ۲۰۰۱ء ۱۴۸ص ۵۰/-
* اردو شعر و ادب: انتخاب رسالہ الناظر لکھنؤ (۱۹۰۹-۱۹۳۷)-۴ ۲۰۰۱ء ۴۴۴ص ۲۰۰/-
* اسلامیات: انتخاب رسالہ الناظر لکھنؤ (۱۹۰۹-۱۹۳۷)-۶ ۲۰۰۱ء ۴۶۸ص ۲۰۰/-
* سعد اللہ مسیح اور فارسی رامائن مسیحی/ ابوسعادت جلیلی ۲۰۰۱ء ۴۷۰ص ۲۲۵/-

ملنے کا پتہ: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

بانکی پور کی لائبریری

ہندوستان میں کوئی پڑھا لکھا آدمی ایسا نہیں ہے، جس نے خدا بخش لائبریری کا نام نہ سنا ہو، لیکن یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ خدا بخش کون تھے، ان کی لائبریری ہندوستان میں کیوں اس قدر مشہور ہوئی اور کس طرح یہ نوادر علمیہ یہاں فراہم ہو سکے؟ چونکہ یہ لائبریری بعض اعتبارات سے ہندوستان کی بہترین لائبریری سمجھی جاتی ہے اور علوم مشرقیہ کی بعض عجیب وغریب کتابیں یہاں موجود ہیں، اس لیے ہم آج کی صحبت میں اس کے متعلق ایک اجمالی بیان پیش کرتے ہیں امید ہے کہ ناظرین نگارات دلچسپی سے پڑھیں گے۔

خدا بخش کا خاندان

خدا بخش (جن کے نام سے لائبریری موسوم ہے) کا تعلق چھپرا کے نہایت معزز اور علم دوست خاندان سے تھا۔ قاضی ہبت اللہ، جنھوں نے عہد اورنگ زیب میں فتاوائے عالمگیری کی ترتیب میں کافی حصہ لیا تھا، انھیں کے خاندان کے ایک فرد تھے۔ خدا بخش کے والد محمد بخش بانکی پور میں وکالت کرتے تھے اور ان کو کتابیں فراہم کرنے کا غیر معمولی ذوق تھا۔

خدا بخش کی زندگی

خدا بخش ۲۳ رجمادی الثانی ۱۲۵۸ھ کو بمقام چھپرا پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم والد کی نگرانی میں ہوئی۔ بعد کو یہ کلکتہ روانہ کیے گئے اور وہاں کچھ عرصہ تک نواب امیر علی خاں بہادر کی نگرانی میں تعلیم پاتے رہے، لیکن اسی اثناء میں ان کے باپ پر فالج کا دورہ ہوا اور انھیں وطن

واپس آنا پڑا۔ اب چونکہ مالی حالت نازک ہوگئی تھی اس لیے انھیں نوکری کی ضرورت ہوئی، اور ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں پیشکاری کی جگہ مل گئی۔ لیکن ان کا افسر سخت مزاج تھا اس لیے چند دن بعد استعفیٰ دے دینا پڑا، اس کے بعد وہ ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے اور ۱۵ ماہ تک یہ خدمت انجام دی چونکہ اس عرصہ میں انھوں نے وکالت کا امتحان پاس کرلیا تھا اس لیے یہ نوکری بھی ترک کر دی۔ اور ۲۵ سال کی عمر میں وکالت شروع کی۔ اس پیشہ میں ان کو اس قدر کامیابی ہوئی کہ چند دن میں وہ نہایت کامیاب وکیل بن گئے اور ایک حد تک معاش کی طرف سے مستغنی۔

جب انھوں نے وکالت میں خاص شہرت حاصل کر لی تو سرلوئی جیکسن نے جو کلکتہ ہائی کورٹ کا جج تھا ان کے سامنے سب ججی کا عہدہ پیش کیا لیکن انھوں نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ بعد کو جب لارڈ رپن کے عہد میں میونسپلٹی اور بورڈ کا قیام ہوا تو سب سے پہلے انھیں کو وائس چیئر مین بنایا گیا اور ۱۸۸۳ء میں خان بہادر کا خطاب دیا گیا۔ چونکہ ان کی قابلیت واہلیت کی شہرت اب حدود بنگال سے نکل کر دیگر حصص ہند میں پہنچ چکی تھی، اس لیے ۱۸۹۴ء میں یہ سلطنت دکن میں ہائی کورٹ حیدرآباد کے چیف جسٹس ہو گئے، لیکن یہاں یہ صرف چار سال تک رہے اور اس کے بعد ۹۸ء میں پھر بانکی پور آ کر وکالت کرنے لگے اور یہیں رہے۔

چونکہ انھوں نے اپنی زندگی حد درجہ دماغی محنت اور کاوش میں بسر کی تھی، اس لیے آخر میں ان کی صحت بہت خراب رہنے لگی۔ یہاں تک کہ ٦٦ سال کی عمر میں ۳؍اگست ۱۹۰۸ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔

۱۹۰۳ء میں انھیں سی، آئی، ای کا خطاب بھی مل گیا تھا اور وہ کلکتہ یونی ورسٹی کے فیلو بھی تھے۔

خدا بخش نہایت وسیع المطالعہ اور قابل شخص تھے، تاریخ اسلام کے متعلق ان کی معلومات رشک انگیز طور پر مکمل تھیں اور مختلف انگریزی رسائل میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔

لائبریری کا قیام

ان کے والد محمد بخش بڑے علم دوست بزرگ تھے اور لائبریری فراہم کرنے کا شوق ان میں بدرجہ کمال پایا جاتا تھا چنانچہ جس وقت ان کا انتقال ہوا تو انھوں نے ۱۵۰۰ نسخے فارسی و عربی کتابوں کے اپنے بعد چھوڑے اور بیٹے کو وصیت کی کہ فراہمی کتب کا کام جاری رکھا جائے۔ اور ایک عمارت لائبریری کے لیے تیار کی جائے اور واقعہ یہ ہے کہ کم بیٹے ایسے ہوتے ہیں جنھیں اپنے باپ کی وصیت کا اس قدر خیال ہو۔

خدابخش نے فوراً لائبریری کی بنیاد ڈال دی اور اسی ہزار کے صرف سے ایک عمارت تیار کرائی۔ یہ دومنزلہ عمارت ہے، اوپر کی منزل میں ایک بڑا وسیع ہال ہے جس کے پہلو میں دو کمرے ہیں اور اس کے چاروں طرف برآمدے ہیں۔ دونوں زینوں، برآمدوں اور نیچے کے کمروں کا فرش سنگ مرمر کا ہے۔ ۲۹ راکتوبر ۱۸۹۱ء کو یہ لائبریری باقاعدہ طور پر پبلک کے لیے وقف کردی گئی اس شرط کے ساتھ کہ اس لائبریری کی کوئی جلد باہر نہیں جا سکے گی۔

لائبریری کا ذوق

خدابخش نے باوجود ایک متوسط الحال آدمی ہونے کے جس قدر روپیہ اس لائبریری پر صرف کیا وہ بجائے خود ایک مستقل ثبوت ان کے شغف علمی کا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ علاوہ روپیہ کے انھوں نے اپنی ساری زندگی اسی کے لیے وقف کردی تھی اور اپنا مقصد حیات ہی صرف فراہمی کتب قرار دے لیا تھا۔ انھیں اس طرف اس قدر انہماک تھا کہ وہ سونے کی حالت میں بھی اسی کا خواب دیکھتے تھے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "ایک رات میں نے خواب دیکھا کہ ایک اجنبی آیا اور اس نے کہا کہ اگر تمھیں کتابوں کی تلاش ہے تو میرے ساتھ آؤ۔ میں اس کے ساتھ ہولیا اور ایسی عمارت میں جو لکھنؤ کا امام باڑہ معلوم ہوتی تھی، گیا۔ میں دروازہ پر ٹھہر گیا اور وہ آدمی اندر چلا گیا، تھوڑی دیر بعد باہر آیا اور مجھے اندر ایک بڑے ہال میں لے گیا، جہاں ایک شخص نقاب

پوش بیٹھا ہوا تھا۔ میرے رہنما نے کہا کہ یہ صاحب کتابوں کے لیے آئے ہیں۔ نقاب پوش نے جواب دیا کہ ''مناسب ہے ان کو کتابیں دے دی جائیں'' اس کے بعد سے کتابیں چاروں طرف سے میری لائبریری میں آنے لگیں۔

ایک جگہ اور انھوں نے دوسرے خواب کا ذکر کیا ہے کہ ''لائبریری کے پاس کی گلی لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ جب میں گھر سے باہر نکلا تو لوگوں نے کہا کہ تم یہاں بیٹھے ہو اور رسولؐ اللہ تمھارا کتب خانہ دیکھنے تشریف لائے ہیں۔ میں فوراً وہاں پہنچا لیکن رسولؐ اللہ اس وقت تک تشریف لے جا چکے تھے اور دو کتابیں حدیث کی میز پر کھلی ہوئی رکھی تھیں، لوگوں نے مجھ سے کہا کہ رسولؐ اللہ نے انھیں دیکھا ہے''۔

چنانچہ ان دونوں کتابوں پر خدا بخش نے نوٹ کر دیا کہ ''کبھی لائبریری سے باہر نہیں جاسکتیں''۔

فراہمی کتب

ہندوستان میں کتابوں کا بہترین ذخیرہ شاہان مغلیہ کا تھا۔ سولہویں، سترہویں صدی میں خوشخط اور مطلا کتابوں کے بہترین نمونے دہلی کے شاہی کتب خانہ میں فراہم ہو چکے تھے، ان میں سے بعض تو وہ تھے جنھیں خود شاہان مغلیہ نے تیار کرایا تھا اور بعض وہ تھے جو عہد اورنگ زیب میں حیدرآباد، بیجاپور وغیرہ سے منتقل ہو کر یہاں آئے۔ اس کے بعد جب اٹھارہویں صدی میں وسط ایشیا، ایران اور عرب میں طوائف الملوکی پھیلی اور ہر جگہ اندرونی کشاکش کی وجہ سے اضطراب پیدا ہوا تو وہاں کے علمی ذخائر دربار اودھ میں کھنچ کھنچ کر آنے لگے۔

جب ۱۸۵۷ء میں غدر کے بعد اودھ کی نوابی اور دہلی کی شاہنشاہی کا خاتمہ ہوا اور وہاں کی تمام دولت منتشر ہوئی تو نواب رامپور نے (جو برطانیہ کا طرفدار تھا) بھی اس میں سے بہت کچھ حصہ پایا۔ نواب نے عام اعلان کر دیا تھا کہ جو شخص کتابیں لائے گا اسے فی نسخہ ایک روپیہ دیا جائے گا۔ چونکہ یہ زمانہ حد درجہ اضطراب و تشویش کا تھا اور تمام مخلوق پریشان پھر رہی تھی اس لیے

جس کو جہاں جو کتاب ملی وہ دربار رامپور میں لے گیا اور اس طرح وہاں بہت کافی ذخیرہ کتابوں کا فراہم ہو گیا۔

خدا بخش نے اس کے بہت عرصہ بعد کتابوں کی فراہمی شروع کی۔تاہم اس وقت بھی رامپور میں یہ کام جاری تھا۔اس لیے ان دونوں میں رقابت پیدا ہو گئی۔نواب رامپور کے ہاں ایک عرب (جس کا نام محمد مکی تھا اور جو خاص ملکہ اس کام میں رکھتا تھا) ملازم تھا کہ وہ چاروں طرف سے کتابیں فراہم کر کے لائے۔خدا بخش نے بڑی ترکیبوں سے اس شخص کو اپنی طرف ملا لیا اور علاوہ کمیشن کے پچاس روپیہ ماہوار اس کی تنخواہ مقرر کر دی،اس نے کامل اٹھارہ سال تک شام و عرب اور مصر میں جا جا کر عجیب و غریب کتابیں مہیا کیں۔

خدا بخش نے عام اعلان کر دیا تھا کہ جو شخص کتابیں دکھانے بانکی پور آئے گا اسے دونوں طرف کا دو چند کرایہ ریل دیا جائے گا،اس لیے ہندوستان کے ہر گوشہ سے لوگ کتابیں لے لے کر بانکی پور پہنچنے لگے۔

ایک بار بانکی پور کے کسی جلد ساز نے بعض نادر قلمی نسخے قفل توڑ کر چرا لیے اور انھیں لاہور کے ایک شخص کے پاس بغرض فروخت روانہ کیا،چونکہ اس وقت خدا بخش سے بہتر اور کوئی خریدار نہ تھا اس لیے اس نے پھر یہ تمام کتابیں خدا بخش کے پاس روانہ کر دیں اور جلد ساز اپنی سزا کو پہنچ گیا۔اسی ضمن میں ایک اور حسن اتفاق کا بیان مناسب معلوم ہوتا ہے جو ان کے والد کو پیش آ گیا تھا:مسٹر ایلیٹ (پٹنہ کے جج) کتابوں کے بہت شائق تھے انھوں نے خدا بخش کے والد محمد بخش سے کمال الدین اصفہانی کی مثنوی جو نہایت نادر چیز تھی مستعار لی،لیکن بعد کو اس کے دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اس کی قیمت لے لی جائے مگر محمد بخش نے اسے منظور نہیں کیا۔جب ایلیٹ کی پنشن ہوئی اور وہ ولایت جانے لگا تو اس نے بہترین کتابیں ایک بکس میں بھر کر ولایت بھیج دیں اور دوسرا بکس جس میں معمولی کتابیں تھیں نیلام کی غرض سے بانکی پور میں چھوڑ دیا۔حسن اتفاق سے وہ مثنوی اسی بکس میں رہ گئی،اور اس طرح محمد بخش نے نہ صرف اس مثنوی کو حاصل کیا بلکہ ایک نسخہ مجالس خمسہ کا ہاتھ آ گیا،جس پر شاہ جہاں کے دستخط تھے۔جب ایلیٹ گھر

پہنچا تو اسے یہ حال معلوم ہوا اور فطرت کے اس فیصلے سے اسے بہت تکلیف پہنچی۔

ایک دن خدا بخش حیدرآباد ہائی کورٹ سے واپس آرہے تھے کہ انھوں نے ایک بنیے کی دکان پر پرانی کتابوں کا ڈھیر دیکھا، فوراً اتر پڑے اور کتابوں پر ایک نگاہ ڈال کر پوچھا کہ ''اس ڈھیر کی قیمت کیا لوگے؟'' اس نے کہا کہ ''کوئی دوسرا ہوتا تو میں تین روپیہ میں دے دیتا، لیکن چونکہ آپ کتابوں کے قدردان ہیں اور یقیناً اس میں کوئی کتاب عمدہ دیکھ کر آپ نے خریداری کی خواہش کی ہے اس لیے بیس سے کم میں نہ دوں گا''۔ انھوں نے فوراً بیس روپیہ دے کر یہ ڈھیر مول لے لیا۔ اس میں ایک نہایت نادر عربی تاریخ بھی تھی، جس کی قیمت بعد کو نظام نے چار سو روپیہ دینا چاہی، لیکن سودا ہو چکا تھا اور خدا بخش کتاب لے چکے تھے۔

لائبریری کی اہمیت

یہ ایک واقعہ ہے کہ اس سے قبل ہندوستان میں علوم مشرقیہ کی تفتیش و تحقیق کرنے والے بہت کم تھے۔ اور اس کے مقابلہ میں انگریزوں کا یہ حال تھا کہ وہ ہندوستان میں یہاں کے تمام علمی آثار کو نگاہِ غور سے دیکھتے تھے اور جس قدر قدیم و نادر کتابیں انھیں ملتی تھیں باڈلین لائبریری، برٹش میوزیم یا انڈیا آفس لائبریری کو بھیج دیتے تھے۔ اس وقت بھی جب ان کے تسلط کی ابتدا تھی یہ لوگ اس طرف سے غافل نہ تھے، اور یہاں کے علمی نوادر یورپ کے کتب خانوں میں منتقل کر رہے تھے۔

جس وقت تک خدا بخش نے اپنی لائبریری کی بنیاد ڈالی تھی، تمام اودھ، مرشدآباد اور بنگال کے لوگ جو قدیم کتابیں فروخت کیا کرتے تھے، انگریزوں کے پاس جاتے اور انھیں سے سودا کرتے تھے، لیکن جب سے یہ لائبریری قائم ہوئی ہے اس وقت سے ہر شخص یہیں اپنی کتابیں لاتا ہے اور فرنگیوں کی دستبرد سے ہندستان کے علمی جواہر ایک حد تک بہت محفوظ ہو گئے ہیں۔ علاوہ اس کے بعض وہ رؤسا جو ایسی نادر کتابیں کسی لائبریری کو دینا چاہتے تھے اس سے قبل انگریزوں کی خدمت میں پیش کر دیا کرتے تھے لیکن اب اس طرف متوجہ ہو گئے ہیں اور اس

طرح کتابوں کا باہر جانا بند ہوگیا ہے۔ یہاں کے بعض فیاض امرانے خدابخش لائبریری کو جو کتابیں ہدیۃً دی ہیں۔ان میں سے بعض بہت عجیب وغریب ہیں،مثلاً گورکھپور کے ایک رئیس سبحان اللہ خاں صاحب نے دیوان حافظ دیا ہے، جس کو جہانگیر ہر وقت اپنے پاس رکھتا تھا اوراس میں فال نکالتا تھا اس میں کہیں کہیں خود جہانگیر کے ہاتھ کے نوٹ بھی ہیں،جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کس موقع پر کیا فال نکالی اوراس کا کیا نتیجہ ہوا۔اسی طرح عنایت اللہ خاں صاحب کے احکام عالمگیری،جس میں اورنگ زیب کے آخری عہد کے خطوط ہیں۔ یہ کتاب بھی بالکل نایاب ہے۔اورسوائے اس لائبریری کے دنیا کے کسی کتب خانے میں اس کی نقل موجود نہیں ہے۔

مشرقی نقاشی کے نمونے

اس لائبریری میں چین، وسط ایشیا، ایران و ہندوستان کی نقاشی اور خطاطی کے مطلا و مذہب نمونے بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں،شاہان مغلیہ کی لائبریری کی بہترین تصاویر و قطعات، رنجیت سنگھ کی انتخاب کردہ تصویریں، دربار اودھ کے مرقع یہاں موجود ہیں اور بعض تصاویر اس قدر قدیم وعجیب ہیں کہ ان کے قیام وبقا پر حیرت ہوتی ہے۔اسی طرح خوشخطی کے ایسے ایسے نادر نمونے ہیں کہ ان کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکتا۔

انگریزی کتابیں

فارسی اورعربی کی کتابیں تو اس قدر کثرت سے ہیں کہ ان کا بیان کرنے کے لیے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے لیکن انگریزی کی کتابیں بھی وہاں کثرت سے پائی جاتی ہیں، فلسفہ،تاریخ،ادب، قصص وحکایات لغت وغیرہ کی کتابیں یہاں کثرت سے موجود ہیں۔الیبان کا لغت انگلش لٹریچر کے متعلق نیشنل بیاگرافی کا لغت (۶۳ جلدوں میں) ویورلی کے ناولوں کا اولین اڈیشن،اسکاٹ کے ناولوں کا وہ اڈیشن جب اسکاٹ ایک گمنام چیز تھا اوراس کی تصانیف

ویور آئی شائع کر رہا تھا اور علاوہ اس کے انگریزی کی اور بھی بہت سی نادر کتابیں یہاں پائی جاتی ہیں۔

یہاں انگریزی کی قدیم مصوّر کتابیں ہزاروں روپیہ کی ہیں۔ خدا بخش نے ولایت جا کر خود ان تمام کتابوں کی جستجو کی تھی اور اتفاق سے وہاں انھیں ایک لائبریری مل گئی تھی، جسے انھوں نے چار ہزار پونڈ (ساٹھ ہزار روپیہ) میں خرید لیا تھا۔

علمی جواہر

اس لائبریری میں علوم مشرقیہ کی بعض کتابیں نہایت نادر ہیں ان میں سے ایک تو جہانگیر کا دیوان حافظ ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ دوسری کتاب شہنشاہ نامہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس میں سلطان محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ کی فتوحات کو نظم میں بیان کیا ہے، مصنف نے یہ کتاب سلطان محمد ثالث کی خدمت میں پیش کی تھی، عہد شاہ جہانی میں یہ کتاب ہندوستان آئی تھی اور خدا معلوم کیونکر خدا بخش کے ہاتھ لگ گئی۔

جامؔی کی مثنوی یوسف زلیخا، میر علی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی۔ جس کی قیمت جہانگیر نے ایک ہزار اشرفی ادا کی تھی یہاں موجود ہے۔ دو کتابیں شاہ جہاں کی ہیں اور ان میں سے ایک پر اس کے دستخط بھی ہیں، جب اس کی عمر صرف ۱۴ سال کی تھی۔ داراشکوہ کی تصنیف سفینۃ الاولیاء خود اس کی دستخطی، دیوان حافظ جو دربار گولکنڈہ سے دہلی لایا گیا تھا۔

امیرؔ خسرو کی مثنوی جسے سلطان عبدالعزیز شاہ بخارا نے نور علی سے تین سال تک اسے محبوس رکھ کر لکھوایا تھا۔ رنجیت سنگھ کے فوجی حسابات گورمکھی اور فارسی میں، شاہ نامہ مطلا جسے علی مردان خان نے شاہ جہاں کے حضور میں پیش کیا تھا، تصانیف خسرؔو، جن پر اکبر کی ماں حمیدہ بانو بیگم کی مہر ثبت ہے، ہاتفی کی شیریں خسرو جو ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور کے لیے نہایت اہتمام سے لکھی گئی تھی، تزک جہانگیری کا وہ نسخہ جسے خود جہانگیر نے فرمانروائے گولکنڈہ کو دیا تھا، تاریخ خاندان تیموریہ، جس میں عہد اکبری کے بائیسویں سال تک کی بہترین تصاویر پائی جاتی ہیں،

بادشاہ نامہ جو اپنے نقوش وتصاویر کے لحاظ سے اس وقت بےنظیر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ملا جامی کی تصانیف خود ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی، تفسیر کبیر جو اپنے کتابت وخطاطی کے لحاظ سے عجیب و غریب چیز سمجھی جاتی ہے، فن نباتات پر کتاب الحشائش (مع رنگین تصویروں کے) جو عہد مامون میں مرتب ہوئی تھی۔ زہراوی کا رسالہ آلات جراحی پر کوفی خط میں لکھا ہوا ایک کاغذ جسے حضرت علیؓ کی تحریر کہا جاتا ہے۔ داستان مسیح جسے اکبر نے پرتگالی راہب جرد نموزیو سے فارسی زبان میں منتقل کرایا تھا اور اسی طرح کے ہزاروں نوادر جن کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکتا اس لائبریری میں موجود ہیں۔



(نگار، آگرہ، اگست ۱۹۲۲ء)

سید نجیب اشرف ندوی

کتب خانۂ خدا بخش خاں
کی
چند نادر کتابیں

پاٹلی پتر، عظیم آباد یا پٹنہ ابتدائے عہد تاریخ سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، چندر گپتا داشوک کی راجدھانی اسی کے ہاتھ آئی، سیاحان وسفراء یونان وچین کا یہی مرکز رہا ہے، اور عہد اسلامی میں صوبہ کے دارالسلطنت کی عزت کے علاوہ مشاہیر کا وطن تھا، اس دور جدید میں بھی وہ دو صوبوں (بہار واڑیسہ) کا صدر مقام اور علوم اسلامی کے بہترین کتب خانہ کی ملکیت کا شرف رکھتا ہے۔

کتب خانہ خدا بخش خاں یا اورینٹل لائبریری پٹنہ (اس نام سے مالک کتب خانہ نے اپنی اور اپنے آباء واجداد کی علمی تلاش وجستجو کے ثمر ہائے شیریں کو وقف عام کیا ہے) جو دنیا میں اپنی علمی دولت کے لیے بے نظیر و بے مثال ہے، اسی نطۂ پاک میں واقع ہے، اس طرف ایک ضرورت سے پٹنہ جانا ہوا اور اسی سلسلہ میں اس بے بہا خزانہ کی زیارت نصیب ہوئی، دس دن کے عرصۂ قلیل میں اس خرمن سے جو کچھ خوشہ چینی کر سکا اسے ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

خدا بخش خاں کے خاندانی اور ذاتی حالات محتاج بیان نہیں، کتابوں کی تلاش اور حصول میں ان کی زر پاشی ضرب المثل ہے، ہندستان کے علاوہ مصر، شام، عرب، ترکی اور دوسرے اسلامی ممالک میں ان کے ایجنٹ موجود تھے، بہت سی کتابیں

عجیب پراسرار طریقہ سے یہاں پہنچی ہیں اور ان کے متعلق اگر سوال کیا جائے تو آنکھوں کی حرکت اور زیر لب تبسم اس کا جواب نہایت خاموشی سے دے دیتا ہے۔

گذشتہ چند صدیوں میں جس طرح اسلامی حکومتوں کے شیرازے بکھر گئے اسی طرح علمی دفتر کے اوراق بھی پریشاں ہو گئے، اگر تاریخ کے صفحے، شکستہ عمارتیں اور منہدم کھنڈر ہم کو ان کی عظمت و جلالت کا پتہ دیتے ہیں تو یہ کتب خانہ ہمارے علمی شان و شوکت اور وسعت و ہمہ گیری کا مرقع ہے، اس میں وہ کتابیں بھی ہیں جو جامع ازہر کے ایک غریب طالب علم نے اپنے لیے لکھی تھیں، اور وہ بھی جو اکبر و شاہ جہاں کے لیے لاکھوں روپے خرچ کر کے برسوں میں مذہّب مصوّر تیار کی گئیں، ایک سمت ان کتابوں کا ذخیرہ ہے جو امراء اور مقربین نے اظہار اطاعت کے لیے پیش کی تھیں، تو دوسری سمت وہ اوراق پارینہ بھی ہیں جو کسی قلعہ یا محل کے غارتگری و فتح کے وقت ہاتھ آئے تھے، اگر چند وہ نسخے ہیں جو غرباء نے صرف طلب علم کے لیے لکھے، تو وہ بھی ہیں جو شاہان اسلام کے لیے باعث تسکین قلب و اطمینان خاطر رہے ہیں، اور اگر بعض نسخے خاص اہتمام سے لکھائے گئے تو بعض ایسے بھی ہیں جو خود مصنف کے ہاتھ کے مسودہ کی صورت میں رونق بخش کتب خانہ ہیں، اور آج ہم انھیں میں سے بعض نادر کتابوں کے حالات و خصوصیات ناظرین کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔

تاریخ خاندان تیموریہ

یہ کتاب تاریخی حیثیت سے بہت کچھ اہمیت رکھتی ہے، فن مصوری و خطاطی کا بہترین نمونہ ہے، تیمور سے لے کر اس کے جانشینان ایران، بابر، ہمایون اور اکبر کے سنہ ۲۲ جلوس تک کے حالات پر مشتمل ہے، یہ کتاب شاہی حکم سے اکبر کے زمانے میں لکھی گئی تھی، کیونکہ مصنف اکبر کا ذکر صیغۂ حال میں کرتا ہے (۱)، نیز

سرورق پر شاجہاں کے ہاتھ سے یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

این تاریخ کہ مشتمل است بر مجمل احوال حضرت
صاحبقران گیتی ستان و اولاد امجاد آنحضرت و سوانح ایام حضرت
عرش آشیانی انار اللہ برہانہ تا سال بست و دوم در عہد دولت شاہ بابا
تصنیف شدہ حررہ شاہ جہاں پادشاہ بن جہانگیر پادشاہ بن اکبر
پادشاہ"۔

شاہ جہاں، اکبر کو ہمیشہ شاہ بابا کے نام سے یاد کرتا ہے۔

اس کتاب میں ۱۱۲ تصاویر ہیں جو ۵۱ مختلف مصوروں کی مساعی کا نتیجہ ہیں، ان مصورین میں سے تیرہ کا ابوالفضل نے آئین اکبری میں تذکرہ کیا ہے (۲)، اور ان تیرہ کے علاوہ تین اور مصورین کے نام مسٹر ونسنٹ اسمتھ آئی، سی، ایس (ریٹائرڈ) کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے (۳)۔

ان تصاویر میں خلاف معمول ہر مصور کا نام لکھا اور جہاں دو یا تین نے مل کر بنایا ہے وہاں ان سب کے نام دیے ہیں، لیکن میرے خیال میں جہاں ایک نام سے زاید درج ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ خاکہ ایک شخص کا ہے رنگ آمیزی دوسرے کی، اور اس کی دوسری خصوصیتیں کسی تیسرے نے ظاہر کی ہیں، چنانچہ ابوالفضل نے جہاں ان مصوروں کے کاموں کی کثرت بتائی ہے وہیں لکھتا ہے کہ:

"نقاشان و مذہبان و جدول آرایان و صحافان را نیز بازار
گری پذیرفت" (جلد ۱، صفحہ ۷۸)۔

اب سوال یہ رہتا ہے کہ نفس اس کتاب کی کیا وقعت و اہمیت ہے، جواباً عرض ہے کہ یہ کتاب جیسا کہ لکھا جا چکا ہے شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں لکھی گئی ہے، اور چونکہ تمام تر مصور و مذہّب ہے اس لیے یقیناً بادشاہ کے یہاں خاص اہتمام سے لکھی

گئی، اب اس کے ثبوت کے لیے ہم کو اس وقت مؤرخ ابوالفضل کی طرف متوجہ ہونا چاہیے، آئین اکبری میں ان کتابوں کا ذکر کرتا ہوا جو اکبر نے خاص طور سے مصوّر کرائی تھی لکھتا ہے:

''فارسی نامہائے نظم ونثر را پیرایۂ بستند ومجلسہائے دلکشا تصویر شد، قصہ حمزہ را دوازدہ دفتر ساختہ رنگ آمیز کردند و استادان سحر پرداز یک ہزار و چہار صد موضع را حیرت افزائے دیدہ وران گردانید، چنگیز نامہ وظفر نامہ و این اقبالنامہ ورزم نامہ (مہابھارت) ورامائن ونلدمن وکلیلہ دمنہ وعیار دانش و جز آن پیکر نگاری برآراستند''۔

ان کتابوں میں سے چنگیز نامہ کے علاوہ تمام کتابیں مشہور عام ہیں، ہمارا خیال ہے کہ یہی چنگیز نامہ ہے جس کو بعد میں کسی نے سرورق کے پھٹ جانے سے تاریخ خاندان تیموریہ کے نام سے موسوم کر دیا ہے، مولوی عبدالمقتدر خان صاحب کی بھی یہی رائے ہے اور وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ وہی نسخہ ہے جس کا ابوالفضل نے تذکرہ کیا ہے، اس کے ثبوت میں وہ اور دلائل کے علاوہ دو دلیلیں یہ بھی پیش کرتے ہیں کہ چنگیز نامہ کوئی کتاب نہیں، دوسرے ابوالفضل والا نسخہ اگر اس نسخہ کے سوا کوئی دوسرا ہوتا تو کہیں نہ کہیں اس کا پتہ ضرور ملتا، لیکن ایسا نہیں ہے (فہرست کتب خانہ جلد ۷، صفحہ ۴۲)۔

قابل ذکر تصاویر یہ ہیں:

(۱) تیمور بچپن میں لڑکوں کے ساتھ کھیلتا اور خود بادشاہ بنا ہے۔

(۲) عمر شیخ کی موت۔

(۳) تیمور کا حملۂ بغداد، یہ تصویر بہت بڑا درس عبرت ہے، تیمور پل پر کھڑا ہے، بغداد کا گورنر فرخ اپنی اکلوتی بیٹی کے ساتھ جو اس وقت بھی باین بے سرو

سامانی و وحشت بر قعہ میں ہے، ایک کشتی میں چڑھ کر بھاگنا چاہتا ہے، تیمور کے اس پر حملہ آور ہوتے ہی وہ اپنی بیٹی سمیت دریا میں کود کر جان دیتا ہے، ملاح اس کی لاش تیمور کے پاس لاتے ہیں اور وہ شہر کے لوٹنے اور قتل عام کا حکم دے دیتا ہے، تیمور اس واقعہ کو خود یوں کہتا ہے:

"فرخ قلعہ دار در آب دجلہ غرق شد و من بہ شہر در آمدم و امر نمودم کہ جمیع مفسدان و اوباش شہر را بقتل رسانند و قلعہ و عمارت شہر را انداختہ بخاک برابر سازند" (۳)۔

(۴) وفات تیمور

(۵) ہمایوں کی پیدائش پر بابر کی خوشی اور ارکان و اعیان کی دعوت

(۶) اکبر کی پیدائش، حمیدہ بانو بیگم، ایک کوچ پر سبز لباس پہنے پڑی ہے، نوزائیدہ اکبر کلاہ تتری سر پر رکھے ایک دایہ کی گود میں بیٹھا ہے، عورتیں مختلف حرکات سے اظہار مسرت کر رہی ہیں، اس تصویر کے زیریں حصہ میں یہ دکھایا گیا ہے، طرزی بیگ خاں ہمایوں کے پاس یہ مژدہ لا رہا ہے، ہمایوں کا آفتابچی جوہر اس واقعہ کو یوں قلمبند کرتا ہے:

"اس نے (جہانگیر) ایک چینی کی رکابی و نافۂ مشک مانگی، اسے توڑ کر تمام حاضرین کو تقسیم کرتے ہوئے کہا، میرے پاس آپ کے لیے اپنے لڑکے کی پیدائش پر صرف یہی تحفہ ہے جو آپ کے سامنے پیش کر سکتا ہوں، (اور امید ہے کہ) اس لڑکے کی شہرت تمام دنیا میں اسی طرح پھیلے گی جس طرح اس مشک کی بو سے یہ خیمہ پُر ہے"۔

(۷) اکبر کی مہم چتوڑ

(۸) داتا شیخ فرید شکر گنج کے مزار کی زیارت کو جاتا ہے

جس صفحہ پر شاہ جہاں کی عبارت ہے، دوسرے حسب ذیل امرائے دربار کی بھی مہریں اور دستخط ہیں:

(۱) عبداللہ چلپی ...... ۲۲ر شوال سنہ ۲۶ جلوس مبارک (۲) خواجہ سہیل

(۳) خواجہ ہلال (۴) عبدالغفور (۵) محمد باقر (۶) نور محمد

ان دستخطوں کے بعد انگریزی میں گلڈون (GLADWIN) کا دستخط ہے، یہ گلڈون شاید مشہور مستشرق فرنسس گلڈون ہے۔

گلڈون، بنگال کی فوج کا افسر تھا، وارن ہسٹنگز کی ہمت افزائی سے اس نے مشرقی زبانوں میں بہت کچھ ترقی کرلی تھی، ابوالفضل کے آئین اکبری کے ایک حصہ کا ترجمہ بھی کیا تھا، (۸۶-۱۷۸۳ء) ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کا ممبر تھا، ۱۷۸۸ء میں ہسٹری آف ہندوستان لکھی، فارسی کی مختلف کتابوں کی جس میں گلستان بھی ہے ترجمہ کیا ہے، ۱۸۰۹ء میں فارسی، ہندوستانی، انگریزی لغت لکھی، فورٹ ولیم کالج کا پہلا فارسی کا پروفیسر ۱۸۰۱ء میں مقرر ہوا، ۱۸۰۲ء میں پٹنہ کا افسر جنگی رہا، ۱۸۰۸ء، میں پٹنہ کا کمشنری ریزیڈنٹ تھا اور تقریباً ۱۸۱۳ء میں مرا (۴)، اسی صفحہ پر اس نسخہ کی قیمت آٹھ ہزار روپیہ لکھی ہے۔

کتاب خوبصورت، صاف نستعلیق میں لکھی ہے، کاغذ نہایت نفیس ہے، کتاب میں ۳۳۸ اوراق یا ۶۷۶ صفحہ ہیں، اور ہر صفحہ میں ۲۱ سطریں ہیں (۵)۔

بادشاہ نامہ

عہد شاہ جہاں کے حالات میں متعدد نایاب نسخے ہیں، مثلاً

(۱) آثار شاہجہانی مصنفۂ محمد صادق دہلوی

(۲) شاہجہاں نامہ، جو چار حصوں میں منقسم ہے اور جس کے ہر حصہ کو معتمد خاں، عبدالحمید لاہوری، محمد وارث اور محمد صالح نے علی الترتیب لکھا ہے۔

(۳) لطائف الاخبار، مصنفہ (شاید) رشید خاں
(۴) ملخص، مصنفہ محمد طاہر آشنا
(۵) عمل صالح، محمد صالح کنبو
(۶) تاریخ نمبر ۱۷۵، مصنفہ لا معلوم (۶)
(۷) پادشاہ نامہ، حصہ اول، مصنفۂ محمد امین قزوینی و حصہ دوم از عمل صالح

ان تمام تاریخوں میں مؤخر الذکر کتاب کا نسخہ خاص وقعت رکھتا ہے، کتاب ابتداء سے لے کر آخر تک مصوری و خطاطی کے محاسن سے پُر ہے، ہر صفحہ مذہّب جدولوں سے گھرا ہے اور عنوان و سرخیاں بھی بہت دیدہ زیب ہیں، تاریخ خاندان تیموریہ کی طرح اس میں بھی ۱۹ تصاویر ہیں، پہلا حصہ مقدمہ، مقالہ اور خاتمہ پر مشتمل ہے، مقدمہ میں شاہجہاں کے لڑکپن کے حالات ہیں، مقالہ میں دہ سالہ عہد حکومت کی تاریخ ہے، اور خاتمہ میں اس عہد کے مشاہیر کے حالات ہیں۔

اس حصہ کا مصنف محمد امین بن ابو الحسن قزوینی، عہد شاہ جہاں میں ہندوستان آیا اور منشی مقرر ہوا، شاہ جہاں کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو اکبر نامہ کی طرز پر اس کی تاریخ لکھے، لیکن کوئی نظر نہ آتا تھا، اس اثناء میں جیسا کہ اس کا خود بیان ہے، اس نے جنگ بندیلہ کی تاریخ پیش کی اور بادشاہ اس سے خوش ہوا، اور اس کو اس کام کے لیے مقرر کیا، چنانچہ اس نے عہد طفلی سے دس سنہ جلوس تک کے حالات قلمبند کر کے سنہ ۲۰ جلوس مطابق ۱۰۵۶ھ میں پیش کیے، لیکن کچھ زیادہ پسند نہ آئے، اور کسی بہتر آدمی کی تلاش ہونے لگی، چنانچہ عبدالحمید کا پتہ چلا اور اسے ٹھٹہ (۵) سے یا پٹنہ (۶) سے بلا کر اسے اس کام پر مامور کیا گیا اس نے بیس سال کے حالات قلمبند کیے ہیں، پھر کبر سنی کی بنا پر وہ علیحدہ ہو گیا، اور محمد وارث جو ابوالفضل کا شاگرد تھا، اس کام پر مقرر ہوا، اس نے دس سال کی تاریخ مرتب کی اور بعد ازاں محمد صالح نے پوری تاریخ لکھتے ہوئے بقیہ دو سال کے حالات بھی لکھ کر تاریخ کو مکمل کر

دیا، جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، محمد امین کی تاریخ صرف دس سنہ جلوس تک ہے، اس لیے بقیہ حصہ کی تکمیل کے لیے محمد صالح کی عمل صالح سے مدد لی گئی ہے۔

ذیل کی تصاویر قابل ذکر، سبق آموز، اور غور طلب ہیں

(۱) شہزادہ خرم (شاہ جہاں) کی مرزا محمد حسین صفوی کی لڑکی سے شادی

(۲) شکارگاہ، جہانگیر شیر پر گولی چلاتا ہے، نشانہ خطا ہوتا ہے، شیر حملہ کرتا ہے، راجہ انوپ رائے سیر کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اس کے منہ میں ہاتھ دے دیتا ہے، شیر اس کو چباتا ہی ہوتا ہے کہ خرم آکر تلوار سے وار کرتا ہے اور شیر کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

(۳) داراشکوہ کی شادی کا جلوس

(۴) شاہزادہ اورنگ زیب ایک مست ہاتھی کا مقابلہ کر رہا ہے

(۵) شاہ جہاں تخت طاؤس پر پہلی مرتبہ بیٹھا ہوتا ہے

(۶) شاہ جہاں کا جنازہ تاج جا رہا ہے

(۷) نذر محمد خاں والی بلخ کی حرم، لڑکیاں اور دوسری رشتہ دار خواتین شاہ جہاں کے محل میں رہتی ہیں اور بیگم نہایت عزت واحترام سے ان کا استقبال کرتی ہے۔

اس کے علاوہ دہلی و آگرہ کی متعدد عمارتوں مثلاً دیوان خاص، تاج، جامع مسجد، قلعہ وغیرہ کی تصاویر ہیں۔

یہ کتاب ایک افسر اعلیٰ کی ہدایت سے ۱۹۱۱ء میں شہنشاہ معظم کی تخت نشینی کے وقت ان کے ملاحظہ کے لیے گئی تھی، چنانچہ سرورق پر متعدد انگریزی عبارتوں کے ساتھ شہنشاہ معظم و ملکہ معظمہ کے دستخط مؤرخہ ۱۰؍دسمبر ۱۹۱۱ء بھی اس پر موجود ہیں۔

جہاں تک میرا خیال ہے یہ کتاب عہد عالمگیری میں کسی امیر نے اپنے کتب خانہ کے لیے لکھوائی تھی، واللہ اعلم بالصواب۔

شہنشاہ نامہ

اس کتاب کی کسی دوسری کاپی کا آج تک دنیا کے کسی گوشہ میں پتہ نہ چل سکا، یہ کتاب سلاطین عثمانیہ کے حالات میں ہے، حسینی اس کا مصنف ہے، موجودہ نسخہ قسطنطنیہ میں سلطان محمد ثالث کے لیے لکھا گیا تھا، شاہ جہاں کے زمانہ میں ایک غیر معمولی طریقہ سے ہندوستان پہنچا اور یہاں بھی کتب خانہ شاہی میں جگہ پائی، اس پر جو متعدد مہریں ہیں ان میں سے ایک ممتاز محل بیگم (جو آج تاج میں میٹھی نیند سو رہی ہے) کی پیاری بیٹی جہان آرا کی بھی ہے، جہاں آرا کے حالات مولانا محبوب الرحمٰن صاحب کلیم اور ضیاء برنی نے رسالوں کی صورت میں شائع کیے ہیں۔

اس کی تصاویر، ایران و ہندوستان کے طرز سے جداگانہ ہیں، ان میں ترکی دیونانی اثر غالب ہے، اس کتاب کی بعض تصاویر تاریخ عالم کے اہم واقعات کو پیش کرتی ہیں، مثلاً محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ مع فوج کے قسطنطنیہ پر حملہ آور ہے، محمد فاتح ابنائے کو عبور کر رہا ہے، سلطان سلیم، محمد متوکل باللہ، آخری عباسی خلیفہ مصر سے لوازم خلافت لے رہا ہے، وغیرہ۔

اپنی یکتائی کی وجہ سے یہ کتاب کتب خانہ کی بہترین کتابوں میں ہے۔

شاہنامہ

اس کا مصنف تعارف سے بالاتر ہے، یہ نسخہ نامکمل ہے، اور ۱۵۳۹ء سے قبل کا لکھا ہوا بھی نہیں ہے، لیکن اس کی اہمیت صرف اس لیے ہے کہ خاص اہتمام سے لکھا گیا مصوّر ہوا اور ایک امیر نے ایک بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔

یہ نسخہ کابل و کشمیر کے گورنر علی مردان نے شاہ جہاں کے لیے لکھایا تھا، یہ وہی علی مردان خاں ہے جس نے نہر بنوائی تھی اور جس کی قبر لاہور کی فصیل کے

باہر آج بھی شکستہ و منہدم صورت میں موجود ہے۔

تصانیف جامی

تصانیف جامی کے لحاظ سے خدا بخش خاں کی لائبریری بہت امیر ہے، اور فہرست کے تقریباً ۳۲ صفحے ان کے اظہار محاسن کے لیے وقف ہوئے ہیں (۷)۔

دارالسلطنت روس سینٹ پیٹرس برگ میں ایک نامکمل حصہ حضرت جامیؒ کے تصانیف کا تھا جو اپنی خصوصیات کے لیے قبل از جنگ تمام عالم میں مشہور تھا، یہ نسخہ اسی نامکمل حصہ کا بقیہ نصف ہے، اس کتاب کی وقعت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلسلۃ الذہب خود مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اسی میں اپنے لڑکے کی پیدائش کی تاریخ بھی لکھی ہے، اس کا ایک فوٹو شیخ عبدالقادر صاحب ایم، اے نے ایک مضمون کے ساتھ معارف کے ساتھ شائع کیا تھا، اور محفوظ الحق صاحب بی، اے نے بھی اس پر اظہار رائے کیا تھا، اس لیے اس پر کچھ اور لکھے بغیر دوسری کتابوں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی یوسف و زلیخا ہے، یہ نسخہ خانخاناں عبدالرحیم نے شہنشاہ خطاط امیر علی ہروی سے لکھا کر اپنے آقا شہنشاہ جہانگیر کے نذر کیا تھا، اس کی قیمت ایک ہزار اشرفی تھی۔

خانخاناں، مشہور سپہ سالار بیرم خاں کا بیٹا تھا، علمی مشاغل و کمال میں اپنا ہمسر نہ رکھتا تھا، لیکن آج اس کا مزار مشکل سے ملے گا، وہ دہلی میں ہمایوں کے مقبرہ کے قریب آرام کر رہا ہے۔

اس نسخہ کے علاوہ، مشہور کاتب میر عماد ایرانی کا لکھا ہوا بھی ایک نسخہ ہے، میر عماد اس نسخے کے لکھنے کے سات سال بعد ۱۶۱۵ء میں قتل کیا گیا تھا۔

ان مطلا و مذہّب نسخوں سے جو ہماری آنکھوں کو کچھ دیر کے لیے اپنی چمک و ضیاءپاشی سے خیرہ کر رہے ہیں، نظر ہٹا کر دوسری طرف دیکھنا چاہیے۔

دیوان حافظ

حافظ رحمۃ اللہ کا یہ دیوان کوئی ظاہری خوبی بجز اس کے نہیں رکھتا کہ خوشخط چھوٹی تقطیع پر لکھا ہوا ہے، لیکن اس کی اہمیت کا اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دیوان متعدد شہنشاہ مغلیہ کا شریک و ہمدم، اور باعث تسکین رہا ہے، ہمایوں اپنی مشکلات میں اسی سے اطمینان حاصل کرتا ہے، جہانگیر کو یہی دیوان سکون واطمینان بخشتا ہے اور بعض اوقات صرف اسی کی فال بے گناہوں کو تختۂ دار سے اتار کر آزادی کی زندگی بخشتی ہے۔

ہمایوں وجہانگیر نے جس جس جگہ فال سفر نکالی ہے اور جس جس وقت اس کو دیکھا ہے وہ اپنے قلم سے لکھ دیا ہے، اس دیوان کے ان نوٹوں پر آئندہ مستقل ایک مضمون لکھنے کا ارادہ ہے، یہ دیوان مولوی سبحان اللہ صاحب رئیس گورکھپور کا عطاکردہ ہے۔

دیوان حافظ

ایک دیوان اور اسی قسم کی اہمیت رکھتا ہے کہ شاہان گولکنڈہ میں سے ایک کے لیے لکھا گیا ہے، دیوان کی ایک تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دیوان ۱۰۲۳ھ میں قطب شاہ ولی گولکنڈہ کے لیے حیدرآباد دکن میں لکھا گیا، ایک دوسری عبارت میں لکھا ہے کتب خانۂ سلطان سے یہ نسخہ حاصل ہوا، یہ عبارت شاید فاتح گولکنڈہ (اورنگ زیب عالمگیر) کے کسی لڑکے کے ہاتھ کی ہے، اور دراصل یہ دونوں

دیوان ہمارے لیے بہت کچھ عبرت بخش ہیں، یہ نسخہ محمد محسن کاتب کا لکھا ہوا ہے۔

دیوان مرزا کامران

لیکن ابھی اس سے بڑھ کر ایک اور دردناک واقعہ کی ہم کو یاد تازہ کرنی ہے، ہمارا غم دیوان مرزا کامران دیکھ کر دوچند ہو جاتا ہے۔

مرزا کامران، فاتح ہندوستان ظہیر الدین بابر کا بیٹا اور ہمایوں کا بھائی ہے، اس نے اپنے بھائی سے وہی سلوک کیا جو برادران یوسف نے یوسف سے کیا تھا۔ ہمایوں کے ہندوستان سے جانے کے بعد سے اس کے واپس آنے کے بعد وہ مختلف سازشوں اور خفیہ وعلانیہ مخالفانہ کارروائیوں میں مشغول رہا تا آنکہ اپنے بھائی ہندال کو قتل کر ڈالا، لیکن قسمت اس پر ہنس رہی تھی، اس کے بعد خود گرفتار ہو کر آیا، اور لوگوں کے اصرار پر اندھا کر دیا گیا، یہاں سے حج کو گیا اور وہیں مرا۔

گلبدن بیگم اپنی زنانہ طرز ادا میں اس واقعہ قتل کو لکھتے ہوئے کہتی ہیں کہ ہندال اس کی روشنی چشم تھا اور اسے قتل کر کے دراصل اس نے اپنی بصارت کھودی، ہمایوں اس وقت بھی اس کو اندھا کرنا نہ چاہتا تھا، لیکن امرا اور رعایا کے متفق مطالبہ نے اسے مجبور کر دیا، بیگم اس واقعہ کو مستقل طور سے یوں لکھتی ہے:

> "عاقبت الامر جمیع خوانان و سلاطین، و وضیع و شریف، صغیر و کبیر و سپاہی و رعیت وغیرہ کہ از دست مرزا کامران داغہا داشتند، در آن مجلس متفق شدہ، بعرض حضرت پادشاہ رسانیدند کہ در پادشاہی و تحکم رسم برادری منظور نمی باشد، اگر خاطر برادر میخواہید ترک پادشاہی بکنید، و اگر پادشاہی می خواہید ترک برادری بکنید، و این ہمین از مرزا کامران است کہ از سبب او در دشت قپچاق سر مبارک ایشان چہ نوع زخم رسیدہ بودہ بہ افغانان مکر و فریب

داده کے شدہ و متعلق شدہ مرزا ہندال راکشت و اکثر چغتائی از سبب
مرزا نابود شدہ، و اہل و عیال بردم بہ بند زیست و بے ناموس شد
...... این برادر نیست، این دشمن حضرت است''۔ ع
رخنہ گر ملک سر افگندہ بہ (۸)

مجبوراً ہمایوں کو حکم دینا پڑا۔

''اگر چہ این سخنان شمایان خاطر نشان من می کند اما دل
من نمی شود، ہر دو چشمان مرزا کامران را میل کشند''(۹)۔

ہمایوں کا واقع نگار آفتابچی بھی اس کام پر معمور ہوا تھا، وہ اس واقعہ کو یوں
بیان کرتا ہے۔

''بعد حکم آمدیم پیش مرزا کامران و غلام علی بمرزا
کامران عرض کرد کہ'' مرزا! اگر این سخن از خود می گفتہ باشیم زبان
ما را خدائے تعالیٰ از قفا بکشد اما از حکم شاہاں چارہ نیست، حکم چنان
است و چشمہائے شما نشتر زنند''۔

''مرزا گفت کہ مرا بکشید''۔

غلام علی جواب داد کہ'' خداوندا آرہ کیست کہ شما را کشتن
بتواند'' پس بتلاش در آمدند، در حال در دست داشت، غلولہ
بست، در دہن آن فراش زد کہ دست دراز کردہ بود، بگرفتن مرزا
بعد ازان دست مرزا را گرفتہ از خرگاہ بیرون آوردند و مرزا را
خوابید شدند و نشتر در چشمہائے مرزا زدند، آن مرد مردانہ ہیچ دم
نزد، الا شخص کہ بالائے زانوئے نشستہ بود مرزا را برد، ہمیں سخن
گفت کہ تو چرا بزانوہائے من نشستہ، تاکہ دلاسائے شما نخواہید شد،
نخواہند گذشت، بجز این سخن دیگر ہیچ دم نزد، مردانہ وار باستقلال

خود ماند و گردے بیوہ دار، در چشمہائے ایشان نمک انداخت بے
طاقت شد، نام اللہ بر زبان راند و بعد ازان ہمین سخن گفت،
"خداوندا! آنچہ در دنیا کردہ بودم بجزائے خود رسیدم و در عقبیٰ
امیدوارم" باز مرزا را سوار کردہ سو روان شدند (۱۰)۔

فاعتبروا یا اولی الابصار!

اس عہد کا یہی ایک واحد نسخہ ہے اور اس وقت کے مشہور کاتب محمود بن اسحاق الشہابی ہروی کا جو ثانی میر علی تھا لکھا ہوا ہے، اس وقت خود مرزا کامران بھی زندہ تھا، اس پر جہانگیر اور شاہجہاں کے ہاتھ کی عبارت ہے، نور جہاں نے بھی اس کو پڑھا تھا، اور دیگر امراء کے پاس بھی رہا ہے، جن کے دستخط اور مہریں اس پر ثبت ہیں۔

جہانگیر کی عبارت یہ ہے:

"اللہ اکبر
دیوان مرزا کامران عم پدر بزرگوار
منست بخط محمود الحق شہابی
حررہ نور الدین محمد جہانگیر شاہ اکبر
سنہ ۲۰ جلوس موافق ۱۰۳۵ھ ہجری"

شاہ جہاں کی عبارت یہ ہے۔

"ہو
الحمد للہ الذی انزل
علی عبدہ الکتاب
حررہ شاہجہاں ابن
جہانگیر شاہ بن اکبر شاہ"

منعم خانخاناں کی عبارت:

''اللہ اکبر

دیوان مرزا کامران بخط خواجہ محمود الحق شہابی

امانت منعم خانخاناں

۳۴ فروشت مہر

نور جہاں بیگم کی عبارت:

قیمت اموال نواب نور جہاں بیگم

مع مہر

اس کے علاوہ اس پر مختلف عرض دیدہ ہیں۔

سفینۃ الاولیاء

یہ بھی ایک بدبخت شہزادہ کی تصنیف ہے، شہزادہ داراشکوہ بن شاہ جہاں اس کا مصنف ہے، مشہور فرانسیسی سیاح موسیو برنیر (M.Bernier) جس وقت راجپوتانہ کے دشت وصحرا کو طے کر رہا تھا کہ دربار دہلی میں پہنچا، بدنصیب شہزادہ وہاں کی صحرا نوردی کرتا ہوا اس کو ملا، اس کے بعد جب وہ گرفتار ہو کر اپنی زندگی کے آخری دردناک خونی پارٹ کے ادا کرنے کے لیے دہلی آیا تو اس وقت بھی وہاں موجود تھا، اس واقعہ شہادت کو اس نے اپنے ایک دوست کے نام خط میں مفصل طور سے لکھا ہے، اس کا لفظ لفظ درد و غم کی حکایت ہے (۱۱)۔ اور ظالم سے ظالم شخص بھی دو آنسو گرائے بغیر نہیں رہ سکتا، ہم کبھی آئندہ اس خط کا ترجمہ پیش کریں گے۔

ان دردناک واقعات سے آپ کی طبیعت منغض ہو گئی ہو گی، تھوڑی دیر کے لیے کسی دوسری طرف متوجہ ہوں۔

کلیات سعدی

مصلح الدین سعدی شیرازی کے تمام نظم ونثر کا مجموعہ ہے، پندرہویں صدی بیسویں کا لکھا ہوا نسخہ ہے، خط نہایت اعلیٰ اور رنگ آمیزی وگلکاری سے مملو ہے، تصاویر بھی ہیں، جو اس عہد کے ایرانی فن تصویر پر کافی روشنی ڈالتے ہیں، شروع میں دو صفحہ کی سفید حروف میں فہرست ہے۔

کلیات کا ایک اور نسخہ بھی ہے جو اس کتب خانہ کا قدیم ترین نسخہ ہے، زر پاشیدہ کاغذ پر نہایت خوشخط لکھا ہوا ہے۔

انتخاب بوستاں

یہ نسخہ فن خطاطی ورنگ آمیزی کے بہترین نمونوں میں ہے، عنوان کے دونوں صفحے اس خوبصورتی سے مذہب ومطلا کیے گئے ہیں کہ کسی محل کے ایرانی قالین معلوم ہوتے ہیں، اس سے زیادہ خوبصورت اس کا آخری صفحہ ہے، اس کا کاتب مشہور میر علی ہے۔

تذکرہ

یہ تذکرہ تیرہ شعراء نے سلطان قطب شاہ والی گولکنڈہ کے لیے لکھا تھا۔

کلیات خسرو

خسرو کی متعدد مثنویاں، نہایت خوشخط، مطلا و مذہب موجود ہیں۔

خلاصۃ الاخبار

خواند امیر (غیاث الدین بن ہمام الدین) کی تاریخ ایشیاء۔ اس نے یہ کتاب روضۃ الصفا سے ماخوذ کی ہے، نستعلیق میں ۹۶۶ ہجری کی لکھی ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ فارسی کتابوں میں عبدالرحیم خانخاناں کی ترکی تزک بابری کا فارسی ترجمہ،

امیر حیدر حسین واسطی بلگرامی کی سوانح اکبری، تزک جہانگیری، اقبال نامۂ جہانگیری، مصنف کی لکھی ہوئی سیرۃ المتاخرین، سینٹ زیویر کی مراۃ القدس، جو اس نے اکبر کی فرمائش سے حضرت عیسیٰ کے حالات میں لکھی تھی، اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے فوجی کاغذات خاص وقعت رکھتے ہیں۔

اس کے علاوہ فارسی کی دوسری قابل بیان کتابیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں، یہ فہرست کے ترتیب میں مسٹراوکانر کی ایسٹرن لائبریری سے بھی مدد لی گئی ہے۔

تاریخ

(۱) تاریخ طبری کا فارسی ترجمہ از بلعمی، مکتوبہ ۷۴۰ ہجری۔
(۲) مجمل فصیحی از فصیح الجوانی، مکتوبہ ۹۹۳ ہجری۔
(۳) تاریخ ابوالخیر خانی از مسعود بن عثمان کوہستانی مکتوبہ ۹۹۹ھ۔
(۴) تحفۃ الکرام از میر علی شیر قانع، مکتوبہ ۱۲۲۳ ہجری۔
(۵) ہشت بہشت از حکیم الدین ادریس السبدلیسی مکتوبہ، مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ہے۔
(۶) تاریخ داؤدی از عبداللہ، مودی اور سور ملاطین کی نایاب تاریخ۔
(۷) منتخبہ عبرتیہ از شہاب الدین طالش، یہ نسخہ ۱۱۸۱ ہجری میں مصنف کے پوتے اعتصام الدین نے لندن میں لکھا تھا۔

تذکرہ

(۱) تذکرۃ الاولیاء از فرید الدین عطار مکتوبہ ۷۲۴ ہجری۔
(۲) آثار الانوار از سیف الدین حاجی ۸۷۳ھ کے وزراء کے حالات ہیں مکتوبہ ۱۰۴۴ ہجری۔
(۳) رشحات، شیوخ نقشبندیہ کے حالات از فخر الدین علی صفی، مکتوبہ ۱۰۳۶ھ۔
(۴) مجالس العشاق، ۷۶ صوفیاء کرام کے مصور حالات ہیں۔

(۵) مآثر رحیمی، از عبدالباقی۔
(۶) کلمات الصادقین، دہلی میں دفن شدہ صوفیاء کے حالات از محمد صادق ہمدانی۔
(۷) گل رعنا، لچھمی نرائن شفیق مصنفہ ۱۱۸۲ھ۔

نظم

(۱) دیوان الشیر ادمانی، اس پر عبداللہ قطب شاہ کی مہر ہے، شاعر کا سنہ وفات ۶۶۵ھ/ ۱۲۶۶ء، ہے مکتوبہ ۱۰۱۵ ہجری۔
(۲) مثنوی مولانا روم، محمد بن حسن کرمانی نے خوبصورت نستعلیق میں ۸۵۶ ہجری میں لکھا تھا۔
(۳) دیوان امامی، از امام ہروی۔
(۴) شش رسالہ سعدی، اس پر شاہ جہاں اور عبدالرحیم خانخاناں کی تحریریں ثبت ہیں، یہ نسخہ باقر بن میر علی کا لکھا ہے۔
(۵) ہفت بند کاشی، مکتوبہ ۱۲۰۰ ہجری۔
(۶) مطلع الانوار خسرو، میر علی نے یہ نسخہ ۹۴۷ ہجری میں سلطان عبدالعزیز بخارا کے لیے بخارا میں لکھا تھا۔
(۷) دیوان حسن، حضرت حسن دہلوی کا کلام، اکبر کے سپہ سالار شیخ فرید بخاری کے لیے ۱۰۱۰ھ میں محمد حسین کشمیری نے لکھا۔
(۸) دیوان سلمان، سلمان کے دیوان کا قدیم ترین نسخہ ہے، وہ ۷۷۸ ہجری میں مرا تھا۔ اور یہ دیوان ۸۱۱ھ کا لکھا ہوا ہے۔

متفرقات

(۱) کیمیائے سعادت، امام غزالیؒ کی مشہور کتاب ہے، یہ کتاب شاید اس کتب خانہ کا قدیمی تاریخی فارسی نسخہ ہے، خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔
(۲) روح الجنان، حسین محمد رازی کی تفسیر قرآن تین جلدوں میں نامکمل مکتوبہ ۷۳۴ ہجری۔

(۳) انیس الطالبین، مصنفۂ صالح بن مبارک، حضرت جامی کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ہے۔
دوسرے نمبر میں انشاء اللہ کتب خانہ کے عربی نوادر ہدیۂ ناظرین کروں گا۔

☆☆☆

(معارف اعظم گڑھ ۳، ۱۱/ مارچ ۱۹۲۳ء)

پٹنہ کے مشرقی کتبخانے

کی

علمی سیر اور اس کی روداد

دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن نے اپنے یہاں کی بعض زیرِ طبع کتابوں کے بعض ناقص اجزاء یا دوسرے صحیح نسخوں کی تلاش کے لیے اپنی طرف سے مولوی سید ہاشم صاحب ندوی کو پچھلے دنوں نامزد کیا تھا، مولوی صاحب نے سفر کی واپسی کے بعد ایک مفصل روئداد دائرہ کے ارکان کے سامنے پیش کی، دائرہ کے شعبہ علمیہ کے ارکان نے اس کو بہت پسند کیا، اسی روئداد کا خلاصہ دائرہ کے معتمد نواب مہدی یار جنگ بہادر (خلف الصدق نواب عماد الملک مرحوم) نے اپنے ایک مکرمت نامہ کے ساتھ معارف میں چھپنے کے لیے بھیجا ہے، جس کو ہم شکریہ کے ساتھ شائع کرتے ہیں، اور مولوی سید ہاشم صاحب ندوی کو ان کی اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔

نواب صاحب ممدوح لکھتے ہیں:

> "مولوی سید ہاشم صاحب ندوی حال میں دائرۃ المعارف کی جانب سے شمال ہند مثلاً لکھنؤ، رامپور اور پٹنہ وغیرہ بھیجے گئے تھے، تاکہ وہاں کے کتب خانوں میں کتب نادرہ کا پتہ لگائیں اور ایسی کتابوں کا نام پیش کریں، جن کی تصحیح اور طباعت دائرۃ المعارف اپنے ذمہ لے سکے، انھوں نے اس سفر کے بعد اپنی رپورٹ جو مرتب کی اور جس میں بعض عمدہ کتابوں کا ذکر کیا، وہ علمی نقطۂ نظر سے بہت بیش قیمت ہے، چنانچہ دائرہ موصوف کے شعبہ علمیہ نے اس کو بہت پسند کیا، اور اس کے مرتب کنندہ کا شکریہ ادا کیا، اب اس رپورٹ کا خلاصہ آپ کے پاس اس رقعہ کے ساتھ روانہ کیا جاتا ہے، غالباً اس کو آپ بھی پسند کریں گے اور اندازہ کر سکیں گے کہ مولوی سید ہاشم صاحب نے کیسی

خدمت کی ہے، بہر حال (بشرطیکہ کوئی امر مانع نہ ہو) آپ اس کو اپنے رسالہ ''معارف'' میں طبع کر دیں تو میں ممنون ہوں گا، کیونکہ یہ اہل علم کی دلچسپی کا باعث ہوگا، اور کتب قدیمہ کے متعلق اکثر اشخاص کی معلومات میں اضافہ ہوگا''۔

(معارف)

امام بیہقی کی سنن کبریٰ، علامہ ابونعیم اصفہانی کی حلیۃ الاولیاء اور حافظ ابن حجر العسقلانی کی درر کامنہ کے قلمی نسخوں کے دیکھنے کے لیے خاکسار کو پٹنہ، رامپور اور لکھنؤ کے کتب خانوں میں جانے کی اجازت مجلس دائرۃ المعارف کی طرف سے دی گئی تھی، اثنائے سفر میں مندرجہ ذیل کتب خانوں میں حاضری کا اور وہاں کی نادر کتابوں کے مطالعہ کا موقع نصیب ہوا۔

(۱) پٹنہ لائبریری (۲) کتب خانہ ریاست رامپور (۳) کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ (۴) کتب خانہ مولانا عبدالحئی صاحب فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ (۵) کتب خانہ مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی مرحوم (۶) کتب خانہ مولانا ناصر حسین صاحب قبلہ (۷) کتب خانہ علویہ، راجہ صاحب سلیم پور اسٹیٹ، لکھنؤ۔

ان کتب خانوں (۱) میں جو قابل ذکر قلمی نسخے نظر سے گذرے ہیں، ان کے متعلق مختصر کیفیت پیش ہے، تا کہ آئندہ بطور یادداشت محفوظ رہے، سہولت کے خیال سے اس فہرست کو علوم کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے، ان میں سے جن کتابوں کے نادر نسخے ہندوستان یا دوسرے ممالک کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے حاشیہ پر ان کی فہرستوں سے بھی حوالہ دے دیا گیا ہے۔

علوم القرآن

(۱)- اسرار التنزیل و انوار التاویل(۱): امام فخرالدین رازی، المتوفی

(۱) یہاں صرف خدابخش لائبریری میں محفوظ قلمی نسخوں کا ذکر کیا جارہا ہے بقیہ حصہ حذف کر دیا گیا ہے۔

۶۰۲ھ کی توحید وعقاید وغیرہ میں ایک خاص کتاب ہے، یہ مسائل آیات قرآن سے مستنبط ہیں اوران پر مصنف نے اپنے خاص اسلوب بیان سے بحث کی ہے، آخر باب ناتمام رہ گیا ہے، کیونکہ اثنائے تصنیف ہی میں مصنف کی وفات واقع ہوئی ہے، اس کا ایک کامل نسخہ پٹنہ لائبریری میں نظر سے گذرا، یہ ۱۱۳۲ھ کا لکھا ہوا ہے، حاشیہ پر علامہ محمد بن اسماعیل الامیر المتوفی ۱۱۸۱ھ کے ہاتھ کی عبارتیں لکھی ہوئی ہیں، جو غالباً کسی دوسرے نسخہ سے یا اصل سے مقابلہ کے وقت اضافہ کی گئی ہیں، ابتدا کی عبارت یہ ہے:

"قال المصنف رتبناه على اربعة اقسام القسم الاول ما يتعلق بعلم الاصول و الثاني ما يتعلق بعلم الفروع و الثالث ما يتعلق بعلم الاخلاق و الرابع ما يتعلق بالمناجات و الدعوات".

مضامین کے اعتبار سے بہت مفید کتاب ہے۔

(۲)-شرح التاويلات للماتريدی(۲): اس کا ایک کامل نسخہ پٹنہ لائبریری میں موجود ہے، جو قدیم الخط ہونے کے ساتھ ہی ہر طرح محفوظ ہے، تاویلات ماتریدی امام ابو منصور محمد بن محمد الماتریدی المتوفی ۳۳۳ھ کی تصنیف ہے، جو اصول اہل السنۃ اور اصول توحید میں لاجواب کتاب ہے، شیخ عبدالقادر نے جواہر المضیہ میں لکھا ہے کہ یہ کتاب بے مثل ہی نہیں ہے، بلکہ اس فن میں تمام پچھلی کتابوں سے سبقت لے گئی، ابوبکر محمد بن احمد السمر قندی نے اس کی شرح لکھی ہے۔

(۳)-كشف اسرار البيان في آداب جملة القرآن: یہ محمد بن الحسن بن یوسف البقائی کی تصنیف ہے، اس کا ایک نادر نسخہ کتب خانہ خدا بخش خاں مرحوم میں موجود ہے، جو سورۂ انعام سے آخر قرآن تک ہے، مؤلف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ہے، مصنف نے اپنے قلم سے شیخ عثمان بن محمد المقری کو ۷۹۴ھ میں اس کتاب کی روایت کی اجازت لکھ کر دی ہے، اس کتاب میں ایک یہ بھی خوبی ہے کہ یہ مصنف پر پڑھی گئی ہے، اس لیے ہر طرح صحیح ہے۔

(۴)-لطائف الاشارات(۳): امام ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری

التوفی ۴۶۵ھ کی تفسیر میں مشہور کتاب ہے، پٹنہ لائبریری میں اس کا ایک کامل نسخہ موجود ہے، جو دسویں صدی ہجری کا لکھا ہوا ہے، بعض جگہ کتابت کی غلطیاں ہیں، لیکن نسخہ کی حالت اچھی ہے، امام موصوف کی یہ کتاب صوفیہ کے یہاں بہت معتبر ہے، اس میں صوفیہ کے اقوال سے کافی بحث ہے، ایک خاص خوبی یہ ہے کہ یہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کی ہر سورہ کے ساتھ علیحدہ تفسیر کی گئی ہے، جو اس سورہ کے معانی پر دال ہے، امام موصوف کی تفسیر میں کتاب التیسیر بھی بہت عمدہ کتاب ہے، ناقدین نے اجود التفاسیر سے یاد کیا ہے، اس کا ایک ناقص نسخہ کتب خانہ رامپور میں ہے، جو ۶۷۹ھ کا مکتوبہ ہے۔

اصول حدیث

(۵)-معرفة علوم الحديث(۴): یہ امام ابوعبداللہ الحاکم التوفی ۴۰۵ھ کی اصول میں معرکۃ الآرا تصنیف ہے، اس کا ایک کامل نسخہ پٹنہ لائبریری میں زیر مطالعہ رہا، یہ اگر چہ ۱۲۹۱ھ کا مکتوبہ ہے، لیکن غور سے پتہ چلا کہ کسی اچھے نسخہ سے یہ منقول ہے کیونکہ کتابت کی غلطیاں بہت کم ہیں، نسخہ کی ابتدا میں یہ عبارت ہے:

"قال المصنف امابعد فانى لما رأيت البدع فى زماننا قد كثرت و معرفة الناس باصول السنن قد قلت مع امعانهم فى كتاب الاخبار و كثرة طلبها على الاهمال و الاغفال دعانى الى تصنيف كتاب خفيف يشتمل على ذكر انواع علوم الحديث مما يحتاج اليه طلبة الاخيار المواظبون على كتابة الآثاروا عمد فى ذلك سلوك الاختصار دون الاطناب فى الاكثار، والله الموفق لما قصدته والمأن فى بيان ما اردته، انه جواد كريم رؤف رحيم".

اس کتاب کا ایک نادر نسخہ ڈاکٹر کرنکو کو لندن میں ملا ہے، جس کی وہ نقل کر رہے ہیں، اصول حدیث

میں ائمۂ فن کی کتابیں کم طبع ہوئی ہیں، ضرورت ہے کہ وقتاً فوقتاً یہ شائع کی جائیں تاکہ حدیث اور رجال سے صحیح واقفیت ہو سکے، امام حاکم نے اپنی کتاب مستدرک کے مقدمہ میں اصول اور شرائط سے بہت کم بحث کی ہے، بلکہ کتاب المدخل پر محول کیا ہے، معرفۃ علوم الحدیث کی اشاعت سے ان کے اصول پر روشنی پڑے گی، شکر ہے کہ گذشتہ اجلاس شعبۂ علمیہ میں یہ کتاب طبع کے لیے منتخب ہوگئی ہے۔

(۶)-مشکل الحدیث: یہ امام ابوبکر محمد بن الحسن بن فورک کی اصول حدیث میں ایک خاص تصنیف ہے، امام موصوف علامہ بیہقی کے شیوخ میں سے ہیں، اس کتاب کا نادر نسخہ پٹنہ لائبریری میں موجود ہے، یہ نسخہ ۷۰۲ ھ کا لکھا ہوا ہے، ہر طرح محفوظ ہے، مقدمہ میں علماء محدثین کے دو فرقوں کو بتایا ہے، ایک وہ جو صرف نقل و روایت کے پابند تھے، اور دوسرے وہ جو تحقیق اسناد اور تحصیل طرق کی طرف زیادہ توجہ کرتے تھے، یہ صحیح و سقیم کی تمیز رکھتے تھے، اور ان کی نظر وسیع تھی، فرقۂ اولیٰ کو ظاہرہ کے نام سے تعبیر کیا ہے، اور فرقۂ ثانیہ کو محققین میں شمار کیا ہے۔

(۷)-توضیح الافکار: علامہ محمد بن اسماعیل الامیر المتوفی ۱۱۸۱ھ نے ابراہیم الوزیر کی تنقیح الانظار کی شرح لکھی ہے، اصول حدیث میں بڑی مبسوط کتاب ہے، متقدمین اور متاخرین دونوں کے اقوال سے محققانہ بحث کی ہے، اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ مولانا حیدر حسین خاں صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پاس نظر سے گذرا، جو ٹونک کے کسی اچھے نسخہ سے منقول ہے، اس کا دوسرا نسخہ پٹنہ لائبریری میں بھی ہے، قابل طبع کتاب ہے۔

حدیث

(۸)-مسند ابو عوانہ: یہ کتاب نایاب ہے، پٹنہ لائبریری میں اس کا جز واول موجود ہے، یہ نسخہ قدیم الخط ہے، ۶۹۲ ھ کا لکھا ہوا ہے، کاتب کا نام ابراہیم بن یونس الحز ومی ہے، تقریباً ۴۰۰ صفحہ کا یہ جز ہے۔

آخرہ باب الجہر بالقراءۃ فی صلاۃ الکسوف۔

(۹)-علل الحدیث: یہ علی بن عمر الحافظ الدارقطنی کی مشہور ومعروف کتاب ہے، علل حدیث میں بہت معتبر تصنیف ہے، اس کا ایک نادر حصہ پٹنہ لائبریری میں زیر نظر رہا، جو تقریباً آٹھویں صدی کا مکتوبہ ہے، یہ غالباً جزء اول معلوم ہوتا ہے، سب سے پہلے خلفائے اربعہ کے مسانید کو لیا ہے، پھر کبار صحابہ اور اس کے بعد مکثرین کا درجہ رکھا ہے، یہ حصہ مسند ابی ہریرہ پر ختم ہوگیا ہے، ثالث اور خامس (۵) کی جلدیں بھی ہیں، مگر وہ جدید الخط ہیں۔

(۱۰)-محیط للسرخسی: امام رضی الدین محمد بن محمد السرخسی مشہور فقہائے احناف میں سے ہیں، امام موصوف نے فقہ حنفی میں محیط کے نام سے تین کتابیں تالیف کیں، ایک کبریٰ، دوسری وسطیٰ اور تیسری صغریٰ، کبریٰ کی دس جلدیں، وسطیٰ کی چار جلدیں اور صغریٰ کی دو جلدیں ہیں، اس کتاب (۶) کے متعدد نسخے نظر سے گذرے ہیں، لیکن سب کے سب ناقص ہیں، اس کا ایک حصہ پٹنہ لائبریری میں ہے، جو جدید الکتابہ ہے، کتاب الشرکۃ سے باب المتشابہ بالفرائض تک کا جزء ہے، کتب خانہ رامپور میں بھی ایک ناقص جزء ہے، اس کی وجیز الحیط یعنی محیط صغریٰ کا بھی ایک حصہ پٹنہ لائبریری میں موجود ہے، جو باب الوصیہ للفقراء والمساکین تک ہے، یہ قدیم الخط ہے۔

(۱۱)-محیط للبرهانی: یہ برہان الدین محمود بن احمد بن عبدالعزیز البخاری المتوفی ۶۱۶ھ کی فقہ میں ایک مبسوط کتاب ہے، اس کتاب کی کل چار جلدیں (۷) ہیں، جن میں سے تین جلدیں کتب خانہ رامپور میں بہت اچھی حالت میں ہیں۔

جلد اول	۶۳۶ صفحہ کی ہے	کتاب الحج تک ہے۔
جلد دوم	۸۹۸ صفحہ کی ہے	کتاب الاقرار سے شروع ہو کر کتاب المضاربہ پر ختم ہوئی ہے۔
جلد سوم	۵۹۲ صفحہ کی ہے	کتاب الجہاد وغیرہ ہے۔

یہ تینوں حصے قدیم الخط ہیں اور ایک ہی کاتب کے لکھے ہوئے ہیں، اس کا ایک جز کتب خانہ خدا بخش خاں مرحوم میں بھی ہے، یہ کتاب مضامین فقہی کے اعتبار سے بہت اعلیٰ وارفع ہے، مصنف

کے مقدمہ کی عبارت یہ ہے:

"قال قد وقع فی رأیی ان اتشبه باسلافی بتالیف اصل جلیل یجمع جل الحوادث الحکمیة و النوازل الشرعیة لیکون عوفانی حال حیاتی و اثر احسنا بعد وفاتی فجمعت مسائل المبسوط و الجامعین و السیر و الزیادات الحقت بها مسائل النوادر و الفتاوی و الواقعات و صممت الی ذلک من الفواید التی استفدتها من والدی ومن مشائخ زمانی و فصلت الکتاب تفصیلا".

رجال وطبقات

(۱۲)-الدرر الکامنه: حافظ ابن الحجرؒ کی آٹھویں صدی کے رجال میں مشہور کتاب ہے، تقریباً تین سال سے دائرۃ المعارف کی نگرانی میں زیر ترتیب وتصحیح ہے، سب سے پہلے اس کا ایک نادر نسخہ مسٹر کرنکو کو شام میں دستیاب ہوا، جو امام سخاوی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اور مصنف نے خود اس کی تصحیح کی ہے، مسٹر موصوف نے اس کی نقل کی اور برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کے نسخوں سے مقابلہ وتصحیح کر کے طبع کے لیے بھیج دیا ہے، اس نسخہ میں بعض جگہ بیاض ہے، اس بنا پر اثنائے سفر میں اس کے اور نسخوں کی تلاش تھی، چنانچہ اس کے چار نسخے نظر سے گذرے۔

(۱) پٹنہ لائبریری میں جدید الخط ہے، حیدرآباد کے نسخہ سے منقول ہے، (۲) کتب خانہ ریاست سلیم پور میں حرف ع میں عطیہ تک کے احوال ہیں، یہ بھی جدید الخط ہے، (۳) کتب خانہ ریاست رامپور میں۔ یہ نسخہ کامل ہے، مدینہ طیبہ کے نسخہ سے منقول ہے، صحت کے اعتبار سے اچھا نسخہ ہے، بعض صفحات کا مقابلہ کیا گیا، ۲۰ صفحہ کے اندر پانچ سات جگہ عبارتیں زیادہ اور الفاظ صحیح ہیں، (۴) مولانا ناصر حسین صاحب کے کتب خانہ میں دو جلدیں ہیں، ایک

قدیم الخط ہے جو عطیہ تک کے احوال پر مشتمل ہے، دوسری علی بن ابراہیم سے آخر تک ہے جو جدید الخط ہے، جلد اول کے بعض صفحات کا مقابلہ کیا گیا، یہ اس نسخہ کی زیادہ تائید کرتا ہے، جو امام سخاوی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، حاشیہ پر بعض علماء کی تصحیح بھی ہے (۸)۔

(۱۳)- جمهرة النسب: لابن حزم الاندلسی، یہ علم الانساب اور معرفۃ القبائل کے عنوان پر لکھی گئی ہے، نہایت مفید کتاب ہے، اس کا ایک نسخہ پٹنہ لائبریری میں نظر سے گذرا جو ۹۰۰ھ کا مکتوبہ ہے (۹)۔

(۱۴)- طبقات الحنابلہ: قاضی ابویعلی الموصلی المتوفی ۵۱۶ھ کی مشہور تصنیف ہے، امام احمد بن حنبلؒ کے تذکرہ سے شروع کیا ہے، اور ۵۱۲ھ تک کے رجال حنابلہ کا ذکر کیا ہے، پٹنہ لائبریری میں اس کا ایک نادر نسخہ نظر سے گذرا جو ۶۳۷ھ کا لکھا ہوا ہے، اس کتاب کا ایک اور نسخہ تین جلدوں میں کتب خانہ علویہ ریاست سلیم پور میں بھی ہے، جو اگرچہ زیادہ قدیم الخط نہیں ہے، لیکن ہر طرح صاف ہے۔

(۱۵)- طبقات الحنابله لابن رجب: شیخ زین الدین عبدالرحمن بن احمد المعروف بابن رجب المتوفی ۷۵۵ھ کی کتاب ہے، انھوں نے ۷۵۰ھ تک کے رجال حنابلہ کا ذکر کیا ہے، اور ان کے احوال لکھے ہیں، اس کا بھی کامل نسخہ پٹنہ لائبریری میں موجود ہے، اس کی ایک جلد کتب خانہ ندوۃ العلماء میں بھی ہے، اور اس کی دوسری جلد مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی ندوہ کے کتب خانے لے گئے ہیں (۱۰)۔

سیر و تاریخ

(۱۶)- بهجة المحافل فی السير و المعجزات و الشمائل، یہ شرف الدین یحیی بن ابی العامری المتوفی ۸۹۳ھ کی فن سیر میں ایک تصنیف ہے، اس کا ایک قدیم الخط نسخہ پٹنہ لائبریری میں ہے، جو ۹۳۲ھ کا لکھا ہوا ہے، اور ایک دوسرا نسخہ کتب خانہ ندوۃ العلماء میں بھی ہے، جو ۱۰۰۱ھ کا مکتوبہ ہے۔

(۱۷)- تاریخ ابن عساکر: اس کتاب کے دو جز پٹنہ لائبریری میں موجود ہیں جو نہایت نادر ہیں۔

۱- الجزء الحادی والثلاثین (۳۱)، جس میں عائذ سے عائذ اللہ تک کے احوال ہیں۔

۲- الجزء الثانی والخمسین (۵۲)، علی سے شروع ہو کر فی آباء من اسمہ عمر تک کے احوال ہیں، یہ دونوں ۶۱۴ھ، ۶۱۵ھ کے مکتوبہ ہیں، دونوں کا کاتب ایک ہے۔

(۱۸)- جزء البدایه و النهایه (۱۱): علامہ ابن کثیر الجزری کی تاریخ میں ایک مبسوط کتاب ہے، جو دس جلدوں میں ہے اس کا ایک حصہ پٹنہ لائبریری میں زیر مطالعہ رہا، جو ہجرت سے وفات تک کے واقعات پر مشتمل ہے، نسخہ نادر ہے، ۸۹۲ھ میں مصر میں اس کی نقل ہوئی ہے، اس کتاب کا ایک اور حصہ مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی کے کتب خانہ میں ہے، جو ابتدائے ہجرت نبوی سے ۱۵ھ تک کے واقعات پر مشتمل ہے، ۱۲۵۶ھ میں لکھا گیا ہے۔

ان کتب خانوں کے نوادر کی فہرست بہت طویل ہے، جو انشاء اللہ کسی خاص موقع پر پیش کی جائے گی، اس وقت صرف ان کتابوں کے نسخوں کا حال لکھا گیا ہے، جن کی دائرۃ کو آئندہ ضرورت ہے۔

شکریہ، میں سب سے پہلے مولانا قطب الدین صاحب عبدالوالی فرنگی محلی، مولوی محمد ایوب صاحب فرنگی محلی، ناظم صاحب ندوۃ العلماء، جناب راجہ صاحب سلیم پور، سکریٹری صاحب پٹنہ لائبریری، چیف سکریٹری صاحب ہز ہائینس نواب صاحب رامپور، ناظم صاحب کتب خانہ ریاست رامپور اور حضرت مولانا ناصر حسین صاحب کا اس امر پر دلی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان معزز اصحاب نے اپنے علمی خزانوں سے فیضیاب ہونے کا دریا دلی سے موقع عنایت فرمایا، اور ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی، جزاہم اللہ خیر الجزاء۔

نیز ارا کین مجلس دائرۃ المعارف کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھ ایسے ناچیز کا اس اہم علمی خدمت کے لیے انتخاب فرمایا، اور سب سے زیادہ اس رب العزت کا شکرگذار ہوں، کہ جس نے انجام کار کی توفیق عطا فرمائی، وما توفیقنا الا باللہ.

حواشی:

۱- اس کا ایک نسخہ مدینہ طیبہ میں شیخ الاسلام کے کتب خانہ میں ہے، اور کتب خانہ خدیویہ مصر میں بھی ایک نادر نسخہ ہے، جو ۷۵۵ھ کا لکھا ہوا ہے۔

۲- پٹنہ لائبریری کی فہرست مفتاح الکنوز الخفیہ میں اس کتاب کا نام شرح التاویلات للماتریدی لکھا ہے، لیکن کتاب پر غور کرنے سے اس کا شرح ہونا منشرح نہ ہو سکا، غالباً یہ تاویلات ماتریدی ہے، جس کو محمد بن احمد السمر قندی نے جمع کیا ہے، کشف الظنون میں التاویلات الماتریدی کے ذیل میں یہ عبارت درج ہے:
(و هی ما اخذه منه اصحابه المبرزون تلقفها و لهذا کان اسهل تناولا من کتبه جمعه الشیخ علاء الدین بن محمد بن احمد بن ابی احمد السمرقندی صاحب تحفة الفقهاء) اس کتاب کا ایک اور قلمی نسخہ مدینہ طیبہ کے کتب خانہ شیخ الاسلام عارف حکمت بے میں موجود ہے، جس کو بعض علمائے ہند نے اپنی نظر سے حال میں دیکھا ہے، اس کتاب کا نام وہاں کی فہرست میں اس طرح درج ہے، **تاویلات القرآن فی بیان اصول اهل السنة و اصول التوحید لابی منصور الماتریدی جمعه الشیخ علاء الدین محمد بن احمد السمرقندی.** (معارف نومبر ۲۶ء)

۳- اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے، شروع کے صفحات کچھ کرم خوردہ ہیں، کتابت قدیم ہے۔

۴- اس کا ایک نسخہ مدینہ طیبہ میں شیخ الاسلام کے کتب خانہ میں ہے، اور دوسرا کتب خانہ محمودیہ میں بھی ہے، (معارف نومبر ۲۶ء)۔

۵- یہی دوجلدیں کتب خانہ آصفیہ میں بھی ہیں، جو ۱۳۱۰ھ کی مکتوبہ ہیں، غالباً اس نسخہ سے پٹنہ لائبریری میں نقل ہوکر گئی ہیں۔

مجلد ثالث اولہ۔ عن سعید و ابی سلمہ عن ابی ھریرہ.

آخرہ۔ و سئل عن حدیث عبدالجلیل الشامی عن عمہ عن ابی ھریرہ.

مجلد خامس اولہ۔ من حدیث یزید بن شجرۃ عن النبی صلعم.

آخرہ۔ و سئل عن حدیث القاسم بن محمد بن عبدالرحمن قصۃ الخنسا.

آخر میں یہ عبارت ہے:

و آخر مسند النساء من کتاب الملل و عن آخر الکتاب.

۶- اس کتاب کا کامل نسخہ ایک جگہ دستیاب ہونا دشوار معلوم ہوتا ہے، لیکن تمام نسخے اگر جمع کیے جائیں تو ممکن ہے کہ ایک کامل نسخہ مرتب ہو جائے۔ کتب خانہ خدیویہ میں جزء رابع، جزء خامس، جزء سادس اور جزء عاشر ہے۔ جن میں سے بعض کرم خوردہ بھی ہیں، اس کی تین جلدیں کتب خانہ آصفیہ دکن میں بھی ہیں۔

جلد اول کتاب الطہارۃ سے کتاب النکاح تک ہے۔

جلد دوم کتاب الذبائح سے کتاب الشہادۃ تک ہے۔

جلد سوم کتاب السرقہ سے کتاب الوصیۃ تک ہے۔

یہ سب قدیم الخط ہیں، جلد ثالث کے اخیر میں تقریباً ۵۰ صفحے کسی دوسرے نسخہ سے منقول ہیں۔

۷- اس کا ایک ناقص حصہ ٹونک کے کتب خانہ میں ہے، جو قدیم الخط ہے، اور ایک کامل نسخہ مدینہ طیبہ میں کتب خانہ شیخ الاسلام میں ہے، جو ۱۰۵۹ھ کا لکھا ہوا ہے، کتب خانہ خدیویہ میں بھی کامل نسخہ ہے، جو ۱۱۸۶ھ کا لکھا ہوا ہے۔

۸- اس کا ایک نادر نسخہ کتب خانہ خدیویہ میں بھی ہے، اور مدینہ طیبہ کے کتب خانوں میں بھی ہے۔

۹- اس کا ایک قدیم نسخہ رباط الفتح (مراکو) میں ہے۔

۱۰- اس کا ایک نسخہ لیبزگ میں ہے، اور دوسرا قسطنطنیہ میں ہے۔

۱۱- اس کا ایک نسخہ وائنا میں ہے۔



(معارف، نمبر ۴ جلد ۲۴)

سید بادشاہ حسن حیدرآبادی

پٹنہ لائبریری

دنیا کی کوئی دولت خطاطی کے ان نایاب نمونوں، خوبصورت اور سڈول نقوش کا جو صفحۂ قرطاس پر اُبھرے دکھائی دیتے ہیں، حقیقی معنوں میں معاوضہ نہیں ہوسکتی۔ مصوری کے وہ شاہکار جن میں بعض کے متعلق تو یہ مشہور ہے کہ گلہری کے ایک بال سے کاغذی پیکروں میں رنگوں کی جان ڈالی گئی ہے یا وہ کتب پارینہ جو ماہرین وکاملین کی انتھک کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ کس قدر عجوبہ روزگار ہیں۔ سچ کہا ہے کسی نے:

"دنیا میں زندہ آدمی کے سوا سب سے زیادہ عجیب چیز کتاب ہے۔"

انسان کی قسمتوں سے زیادہ ان کتابوں نے گردشیں کی ہیں کبھی عالم کی آنکھوں کے آگے کبھی شوقین کے سینے پر کبھی طالب علم کے ہاتھوں پر ورق گرداں رہی ہیں۔ بعض علم دوست شہزادوں کے حضور میں بطور نذر گذرانی گئیں۔ ایک بادشاہ نے اپنے ذوق علم کا ثبوت دینے کے لیے انہیں دوسرے کے یہاں تحفتاً بھیجا۔ کسی فاتح نے انہیں مال غنیمت سمجھ کر لوٹا۔ انہی کی بدولت اکثروں نے شاہوں کے دربار میں رسوخ حاصل کیا۔ دولت وثروت پائی۔ اور عزت و افتخار حاصل کیا۔ غرض انھوں نے بادشاہوں کا دربار چمکایا، عالموں کا ذوق پورا کیا۔ غریبوں کا ساتھ دیا۔ لالچیوں کی تشنگی آب زر سے بجھائی۔ تاجروں کو نفع پہنچایا۔ اور نہ معلوم کتنے دلوں کی تمناؤں کو پورا کیا اور کس کس کی قسمتوں کو جگایا اور آخر دست بدست ہوتے ہوئے پٹنہ لائبریری میں مستقل قیام کیا۔

انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں جب سلطنت مغلیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور حکومت برطانیہ کا درخشاں ستارہ اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جگ مگ جگ مگ کررہا تھا بہار کے شمالی علاقہ میں چمن اسلام کے ایک سدا بہار پودے میں ایک پھول اپنی بہار دے رہا تھا۔ اس کے پہلو میں ایک کلی تھی۔ جس کی بھینی بھینی لپک اور ہلکی ہلکی لپٹ بادصبا کے ساتھ ساتھ چاروانگ

عالم میں پھیل گئی۔ اپنی خوشبو سے قدر شناسان علم کو مست اور متوالا کر کے کتب نادرہ کو جگہ جگہ سے اپنے دامن میں گھسیٹ لیا۔ یہ محمد بخش اور ان کے صاحبزادے خدا بخش تھے۔

کہا جاتا ہے کہ اسی خاندان کے ایک لائق فرد نے شہنشاہ اورنگ زیب کو ''فتاویٰ عالمگیری''، ترتیب دینے میں بڑی مدد دی تھی۔ محمد بخش کو جو بلند پایہ عالم اور اچھے شاعر تھے قلمی کتابیں جمع کرنے کا شوق ہوا۔ وقت انتقال انھوں نے چودہ سو کتابیں چھوڑیں جن میں سے تین سو انہیں آباؤ اجداد سے ترکہ میں ملی تھیں۔ باقی سب ان کی ذاتی کاوشوں کا نتیجہ تھیں۔ مرتے دم محمد بخش صاحب نے وصیت کی کہ ان کتابوں کو کسی حالت میں بھی منتشر نہ کیا جائے۔ بلکہ انھیں مشرقی علوم وفنون کا ایک بیش بہا خزینہ بنایا جائے۔ خدا بخش نے اس وصیت پر پورا پورا عمل کیا اور یقیناً مسلم لٹریچر کے لحاظ سے ایک بہترین لائبریری بنا دیا۔ لیکن انگریزی کو ذریعہ تعلیم قرار دینا میکالے کی ایسی ستم ظریفی تھی جس سے پٹنہ لائبریری کی وقعت کو خصوصاً اور علوم مشرقیہ کو عموماً ہندوستان میں ایک ناگزیر نقصان پہنچا۔

کتب جمع کرنے کے شوق میں خدا بخش صاحب نے ہندوستان بھر کی سیاحت کی۔ اسی ضمن میں وہ حیدرآباد دکن بھی آئے تھے۔ ان کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ ہر کتب فروش چھوٹا ہو کہ بڑا اور ہر پرانی کتابوں کا دوست امیر ہو کہ غریب ان کے نام سے واقف اور ان کے خلوص کا مداح تھا۔ اسلامی دنیا اور ہندوستان کے باہر یقینی ان کے خود دسترس میں نہ تھی۔ لیکن جیسا مشہور ہے، ڈھونڈنے والے کو خدا بھی مل جاتا ہے، تو بھلا غیر ممالک کی کمیاب کتابیں ان کی نظر سے کہاں بچ سکتی تھیں۔ خدا بخش صاحب نے ہمسایہ کے ایک علم دوست رئیس کے ایک محنتی، جفا کش، اور دیانت دار جامع کتب کا اغوا کرنے میں ذرا نہ باک کیا۔ کیونکہ ان کی نظر انتخاب میں یہ عرب ان داموں میں بھی سستا تھا۔ یہ جامع ایران، مصر اور عرب کے ممالک میں اٹھارہ سال تک گشت لگا کر قلمی نسخے جمع کرتا رہا۔

کتب جمع کرنے کا شوق ایک معمولی واقعہ سے گذر کر رومان کی حد تک جا پہنچا۔ واقعہ ہے کہ اگر وہ عرب جامع جستجوئے کتب کی ۱۸ سالہ سرگردانی قلمبند کرتا تو یقیناً ایک نہایت دلچسپ

عقیدہ حضرات دیوان حافظ سے فال دیکھتے ہیں۔

حاشیہ پر اکثر شہنشاہوں کے اپنے حسب حال شعر کے مقابلہ میں نوٹ لکھے ہیں اور جن اشعار سے انہوں نے نصیحت حاصل کی یا سبق سیکھا نشان کر دیا ہے۔ ایک جگہ جہاں حافظ نے یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کے مظالم کا ذکر کیا ہے، ہمایوں نے ایک نشان تو اس شعر کے مقابل بنایا اور دوسرا اپنے لوحِ دل پر۔ یقیناً اس کے نامہرباں بھائیوں نے اس کی نیکیوں کا جواب بغاوت، سرکشی اور ظلم سے دیا۔

ماہرین خطاطی کی ضرورت نہیں ہر تھوڑا سا شوق رکھنے والا ہمایوں کی خاص طرز کتابت جن میں گول گول حروف نمایاں ہیں پہچان سکتا ہے۔ شاہجہاں کے بڑے بڑے حروف اور جہانگیر کے شکستہ لیکن سڈول حروف صاف شناخت ہو سکتے ہیں۔ حالانکہ یہ مسلم ہے کہ یہ دیوان اکبر کے بھی مکتب خانہ میں رہ چکا ہے لیکن اس کی کوئی تحریر اس پر نہیں جو اس بات کی صاف دلیل ہے کہ وہ نہ لکھ سکتا تھا اور نہ پڑھ سکتا تھا۔

دیوان حافظ کے کئی اور نسخے ہیں لیکن کوئی بھی اس نادر نسخہ کے مقابلہ میں نہیں پہنچ سکتا۔ ایک نسخہ سلطان قطب شاہ (گولکنڈہ) نے حیدرآباد دکن کے مشہور کاتب محمد محسن سے ۱۰۲۳ھ میں لکھوایا تھا۔ فہرست نیلے رنگ کی نہایت زرق برق ہے۔ عنوان سرخ اور سنہری روشنائی سے بڑی خوبصورتی کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ فتح گولکنڈہ کے بعد یہ نسخہ اورنگ زیب کے ہاتھ لگا تھا۔ یہاں "سوانح جہانگیری" کا بیان یا موقع ہوگا کیونکہ یہ بھی اسی معرکہ میں عالمگیر کے ہاتھ آئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے چار نسخے مختلف ہمعصر بادشاہوں کے پاس روانہ کئے گئے تھے جن میں سے ایک یہ تھا اور باقی تین نامعلوم ہیں۔

(۷) دیوان کامران:

ہمایوں کے بھائی مرزا کامراں کی زندگی کے آخری دردناک لمحوں کی یاد تازہ کرنے کے لیے صرف یہی ایک نسخہ ہندوستان میں باقی رہ گیا ہے۔ ہمایوں نے کئی مرتبہ اس کی جان بخشی کی، اور بار بار برادرانہ رحم و کرم سے پیش آیا۔ آخر تنگ آکر اُس نے کامراں کی آنکھیں نکلوا ڈالیں

تھے۔ پہنچ کر کیا دیکھتا ہوں کہ کمرہ تو خالی ہے لیکن دوحدیث کی نایاب کتابیں میز پر کھلی رکھی ہیں۔لوگوں نے کہا کہ سرور کائنات نے انہی صفحات پر ضیاپاشی کی ہے۔''

اب ان کتابوں پر خدابخش صاحب کی تاکید لکھی ہے کہ کبھی انہیں لائبریری سے باہر نہ لے جائیں۔

''خدابخش صاحب'' سرعلی امام ایک خط میں لکھتے ہیں۔''عجیب وغریب شخصیت کے مالک تھے۔ بہت پرانی وضع کے آدمی تھے۔ اُنہیں دیکھ کر مجھے الف لیلیٰ کی تصویریں بے ساختہ یاد آتی تھیں۔ پہلی مرتبہ جب میں ان کے مکان پر گیا ہوں تو شبلی نعمانی بھی مہمان تھے۔ یہ پُر لطف صحبت مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ خدابخش صاحب نے شبلی صاحب کے آگے قلمی نسخوں کا ایک ڈھیر لگا رکھا تھا۔ ہم تینوں مسکرار ہے تھے۔ خدابخش کے تبسم میں اس بیش بہا خزانہ کے مالک ہونے کی حیثیت سے غرور کی ہلکی سی جھلک نمایاں تھی۔ شبلی کی مسکراہٹ میں ایسے انداز پائے جاتے تھے جیسے کوئی بنیا روپیہ کا ڈھیر سامنے دیکھ کر غیرارادی طور پر دانتیں باہر نکال دیتا ہے۔ لیکن نہ معلوم میری باچھیں کیوں کھلی جاتی تھیں؟

''اس کے بعد میں اکثر ان کے یہاں جاتا آتا رہا۔ بہت پس وپیش کے بعد ایک موقع پر میں نے آخر پوچھ ہی لیا کہ اتنی کتابیں کیسے جمع ہوئیں اور کہاں کہاں سے کس کس طریقہ سے فراہم کی گئیں؟ وہ مسکرائے۔ ان کی آنکھوں میں ایک قسم کی چمک پیدا ہوئی۔

''کتب جمع کرنے کا شوق جب حد سے بڑھ جاتا ہے۔''انہوں نے کہا'' تو قاعدے ،قانون اور ضابطے کی پروا نہیں رہتی۔ سنو! دنیا میں تین قسم کے اندھے ہیں۔ ایک وہ جو بینائی سے محروم ہیں۔ دوسرے وہ جو کمیاب کتابیں دوستوں کو عاریتاً دیتے ہیں۔ اور تیسرے وہ جو ایسی نادر کتابیں اپنے قبضہ میں کرنے کے بعد بھی واپس کرتے ہیں۔''

''خدابخش صاحب کا شوق یقیناً حد سے تجاوز کر گیا تھا۔ برٹش میوزیم نے ایک گراں قدر رقم ہدیۃً پیش کی لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ میں ایک غریب آدمی ہوں، انھوں نے مجھ سے کہا۔ اور وہ مجھے دولت شاہانہ دے رہے تھے۔ بھلا میں کیسے قبول کر سکتا؟

''کیا میں لالچ کا شکار ہو کر اپنی اور والد مرحوم کی محنت پر پانی پھیر دوں؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ کہ کتب خانہ جو مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے دولت کی دیوی کے آگے بھینٹ چڑھادوں؟'' ان کی آنکھیں اشک آلود تھیں۔ انھوں نے پر جوش لہجے میں کہا۔ ''نہیں! ناممکن ہے! وہ پبلک کے لیے وقف ہے اور ہمیشہ برادرانِ ملک کے فائدہ کے لیے اس کا دروازہ کھلا رہے گا۔''

''جہاں تک میرا علم ہے میں کہ سکتا ہوں کہ خدابخش صاحب ایک عالی ہمت، بلند حوصلہ اور ہمدرد انسان تھے۔''

۱۹۰۸ء میں خدابخش صاحب جو بہار کے ایک تعلقہ چھپرا میں پیدا ہوئے تھے اپنی عمر کے (۶۲) سال پورے کر کے پٹنہ میں انتقال کر گئے اور لائبریری کی دونوں عمارتوں کے درمیان جو چھوٹی سی کھلی جگہ ہے وہاں دفن کردیئے گئے۔ قبر کی چاروں طرف سبزہ بے ترتیبی کے ساتھ اُگ آیا ہے جس سے ایک عجیب سادگی برستی ہے۔

مرحوم نے وصیت کی کہ لائبریری کسی صورت میں بھی موجودہ مقام سے نہ ہٹائی جائے۔ کیونکہ وہ مر کر بھی لائبریری سے جدا ہونا نہ چاہتے تھے۔

پٹنہ لائبریری اس طرح قائم ہوئی۔ ایک شخص کا قول ہے کہ کتابوں کی حالت انسانوں کی سی ہے۔ اگر کوئی ان کی دل کی باتیں جاننا چاہتا ہے تو یکے بعد دیگرے مستقل مزاجی سے ان کا مطالعہ کرے۔ کتابوں کے ترتیب دینے میں جو محنت صرف کی گئی اس کا اندازہ یوں ہوسکتا ہے کہ ۱۹۰۴ء سے کتب خانہ کی فہرست مرتب ہونی شروع ہوئی اور تقریباً پندرہ سال تک مکمل نہ ہوسکی۔ چند نوجوان طلبہ جنھوں نے فہرست مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا مکمل کرتے کرتے ادھیڑ عمر کے ہوگئے۔ ان میں مولوی عبدالمقتدر، ڈاکٹر عظیم الدین احمد اور مولوی عبدالحمید صاحبان قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ سر ایڈورڈ ڈینسن راس کی محنت جن کی نگرانی میں یہ سب کام انجام پایا لائق داد ہے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ پٹنہ لائبریری کی نادر و نایاب کتابوں میں سے چند کا ذکر کروں۔ امید ہے کہ بڑی دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

اب میں چاہتا ہوں کہ پٹنہ لائبریری کی نادرونایاب کتابوں میں سے چند کا ذکر کروں۔ امید ہے کہ بڑی دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

(۱) تاریخ خاندان تیموریہ:

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ تاریخ خاندانِ تیموریہ سے مختص ہے۔ یہ کتاب تاریخی نقطہ نظر سے کچھ زیادہ وقیع نہیں کیونکہ اس کا بیشتر حصہ ظفر نامہ اور بابر نامہ سے نقل کیا گیا ہے۔ البتہ اکبر اعظم کی ۱۹ رسالہ حکومت کے متعلق جو کچھ بھی لکھا گیا ہے وہ چشم دید ہے۔ آرٹ کے لحاظ سے یہ کتاب انمول ہے۔ اس میں ۱۳۳ رلاجواب تصویریں ہیں۔ ہر تصویر کے کسی نہ کسی گوشہ میں مصور کا نام بھی لکھا ہے جو غالباً ہندوستانی آرٹ میں کافی عجیب چیز ہے کیونکہ اکثر ہندوستانی مصور اپنی تصویروں پر نام نہیں لکھتے۔ بہزاد زماں نامی دوراں خواجہ عبدالصمد کے شاگردوں کی بنائی ہوئی بھی کئی تصویریں ہیں۔ اگر چہ خود عبدالصمد کا نام کسی تصویر پر نہیں لیکن عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنے متعدد نمونے شاگردوں کے نامزد کردیئے ہیں بہت ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو اس وجہ سے کہ وہ اپنے آپ کو ہمعصر مصوروں میں بلند ترین خیال کرتا تھا اور ان کے شاہکاروں کے ساتھ بھی اپنا معمولی کام شامل کرنا ذلت سمجھتا تھا۔ یہ ہمایوں کے زمانے میں شیراز سے دہلی آیا اور شہنشاہِ وقت کو مصوری اور خوشنویسی سکھلانے پر مقرر ہوا۔ اس کو شیریں قلم خطاب دیا گیا اور دربار میں بہت عزت کی گئی۔ اس کا بیٹا جہانگیر کے عہد میں خانخاناں کے معزز خطاب سے سرفراز ہوا۔

اس کتاب میں کم وبیش تیس مصوروں کی نقاشی کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ جن میں سے تیرہ تو وہ نام نہاد درباری مصور ہیں۔ جو اکبر اعظم کے منظور نظر اور استاد زمانہ تھے۔ بعض تصویروں کے نیچے بساون اور مسکین کے نام لکھے ہیں۔

ہر تصویر کسی نہ کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ان میں سے ۹۷ تصویریں تیمور کے بچپن سے لیکر بستر مرگ تک کے مختلف مناظر پیش کرتی ہیں۔ میدان کارزار اور حالتِ جنگ وجدل کی عموماً نقشہ کشی کی گئی ہے۔ اسی سلسلہ میں دمشق سے لیکر دہلی اور بدخشاں کی برف پوش چوٹیوں سے لیکر وادیٔ نیل تک کا جغرافیہ خود بخود نمایاں ہو گیا ہے۔ تصویروں میں اکثر جگہ تیغ

زنی، نیزہ بازی، شہیدوں کی بے بسی، نمازیوں کی لوٹ، دریاؤں کا عبور، اور قلعوں کا انہدام ۔غرض یہی وہ مناظر ہیں جن میں مصوروں نے اپنا پورا زور مارا ہے۔لیکن وہی تصویریں کامیاب ہیں جن میں لہلہاتے سبزہ زار۔ پھلے پھولے مرغزار۔ چڑیوں کے چہچہے۔ چوپایوں کی کلیلیں۔دریاؤں کی روانی۔ پہاڑوں کا سکوت۔اور درختوں کا وجد دکھلایا گیا ہے۔تصویروں کا یہ حصہ اسقدر دلچسپ ہے کہ دیکھنے والا چاہتا ہے کہ سارا سارا دن ایک ہی تصویر کو گھورتا رہے۔لیکن میرا دعویٰ ہے کہ پھر بھی تشفی نہ ہوگی۔

ایک تصویر اُس مشہور جنگ کا نقشہ کھینچتی ہے جو ۱۴۰۰ء میں تیمور اور گورنر بغداد کے درمیان ہوئی تھی۔ گورنر اور ان کی بیٹی جس نے اس وقت بھی چہرہ پر نقاب ڈال رکھا تھا دریا میں کشتی کے سہارے اپنی جان کو مٹھی میں لیے رہائی کی فکر میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔جب شہنشاہ کے تیرانداز انہیں دیکھ پاتے ہیں تو پانی میں کود کر کشتی ڈبو دیتے ہیں۔پھر تیمور کے آگے گورنر کی نعش لاتے ہیں۔شہنشاہ اپنے قہر خدا ہونے کے ثبوت میں شہر کو آگ لگا دینے کا حکم نافذ کرتا ہے۔نظام شامی مصنفِ ظفر نامہ جس نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا لکھتا ہے۔کہ تیمور کی فوج دریا عبور کرنے کے لیے اُتر پڑی تو دریا کا پاٹ ایسا پھٹ گیا تھا کہ زمین اور پانی میں فرق کرنا دیکھنے والوں کے لیے تقریباً ناممکن تھا۔اس لیے اس نے کہا'' کیسے فوجی ہیں یہ جن کے لیے خشکی اور تری دونوں برابر ہیں؟''

دوسری تصویر میں تیمور جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اپنی کمسنی کے زمانے میں چیونٹی تک کو کچلنے سے احتراز کرتا تھا۔اپنے جوانا مرگ بیٹے شہزادہ محمد سلطان کے غم میں رو رہا ہے۔تیمور سے بابر تک مختلف حالتوں کی متعدد تصویریں ہیں۔ایک میں ہمایوں کی پیدائش کی تقریب میں جشن منایا جا رہا ہے۔بابر چتر زریں کے سایہ میں تخت مرصع پر رونق افروز ہے۔سامنے خوبصورت ایرانی قالین پر نصف دائرہ کی شکل میں مصاحبین باادب بیٹھے ہیں۔قلعہ کے باہر عام لوگوں میں ایک غلغلۂ خوشی بلند ہے۔دف بج رہے ہیں۔ڈھولکیں پٹ رہی ہیں۔غرض ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محفل طرب میں مے نشاط کا دور دورہ ہے۔جس سے ہر شخص مست و سرشار اور بے خود و بے

حواس ہے۔لیکن یہ جشن ہندوستانی نہیں بلکہ وسط ایشیا کا اپنا منظر معلوم دیتا ہے۔

اس سے زیادہ دلکش اور تاریخی نقطۂ نظر سے اہم اکبراعظم کی پیدائش کا منظر ہے۔ایک دکھی عورت اور ایک بے بس مرد کی داستان ناگہانی سادے لیکن دلفریب انداز میں پیش کی گئی ہے۔ماں سبز پوشاک میں ناتوانی کے عالم میں پلنگ پر پڑی ہے۔اور نومولود فرزند کے اطراف کئی عورتیں حلقہ کئے کھڑی ہیں۔سب کے چہروں پر شادمانی کی لہریں دوڑ رہی ہیں۔

تصویر کے بیچ میں نجومی ہونے والے شہنشاہ اعظم کے طالع دیکھ کر انگشت بدنداں ہیں۔سوار خوشخبری لیے ہمایوں کے خیمہ کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ہمایوں کو ایک خیمہ میں تخت پر بیش بہاخلعت پہنے مصاحبوں کے حلقے میں بیٹھے بتلایا گیا ہے۔اس طرح مصور نے اپنا کمال دکھلانے کا خوب موقع نکال لیا لیکن یہ نہ سمجھا کہ تاریخی واقعہ بے مزہ ہوگیا۔اکثر معتبر مورخین کا بیان ہے کہ اکبر ایک چٹیل میدان میں پیدا ہوا۔ہمایوں شہنشاہ تو تھا لیکن ایک مغلوب اور مفرور۔تزک واحتشام اور تاج وتخت اس سے کوسوں دور تھے۔کہا جاتا ہے کہ جب اس کو اکبر کی پیدائش کی خبر ملی تو اس نے تھوڑی سی مشک منگوائی اور ذری ذری سی اپنے تمام ساتھیوں میں تقسیم کی اور کہا" یہی ہے جو کچھ میں تمہیں اپنے اس لڑکے کی پیدائش کے موقع پر دے سکتا ہوں۔مجھے امید ہے کہ اس کی خوشبو کی طرح میرے فرزند کی حکومت بہت جلد چاردانگ عالم میں پھیل جائے گی۔"

ایک اور تصویر ہمایوں کے اوج واقبال کے زمانے کی بھی ہے۔قلعہ شامپنیر کی ایک چٹان پر مٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ جگ مگ جگ مگ کرتی ہوئی زرہ پہنے کھڑا ہے۔چہرے سے وقار،تمکنت اور بہادری عیاں ہے۔پہلو میں بیرم خاں جس کو بجاطور پر اس خاندان کا بسمارک کہنا چاہئے استادہ ہے۔قلعہ کے دروازے سے شہنشاہ کے سوار قیمتی زرہ بکتر سے سجے سجائے اور پیادے تلواریں علم کیۓ جوش وخروش کے ساتھ اندر گھسے جاتے ہیں۔

طوالت کے خوف سے بس ہم ایک اور تصویر کا ذکر کر کے اس کتاب کا بیان ختم کرتے ہیں۔یہ چتوڑ کا معرکہ ہے۔جب اکبر ابھی نوجوان تھا۔شہر میں ایک ہلڑ مچی ہے۔شہنشاہ ایسے نازک موقع پر بندوق اٹھاتا ہے اور راجہ جے مل کو نشانہ موت بناتا ہے۔یہ وہی بہادر راجہ ہے جس

کی موت آج بھی قصر دہلی کے ایک دروازے پر ہاتھی پر دکھائی دیتی ہے۔ یہ مورت لارڈ کرزن (ویسرائے ہند) نے پینٹر میکنزی کی مدد سے تیار کرائی تھی۔ راجپوت عورتیں جنھیں خاص رسم کے تحت آگ کے لپکتے شعلوں سے ہم آغوش ہونا ہے راجہ کی موت پر آخری مرتبہ آنسو بہا رہی ہیں۔ شہر کے باہر شہنشاہ کا توپ خانہ فصیل منہدم کردینے کی فکر میں ہے، فوج ہے کہ گھٹا ٹوپ بادل کی طرح امنڈی چلی آرہی ہے۔

نہ اب چتوڑ کی راجدھانی رہی اور نہ مغلیہ شہنشاہی۔ سچ ہے سب زوال پذیر ہیں۔ کوئی آگے کوئی پیچھے۔ ع:

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

لیکن ایسی تصویروں کے دیکھنے سے مٹے ہوئے نقش پھر اُبھر آتے ہیں اور دیکھنے والے کی نظروں کے آگے سنیما کی تصویروں کی طرح پچھلے حالات تیزی کے ساتھ گردش کرتے ہیں اور وہ تھوڑی دیر کے لیے ان میں محو ہو کر کچھ کھویا سا ہو جاتا ہے۔

اس کتاب کے اختتام پر شاہجہاں کی تحریر بھی ہے جو اس نے خود اپنے قلم سے لکھی تھی۔ وہ تصدیق کرتا ہے کہ یہ تاریخ اکبر کے زمانہ میں لکھی گئی۔ اس پر کئی مہریں ثبت ہیں جن کے ذریعے سے مولوی عبدالمقتدر صاحب نے پتہ چلایا کہ یہ اُن نونایاب کتابوں میں سے ہے جو اکبر کو بیحد پسند تھیں۔ جہاں شاہجہاں کی تحریر ہے اسی جگہ ایک گوشہ میں فرانسس گلاڈون کا بھی نام لکھا ہے جو وارن ہیسٹنگس کے زمانے کا مشہور مورخ تھا۔ ایک جگہ کسی نے اس کتاب کی قیمت آٹھ ہزار روپیہ بتائی ہے۔ لیکن آج آٹھ ہزار پونڈ بھی اس کی قیمت کو نہیں پہنچ سکتے۔ حالانکہ یہ تصویریں معیار کے لحاظ سے راجہ منوہر سنگھ کی ''جہانگیر اور شاہجہان کی جدائی'' یا اور اسی قسم کے شاہکاروں کی برابری نہیں کرسکتیں لیکن صناعی۔ کاریگری۔ اور دولت کے لحاظ سے عجوبہ روزگار ہیں۔

(۲) پادشاہ نامہ:

یہ تاریخ شاہجہاں کے حالات پر مبنی ہے۔ اس کے دیکھنے سے مصوروں کی انتھک

کوششوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ مغلوں کے خون میں جو تدریجی تغیر ہوا اس کی ایک جھلک ان تصاویر سے نمایاں ہے۔ جہانگیر اور شاہجہاں کی رونق بابر و ہمایوں سے بالکل علیحدہ ہے۔ ہندوستانی شادیوں اور گرم وخشک آب وہوا نے ان میں خاصی تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ بابر کے خدوخال میں ہر شخص ذرا سے غور کے بعد اس کا عزم بالجزم پڑھ سکتا ہے۔ دریاؤں کو عبور کرنے اور پہاڑوں پر چڑھنے میں اسے کسی قسم کا تکلف نہ تھا۔ برعکس اسکے جہانگیر اور شاہجہاں کے بشرے سے دولت و ثروت کی بوندیں ٹپکتی ہیں اور لہو ولعب کے آثار جھلکتے ہیں۔ آخری تصویر میں شاہجہان کا جنازہ ''تاج محل'' کی طرف لے جا رہے ہیں جہاں اب وہ اپنی رفیقۂ حیات ممتاز محل کے پہلو میں ہمیشہ کی نیند سو رہا ہے۔

(۳) شہنشاہ نامہ:

یہ ترکوں کی تاریخ جس کا مصنف ''حسینی'' ہے، سولھویں صدی کے اواخر میں لکھی گئی۔ یہ نسخہ سلطان محمد سوم کے نام نامی سے معنون کیا گیا ہے۔ شاہی کتب خانہ کی زینت رہا۔ اس لیے اس پر شہزادگان والا تبار کی متعدد مہریں اور کئی دستخط ہیں۔ سب میں نایاب دستخط ممتاز محل کی لاڈلی بیٹی اور شاہجہاں کے آخری وقت کی شریک جہاں آرا کے ہیں۔ یہ وہی وفادار شہزادی ہے جس نے شاہجہاں کی قید میں خدمت کی اور جس کے زانو پر حرماں نصیب شہنشاہ کا دم ٹوٹا۔ دہلی میں نظام الدین اولیا کی درگاہ میں اب اس کا مزار زبان حال سے کہہ رہا ہے:

حسرت برس رہی ہے یہ کس کا مزار ہے شاید کہ دفن اس میں دلِ داغدار ہے

شہزادی جہاں آرا ایک اچھی شاعرہ اور ایک زبردست انشا پرداز تھی۔ اس کی فارسی کتاب ''مونس الادواح''، جس میں خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات لکھے ہیں کافی مشہور ہے۔

شہنشاہ نامہ کا کوئی اور نسخہ کہیں بھی نہیں پایا جاتا ہے۔ اس لیے یہ کتاب پٹنہ لائبریری کا گوہر نایاب ہے۔ اس کی تصویریں ہندوستانی یا ایرانی آرٹ سے بالکل علیحدہ ہیں۔ بعض تصاویر کا تاریخ عالم سے لگاؤ ہے ایک میں سلطان محمد دوم کی قسطنطنیہ پر چڑھائی کا منظر ہے۔ سلطان سلیم علم اور خلعت دستور

سلاطین عثمانیہ کے مطابق مصر کے آخری عباسی خلیفہ محمد متوکل باللہ کے ہاتھوں لے رہا ہے۔

(۴) شاہ نامہ:

یہ دنیا کی مشہور ترین رزمیہ نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ اسی کی بدولت فردوسی کو شہرت عام کے دربار میں صف اول میں جگہ ملی اور بقائے دوام کی خلعت فاخرہ عطا ہوئی۔ اس کا پینتیس سال کے بعد مکمل ہونا جبکہ فردوسی کی عمر تقریباً اسی ۸۰ ہو چکی تھی اور سلطان محمود کی بدنیتی کی وجہ سے مصنف کا دل شکستہ مرنا بجائے خود ایک دلچسپ المیہ رومان ہے۔

اس نسخہ میں پورے دس ہزار اشعار ہیں۔ اور یہ تقریباً ۱۵۳۹ء کا لکھا ہوا ہے۔ کابل اور کشمیر کے گورنر علی مردان خاں نے جو امراء ایران میں سے تھا۔ یہ نسخہ شاہجہاں کی بارگاہ میں بطور تحفہ گذرانا تھا۔ اس کی کتابت دیدہ زیب روشنائی سے خوبصورت نستعلیق خط میں ہے ہر صفحہ میں چار کالم ہیں جن کی لکیریں سنہری ہیں۔

۱۹۱۱ء کے دلی دربار میں یہ نسخہ شہنشاہ معظم کے آگے پیش کیا گیا تھا جس پر انہوں نے بخوشی دستخط کئے۔

شاہ نامہ کا ایک اور نسخہ بھی ہے جو شاید اس سے قدیم اور خوبصورت ہے۔ اس کے حواشی پر چینی نقاشی ہے۔ پھولوں پرندوں اور جانوروں کی تصویریں جا بجا زینت دے رہی ہیں۔ اس کے سنہرے عنوان اور نفیس چرمی جلد یقیناً زیادہ دلکش ہیں۔ لیکن یہ تصفیہ کرنا کہ کس نسخہ کی تصویریں ایک دوسرے پر فوقیت رکھتی ہیں، بہت مشکل ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ بے نظیر نمونے ہیں۔ اکثر جگہ ایک ہی منظر دونوں مصوروں نے پیش کئے ہیں۔ درباروں کی شان و شوکت۔ شہنشاہوں کی رونق و تمکنت۔ میدان کارزار کی گرم بازاری اور ہیبت آرٹ کے اعتبار سے جاذب نظر ہیں۔ شکارگاہوں کے سین، معشوقان گلرنگ کی ناز آفرینیاں، بہار کے مناظر، بادلوں کا رنگ بدلنا، سبز پوش درختوں کا بے خودی میں جھومنا، سبزہ کا کسی کی انتظار میں آنکھیں بچھانا، کلیوں کا چٹک چٹک کر انگڑائی لے کے بیدار ہونا، شبنم کا خاروں کی سوکھی زبانیں بچا بچا کے عارض گل تر و تازہ کرنا اسقدر پر کیف ہیں کہ دیکھنے والا مدہوش ہو کر تھوڑی دیر کے لیے اپنے آپ کو دنیائے تصویر کا ایک باشندہ

سمجھنے لگتا ہے۔ بہار یہ مناظر سے نظر اٹھایئے تو خزاں کا پرحسرت سماں دکھائی دیتا ہے لیکن جب دنیا کی سب سے عجیب اور زبردست لڑائی سہراب اور رستم کا مرقع نظر آتا ہے تو کبھی باپ سے اور کبھی بیٹے سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔

(۵) کلیاتِ جامی:

کتب خانہ میں جامی کے کئی دواوین اور متعدد کلیات ہیں۔ لیکن ایک نسخہ خود اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس لیے اس کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے۔

اس کی شہرۂ آفاق مثنوی ''یوسف زلیخا'' مشہور خوشنویس میر علی کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کی کتابت ۱۵۲۳ء میں کی گئی جس کو خانخاناں عبدالرحیم نے شہنشاہ جہانگیر کے حضور میں پیش کیا تھا۔ اس وقت بھی اس کی قیمت ایک ہزار سنہرے سکے تھی۔

اس کے علاوہ ایک اور نسخہ ہے جو گو وقعت و قیمت میں کمتر ہے۔ لیکن شوقین کے لیے ایک خاص دلچسپی رکھتا ہے، یہ نامور خوشنویس میر عماد کا لکھا ہوا ہے۔ جو شاہ عباس بادشاہِ ایران کے زمانے میں شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اس نسخہ کی تکمیل کے سات سال بعد یعنی ۱۶۱۵ء میں وہ قتل کیا گیا۔

اس کی تصویریں نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب ہیں۔ یوسف علیہ السلام کی ایک نوعمری کی تصویر ہے۔ بردہ فروش آپ کو ایک چھوٹی سی کشتی میں رودِ نیل کے پار لے جا رہا ہے۔ دوسری تصویر میں آپ کو وزیر مصر کے آگے پیش کیا گیا ہے۔ یوسف علیہ السلام کا حسن، زلیخا کی فریفتگی، باغاتِ مصر، قصراتِ عالیشان، بازارِ مصر، دریائے نیل، اور اس کی لہلہاتی وادی دنیا کے دلفریب مناظر میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں۔

(۶) دیوان حافظ:

اس میں نہ تو دلکش تصویریں ہیں نہ آرٹ کے شاہکار اور نہ اتنا زیادہ سونا صرف کیا گیا ہے جتنا کہ متذکرہ بالا کتابوں میں۔ پھر خدا معلوم اس کی سادگی میں کون سا جادو ہے کہ ہمایوں نے اپنی جان جوکھوں کے وقت اس کو ساتھ رکھا۔ جہانگیر اپنی عافیت پرستی میں اسے نہ بھولا۔ اور عالمگیر اپنے انتہائی زہد و تقویٰ کے باوجود اسے ''ہاتف غیبی'' سمجھا کیا۔ آج بھی بہت سے خوش

عقیدہ حضرات دیوان حافظ سے فال دیکھتے ہیں۔

حاشیہ پر اکثر شہنشاہوں کے اپنے حسب حال شعر کے مقابلہ میں نوٹ لکھے ہیں اور جن اشعار سے انہوں نے نصیحت حاصل کی یا سبق سیکھا نشان کر دیا ہے۔ایک جگہ جہاں حافظ نے یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کے مظالم کا ذکر کیا ہے، ہمایوں نے ایک نشان تو اس شعر کے مقابل بنایا اور دوسرا اپنے لوحِ دل پر۔ یقیناً اس کے نامہرباں بھائیوں نے اس کی نیکیوں کا جواب بغاوت، سرکشی اور ظلم سے دیا۔

ماہرین خطاطی کی ضرورت نہیں ہر تھوڑا سا شوق رکھنے والا ہمایوں کی خاص طرز کتابت جن میں گول گول حروف نمایاں ہیں پہچان سکتا ہے۔شاہجہاں کے بڑے بڑے حروف اور جہانگیر کے شکستہ لیکن سڈول حروف صاف شناخت ہو سکتے ہیں۔ حالانکہ یہ مسلم ہے کہ یہ دیوان اکبر کے بھی کتب خانہ میں رہ چکا ہے لیکن اس کی کوئی تحریر اس پر نہیں جو اس بات کی صاف دلیل ہے کہ وہ نہ لکھ سکتا تھا اور نہ پڑھ سکتا تھا۔

دیوان حافظ کے کئی اور نسخے ہیں لیکن کوئی بھی اس نادر نسخہ کے مقابلہ میں نہیں پہنچ سکتا۔ایک نسخہ سلطان قطب شاہ (گولکنڈہ) نے حیدرآباد دکن کے مشہور کاتب محمد محسن سے ۱۰۲۳ھ میں لکھوایا تھا۔فہرست نیلے رنگ کی نہایت زرق برق ہے۔عنوان سرخ اور سنہری روشنائی سے بڑی خوبصورتی کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔خیال کیا جاتا ہے کہ فتح گولکنڈہ کے بعد یہ نسخہ اورنگ زیب کے ہاتھ لگا تھا۔ یہاں ''سوانح جہانگیری'' کا بیان یا موقع ہوگا کیونکہ یہ بھی اسی معرکہ میں عالمگیر کے ہاتھ آئی۔کہا جاتا ہے کہ اس کے چار نسخے مختلف ہمعصر بادشاہوں کے پاس روانہ کئے گئے تھے جن میں سے ایک یہ تھا اور باقی تین نامعلوم ہیں۔

(۷) دیوان کامران:

ہمایوں کے بھائی مرزا کامران کی زندگی کے آخری دردناک لمحوں کی یاد تازہ کرنے کے لیے صرف یہی ایک نسخہ ہندوستان میں باقی رہ گیا ہے۔ہمایوں نے کئی مرتبہ اس کی جان بخشی کی، اور بار بار برادرانہ رحم و کرم سے پیش آیا۔آخر تنگ آ کر اُس نے کامران کی آنکھیں نکلوا ڈالیں

۔اس دردناک قصہ کو جوہر اور گلبدن بیگم دونوں نے بیان کیا ہے۔وہ لکھتی ہیں۔

''امراء وقت، حکام زماں، رؤساء شہر اور افسران خیر خواہ، سبھوں نے ہم زباں ہوکر شہنشاہ سے عرض کی:

''محبت برادرانہ اور دنیاوی رسم کو حکومت کے معاملات میں دخیل نہ ہونا چاہئے۔اگر جہاں پناہ کو بھائی کی پاس داری منظور ہے تو سلطنت سے دست بردار ہو جائیں۔اور اگر شاہی منظور ہے تو شفقت برادرانہ کو بالائے طاق رکھیں۔وہ جہاں پناہ کے بھائی نہیں، دشمن ہیں۔سرکشوں کی گردن خم کرنا حکومت کی بہبودی اور سلطنت کے استحکام کے لیے ضروری ہے۔''

ہمایوں نے جواب دیا۔''گو میرا دماغ تمہارے پیش کردہ اصول کو ماننے کے لیے تیار ہے--لیکن کیا کروں کہ دل پر قابو نہیں۔''

امراء کے جبر سے ہمایوں نے سید محمد کو حکم دیا کہ مرزا کامران اندھے کر دیئے جائیں۔سید محمد نے غلام علی سے آنکھیں نکال ڈالنے کے لیے کہا۔غلام علی کامران کے پاس پہنچا اور رسمی تسلی اور دلاسہ کے بعد حرف مطلب زبان پر لایا۔شہزادہ نے یہ خبر سُنکر کہا۔''اندھا کر کے چھوڑ دینے سے تو بہتر ہے کہ تم مجھے قتل ہی کر ڈالو۔'' لیکن غلام علی نے جواب دیا ''ہم حکم شاہی سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔''اس کے بعد غلام علی نے شہزادہ کے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور خیمہ سے باہر لاکر جلتی زمین پر لٹا دیا۔تقریباً پچاس مرتبہ نشتر آنکھوں میں چبھویا گیا۔کامران نے صبر واستقلال سے کام لیا اور اُف تک نہ کی۔لیکن جب جلاد نے لیمو کا رس اور نمک کا پانی اُس کی آنکھوں میں ڈالا تو ضبط نہ ہو سکا وہ چلایا:

''اے خدا! اے میرے خدا! جو کچھ گناہ میں نے کئے تھے اس کی معقول سزا اسی دنیا میں بھگت رہا ہوں! اب دوسری دنیا میں میرے حال زار پر رحم کرنا!''

اندھے شہزادے نے مکہ معظمہ کی راہ لی جہاں وہ چار سال بعد مر گیا۔

اس نسخہ کا کاتب خواجہ محمود اسحاق شہابی ہے جو خوشنویسی میں میر علی کے بعد استاد سمجھا جاتا ہے۔ کامران کی زندگی ہی میں یہ دیوان مکمل ہو چکا تھا۔ اس پر جہانگیر، نور جہاں اور شاہجہاں کی تحریریں اور مہریں ثبت ہیں۔

مرزا کامران علم کا دوست اور ایک اچھا شاعر تھا۔

(۸) سفینۃ الاولیا:

یہ اولیائے کرام کے سوانح ہیں جن کو شاہجہاں کے چہیتے لڑکے دارا شکوہ نے مرتب کیا تھا حالانکہ شہنشاہ کی یہی مرضی تھی کہ اس کے بعد دارا شکوہ ہی تخت و تاج کا مالک ہو لیکن قسمت میں اورنگ زیب کے ہاتھوں قید ہو کر طرح طرح کی ایذا اٹھانی تھی۔ فرانسیسی سیاح موسیو برنیر نے اس واقعہ کو اس قدر موثر اور پُر درد الفاظ میں لکھا ہے کہ دل کانپ اُٹھتا ہے۔ اپنے خط میں وہ لکھتا ہے:

"رعایا کے دلوں میں دہشت پیدا کرنا اور لوگوں کو تعجب میں ڈال رکھنا اورنگ زیب دبدبہ شاہی خیال کرتا تھا۔ اس لیے بدبخت قیدی (دارا شکوہ) کو ہاتھی پر سوار کر دیا۔ اس کے پہلو میں ایک خردسال لڑکا بھی تھا۔ یہ ہاتھی پیگو یا لنکا کے شاہی جانوروں میں سے نہ تھا بلکہ ایک بھدا اور بوڑھا ہاتھی تھا۔ اس پر نہ سنہری عماری تھی اور نہ چتر زریں۔ دارا شکوہ نہ تو خلعت فاخرہ پہنے تھا اور نہ در شہوار کی مالا۔ اس ہیئت کذائی سے یہ سواری جدھر جدھر جاتی لوگ جوق در جوق گھروں سے باہر شوق دید میں نکل آتے لیکن یہ کریہہ اور دردناک منظر دیکھ کر عورتیں اور بچے خصوصاً پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے۔"

اس کے بعد وہ قتل کر دیا گیا۔

"دارا شکوہ کا سر اورنگ زیب کے دربار میں پیش کیا گیا تو شہنشاہ نے حکم دیا کہ چہرہ سے خون صاف کیا جائے۔ پھر اُس نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچ کر کہا:

"اے بدبخت! تاج گنج میں سونے والی کو کیا خبر تھی کہ اس کی دونوں آنکھوں کے

نور ایک جو شہنشاہ کی آغوش عاطفت میں پلا اور دوسرا جو ملکہ کی گود میں کھیل کود کر بڑا ہوا آج یوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں گے؟"

پھر اورنگ زیب نے حکم دیا کہ اس کو دفن کر دیا جائے۔

(۹) کلیات سعدی:

مشہور ہے کہ سعدی علیہ الرحمہ نے چودہ حج پیدل کئے۔ اور بیت المقدس میں غریبوں اور مسافروں کے فائدہ کی غرض سے ایک مدت تک سقائی کی۔ اسی وجہ سے اُن کی سیاحت کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا۔ یہ ہندوستان بھی آئے تھے۔ یہاں ایک قصہ ان کے نام سے منسوب کر دیا گیا کہ وہ کچھ دنوں سومنات کے مندر میں پناہ گزیں رہے۔ انہوں نے ایک رات چھپکر بت کا راز معلوم کر لیا۔ اتفاقاً پجاری کی نظر بھی ان پر پڑ گئی۔ اس خوف سے کہ کہیں راز فاش نہ ہو جائے پجاری نے ان کا پیچھا کیا۔ اور یہ ایسے فرار ہوئے کہ پھر کبھی ہندوستان میں ان کا پتہ نہ چلا۔ نقادوں کے نزدیک یہ قصہ بے بنیاد ہے۔ البتہ بعض نے ان کا ہندوستان آنا تسلیم کیا ہے لیکن کسی نے بھی تفصیلی حالات قلمبند نہیں کئے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ آئے بھی تھے تو انہوں نے بہت مختصر قیام کیا۔

کلیات سعدی کا ایک نسخہ پندرھویں صدی کا لکھا ہوا ہے یہ اس زمانہ کی خطاطی کا بہترین نمونہ ہے نفیس ایرانی کتابت اور رنگ برنگ کی خوشنما گلکاری نہایت دیدہ زیب ہے۔

ایک اور نسخہ جس کے زرنگار کاغذ بوسیدہ ہیں، کلیات سعدی کا قدیم ترین نسخہ خیال کیا جاتا ہے یہ کسی شیرازی خوشنویس کی دستکاری کا نتیجہ ہے۔

ایک جلد انتخابات بوستاں کے نام سے ہے۔ اس کی فہرست ایرانی قالین کی طرح رنگ ریزی، گلکاری اور نقاشی کا دلکش نمونہ ہے۔ عنوانات سنہری نقش ونگار سے جگ مگ جگ مگ کرتے ہیں۔ اس کا کاتب میر عماد ہے۔

یہ شہرۂ آفاق خوشنویس شاہ عباس صفوی (اول) کے زمانے میں زبان زد عام وخاص تھا۔ شاہ عباس کو بیحد خواہش تھی کہ شاہنامہ کا ایک نسخہ میر عماد کے خط میں اس کے کتب خانہ میں

رہے۔اس غرض سے اس نے ستر طومان خوشنویس کے یہاں روانہ کئے۔ایک سال بعد بادشاہ نے سرکاری آدمی روانہ کیا کہ دیکھے کہ کتابت ختم ہوئی ہے یا نہیں۔میر عماد نے ستر بیت جو اس نے شاہ نامہ سے نقل کئے تھے، شاہی آدمی کو یہ کہہ کر دئے کہ جہاں پناہ نے ستر بیت ہی کا معاوضہ روانہ کیا تھا۔شاہ عباس یہ مغرورانہ جواب سن کر طیش میں آیا اور اس کے لکھے ہوئے ستر بیت واپس کر کے طومان طلب کیے۔

میر عماد نے کاغذات لیکر جن پر بیت لکھے ہوئے تھے ستر ٹکڑے کئے اور ایک ایک ٹکڑا اپنے ایک ایک شاگرد کے حوالہ کیا۔جنہوں نے بڑی خوشی سے فوراً ایک ایک طومان نذر کیا۔اس طرح میر عماد نے ستر طومان بادشاہ کے ہاں بھیج دیئے۔اس حرکت سے بادشاہ کو تاب ضبط باقی نہ رہی اور اس نے حکم دیا کہ فوراً میر عماد قتل کر دیا جائے۔منصور نامی ایک غلام نے ۱۰۲۴ھ میں اس بے نظیر خوشنویس کا خاتمہ کر دیا۔

شاہجہاں اس کی کتابت کا بیحد شائق تھا۔جو شخص اس کا لکھا ہوا کوئی نسخہ پیش کرتا شاہجہاں کے دربار سے بہت کچھ انعام واکرام اور جاہ و منصب پاتا۔

میر عماد کے قتل کے بعد عبدالرشید اس کا بھانجا جو کتابت میں شاگرد بھی تھا ہندوستان چلا آیا۔کسی طرح وہ شاہجہاں کے دربار میں حاضر ہوا۔شہنشاہ نے بہت خوشی کے ساتھ معقول معاوضہ پر نوکر رکھ لیا اور دارا شکوہ کو کتابت سکھلانے کے لیے مقرر کیا۔اس کا ۱۰۸۱ھ میں انتقال ہوا۔

وہ نسخہ جس میں گلستاں اور بوستاں دونوں کے انتخابات درج ہیں اپنی تصویروں کے اعتبار سے جاذب نظر ہے۔ایک تصویر میں سعدی کو درویش دکھلایا گیا ہے۔سفید لمبی داڑھی کے ساتھ فقیروں کے لباس میں وہ ایک درخت کے نیچے ناچ رہے ہیں۔ان کے ساتھی جو وضع قطع میں ان ہی کے ہم مشرب دکھائی دیتے ہیں۔حلقہ کیے وجد کے عالم میں ناچنے میں محو ہیں۔تماشائی فرط انبساط سے تالیاں بجا رہے ہیں۔دوسری تصویر میں بوستاں کو واقعیت کے رنگ میں دکھلایا گیا ہے۔ایک ہرا بھرا الہلہاتا ہوا باغ ہے۔ہر شجر عروس نو کی طرح کہ جو زیور کے وزن سے خمیدہ ہو گئی ہو کثرت ثمر سے جھک کر اشتیاق زمین بوسی ظاہر کر رہا ہے۔آسمان پر ہوا کے جھونکے ابر کے

رنگیں ٹکڑوں کو اُڑائے لیے جاتے ہیں۔

(۱۰) سہ دیوان خسرو:

پہلے حصہ کا نام'' تحفۃ الصغر'' ہے۔اس کے دیباچے میں خسرو نے اپنا مذاق شاعری بیان کیا ہے۔وہ لکھتا ہے کہ بچپن ہی سے نظم کہنے کا شوق تھا۔تھوڑے ہی عرصہ میں وہ ایک اچھا شاعر تسلیم کر لیا گیا ہے۔اس کا شہرہ سن کر ایک مرتبہ خواجہ عزیزالدین نے بلا بھیجا۔چار لفظ خربزہ۔تیر۔بیضہ۔موی دیئے اور کہا کہ ان کو چار برجستہ مصرعوں میں موزوں کرے۔ظاہر ہے کہ ان کا ایک دوسرے سے کچھ تعلق نہیں لیکن خسرو نے وہیں یہ قطعہ عرض کیا:

ہر موی کہ در دوزلف آں صنم است صد بیضہ عنبریں برآں موی صنم است

چوں تیر مداں راست دلش راز یرک چوں خربزہ دندانش درون شکم است

خواجہ بیحد خوش ہوا اور'' سلطانی'' کا خطاب دیا۔اس کے بعد خسرو لکھتا ہے کہ اس کے بھائی تاج الدین زاہد نے بڑی تلاش وتجسس سے اس کا سولہ اور انیس سال کا درمیانی کلام جمع کیا۔

'' تحفۃ الصغر'' میں قصیدے۔غزلیات۔رباعیات۔قطعات اور مثنویاں ہیں۔ رباعیات کی تعداد تقریباً (۱۱۰) ہے۔

دوسرا حصہ'' غرۃ الکمال'' ہے۔اس کے شروع میں ایک بسیط دیباچہ ہے۔جس میں خسرو نے علم کے فوائد اور اس کی ضرورت پر بحث کی ہے اور قرآن پاک کی متعدد آیتوں سے ثابت کیا ہے کہ'' علم ہی سے انسان انسان ہے۔'' اس کے بعد خسرو نے فارسی شاعری کو عربی پر ترجیح دی ہے اور بطور نمونہ ثانی،خاقانی،راضی،کمال،نظامی،سعدی وغیرہ کے دلپسند اشعار پیش کئے ہیں۔آخر میں کچھ اپنی زندگی کے حالات دیکر خسرو نے دیباچہ ختم کیا ہے۔

''غرۃ الکمال''میں قصیدے۔قطعیات۔ترجیع بند۔مثنویاں۔غزلیات اور رباعیاں ہیں۔

تیسرا حصہ'' نہایۃ الکمال'' ہے۔اس کے شروع میں بھی ایک مختصر سا دیباچہ ہے لیکن یہ صرف خدا۔رسول۔اور نظام الدین اولیا کی حمد وثنا و تعریف پر ختم ہوتا ہے۔

تاریخ کتابت درج نہیں۔

(۱۱) دیوان امیر خسرو:

اس نسخہ میں غزلوں کا انتخاب ہے۔ لیکن آخر میں قطعات اور رباعیات بھی شامل کر دی گئی ہیں۔

یہ نسخہ ایک زمانہ میں" سکینہ بانو بیگم" کی ملک تھا۔ چنانچہ اس عبارت سے صاف ظاہر ہے:

"دیوان خسرو از اموال سکینہ بانو بیگم ......الخ"

سکینہ بانو بیگم ہمایوں کی بیٹی اور اکبر کی علاتی بہن تھیں، ان کی شادی شاہ غازی خاں سے کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ شاہجہاں کے مختلف امراء کی مہریں اس پر ثبت ہیں۔ مثلاً عماد خاں۔ عنایت خاں وغیرہ۔

اس کی کتابت ۲۵ رمضان المبارک ۸۷۹ھ کی ہے۔ کاتب کا نام" محمد حسین بن سلطان علی غیاث الدین علی جنابدی ہے۔"

(۱۲) مطلع الانوار:

یہ خسرو کی قابل قدر تصنیف ہے۔ اس نسخہ میں کئی بیش قیمت تصویریں ہیں۔ خصوصا مشہور ایرانی مصور محمود کی تین تصویریں نہایت قدر و قیمت رکھتی ہیں۔ سرایڈورڈ کے اندازہ کے لحاظ سے یہ تصویریں کتبخانہ کی بہترین تصاویر میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ یہ نسخہ ہرات کے بہترین خوشنویس میر علی نے حسب فرمائش سلطان عبدالعزیز شاہ بخارا لکھا تھا۔ خاتمہ کی عبارت ملاحظہ ہو:

"تمت علی ید اضعف الکاتبین و اقل العباد السلطانی میر علی الکاتب السلطان الاعدل الاکرم معز السلطنۃ والدنیا والدین ابو الغازی سلطان عبدالعزیز بہادر خلد اللہ تعالیٰ ملکہ وسلطانہ وافاض علی العالمین برہ واحسانہ فی اواسط شعبان المعظم سنہ سبع واربعین وتسعمائہ بدار الفاخرہ بخارا باہتمام سلطان میرک کتابدار۔"

صفحہ ۱۵۰ پر یہ عبارت درج ہے۔

"تصنیفات خسرو بابت محمد معصوم سوداگر بتاریخ بستم شوال ۱۰۸۸ھ در سرکار نواب فلک جناب نواب امیر الامراء بمعرفت محمد ربیع ابتیاع شدہ داخل جمع شد۔"

(۱۳) دیوان ارسلانؔ:

یہ اپنے آپ کو ارسلان جاذبؔ کے خاندان سے بتلاتا تھا جو محمود غزنوی کا مشہور درباری امیر تھا۔ قاسم نام تھا لیکن اسی مناسبت سے تخلص ارسلانؔ رکھا۔

قاسم طوس میں پیدا ہوا۔ لیکن ماوراالنہر میں پرورش پائی۔ اکبر اعظم کے زمانہ میں ہندوستان آیا۔ اس کے دیوان میں اکثر رباعیات اکبر کی تعریف میں پائی جاتی ہیں۔ ۹۹۵ھجری میں انتقال ہوا۔ جب اکبر لاہور میں مقیم تھا۔ دیوان حمد کے اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

بہر حمد بادشاہ انس و جاں   یہ کہ بسم اللہ آرم برزباں

ایک قصیدہ امام حضرت علی موسیٰ رضا علیہ السلام کی شان میں یوں شروع ہوتا ہے:

ای حریمی کہ ورت قبلہ کہ دل افتاد   حرم کعبہ بمحراب تو مائل افتاد

تین قصیدے اکبر کی تعریف میں ہیں پہلا یوں شروع ہوتا ہے:

چوں برآورد از گریبان افق سر آفتاب   ماہ رویش دید و گفت اللہ اکبر آفتاب

اکبر کی تعریف میں جو مثنوی ہے اس کا پہلا شعر یہ ہے:

ای سریر معدلت را بادشاہ   بادشاہان دردکا بت خاک راہ

غزلیات ردیف وار درج ہیں۔ پہلی غزل کا مطلع ملاحظہ ہو:

ساقی زعکس می شدہ روشن ضمیر ما   جامی بدہ کہ عارف جامست پیر ما

غزلیات کے درمیان ایک چھوٹی سی مثنوی کوہ اجمیر کی ستائش میں یوں شروع ہوتی ہے:

زہی کوہ اجمیر عنبر سرشت   مقام سر مقتدایان چشت

رباعیات کی تعداد کل تیس ہے۔ پہلی رباعی درج ذیل ہے:

جز بادہ لعل آں پری وش مطلب
ایں سرخوشی از بادہ بیغش مطلب
کیفیت لعل او مجواز بادہ ناب
خاصیت آب خضر ز آتش مطلب

یہ کمیاب اور گرانقدر نسخہ ہے۔ کتابت کی تاریخ درج نہیں۔

(۱۴) دیوان رکن الدین صائن:

مولانا رکن الدین ہروی معروف بہ رکن صائن سلطان مبارز الدین محمود المظفر کے جو خاندان مظفریہ کا بانی تھا خاص مصاحب تھے۔ ۷۶۰ ہجری میں سلطان کو اندھا کر کے شہزادوں نے تخت و تاج کے لالچ میں قید رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب شاہ شجاع اور شاہ محمود (فرزندان شاہ مبارز الدین) اپنے والد کو گرفتار کرنے کے ارادہ سے محل شاہی میں داخل ہوئے تو بد بخت بادشاہ کی نگرانی کے لیے وفادار رکن الدین صائن کے کوئی حامی و مددگار نہ تھا۔ صائن نے اپنے آپ کو کوٹھے پر سے گرا دیا اور مردانہ وار شاہ مبارز الدین کی طرف سے لڑتا رہا۔ آخر زخموں سے چور ہو کر بے ہوش ہو گیا۔ شاہ شجاع اس شیوۂ مردانگی سے بیحد خوش ہوا اور نام دریافت کیا۔ مصاحبوں نے عرض کی کہ یہی تو رکن الدین صائن ہے۔ شہزادہ نے صائن سے معافی مانگی اور جاہ و منصب دیکر اپنے دربار میں ملازم رکھا۔

۷۶۴ ہجری میں اس کا انتقال ہوا۔

اس دیوان میں قصیدے۔ قطعات۔ غزلیات اور رباعیات ہیں لیکن ردیف وار ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا۔ اکثر قصیدے غیاث الدین بن رشید الدین وزیر سلطان ابوسعید اور سلطان مبارز الدین کی تعریف میں ہیں۔

صائن کا دیوان کمیاب ہے۔ اس کی کتابت ۸۸۳ ہجری کی ہے۔

(۱۵) ہفت بند کاشی:

پہلا بند یوں شروع ہوتا ہے:

السلام اے سایہ ات خورشید رب العالمین
آسمان عزو تمکین آفتاب دادو دیں
مفتی ہر چار دفتر خواجہ و ہرہشت خلد
داور ہر شش جہت اعظم امیر المومنین

اور نظم یوں ختم ہوتی ہے:

زائرانِ حضرتت رابر در خلد بریں   میر سد آواز طبتم فادخلوھا خالدین

مولینا کمال الدین محسن کاشی آمل میں پیدا ہوئے۔ لیکن آباواجداد کاشان کے رہنے والے تھے۔ اسی رعایت سے تخلص کاشی رکھا۔ انہوں نے عمر بھر میں ایک شعر بھی کسی بادشاہ کی تعریف میں نہیں کہا۔ ہمیشہ حمد، نعت اور مدحت آئمہ میں شعر موزوں کرتے رہے ۱۰۷ھ میں انتقال کیا۔

یہ نسخہ محمد علی اعجاز رقم کا لکھا ہوا ہے۔ سنہ کتابت ۱۲۰۰ ہجری ہے۔ دوسرا نسخہ شاہی کتب خانہ کے لیے ۱۲۵۰ ہجری میں لکھا گیا تھا۔ تیسرا نسخہ خود خدابخش مرحوم کے لیے لکھا گیا۔ کاتب لکھتا ہے:

"الحمدللہ... کہ ایں نسخہ ہفت بند کاشی بتاریخ ہفت جمادی الاول در ۱۳۰۴ ہجری حسب فرمائش ستودہ صفات خان بہادر مولوی خدابخش خانصاحب ابن مولوی محمد بخش صاحب مرحوم بہ ید مسکین رضی الدین غفراللہ... در بلدہ بانکی پورہ صورت اختتام یافت۔"

(۱۶) رباعیات سیف الدین باخرزی:

سعید الدین مظفر جو سیف الدین کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ باخرز کا باشندہ تھا۔ یہ شہر ہرات اور نیشاپور کے درمیان واقع ہے۔ سیف الدین ایک زبردست صوفی خیال کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ کے بادشاہ اور شہنشاہ اس کے یہاں پابرہنہ آتے اور بے حد احترام کرتے تھے۔ اُس کی عمر کا آخری حصہ بخارا میں کٹا، اور وہیں انتقال ہوا۔ مجمع الفصحاء میں ۶۵۸ ہجری اور مجالس العشاق میں ۶۵۰ ہجری درج ہے۔ رباعیات کی تعداد کل ۵۱ ہے۔ آخری رباعی ملاحظہ ہو:

سیفا زجفائی دہر بسیار منال
ہر گز مکن اززمانہ اظہار ملال

کاین دولت دیگراں و ایں محنت تو
چوں نیک نگہ کنی خیالست خیال

رباعیات کا کوئی اور نسخہ کسی کتبخانہ میں نہیں ہے۔

(۱۷) مجالس العشاق:

اس کتاب میں (۷۶) عشاق کا ذکر ہے جو دوسری صدی ہجری سے لیکر مصنف کے وقت تک قابل لحاظ سمجھے گئے۔ یہ سلطان حسین کی تصنیف خیال کی جاتی ہے لیکن بعض نقاد کمال الدین حسن کو مصنف سمجھتے ہیں۔ اس کی تصویریں نہایت دلکش ہیں۔ پھول ایسے معلوم ہیں گویا کہ چمن میں ابھی ابھی کھلے ہیں اور پھل پک کر ٹپکا چاہتے ہیں۔ ایک تصویر میں جنگ کا نقشہ بھی ہے۔ چنگیز خاں تبریز پر حملہ کر رہا ہے۔ نجم الدین اولیا ایک گوشہ میں بارگاہ رب العزت میں دست بدعا ہیں کہ کسی طرح یہ آئی ہوئی بلا ٹل جائے۔ دوسری تصویر میں شیریں اپنی سہیلیوں کے ساتھ تلاش فرہاد میں سرگرداں ہے۔

(۱۸) تاریخ داؤدی:

بہلول سے لیکر داؤد شاہ تک خاندان لودی اور سور کے حالات درج ہیں۔

مصنف کا نام درج نہ ہونے کی وجہ سے اس بارے میں اختلاف ہے۔ لیکن گمان غالب ہے کہ یہ عبداللہ کی تصنیف ہے۔ یہ تاریخ جہانگیر کے زمانہ میں مرتب ہوئی۔ مصنف نے ''طبقات اکبرشاہی'' اور کہیں کہیں ''تاریخ فرشتہ'' سے واقعات اخذ کئے ہیں۔

اس کے سات باب ہیں: بہلول لودی۔ سکندر لودی۔ ابراہیم لودی۔ فرید بن حسن سور المخاطب بہ شیر شاہ۔ اسلام شاہ۔ محمد عادل۔ اور داؤد شاہ۔

مغلوں اور داؤد کی لڑائی پر تاریخ ختم ہوتی ہے جو پندرہ ربیع الثانی ۹۸۳ ہجری کو ہوئی تھی۔ مصنف لکھتا ہے کہ داؤد قید کر دیا گیا اور اس کا سر خان جہاں کے حکم سے اکبر کے یہاں روانہ کیا گیا۔ مصنف نے قتل داؤد کی تاریخ یوں نکالی ہے:

''ملک سلیماں ز داؤد رفت''

(۱۹) بادشاہ نامہ:

اس کے دو نسخے ہیں ۔ایک کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔اب دوسرے کا حال سنئے ۔اس کے شروع میں ایک بسیط دیباچہ ہے۔جس میں مصنف لکھتا ہے کہ وہ کس طرح ایران سے آکر شاہجہاں کے دربار میں منشی مقرر ہوا۔یہ شاہجہاں کے دورِ حکومت کا پانچواں سال تھا۔ شہنشاہ درباری مورخوں کی خدمت گزاری سے کچھ زیادہ خوش نہ تھا اور کسی دوسرے معتبر مورخ کی فکر میں تھا۔ایسے وقت میں مصنف کی رسائی ہوئی اور فوراً ہی وہ درباری مورخ مقرر کرلیا گیا۔یہ شاہجہاں کا آٹھواں سال تھا۔مصنف کو حکم ہوا کہ شہنشاہ کی پیدائش سے لیکر اس وقت تک کا حال قلمبند کرے۔''بادشاہ نامہ'' خود شاہجہاں نے نام رکھا۔

اس حصہ کے خاتمہ کے بعد شاہجہاں نے پھر حکم دیا کہ دوسرے دہ سالہ واقعات مرتب کرے لیکن بعد میں اس کو دوسرا کام تفویض کر دیا گیا۔''عمل صالح'' کا مصنف بیان کرتا ہے:

''میرزا اینا (مصنف کا نام میرزا امین تھا لیکن میرزا آینا مشہور تھا)...سابق خدمت نگارش بادشاہ نامہ بدو متعلق بود و بعد ازاں بخدمت جمع وقائع می پرداخت مردی خوش ظاہر و خوش محاورہ بود۔''

''مقدمہ'' میں شاہجہاں کی پیدائش سے تخت نشینی تک کے واقعات درج ہیں۔اس کے بعد''مقالہ'' شروع ہوتا ہے۔یہ دس سالہ حکومت بیان کر کے ختم ہو جاتا ہے۔آخری سال کی تاریخ مکمل نہیں۔''خاتمہ'' میں مختلف مشاہیر کا مختصر سا تعارف ہے۔جس میں شاعر، اولیا کرام اور علماء شامل ہیں۔

دوسرا حصہ عہد سلطنت کے گیارہویں سال سے وفات تک کے واقعات سے پر ہے۔اس میں حسب ذیل انیس تصاویر قابل دید ہیں۔

(۱) جہانگیر پہلی مرتبہ تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہو رہا ہے۔
(۲) شہزادہ خسرو کی شادی میرزا مظفر حسین صفوی کی لڑکی سے رچی ہے۔
(۳) شہزادہ خرم تلوار سے شیر کا شکار کر رہا ہے۔

(۴) شاہجہاں اورنگ زیب کے لیے ایک ہاتھی تحفۃً بھیج رہا ہے۔
(۵) شہاہجہاں ایک سفید ہاتھی پر سوار ہے۔
(۶) شہزادہ داراشکوہ کی محفل شادی منعقد ہے۔
(۷) شہزادہ اورنگ زیب ایک شریر ہاتھی پر برچھے سے حملہ کر رہا ہے۔
(۸) شاہجہان پہلی مرتبہ تخت طاؤس پر متمکن ہے۔
(۹) تاج محل کا ایک منظر۔
(۱۰) نادر محمود خاں کی بیگمات، لڑکیاں اور دوسری رشتہ دار عورتیں شاہجہاں کی حرم سرا میں ملکہ معظمہ کی مہمان ہیں۔
(۱۱) نادر محمود خاں کا شاہ ایران کے دربار میں باریابی حاصل کرنا۔
(۱۲) اکبرآبادی کی مسجد۔
(۱۳) جامع مسجد (شاہجہاں آباد)
(۱۴) جعفر خاں شاہجہاں کے حضور میں اعلیٰ گھوڑے پیش کر رہا ہے۔
(۱۵) قلعہ دہلی کا ایک دروازہ۔
(۱۶) نقارخانہ۔
(۱۷) دیوان خاص۔
(۱۸) قلعہ دہلی کا ایک منظر
(۱۹) شاہجہاں کا جنازہ تاج محل کو جارہا ہے۔

یہ نسخہ ملک معظم اور ملکہ مخدومہ نے ۱۹۱۱ء کے موقع پر دیکھا تھا اور خوشی سے دستخط بھی کئے۔

(ادبی دنیا۔فروری ۱۹۳۱ء)

☆☆☆

مختار الدین احمد آرزو
علی گڑھ

مشرقی کتب خانہ

بانکی پور پٹنہ

یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ شاہان مغلیہ کو علم وادب کی سرپرستی میں بغداد، قاہرہ اور قرطبہ کے حکمرانوں کی سی عظمت وشہرت حاصل نہیں، تاہم یہ واقعہ ہے کہ جب ان کی بربریت کا دور ختم ہوا اور چنگیز خاں کی اولاد حلقہ بگوش اسلام ہوئی تو انھوں نے علماء کی ہمت افزائی میں نمایاں حصہ لیا، نصیر الدین طوسی، قطب الدین شیرازی، سعد الدین تفتازانی اور دوسرے بہت سے علماء اسی مغلیہ دور حکومت میں آسمان علم پر مہر درخشاں ہو کر چمکے اور مغل تاجداروں کی فیاضی سے مالا مال ہوئے، ہندوستان کی مغلیہ سلطنت بھی علم وہنر کی سرپرستی میں ہمیشہ پیش پیش رہی۔ بانی سلطنت ظہیر الدین بابر ترکی اور فارسی میں ید طولی رکھتا تھا۔ اس کے ترکی دیوان کا ایک نایاب نسخہ رامپور کے کتب خانے میں موجود ہے۔ ہمایوں بھی اپنی پریشانیوں کے باوجود علماء کی قدر افزائی میں کوتاہ دست نہ تھا، اکبر نے اگرچہ خود تعلیم نہیں پائی تھی تاہم اگر اس کی علم برداری دیکھنا ہو تو آئین اکبری کے آخری ابواب پڑھو۔ جہانگیر اپنے توزک میں لکھتا ہے کہ اس نے یوسف وزلیخا کا ایک نسخہ بیس ہزار روپیہ میں خریدا تھا۔ صرف اسی ایک واقعے سے تم اس کی علمی قدردانی کا اندازہ کرو۔ کتب خانہ مشرق نیز ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں ایسی متعدد کتابیں موجود ہیں جن پر شاہ جہاں نے چودہ سال کی عمر میں دستخط کیے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عہد طفولیت ہی سے بادۂ علم سے سرشار تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر خود ذی علم تھا اور علماء کو محبوب رکھتا تھا۔ اس کے رقعات میں علمی قدردانی کی متعدد شہادتیں موجود ہیں، غرض شاہان مغلیہ کی نوازش وکرم گستری سے دہلی علم وہنر کا مرکز بن گئی تھی۔ دہلی کے شہنشاہی کتب خانے میں خطاطی ومصوری کے بہترین نمونے تیار کیے گئے اور چونکہ ان دنوں وسط ایشیا اور ایران وعرب میں طوائف الملوکی اور خونریز

لڑائیاں غیر منتہی سلسلہ قائم کیے ہوئے تھیں اس لیے وہاں کے علمی خزانے بھی دہلی منتقل ہو گئے تھے پھر دکن میں قطب شاہی اور عادل شاہی حکومتیں نیست و نابود ہوئیں تو وہاں کے کتب خانے بھی دہلی کے شہنشاہی کتب خانہ سے ملحق ہو گئے۔ امراء وا ہالیان منصب کے کتب خانے بھی اکثر ضبط ہو کر شہنشاہی کتب خانے سے ضم ہو جاتے تھے۔ چنانچہ دربار اکبری کے ملک الشعراء فیضی نے وفات پائی تو ان کی ۴۳۰۰ کتابیں شہنشاہی کتب خانے میں منتقل ہو گئیں۔ خلاصہ یہ کہ دہلی کا شہنشاہی کتب خانہ اپنی عظمت و ندرت کے لحاظ سے عدیم النظیر تھا، اٹھارہویں صدی میں نوابان اودھ نے بھی قدر دانی کا ہاتھ بڑھایا اور لکھنؤ کے کتب خانے کو اچھی خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ ریزیڈنٹ کے ایما سے مشہور جرمن مستشرق مسٹر اشپرنگر نے اس کتب خانے کے اردو اور فارسی مخطوطات کی ایک ضخیم فہرست مرتب کی تھی، ان دونوں کتب خانوں کے علاوہ اطراف و اکناف ملک میں اور بھی بہت سے کتب خانے موجود تھے مگر لکھنؤ اور دہلی کی تباہی اور ۱۸۵۷ء کی ہنگامہ آرائیوں میں مسلمانوں کے تمام قابل ذکر علمی خزانے تباہ و برباد ہو گئے۔

۵۷ء کے موقعے پر نواب رامپور نے انگریزوں کا ساتھ دیا اس لیے لوٹ کا ایک معتد بہ حصہ انھیں دستیاب ہوا۔ انھوں نے انگریزی فوج میں اعلان کر دیا تھا کہ جو سپاہی کتابیں لا کر دے گا اسے ہر قلمی نسخے کے معاوضے میں ایک روپیہ ملے گا۔

بہر کیف یہ تو سلف کی باتیں تھیں لیکن خلف میں بھی کچھ لوگ ایسے ہوئے ہیں جن سے سلف کی یاد تازہ تھی۔

بہار کے ایک شہر چھپرہ میں ایک وکیل محمد بخش تھے جنھیں قلمی کتابیں جمع کرنے کا بے حد شوق تھا اور اس شوق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مرتے وقت حالت نزع میں بھی کتابیں ہی ان کے پیش نظر رہیں۔ اپنے لائق فرزند خدا بخش خاں مرحوم کو وصیت کی کہ اگر زمانہ موقع دے تو خاندانی کتب خانہ کو ترقی دے کر رفاہ عام کے لیے وقف کر دیا جائے۔

خدا بخش مرحوم ۲ راگست ۱۸۴۲ء کو چھپرہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۴ء میں پٹنہ ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ ۱۸۵۹ء میں کلکتے تعلیم کے لیے روانہ ہوئے اور ۱۸۶۱ء میں کلکتہ

یونیورسٹی سے میٹرک کا سرٹیفکٹ حاصل کیا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد ڈسٹرکٹ جج کے پیشکار ہوئے، لیکن کسی مجبوری سے اسے چھوڑنا پڑا۔ اس کے بعد ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول ہوئے لیکن آخر اس سے بھی الگ ہونا پڑا۔ آخر کار ۱۸۶۸ء میں وکالت شروع کی اور اس میں بڑی کامیابی حاصل کی۔ ۱۸۷۷ء میں گورنمنٹ کی طرف سے ایک اعزازی صداقت نامہ ملا۔ ۱۸۹۱ء میں مشرقی کتب خانے کی بنیاد ڈالی اور ۲۹ر اکتوبر کو پورا کتب خانہ مع زمین و عمارت ایک وقف نامے کی رُو سے حکومت وقت کی سرپرستی میں قوم وملک کے حوالے کر دیا گیا۔ ۱۸۹۵ء میں نظام حیدرآباد کے وہاں چیف جسٹس مقرر ہوئے اور تین برس کی مدت ختم ہو جانے کے بعد ۱۸۹۸ء میں حیدرآباد سے پٹنے آکر پھر وکالت شروع کر دی۔ ۱۹۰۳ء میں سی، آئی، ای کا معزز خطاب ملا اور مبلغ دوسو روپیہ ماہانہ مشاہرے پر کتب خانے کی نظامت تفویض ہوئی۔ لیکن افسوس کہ کتب خانے میں ناظم کی حیثیت سے ابھی پانچ ہی سال رہے تھے کہ ۳ر اگست ۱۹۰۸ء کی ایک بجے شب کو ۶۶ برس کی عمر میں پٹنے میں انتقال کر گئے۔ لائبریری کی دونوں عمارتوں کے درمیان جو تھوڑی سی جگہ تھی حسب وصیت وہیں دفن کیے گئے۔

کتابوں کے جمع کرنے میں کہا جاتا ہے کہ خدابخش مرحوم کو فرشتوں سے بڑی مدد ملی، یہ فسانہ صحیح ہو یا غلط لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کتب خانے کو محمد مکی (عرب) سے بڑی مدد ملی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ خدابخش مرحوم نے انھیں پچاس روپیہ ماہانہ پر ملازم رکھا تھا، انھوں نے عرب، شام، مصر اور ایران کی نادر قلمی کتابوں کا کافی ذخیرہ لاکر ڈھیر کر دیا اور خود خدابخش مرحوم نے دوران قیام حیدرآباد میں اپنے کتب خانے کے لیے ایک بڑا ذخیرہ جمع کر لیا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ قدرت بھی خدابخش مرحوم کا ساتھ دے رہی تھی۔ ایک مرتبہ کتب خانہ مشرقی کے ایک سابق جلد ساز نے نقب زنی کر کے کتب خانے کی چند نادر ترین قلمی کتابیں چرائیں اور انھیں لاہور لے جا کر ایک کتب فروش کے حوالے کر دیا۔ مؤخر الذکر نے نادانستگی میں یہ خیال کر کے کہ خدابخش مرحوم سے زیادہ ایسی کتابوں کا قدر دان اور کون ہو سکتا ہے انھیں کے پاس بغرض فروخت پیش کیا۔ اس طرح چور کو سزا ملی اور حق بحقدار رسید کا مفہوم پورا ہوا۔

خدائی انصاف کا دوسرا حیرت انگیز واقعہ سنیے۔ ایک مرتبہ پٹنے کے ڈسٹرکٹ جج مسٹر جے، بی، ایلیٹ نے خدابخش مرحوم سے قصائد کمال الدین اسرائیل اصفہانی کا ایک قلمی نسخہ مستعار لیا۔ صاحب بہادر کو کتاب بہت پسند آئی اور اس کو واپس دینے کے عوض ایک بڑی رقم بطور قیمت دینے لگے۔ خدابخش مرحوم نے نہایت ہی ناگواری کے ساتھ اس تجویز سے انکار کیا مگر کرتے تو کیا کرتے صبر کر کے خاموش ہو رہے۔ مسٹر ایلیٹ مخطوطات کے جمع کرنے کا غیر معمولی ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے ''بوڈلین لائبریری'' کو بہت سی کتابیں دیں، جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہو کر پٹنے سے جانے لگے تو انھوں نے اپنی منتخب کتابوں کو ساتھ لے جانے کے لیے ایک صندوق میں بند کیا اور بقیہ کتابوں کو ایک دوسرے صندوق میں بند کرا کے ہدایت کی کہ انھیں اسی طرح سربمہر نیلام کر دیا جائے۔ مگر نوکروں کی غلطی یا خدا کی قدرت سے ردی کتابوں کا صندوق ایلیٹ صاحب کے ساتھ چلا جاتا ہے اور منتخب کتابوں کا صندوق کوڑیوں کے مول نیلام ہو جاتا ہے، خدابخش مرحوم اسے خریدتے ہیں اور اس میں قصائد کمال الدین کے علاوہ اور بہت سے نادرونایاب جوہر گراں مایہ پاتے ہیں۔ چنانچہ'' مجالس خمسہ'' کا وہ نسخہ جس پر شاہجہاں کے دستخط ہیں اس میں ملتا ہے۔ خوشی سے باچھیں کھل جاتی ہیں اور فوراً ازراہ تشکر سربہ سجود ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف صاحب بہادر جب انگلینڈ پہنچ کر کتابوں کا صندوق کھولتے ہیں فرط غم سے دم بخود رہ جاتے ہیں۔

ایک دن خدابخش مرحوم حیدرآباد ہائی کورٹ سے واپس آ رہے تھے مخطوطات کے تجسس میں ان کی نگاہیں والہانہ انداز کے ساتھ دوکانوں پر ادھر اُدھر پڑ رہی تھیں۔ ایک دوکان پر بوسیدہ قلمی کتابوں کا ایک انبار نظر آیا، فوراً گاڑی رکوا کر اتر پڑے۔ اس کوڑے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور دوکاندار سے قیمت دریافت کی۔ اس نے کہا حضور! اگر کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو کوڑا سمجھ کر اس کو تین روپے میں دے دیتا۔ مگر جب حضور کو اس سے دلچسپی ہو تو اس میں یقیناً کوئی اچھی چیز ہوگی، اب میں بیس روپے قیمت لوں گا۔ پورا انبار خرید کر ساتھ لائے، اس میں نہایت نادرو نایاب کتابیں نکلیں۔ بعد کو صرف ایک کتاب کے لیے نظام حیدرآباد کی طرف سے چار سو روپیہ

پیش کیے گئے مگر انھوں نے دینے سے انکار کردیا۔ اسی طرح ''برٹش میوزیم'' کسی کتاب کی ایک گراں قدر رقم دے رہا تھا لیکن انھوں نے صاف انکار کردیا کہ میں لالچ کا شکار ہو کر اپنے والد کی محنت پر پانی نہیں پھیر سکتا۔

خدا بخش مرحوم کو کتب خانے سے جو انہماک تھا اس کے بیان کے لیے تو ایک دفتر چاہیے لیکن اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وفات سے دو دن پہلے جب کہ مرض نہایت شدت پر تھا اور حواس خمسہ جواب دے رہے تھے۔ انھوں نے صحیح طور پر بتا دیا کہ سنن ابوداؤد کا قلمی نسخہ فلاں الماری کے فلاں خانے فلاں کتاب کے بعد ہے۔

کتابوں کی تعداد محمد بخش مرحوم کے انتقال کے وقت پندرہ سو تھی۔ بارہ سو (۱۲۰۰) محمد بخش کی حاصل کردہ تھیں اور تین سو انھیں وراثت میں ملی تھیں۔ خدا بخش مرحوم نے ترقی دے کر پانچ ہزار تک پہنچا دیا۔ تفصیل حسب ذیل ہے:

نسخ خط عربی (۲۹۵۱)، نسخ خط فارسی (۲۵۰۰) تقریباً، نسخ خط اردو (۵۶)، نسخ ترکی (۱۵)، مجموعہ پانچ ہزار پانچ سو بائیس (۵۵۲۲)۔

۱۸۹۱ء میں جب کہ مخطوطات کی مجموعی تعداد صرف تین ہزار تھی، سرالفریڈ کرافٹ کی ماتحتی میں ایک ماہر مخطوطات نے اس کی قیمت کا تخمینہ ڈھائی لاکھ روپیہ کیا تھا۔ قلمی کتابوں کے علاوہ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی مطبوعات کا ایک معتد بہ ذخیرہ بھی فراہم کیا گیا ہے جس کی قیمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ صرف انگریزی کتابوں کی مجموعی لاگت تقریباً ایک لاکھ روپیہ ہے۔

لیکن یہ اعداد و شمار خدا بخش مرحوم کی وفات کے وقت کی تھی مگر اب اس میں معتد بہ اضافہ ہوا ہے۔ مسٹر صلاح الدین مرحوم کی وصیت کے مطابق ان کی سات ہزار تین سو (۷۳۰۰) کتابیں بھی اس کتب خانے میں منتقل ہوگئی ہیں اور اس طرح عربی، فارسی، اردو اور انگریزی مطبوعات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ سر دست تمام مخطوطات و مطبوعات کی مجموعی تعداد چوبیس ہزار (۲۴۰۰۰) ہے۔

مشرقی کتب خانے (بانکی پور) کی کتابوں کے ساتھ ساتھ اگر دنیا کے دوسرے اہم

کتب خانوں کے اعداد و شمار بھی لکھ دوں تو مناسب ہے۔
کتب خانہ انڈیا آفس (۲۹۸۸) موزیہ برطانیہ لندن (۲۹۶۱) کتب خانہ بوڈلین (۲۰۲۰) کتب خانہ برلن (۱۰۹۸) کتب خانہ پارس (۱۱۶۰) کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد دکن (۳۰۵۲)۔

نقشہ بالا سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ مشرقی کتب خانہ بانکی پور میں ان تمام کتب خانوں سے زیادہ کتابیں ہیں۔ اب میں قارئین کی ضیافت طبع کے لیے چند اہم اور نادر کتابوں کا ذکر کرتا ہوں امید ہے کہ یہ بڑی دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

اس کتب خانے میں عربی کتابوں کا بہت ہی کافی ذخیرہ ہے اور جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں ان کی تعداد تین ہزار سے بھی زائد ہے۔ یہاں قرآن پاک کے کئی نایاب نسخے موجود ہیں۔ ایک حمائل خط کوفی میں لکھا ہوا ہے، اعراب کے لیے سرخ نقطے استعمال کیے گئے ہیں۔ اس کی کتابت چوتھی صدی ہجری کی معلوم ہوتی ہے۔ دوسرا نسخہ یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ خطاطی کا بہترین نمونہ ہے، مکتوبہ ۶۶۸ھ۔ ایک نسخہ میر علی تبریزی کا ہے۔ اس نسخے کی خطاطی، طلاکاری، منقش حواشی اور زرنگار بین السطور کو دیکھ کر ازمنہ ماضیہ کی صنائع پر انسان محو ہو جاتا ہے۔ ایک مصحف عبدالباقی حداد کا مکتوبہ ہے۔ شاہ جہاں نے یاقوت رقم کا خطاب دیا تھا۔

تفسیر میں زمخشری کی کشاف کا ایک نسخہ ہے جو سلطان شاہ رخ کے کتب خانے کے لیے لکھا گیا تھا۔ سیوطی کی اتقان ان کے خاص شاگرد داؤدی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، حدیث میں خطیب بغدادی کی الکفایہ کا وہ قیمتی نسخہ ہے جس میں شاہزادہ ابوالعباس احمد نے درس لیا ہے۔ یہاں کی کتاب ''کتاب المشیخہ'' کا دنیا میں کوئی نسخہ نہیں ہے۔

بہت سی کتابیں ایسی بھی ہیں جنھیں مصنفین نے خود اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ ان میں ''شرح خصوص الحکم''، ''جوامع الکلم'' (متقی) ''مواہب اللدنیہ''، ''مختصر النہایہ''، ''شرح ابن ماجہ''، ''الاربعین'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کتاب فی التصوف، اس کتاب خانے کی قیمتی کتابوں میں سے قدیم کتاب ہے۔

عربی کتابوں کے علاوہ فارسی مخطوطات کا بھی ذخیرہ ہے، چند اہم مخطوطات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

''دیوان مرزا کامران''، یہ شہنشاہ ہمایوں کے بھائی شاہزادہ کامران کا دیوان ہے۔ کامران کو شعر و شاعری میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ فارسی اور ترکی دونوں زبانوں میں کہتا تھا، چنانچہ اس دیوان میں دونوں زبانوں کے اشعار موجود ہیں۔ دیوان میں غزل، قطعہ، رباعی، مثنوی فارسی اور ترکی دونوں زبانوں میں ہے۔ شروع میں الف کی ردیف میں چھ غزلیں ہیں۔ پہلی چار فارسی میں اور دو آخری ترکی میں۔ ابتداء ان اشعار سے ہوتی ہے ؎

چون بمقصود نشد، ہیچ کسے رہبر ما
بعد ازیں خاک در پیر مغاں بر سر ما

کار ما چوں ز در بستہ زاہد نشود
بو کزیں پس ز خرابات کشائد در ما

بارگی مست و شب تیرہ و رہزن بہ کمین
وائے اگر کہادی لطفت نشود رہبر ما

ایک فارسی ہی کا مطلع ہے ؎

غمت را کامراں در دل نہفتہ
کہ باشد گنج را ویرانہ منزل

کتاب کے پہلے صفحہ پر جہانگیر کے ہاتھ کی یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:

''الله اکبر''

''دیوان مرزا کامران کہ عم پدر بزرگوار من است بخط محمود بن اسحٰق شہابی حررہ، نورالدین محمد جہانگیر شاہ ۲۰ جلوس موافق ۱۰۳۴ھ۔

"الحمد لله الذی انزل علی عبده الکتاب. حرره شاه جهان ابن جهانگیر شاه". اس نسخہ کا کاتب خواجہ محمد اسحٰق شہابی ہے جس کا درجہ میر علی کے بعد سمجھا جاتا

ہے۔ یہ کتاب خوبصورت نستعلیق میں لکھی گئی ہے اور سنہرے پانی سے مزین کی گئی ہے۔ یہ دیوان اس کتب خانے کے علاوہ دنیا میں کہیں نہیں۔

اقبال نامۂ جہانگیری، مصنف کا نام محمد شریف، مخاطب بہ معتمد خاں ہے۔ کتاب کے نام سے بظاہر مترشح ہوتا ہے کہ مصنف نے اس میں صرف جہانگیر کے ایام سلطنت کا تذکرہ کیا ہوگا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں اکبر و جہانگیر دونوں کی حالت بسط کے ساتھ موجود ہے۔

اقبال نامے کی تینوں جلدوں میں سے جلد سوئم جس کا تعلق جہانگیر کے ایام حکومت سے ہے عام طور پر ملتی ہے، ہندوستان اور یورپ کے کتب خانوں میں اس کے متعدد قلمی نسخے موجود ہیں۔ لیکن اقبال نامے کی پہلی اور دوسری جلد بے حد نادر اور کمیاب ہے، ریو نے پہلی جلد اقبال نامہ کو بہت کمیاب لکھا ہے۔ پروفیسر بنی پرشاد نے بھی اپنی کتاب HISTORY OF JAHANGEER میں پہلی دو جلدوں کی کمیابی کی تصریح کی ہے۔ خان بہادر مولوی عبدالمقتدر کیٹلاگر مشرقی کتب خانہ پٹنہ نے بھی لکھا ہے کہ اس کی پہلی دو جلدیں کمیاب ہیں۔

بوڈلین، کیمبرج اور ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانوں میں صرف جلد سوئم کے قلمی نسخے موجود ہیں لیکن مشرقی کتب خانہ پٹنہ میں اقبال نامے کا مکمل نسخہ موجود ہے جس کا نمبر ۱۰۹ ہے۔

اقبال نامۂ جلد اول و دوم کے کئی نسخے دنیا میں اور بھی ہیں لیکن مشرقی کتب خانے کے نسخے کو اس بنا پر فضیلت حاصل ہے کہ وہ تقریباً سبھوں میں سب سے زیادہ صحیح لکھا ہوا ہے۔

اقبال نامۂ جہانگیری کے سال کتابت کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے، اس لیے کہ بعض مخطوطے ایسے ہیں جن پر سرے سے سنہ کتابت ہی درج نہیں، جس پر درج بھی وہ اس قدر مبہم ہے کہ یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔

''انڈیا آفس'' میں بھی جلد اول و دوم کے مکمل نسخے پر سنہ ہجری یا عیسوی درج نہیں بلکہ دس ربیع الاول ۱۹ سال جلوس رقم ہے۔ اس سے ''ایتھے'' نے یہ استنباط کیا ہے کہ یہ غالباً جلوس عالمگیری ہوگا، اس حساب سے سنہ کتابت ۱۰۸۷ھ قرار پاتا ہے مگر ہے یہ کہ سنہ جلوس محمد شاہ یا شاہ عالمگیر ثانی کا ہوگا جنھوں نے ۱۹ سال سے زیادہ حکمرانی کی تھی۔ اس بنا پر ۱۰۸۷ھ یقینی طور پر سنہ

کتابت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ انڈیا آفس کی جلد دوئم پر بھی کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔
مشرقی کتب خانہ بانکی پور کے مکمل نسخے پر بھی سنہ کتابت درج نہیں۔ اس کتب خانے میں جلد اول کا بھی ایک مکمل نسخہ ہے لیکن افسوس کہ سال کتابت اس پر بھی درج نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ علی گڑھ لائبریری میں اقبال نامے کے بعض نسخے ہیں جن پر سال کتابت ۱۱۰۳ھ مطابق ۳۵ جلوس عالمگیری لکھا ہے۔

''کلیات جامیؒ'' مشرقی کتب خانے میں کلیات جامی کا جو نسخہ ہے اسے یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس کی پہلی جلد خود مؤلف (جامی) کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی ہے، اس کی دوسری جلد سینٹ پیٹرس برگ کے کتب خانے میں تھی۔ معلوم نہیں جنگ عظیم کے بعد اس کا کیا حشر ہوا۔
کلیات کے علاوہ جامی رحمۃ اللہ علیہ کا دیوان بھی اکثر کتب خانوں میں پایا جاتا ہے۔ دیوان جامی کا ایک نادر قلمی نسخہ لافیٹ کالج پنسلونیا (امریکہ) کے کتب خانے میں بھی محفوظ ہے۔ یہ جامی کی چھوٹی چھوٹی نظموں کا مجموعہ ہے۔ جامی کی ولادت جام (خراسان) میں ۷ر نومبر ۱۴۱۴ء کو اور وفات ہرات کے مقام میں ۹ر نومبر ۱۴۹۲ء کو ہوئی تھی۔ یہ نسخہ وفات کے صرف بتیس سال بعد لکھا گیا اور اسے اس زمانے کے دو مشہور ماہر فن نے تیار کیا یعنی مشہدی خوشنویس اور محمود مذہّب طلاکار۔

اس دیوان میں قصیدے، غزلیں اور رباعیاں ہیں۔ صفحات کی تعداد ۱۵۳ ہے، چار تصویریں بھی ہیں۔ پہلی تصویر میں جامی ایک فلسفی سے باتیں کر رہے ہیں، زاویے میں مصور کے دستخط اور یہ عبارت ہے: ''اسے محمود مذہّب نے بنایا''۔ دوسری تصویر میں ملازمین باغ میں ایک دعوت کا سامان کر رہے ہیں اور ایک فقیر بچے کو لئے ہوئے ان کو دیکھ رہا ہے۔ تیسری تصویر میں ایران کا سلطان ''حسین بالقیرا'' اپنے درباریوں اور بعض علماء کے حلقے میں بیٹھا ہوا ہے۔ چوتھی تصویر میں ایک استاد اپنے شاگردوں کے ساتھ باغ میں بیٹھا ہوا ہے۔ کتاب کے آخر میں تحریر ہے: ''اس مخطوطہ کو سلطان علی مشہدی نے بمقام ہرات ۹۱۰ھ مطابق ۱۵۱۵ء میں ختم کیا''۔
یہ مخطوطہ اول بابر کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ اس کی وفات کے بعد کے اس کے

جانشینوں کے شاہی کتب خانے میں رہا۔ اس پر جہانگیر، شاہ جہاں، اورنگ زیب کے دستخط ثبت ہیں۔ پھر ایک عطیہ شاہی کی حیثیت سے بعض صوبوں کے حکمرانوں کے پاس رہا اور ان میں سے ایک کے کتب خانے میں ۱۸۵۷ء تک محفوظ رہا۔ اس وقت دوسرے سامانوں کے ساتھ یہ بھی ضبط کرلیا گیا، اور جیمس اسکاٹ (JAMES LONG SCOTT) نام کی ایک امریکن مشنری نے اس کو نیلام میں خرید لیا اور لافیٹ کالج میں یہ نسخہ اسی کا عطیہ ہے۔

''یوسف وزلیخا'' جامی کی اس مشہور تصنیف کا ایک نسخہ ۹۳۰ھ کا میر علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس کی تیاری میں بیس ہزار روپے صرف ہوئے ہیں۔ خان خاناں عبدالرحیم نے اس کو جہانگیر کے سامنے بطور نذر پیش کیا تھا۔ اس وقت بھی اس کی قیمت ایک ہزار سنہرے سکّے تھے۔

اس کتاب کا دوسرا نسخہ مورخہ ۱۰۱۸ھ مشہور و معروف خطاط میر عماد کے ہاتھ کا لکھا ہوا جو شاہ عباس بادشاہ ایران کے زمانے میں خاصہ مشہور ہو چکا ہے۔ اس نسخے کی تکمیل کے سات سال بعد وہ ۱۶۱۵ء میں قتل کردیا گیا۔ اس نسخے کی اعلیٰ خطاطی مصوری اور مطلا اور مذہب نقاشی دیکھ کر عقل انسانی متحیر ہو جاتی ہے۔

''تاریخ خاندان تیموریہ'' مصنف کا نام صحیح طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ کتاب اکبر اعظم کے زمانے میں تصنیف ہوئی۔ اس میں تیمور سے لے کر اکبر اعظم کی حکومت کے بائیسویں سال تک کے واقعات مندرج ہیں۔ تاریخی حیثیت سے تو شاید نہیں لیکن آرٹ کے لحاظ سے اس کتاب کا پلّہ بہت بلند ہے۔ پوری کتاب میں ۱۳۲ تصویریں ہیں اور ہر تصویر میں مصور نے اپنا نام بھی لکھ دیا ہے، جس میں تیرہ تو آگرہ کے دربار کے مصورین ہیں اور بقیہ دوسرے۔ ان تصویروں میں بساون اور مسکین کی تصویریں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ابتدائے کتاب میں شاہ جہاں کے ہاتھ کی ایک تحریر اور مہریں بھی ہیں۔ اسی کے ایک گوشے میں ''وارن ہسٹنگس'' کے زمانے کے مشہور فرانسیسی مؤرخ گلیڈوین کے دستخط ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے قبضے میں بھی یہ کتاب رہی ہے۔ اسی صفحے پر ایک اور مختصر سی تحریر ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ اس کتاب کی تیاری میں آٹھ ہزار روپے صرف ہوئے تھے۔

''شہنشاہ نامہ'' اس کا مصنف حسینی ہے، یہ ترکوں کی تاریخ سولھویں صدی میں لکھی گئی۔ یہ سلطان محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ کی منظوم تاریخ ہے، یہ نسخہ سلطان محمد ثالث کے لیے مصنف نے خود مرتب کیا ہے، سلطان کے نام سے معنون کیا اور شاہی کتب خانے میں داخل کیا۔ کچھ مدت تک قسطنطنیہ کے شاہی کتب خانے میں رہنے کے بعد شاہ جہاں کے عہد حکومت میں ہندوستان پہنچا، اور دہلی کے شہنشاہی کتب خانے میں داخل کیا گیا اس کا پہلا صفحہ دستخطوں، مہروں سے بھرا پڑا ہے، سب میں نایاب دستخط ممتاز محل کی لاڈلی بیٹی جہاں آرا کے ہیں۔ اس نسخے کی تصویریں ہندوستانی اور ایرانی طرز کی تصویروں سے جداگانہ ہیں۔ ان میں بازنطینی اثر نمایاں ہے۔ شہنشاہ نامہ مشرقی کتب خانے کے علاوہ اور کہیں نہیں پایا جاتا ہے۔

''دیوان حافظ'' اس کتب خانے میں دیوان حافظ کے متعدد نسخے پائے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ مشہور نسخہ ہے جسے ہمایوں جہانگیر اور دوسرے بادشاہوں نے بار ہا فال کھولنے کے لیے استعمال کیا تھا اور جا بجا حاشیے پر حسب حال اشعار کو اپنے ہاتھ سے قلمبند کیا ہے۔ ابتدائے کتاب میں سلطان حسین بایقرا اور دوسرے سلاطین و امراء کے دستخط ہیں۔ دیوان حافظ کے یہاں اور بھی متعدد نسخے موجود ہیں۔ ایک نسخہ مورخہ ۹۵۱ھ ملا میرک کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ دوسرا نسخہ ۱۰۳۳ھ میں سلطان محمد قطب شاہ کے کتب خانے کے لیے محمد محسن خوشنویس نے لکھا تھا، یہ نسخہ فتح گولکنڈہ کے بعد اورنگ زیب کے ہاتھ لگا تھا۔ اس کا تیسرا نسخہ بھی یہاں موجود ہے جو مطلا ہے اور زریں عنوان اور پاکیزہ تصویر سے آراستہ ہے۔

''جہانگیر نامہ'' یہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ جہانگیر نے توزک جہانگیری کے علاوہ ایک کتاب جہانگیر نامہ بھی لکھی تھی۔ اس کے نسخے بہت ہی کمیاب ہیں۔ اس کتب خانے میں اس کا وہ نسخہ ہے جس کو ۱۰۲۰ھ میں خود جہانگیر نے اپنے ایک درباری خطاط سے لکھوا کر قطب شاہی گولکنڈے کے پاس بھیجا تھا۔ گولکنڈے کے مفتوح ہونے کے بعد سلطان محمد کے قبضے میں آیا۔ چنانچہ اس کے اول صفحے پر شہزادہ موصوف کے دستخط بھی ہیں۔ اس نام کی ایک کتاب اور بھی یہاں موجود ہے اس کی ابتداء ان اشعار سے ہوتی ہے۔

اے نام تو سر دفتر اسرار وجود
نقش صنعت پے در و دیوار وجود
در پردہ کبریا نہاں نہاں گشتہ ز خلق
بے خود عیاں بر سر بازار وجود

''کلیات سعدی'' کلیات کے بھی کئی نسخے یہاں موجود ہیں۔ ایک نسخہ پندرہویں صدی کا لکھا ہوا ہے۔ یہ خطاطی کا بہترین نمونہ ہے۔ ایک نسخہ کسی شیرازی خوشنویس نے لکھا ہے۔ یہ کلیات سعدی کا قدیم ترین نسخہ خیال کیا جاتا ہے۔

کلیات سعدی کا ایک نادرالوجود مخطوطہ خود ہمارے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔ کتابت نستعلیق ہے، حروف واضح اور خوشخط ہیں۔ کلیات میں غزل، قطعہ، رباعی سبھی کچھ ہے۔ کتاب کے پہلے صفحہ پر ایک جگہ لکھا ہوا ہے'' دوصدوسی ورق است'' نیچے دو دستخط بھی ہیں، ایک حسین خاں کرامی اور دوسرا عبدالحسین کا، ایک گوشہ میں وارن ہسٹنگس کے عہد کے مشہور فرانسیسی مؤرخ'' گلیڈ وین'' کے دستخط ہیں۔ انگریزی میں ایک دستخط اور ہے جو پڑھا نہیں جاتا۔

اس کتاب پر امجد علی شاہ، نصیرالدین حیدر اور واجد علی شاہ کی مہریں ہیں۔ امجد علی شاہ کی مہر میں یہ شعر پڑھا جاتا ہے ۔

تا نخ ہر مہر شد چوں شد مزین بر کتاب
خاتم امجد علی شاہ زماں عالی جناب

انگریزی دستخط صاف پڑھا نہیں جاتا لیکن ہوسکتا ہے کہ وہ جارج بیلی کا ہو۔

ان کتابوں کے علاوہ شاہنامۂ فردوسی، سر دیوان خسرو، دیوان امیر خسرو، مطلع الانوار، ہفت بند کاشی، بادشاہ نامہ سیرت فیروز شاہی، دیوان رکن صائن، دیوان اثیر ادمانی، تاریخ ابو الخیر فانی، عرفات العاشقین، خلاصۃ الاشعار، دیوان علی نقی کرد، مکاتبات علامی، جواہر العلوم وغیرہ بھی بہت زیادہ قابل ذکر ہیں۔

(آج کل، اکتوبر ۱۹۴۸ء)

سید احسن شیر

خدابخش لائبریری

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کے نادر قلمی نسخوں کے متعلق کچھ کہنے سے قبل مناسب یہ ہے کہ خود لائبریری کی ابتدائی تاریخ اور اس کے بانی خدابخش خاں کے حالات زندگی مختصر طور پر بیان کر دیے جائیں۔ موصوف کے حالات زندگی کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہو گا کہ اس لائبریری کی تعمیر میں انھیں کن کن منزلوں سے گزرنا پڑا تھا۔

خدابخش خاں ۲ راگست ۱۸۴۲ء کو شہر چھپرہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر پائی اور بارہ برس کی عمر یعنی ۱۸۵۴ء میں پٹنہ ہائی اسکول میں تعلیم کے لیے داخل کر دیے گئے۔ یہاں ۱۸۵۹ء تک تعلیم پائی۔ ۱۸۶۱ء میں کلکتہ یونی ورسٹی سے انٹرنس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ مالی مشکلات کی وجہ سے تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور منصف کے نائب عہدہ کے لیے درخواست دی، کامیابی نہ ہوئی۔ آخر کار ضلع جج کے پیشکار کا عہدہ سنبھالا۔ زیادہ دنوں اس خدمت پر نہ رہے، جلد ہی انھیں ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس کی خدمت سپرد ہوئی۔ یہاں بھی انھوں نے صرف ایک سال کام کیا، اس کے بعد پیشۂ وکالت کی طرف توجہ کی۔ ان کے والد ایک اچھے وکیل تھے اور شاید اسی وجہ سے اس پیشہ میں انھوں نے اپنے لیے کشش محسوس کی۔ وہ قانون پڑھنے لگے اور کامیاب ہونے کے بعد ۱۸۶۸ء میں پٹنہ کی عدالت میں وکالت شروع کر دی۔ آہستہ آہستہ مقبولیت بڑھی اور وہ پٹنہ کے کامیاب وکیلوں میں شمار کیے جانے لگے۔

خدابخش خاں کے والد محمد بخش مرحوم صرف وکیل ہی نہ تھے بلکہ ادبی ذوق بھی رکھتے تھے۔ اور انھوں نے اپنا کافی سرمایہ قلمی نسخوں کے حصول میں صرف کیا تھا۔ ان کے انتقال کے وقت ان نسخوں کی تعداد چودہ سو (۱۴۰۰) ہوگئی تھی۔

اپنے انتقال کے وقت محمد بخش مرحوم نے ان قلمی کتابوں کو اپنے بیٹے خدابخش خاں کو

سپرد کرتے ہوئے یہ وصیت کی کہ ان کو جب بھی موقع ملے، اس کتب خانہ کو کتب خانۂ عوام بنادیں تاکہ سب لوگ مستفید ہوں۔ بمرورِ زمانہ خدا بخش خاں نے خود بھی ایک بڑی تعداد قلمی نسخوں کی جمع کرلی اور اس طرح ضرورت ہوگئی کہ اس کتب خانہ کے لیے ایک خاص عمارت ہو۔ ۱۸۸۸ء میں یہ عمارت بھی تیار ہوگئی اور اس عمارت میں کل کتابیں سکنی مکان سے منتقل کر دی گئیں۔ ۱۲ راگست ۱۸۹۰ء کو خدا بخش خاں نے اس لائبریری کو حکومت کے انتظام میں دینے کی پیشکش کی۔ موصوف نے یہ بھی وعدہ کیا کہ لائبریری کے مصارف کے لیے وہ پندرہ ہزار روپیہ بذریعہ چندہ فراہم کردیں گے اگر حکومت بھی اتنی ہی رقم دینے پر آمادہ ہو۔ اس سلسلے میں ایک عام جلسہ بھی ۵ راکتوبر ۱۸۹۰ء کو زیرِ صدارت بادشاہ نواب صاحب رئیس پٹنہ منعقد ہوا۔

حکومت بنگال نے ۲۷ راکتوبر ۱۸۹۰ء کو یہ اطلاع کمشنر صاحب پٹنہ کو بھیجی کہ لفٹننٹ گورنر صاحب خان بہادر مولوی خدا بخش خاں کی اس فیاضی اور جذبۂ خدمت کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ انھوں نے قلمی نسخوں کا شاندار ذخیرہ جو علوم شرقیہ سے متعلق ہے اور جس کی مالیت دو لاکھ روپیہ ہے، پٹنہ میں پبلک لائبریری کے لیے پیش کیا ہے اور اسی غرض سے ایک عمارت بھی دی ہے جس کی قیمت پینتیس ہزار روپیہ ہے۔ خط میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ بانی کتب خانہ کی تجویز کو گورنر صاحب محض مالی مشکلات کی وجہ سے ناکام نہ ہونے دیں گے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ کم سے کم تیس ہزار روپے کا ایک وقف اور بارہ سو (۱۲۰۰) روپے کی سالانہ آمدنی اس کتب خانہ کے اخراجات کے لیے ضروری ہے۔ مولوی خدا بخش خاں نے یقین دلایا ہے کہ وہ مقامی چندے سے پندرہ ہزار روپے جمع کریں گے۔ سر اسٹوارٹ بیلی کو کوئی شک نہیں کہ پٹنہ سیٹی کے محب وطن مسلمان امراء اور اس تحریک کے ہمدرد حضرات کے تعاون سے وہ اپنے اس آخری مشن میں بھی کامیاب ہوں گے۔ حکومت یقین دلاتی ہے کہ اگر یہ رقم جمع کرلی گئی تو حکومت بھی چھ سو (۶۰۰) روپے سالانہ دے کر اس کتب خانہ کی مدد کرے گی۔

۱۴ رجنوری ۱۸۹۱ء کو خدا بخش خاں نے ایک وقف نامہ تکمیل کیا جس کے رو سے یہ کتب خانہ گورنمنٹ کے انتظام و نگرانی میں آیا اور عوامی کتب خانہ کی شکل اختیار کرلی۔

لائبریری کی شہرت دور دور تک پہنچی۔ علامہ شبلی نعمانی نے تشریف لاکر لائبریری کا معائنہ کیا۔ موصوف چار روز مقیم رہے اور قلمی نسخوں کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے۔ ۲۴؍فروری ۱۸۹۱ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ان کے تاثرات ''مولوی خدا بخش خاں عظیم آبادی کا کتب خانہ'' کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں۔

۲۶؍جون ۱۸۹۱ کو حکومت نے لائبریری کے نظم ونسق اور بقا کے لیے چھ سو(۶۰۰) روپے سالانہ دینا منظور کیا۔ اسی سال ۳۰؍جولائی کو اس لائبریری کے لیے ایک مجلس انتظامیہ کی تشکیل کی منظوری بھی دی، ارکان انتظامیہ حسب ذیل تھے:

پیٹرن

ہزاونردی لفٹننٹ گورنر آف بنگال

پریسیڈنٹ

مجسٹریٹ اینڈ کلکٹر آف پٹنہ

ممبران اِکس آفیشیو

سینیر محمڈن جوڈیشیل آفیسر، پٹنہ — سینیر محمڈن ایکزیکیوٹو آفیسر، پٹنہ

پرنسپل پٹنہ کالج

اسسٹنٹ انسپکٹر آف محمڈن ایجوکیشن بہار

ممبران عمومی

(۱) سی۔سی۔ اسٹیونس اسکوائر سی۔ اس۔ کمشنر پٹنہ ڈویژن

(۲) ڈبلو کیمبل اسکوائر — (۳) جے۔ ٹوئیڈی اسکوائر

(۴) رائے رادھے کرشنا — (۵) بابو گجادھر پرشاد
(۶) بابو بشیشور سنگھ — (۷) بابو بلدیو پالٹ
(۸) بابو گر پرشاد سین — (۹) مولوی ابوالخیر محمد عبدالسبحان خاں بہادر
(۱۰) قاضی سید رضا حسین خاں بہادر — (۱۱) شمس العلماء مولوی عبدالرؤف
(۱۲) مولوی سید فضل امام خاں بہادر — (۱۳) سید مہدی حسین خاں بادشاہ نواب
(۱۴) نواب سرفراز حسین خاں — (۱۵) نواب احمد علی خاں
(۱۶) مسٹر سید شرف الدین — (۱۷) مولوی خدا بخش خاں بہادر، ممبر، سکریٹری، لائبریرین
(۱۸) حکیم محمد سلیمان، پھلواری
(۱۹) شاہ بدرالدین صاحب، پھلواری

خدابخش خاں کا کتب خانہ یعنی اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، اپنے قلمی مخطوطات کی اہمیت کے لحاظ سے دنیا کے ممتاز ترین کتب خانوں میں سے ایک ہے۔ اس میں ہزاروں قلمی نوادر انسانی جدوجہد کے طفیل دست بردِ زمانہ سے محفوظ ہو کر قدردانانِ علم و فن کی نگاہ و شوق اور التفات کا مرکز ہیں۔

☆☆

(نوادر/احسن شیر)

۱۹۶۱ء

ضیاءالدین اصلاحی
دارالمصنفین، اعظم گڑھ

کتب خانۂ خدابخش پٹنہ

کتب خانۂ خدابخش اپنی بیش بہا قلمی کتابوں، نادر و نایاب مصوّر نسخوں اور متعدد زبانوں کی مطبوعہ کتابوں کا وسیع ذخیرہ ہونے کی وجہ سے دنیا کے اہم کتب خانوں میں شمار کیا جاتا ہے، یہ کتب خانہ خان بہادر مولوی خدابخش مرحوم کی عظیم الشان یادگار ہے، اس کی داغ بیل ان کے والد بزرگوار مولوی محمد بخش مرحوم کے زمانے ہی میں پڑ چکی تھی، وہ ۱۸۱۰ء میں چھپرہ میں پیدا ہوئے یہیں ان کے فرزند مولوی خدابخش خاں مرحوم بھی ۱۸۴۲ء میں پیدا ہوئے، مگر کچھ عرصہ بعد ان کا خاندان بانکی پور پٹنہ میں منتقل ہوگیا، دونوں باپ بیٹے وکالت کے پیشہ سے وابستہ تھے، خدابخش خاں نے پٹنہ ہائی کورٹ میں بھی پریکٹس کی اور ۱۸۸۰ء میں وہ سرکاری وکیل بھی ہوئے۔ ۱۸۹۵ء میں نظام حیدرآباد دکن کی عدالت عالیہ میں تین برس کے لیے میر عدالت (چیف جسٹس) کے منصب پر فائز ہوئے۔ اسی زمانے میں کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد کے نوادر کی ایک مفصل فہرست ''محبوب الالباب فی تعریف الکتب والکتاب'' کے نام سے مرتب کی۔

کتب خانہ کے قیام کی سرگذشت

مولوی محمد بخش مرحوم اور ان کے خلف الرشید مولوی خدابخش خاں کامیاب وکیل ہی نہ تھے بلکہ علم و ادب کے بھی شیدائی تھے، علم و فن سے اشتغال اور کتب بینی سے شغف کی وجہ سے انھیں نادر و نایاب کتابوں اور اہم مخطوطات کی فراہمی سے غیر معمولی دلچسپی تھی، ان کی آمدنی قلمی کتابوں کے حصول میں صرف ہوتی تھی۔ مولوی محمد بخش مرحوم اچھے خوش نویس بھی تھے، نسخ و نستعلیق دونوں خط بہت اچھا تھا، اس لیے بہت سی کتابیں اپنے ہاتھ ہی سے نقل کر لیتے تھے، ۱۸۷۶ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے پاس چودہ سو کتابیں تھیں، جن میں اکثر قلمی تھیں،

انھوں نے یہ کتابیں اپنے لائق فرزند مولوی خدابخش خاں کوسپرد کرتے ہوئے یہ وصیت کی کہ ان کتابوں کو وقف کر کے ایک عام کتب خانہ قائم کردیا جائے۔

مولوی خدابخش خاں اس پر قانع نہیں ہوئے اوراپنے والد کے متروکہ ذخیرہ میں مزید اضافہ وتوسیع کے لیے غیر معمولی جدوجہد شروع کی اور عرب، مصر، فرانس اورلندن سے کتابیں بہم پہنچائیں اور اسی مقصد سے ہندوستان کے مختلف علاقوں اور علمی مرکزوں دہلی، حیدرآباد، جونپور اور لکھنؤ کے متعدد بار سفر کیے۔

شروع میں یہ کتب خانہ مولوی خدابخش کے گھر ہی میں رہا مگر روز بروز کتابوں میں اضافہ کی وجہ سے انھیں اس کے لیے ایک مستقل عمارت تعمیر کرانے کا خیال ہوا اور جب ۱۸۸۸ء میں ایک خوشنما جگہ کتب خانہ کی خوبصورت اور شاندار عمارت بن کر تیار ہوگئی تو کتابیں وہیں منتقل کردیں۔

۱۸۹۰ء تک اس کی حیثیت پرائیوٹ کتب خانے ہی کی رہی، ۱۲/اگست ۱۸۹۰ء کو مولوی خدابخش نے اس لائبریری کو حکومت کے انتظام میں دینے کی پیش کش کی اور اس کا وعدہ بھی کیا کہ وہ اس کے لیے چندہ کر کے ۱۵ ہزار روپے فراہم کریں گے اگر حکومت بھی اتنی ہی رقم دینے پر آمادہ ہو۔

۱۵/اکتوبر ۱۸۹۰ء کو ایک عام جلسہ اسی مکان میں ہوا جس کو مولوی خدابخش خاں نے لائبریری کے لیے تعمیر کیا تھا، جلسہ کی صدارت سید بادشاہ نواب صاحب خلف اکبر نواب سید لطف علی خاں صاحب نے فرمائی اور اس میں شہر کے ڈیڑھ سو امراء، روٴسا اور معززین بھی شریک ہوئے ان سب نے کتب خانے کے سلسلے میں بڑا جوش وخروش ظاہر کیا اور ہر طرح کی تائید وحمایت کا یقین دلایا، ہندو وکلا اور معززین نے بھی پوری دلچسپی لی اور ہمدردی کی۔ بابو گجادھر پرشاد وکیل نے کہا کہ اس کتب خانہ کی بقا کے لیے سب قوموں کو کوشش کرنی چاہیے اور بابو گجادھر پرشاد سین نے فرمایا علوم وفنون کی کتابیں چاہے وہ کسی زبان میں ہوں، کسی خاص قوم یا کسی خاص شخص کے لیے نہیں ہیں، جب کہ یہ ایک ودیعت ہے موجودہ اور آئندہ نسل کے لیے، اس کی حفاظت ہر فرد وبشر

اور قوم وملت پر واجب ولازم ہے۔

شہر کے اکثر دولت مند بطیب خاطر چندہ میں شریک ہوئے، جن کی فیاضی نے گیارہ ہزار روپے جمع کر دیے، اور خان بہادر مولوی سید فضل امام صاحب وائس چیئرمین نے اعلان کیا کہ اپنی کل کتابیں کتب خانہ کو دے دیں گے

بنگال کی حکومت نے ۲۷/اکتوبر ۱۸۹۰ء کو کمشنر صاحب پٹنہ کو مطلع کیا کہ لیفٹننٹ گورنر سر اسٹوارٹ بیلی صاحب خان بہادر مولوی خدا بخش خاں کی فیاضی اور جذبۂ خدمت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کی ہر تجویز کو وہ محض مالی مشکلات کی وجہ سے ناکام نہ ہونے دیں گے۔ مولوی خدا بخش خاں نے یقین دلایا ہے کہ وہ مقامی چندے سے پندرہ ہزار روپے جمع کریں گے، حکومت بھی یقین دلاتی ہے کہ اگر یہ رقم جمع کر لی گئی تو حکومت بھی چھ سو روپے سالانہ دے کر اس کتب خانہ کی مدد کرے گی۔

۱۴/جنوری ۱۸۹۱ء کو خدا بخش نے ایک وقف نامہ تکمیل کیا جس کی رو سے یہ کتب خانہ گورنمنٹ کے انتظام ونگرانی میں آیا، اس طرح یہ ذاتی کتب خانہ عوامی کتب خانہ میں تبدیل ہو گیا، اس وقت اس کی کتابیں تین ہزار تک پہنچ گئی تھیں۔

کتب خانہ کا باقاعدہ افتتاح سر چارلس ایلیٹ لفٹنٹ گورنر بنگال نے اکتوبر ۱۸۹۱ء میں کیا جو عربی کے بڑے فاضل شخص تھے، اس وقت سے وہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔

اس موقع پر کتب خانہ کے بانی مولوی خدا بخش خاں نے ایک رپورٹ پیش کی تھی، جس میں ماضی میں مسلمانوں کی علمی سرگرمیوں کی داستان بیان کر کے اپنے کتب خانہ کے اہم ذخائر کے متعلق معلومات پیش کیے اور اس کے ہمدردوں اور قدردانوں کا شکریہ ادا کیا، اس میں یہ بھی فرمایا کہ:

> ''اس کتب خانہ کے وقف کرنے کا خیال پہلے پہل میں نے کیمبل صاحب سے ظاہر کیا جو قائم مقام کمشنر تھے، صاحب نے نہایت مہربانی سے

ہماری تحریک سماعت فرمائی اور جو اعانت اس باب میں کی ہے اس کا بغایت مشکور ہوں، اسی زمانہ میں ہماری خوش نصیبی سے جناب سر اسٹوارٹ بیلی صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر بھی تشریف لائے، صاحب موصوف نے ایک اچھے موقع سے ہماری تحریک بذات خاص پیش کی۔ جناب لفٹنٹ گورنر بہادر موصوف نے چھ سو روپیہ سالانہ اس کتب خانہ کے لیے اس شرط پر منظور فرمایا کہ پہلے چندہ پندرہ ہزار روپے فراہم کیے جائیں''۔

مولوی خدا بخش خاں کا انتقال ۱۹۰۸ء میں ہوا اور وہ لائبریری کیمپس ہی میں آسودۂ خواب ہیں، ان کے بعد صلاح الدین خدا بخش کو اس کی تولیت سپرد ہوئی مولوی خدا بخش خاں کی زندگی ہی میں کتب خانہ کو بڑی شہرت اور امتیاز حاصل ہو گیا تھا فروری ۱۸۹۱ء کے اپنے مضمون میں علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں:

''مولوی خدا بخش خاں کا کتب خانہ اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے روم و مصر، عرب و ہند کے نامور کتب خانوں کی صف میں جگہ پانے کے قابل ہے''۔

کتب خانہ کی خصوصیات

ذیل میں اس کے بعض خصوصیات ممیزات بیان کیے جاتے ہیں:

(۱) یہ کتب خانہ تنہا ایک شخص کی ذاتی سعی و محنت کا ثمرہ ہے، مولوی خدا بخش خاں مرحوم پٹنہ کے ایک اچھے وکیل ضرور تھے لیکن وہ زیادہ متمول نہیں تھے، تاہم انھوں نے کتب خانہ کی جانب اپنی پوری توجہ مبذول کی اور اپنا سارا سرمایہ اس کی تعمیر و ترقی، کتابوں کی فراہمی اور نوادر کے حصول میں خرچ کر دیا، انھوں نے جس اہتمام اور زر خطیر کے صرف سے کتابیں بہم پہنچائیں، اس کی نظیر سے تمام ہندوستان خالی ہے، قلمی کتابوں کی خریداری میں ان کی غیر معمولی دلچسپی کا حال بیان کرتے ہوئے علامہ شبلیؒ رقم طراز ہیں:

''دہلی اور لکھنؤ میں بعض تاجر نایاب قلمی کتابیں جابجا سے بہم پہنچاتے ہیں اور ان کو نہایت گراں قیمت پر بیچتے ہیں، ہم جب کبھی ان سے ملے اور کمیاب نسخوں کی فرمائش کی تو انھوں نے کہا کہ اس قسم کی کتابیں سب سے پہلے مولوی خدابخش خاں کے پاس جاتی ہیں، کیونکہ ہمارے ملک میں کوئی شخص ان سے زیادہ قیمت نہیں دے سکتا''۔

قلمی کتابوں کی خریداری سے اس درجہ شغف ہی کی بنا پر وہ منھ مانگی ان کی قیمت دیتے تھے اور جو نسخہ ان کے ہاتھ لگ جاتا اسے کسی حال میں بھی کسی کو دینا پسند نہیں کرتے تھے خواہ وہ اس کی قیمت کتنی ہی کیوں نہ دیتا۔

(۲) کتب خانہ کی دوسری مگر سب سے بڑی اور اہم خصوصیت اس کے مخطوطات اور نوادر ہیں جن کی بنا پر وہ نہایت عظیم الشان اور دنیا کے ممتاز کتب خانوں میں خیال کیا جاتا ہے، مصاحف، علوم القرآن، حدیث، رجال، فقہ، اصول فقہ، سیر، تاریخ، طبقات، منثور و منظوم ادبیات، نعت صرف ونحو، معانی و بیان، فلسفہ، طب، نجوم، جراحی، ادویہ، ریاضی اور طبعیات وغیرہ کی جس قدر نادر تصنیفات قدیم وصحیح نسخے، پاکیزہ وخوش خط، مطلا و مذہّب، مصوّر اور دستخطوں اور مہروں سے مزین ذخائر یہاں موجود ومحفوظ ہیں اور کسی جگہ نہیں مل سکے، اسی طرح بعض اعلا درجے کی تصنیفات جو پہلے تو ہندوستان میں بالکل ہی نایاب تھیں اور اب بھی بہت ہی نایاب ہیں، وہ اس کتب خانہ میں پائی جاتی ہیں، یہاں کے بعض نسخے بالکل نایاب ہیں جیسے الملخص لمافی الموطامن الحدیث المسند جو ابوالحسن علی بن محمد بن خلف معافری قروی قالبسی (م ۴۰۳ ھ) کی تلخیص ہے۔ اس کا دوسرا نسخہ کہیں نہیں ملتا، یہ عربی خط نسخ میں لکھا ہوا ہے، سن کتابت ۶۲۸ ھ ہے۔

(۳) کتب خانہ خدابخش کی کتابیں قدامت کے لحاظ سے بھی اہم اور بے نظیر ہیں، گو اکثر کتابیں ساتویں صدی ہجری سے گیارہویں صدی ہجری کی ہیں تاہم متعدد کتابیں اس سے پیشتر کی لکھی ہوئی اور بہت قدیم ہیں، مثلاً ایک قرآن مجید کے نسخہ پر سنہ کتابت درج نہیں ہے،

لیکن یہ کوفی خط میں ہے اور اس کا کاغذ نہایت قدیم ہے، جا بجا حرف بھی اڑ گئے، زیر زبر اور رکوع نہ ہونے اور اس کی ترتیب کے بدلے ہونے کی وجہ سے خیال ہوتا ہے کہ یہ عہد صحابہ کا لکھا ہوا ہے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے نسخہ کی نقل ہے، علامہ شبلیؒ جب ۱۸۹۱ء میں کتب خانے دیکھنے آئے تو انھوں نے خاص طور پر اس نسخہ کو ملاحظہ فرمایا۔

قشیری کا ایک رسالہ ۴۳۷ھ کا لکھا ہوا ہے، مسند ابوداؤد طیالسی کا بہت نایاب ہے جو ساتویں صدی ہجری سے پہلے کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے، یہ مسند گیارہ حصوں میں منقسم ہے، ہر حصہ کے اختتام پر ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے محدثین علماء کے خود نوشتہ، دستخط اور اسناد موجود ہیں جن کے مطالعے میں یہ رہ چکا ہے، الجزء فیہ مجالس من امالی ابی القاسم ومن حدیث ابی محمد الحسن الخلال کا نسخہ ۴۸۷ھ یا اس سے قبل کا لکھا ہوا اور بسلسلۂ درس و تدریس کبار اساتذہ و طلبائے حدیث کے مطالعہ میں رہا ہے، قدامت و نوشتہ جات کی وجہ سے یہ اہم نسخہ ہے جو دبیز کاغذ پر عمدہ خط نسخ میں لکھا ہوا ہے۔

جراحی پر زہراوی کا نسخہ ۵۸۴ھ کا مکتوب ہے، بانی کتب خانہ اس کا ذکر فخر و مسرت سے کرتے تھے، ان کا بیان ہے کہ کتاب میں آلات جراحی کی ہیئت کذائی بھی مندرج ہے اور اکثر ان آلات میں سے وہ ہیں جو اس زمانہ میں بھی استعمال میں آتے ہیں، اس کتاب سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ پانچویں صدی کے مسلمانوں میں یہ آلات اندلس اور بغداد میں مستعمل تھے، اس کے علاوہ متعدد اور کتابیں آٹھ نو سو برس پہلے کی مکتوب ہیں۔

(۴) متعدد کتابیں کسی مشہور کاتب یا خود مصنف یا اس کے لکھے ہوئے یا مصور ہونے کی بنا پر نہایت اہم ہیں بعض اس لیے اہم ہیں کہ ان پر بادشاہوں، امراء اور دوسرے قابل ذکر لوگوں کے دستخط ہیں، یا بعض پر ان کے کتب خانوں کی مہریں ثبت ہیں مثلاً قرآن پاک کا ایک بہت نفیس اور خوبصورت نسخہ مشہور خطاط یاقوت مستعصمی کا لکھا ہوا ہے جو خطاطی کا اعلیٰ نمونہ ہے، اس کا ہر صفحہ مزین ہے، حواشی کے چاروں طرف بہت خوبصورت نیلے اور سنہرے خطوط ہیں، ہر صفحہ کی پہلی درمیانی اور آخری سطر بہت خوبصورت ہے، واضح اور جلی طرز ثلث میں رقم کردہ ہیں

جن کے مطلا گلکار حاشیے ہیں، سورتوں کے عنوان مع تعداد آیات بہت ہی جاذب نظر اور سنہرے خط ریحان میں ہیں، سرورق پر زبادۃ الدولہ مرید خاں کی ایک مہر ہے۔

یاقوت ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا دعائے سیفی کا ایک نسخہ بھی ہے، اس پر کتب خانہ شاہجہانی عالمگیری کی مہریں ہیں، فردوسی کے شاہ نامہ کے متعدد نسخے ہیں جو مطلا و مذہب اور مصور ہیں، ایک دلکش و نایاب نسخہ علی مردان خان نے شاہجہاں بادشاہ کو نذر کیا تھا، اس کی متعدد رنگوں کی طلاکار تصاویر ایرانی نقاشی کے اعلیٰ نمونے ہیں، ہر صفحہ میں چار سنہرے جدول ہیں جن میں نستعلیق اشعار مکتوب ہیں۔

دیوان کامران کا ایک نسخہ بھی بہت نادر ہے جو تاریخی و ادبی حیثیت سے بڑا اہم ہے، اس پر جہانگیر اور شاہجہاں کے نوشتہ اور ان کے درباروں کے بڑے بڑے امراء و عمائد کے دستخط اور مہریں ہیں جو مشہور خطاط اسحاق شہابی کا لکھا ہوا ہے، خط نہایت خوبصورت اور پاکیزہ ہے، حواشی کے خطوط سنہرے ہیں۔

مصور نسخوں میں معرکوں، جنگوں، محاصروں، موسیقی، رقص، شکار اور خوشی و مسرت کی تقریبات کی رنگ برنگ تصویریں دی گئی ہیں مثلاً فردوسی کے مذکورہ بالا شاہنامہ میں کل معرکوں کی طلائی تصویریں ہیں، اسی طرح تاریخ تیموریہ میں بھی تمام معرکوں کی طلائی تصویریں بنی ہیں، جو مختلف مصوروں کے ہاتھ کی ہیں، ہر موقع پر مصور کا نام بھی لکھا ہے، اس نسخہ پر شاہجہاں کے دستخط بھی ہیں، اسے اور شاہنامہ کو مولوی خدابخش خاں نے ساڑھے تین ہزار میں خریدا تھا۔

نباتات طبیہ کے بیان میں دیاس قریدوس کی کتاب کا ترجمہ مامون الرشید کے زمانہ میں ہوا اس کا جو نسخہ کتب خانہ خدابخش میں ہے اس میں مختلف قسم کے درخت اور نباتات کی تصویریں دی ہوئی ہیں، یہ نسخہ تقریباً سات سو برس پہلے دارالشفا جلالی شیراز میں وقف تھا، مسلمانوں نے اس کتاب کو اپنی تحقیقات کا سنگ بنیاد بنایا اور وقتاً فوقتاً اس پر افزائشیں ہوتی رہیں۔

جو کتابیں خود مصنف کی لکھی ہوئی ہیں، ان میں جامی کا دیوان بڑی اہمیت کا حامل ہے، اس کے ساتھ مصنف کی مشہور مثنوی سلسلۃ الذہب بھی شامل ہے، جس کا پہلا دفتر بھی خود انھیں کا لکھا

ہوا ہے، نسخہ کے صفحہ اول الف پر بھی ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی عبارت ہے جس میں اپنے فرزند ضیاء الدین یوسف کی تاریخ پیدائش وغیرہ لکھی ہے، خط نستعلیق ہے جو نہایت پاکیزہ ہے جو کتابیں مصنف کے زمانے کی لکھی ہوئی ہیں یا اس کے استعمال میں رہنے والے نسخہ سے نقل کی گئی ہیں، ان میں علامہ ابن عساکر (متوفی ۵۷۱ھ/ ۱۱۷۶ء) کی تاریخ دمشق کی دو جلدیں ہیں جن میں سے ایک کو مصنف کے بیٹے القاسم کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ایک نسخہ سے محمد بن یوسف البرزلی (متوفی ۶۳۶ھ/ ۱۲۳۹ء) نے نقل کیا تھا، مغربی نسخ میں اس کی کتابت اعلا ہے، دوسرا قلمی نسخہ بھی البرزلی نے ۶۱۵ھ/ ۱۲۱۸ء میں لکھا تھا۔

مسند ابوعوانہ کا جو نسخہ کتب خانہ کی زینت ہے وہ بھی مصنف کے خود نوشتہ نسخہ سے ۶۱۵ھ/ ۱۲۱۸ء میں نقل کیا گیا ہے اس کو بعض محدثین نے پڑھا ہے اور غالباً دوسرے مستند نسخوں سے اس کا مقابلہ بھی کیا ہے۔ اس پر مشہور محدثین کے نوشتے بھی ہیں اور یہ مصر کے کسی مدرسہ کی ملکیت میں رہ چکا ہے، اس پر دو وقف نامے بھی لکھے ہوئے ہیں۔

التنقید والایضاح عبدالرحیم بن حسن بن عبدالرحمٰن عراقی (۸۰۶ھ) کی تصنیف ہے۔ اس کا جو نسخہ کتب خانہ میں ہے، اس پر ان کے بیٹے احمد کی تحریر موجود ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے اصل نسخہ سے اس کا مقابلہ کرایا گیا ہے۔

مشکوۃ الانوار۔ محی الدین ابن العربی (متوفی ۶۳۸ھ/ ۱۲۴۰ھ) کی تصنیف ہے، جو مکہ معظمہ میں ۵۹۹ھ میں لکھی گئی اس کا قلمی نسخہ مصنف کے خود نوشتہ قلمی نسخہ سے ۶۹۱ھ میں نقل کیا گیا ہے۔

القول المسدد حافظ ابن حجرؒ (متوفی ۸۵۲ھ/ ۱۴۴۹ء) کی تصنیف ہے کتب خانہ خدا بخش میں اس کا جو نسخہ ہے اس کی بعض عبارتوں کی تصحیح خود مصنف نے اپنے قلم سے حاشیہ میں کی ہے اور اس کا مقابلہ اپنے ایک دوسرے خود نوشتہ نسخہ سے کیا ہے اس نسخہ کے کاتب محمد خلیل نے ۸۴۸ھ میں اس کا درس شمس الدین سخاوی سے لیا تھا۔

(۵) کتب خانہ خدا بخش کے بعض نسخوں کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ ان سے خود

مصنف یا دوسرے ممتاز علماء نے لوگوں کو درس دیا ہے جیسے ابوبکر احمد بن علی...... بن ثابت خطیب بغدادی (متوفی ۴۶۳ھ/۱۰۷۱ء) کی مشہور کتاب الکفایہ فی معرفتہ اصول الروایہ کا جو قدیم اور گراں قدر نسخہ یہاں موجود ہے، اس سے بہت سے علماء و محدثین نے درس لیا ہے، اور یہ نسخہ سلطان صلاح الدین محمدی کے بیٹے احمد کی ملک میں بھی رہ چکا ہے اور اس پر شاہزادہ کی خودنوشتہ تحریر ہے۔

کتاب معرفتہ انواع الحدیث جو علامہ ابن صلاح (متوفی ۶۴۳ھ) کی تصنیف اور ''مقدمہ ابن صلاح'' کے نام سے مشہور ہے یہ نسخہ ۶۳۷ھ میں ان کی زندگی ہی کا لکھا ہوا ہے، اس میں ان کے نوشتے بھی ہیں اور انھوں نے اس سے لوگوں کو درس بھی دیا تھا۔ مجموعہ فی الاحادیث الامام ابن تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ/۱۳۲۸ء) پر دمشق کے آٹھویں صدی ہجری کے متعدد علماء و محدثین اور رؤسا و امرا کے خودنوشتہ اسناد اور عبارتیں درج ہیں اور وہ دمشق کے دارالعلوم میں اسی نسخہ سے درس لیتے تھے۔

(۶) کتب خانہ خدابخش میں ایسے نسخے بھی پائے جاتے ہیں جو سلاطین و امرا کے لیے لکھے گئے یا ان کے کتب خانوں کی زینت رہے۔

(۷) کتب خانہ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی کتابوں میں برابر اضافہ ہو رہا ہے بلکہ کئی کئی کتب خانے تو اس میں ضم ہو چکے ہیں چنانچہ کتب خانے نے جس روز عوامی کتب خانے کی شکل اختیار کی، اسی روز خان بہادر مولوی سید فضل امام کی تمام کتابیں اس کو حاصل ہو گئی تھیں، کتب خانے کے بانی اپنی رپورٹ میں جو اکتوبر ۱۸۹۱ء میں پڑھی بھی تھی اس کی صراحت کی ہے کہ بعض کتب خانے کلاً یا جزواً اس میں شامل ہو گئے تھے لکھتے ہیں:

> ''اس کتب خانہ میں سرکوروزلی کے کتب خانے کی کتابیں بھی ہیں جو مسٹر جی۔ بی ایلیٹ کے قبضہ میں تھیں، اس کے علاوہ آٹھ مختلف کتب خانوں کی کتابیں جو پٹنہ، لکھنؤ، دلی اور بمبئی میں تھیں، اس کتب خانہ میں داخل کی گئیں، مجھ کو بلاک مین صاحب کے مجموعہ کتب سے بھی انتخاب کرنے کا موقع

ملا جو کلکتہ میں پرنسپل تھے...... یہ کتب خانہ ان قلمی کتابوں کا بہترین مجموعہ ہے
جو اس ملک میں مل سکتی تھیں''۔

اور یہ سلسلہ ابھی موقوف نہیں ہوا ہے، چنانچہ کتب خانۂ الاصلاح دیسنہ کو جو سات آٹھ ہزار علمی کتابوں اور نادر مخطوطات پر مشتمل تھا، جولائی ۱۹۶۰ء میں اس وقت کے گورنر ذاکر حسین خاں نے کتب خانہ خدابخش میں منتقل کرا دیا تاکہ اس کا فیض عام جاری رہے اور وہ ضائع ہونے سے بھی بچ جائے۔ اب یہ خدابخش لائبریری میں دیسنہ لائبریری کلکشن کے نام سے محفوظ ہے۔

کتابوں کی خریداری پر بھی خطیر رقم خرچ کی جاتی ہے۔ اس طرح یہ کتب خانہ ہر لحاظ سے ترقی پذیر ہے......اور دنیا کی مختلف زبانوں کی کتابوں سے معمور ہے۔ اس طرح اس کے ذخائر تین طرح کے ہیں:

(۱) عربی، فارسی اور اردو کی قلمی کتابیں۔

(۲) عربی، فارسی اور اردو کی مطبوعہ کتابیں۔

(۳) انگریزی، ہندی اور ملک و بیرون ملک کی زبانوں کی کتابیں۔

کتب خانہ کے بعض نسخوں پر جن علمائے کبار و محدثین عظام کے دستخط، نوشتے یا اجازات موجود ہیں، ان کے اسمائے گرامی ملاحظہ ہوں:

علمائے اہل سنت میں علامہ ذہبی، حافظ مزی، علامہ ابن سبکی، حافظ ابن حجر، علامہ سیوطی، حافظ سخاوی، ابن فہد ہاشمی، جمال الدین محدث اور علامہ شوکانی وغیرہ۔

علمائے فرقۂ اثنا عشریہ میں ملا باقر داماد، بہاء الدین عاملی، ملا باقر مجلسی، صدر الدین شیرازی، غیاث اور منصور وغیرہ۔

خدابخش لائبریری پٹنہ میں جن مشہور خطاطوں کے لکھے ہوئے نسخے موجود ہیں، ان میں سے بعض اہم کے نام یہ ہیں:

(۱) جمال الدین ابوالدر یاقوت مستعصمی: یاقوت عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کے عہد کا

مشہور خطاط ہے، اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن مجید اس کتب خانہ کا بہت قیمتی اور اہم نسخہ ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

(۲) میر علی تبریزی: یہ تیمور کے ہم عصر اور نستعلیق کے موجد تھے، ان کے ہاتھ کا تحریر کردہ ایک شعری مجموعہ یہاں موجود ہے جو بہت نادر اور اہم ہے، اس پر شاہ جہاں کا دستخط بھی ہے۔

(۳) میر عماد قزوینی: اس نامور خطاط کے لکھے ہوئے نسخے بھی پٹنہ کی اورینٹل پبلک لائبریری میں موجود ہیں۔

(۴) آقا رشید: یہ عماد قزوینی کے بھانجے اور اچھے خطاط تھے، ان کے کتابت کردہ نسخے بھی اس کتب خانے میں موجود ہیں، اپنے ماموں کے انتقال کے بعد ہندوستان آئے۔ دارا شکوہ نے ان سے خطاطی سیکھی تھی۔

(۵) سید علی خاں جواہر رقم: یہ مشہور خطاط ترک وطن کر کے جب ہندوستان میں وارد ہوئے تو اورنگ زیب نے اپنے فرزندوں کو خطاطی سکھانے کے لیے انھیں مامور کیا ان کے لکھے ہوئے نسخے کتب خانہ میں موجود ہیں۔

فہارس کتب

جب کتب خانہ وسیع ہوا تو اس سے استفادے کی سہولت اور آسانی کے لیے اس کے نوادر و مخطوطات کی فہرستیں اردو، انگریزی میں کئی جلدوں میں شائع کی گئیں، انگریزی فہرست خاص طور پر بڑی محنت سے تیار کی گئی اور بہت مفصل ہے۔ اس کی ترتیب کے کام کا آغاز اس طرح ہوا کہ ۱۹۰۱ء میں ڈاکٹر ای ڈینیسن راس، مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسل ہوئے، ان کو اسلامی تاریخ اور عربی و فارسی کی قلمی کتابوں سے بڑا شغف تھا، انھوں نے گورنمنٹ کو کتاب خانے کی جانب متوجہ کیا چنانچہ ۱۹۰۴ء میں لائبریری کی کتابوں کی انگریزی فہرست کا کام شروع ہوا، اور راس صاحب کی نگرانی میں ان کی کئی جلدوں میں ترتیب و اشاعت کا منصوبہ بنایا

گیا، پہلے شمس العلما مولوی کمال الدین کو اس کی نگرانی سپرد کی گئی پھر ڈاکٹر عظیم الدین کو نگراں مقرر کیا گیا، فارسی مخطوطات کی فہرست عموماً مولوی عبدالمقتدر خان بہادر نے مرتب کی ہے اور عربی مخطوطات کی فہرستیں مولوی عبدالحمید صاحب کی ترتیب دی ہوئی ہیں، مولوی صاحب ہی نے تین جلدوں میں اردو میں بھی مخطوطات کی فہرست مفتاح الکنوز الخفیہ کے نام سے تیار کی اور فارسی مخطوطات کی دو جلدیں مرآۃ العلوم کے نام سے مولوی عبدالمقتدر خاں نے اور تیسری جلد جناب سید اطہر شیر اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے مرتب کی۔

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کی فہرست کا ایک ملخص جناب سید حسن شیر معتمد اعزازی خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری نے نوادر کے نام سے اردو میں مرتب کیا ہے جس میں ۳۰۴۰ فارسی و عربی مخطوطات کا ذکر ہے، اردو مخطوطات کی ایک فہرست جناب عابد امام زیدی اسسٹنٹ لائبریرین نے مرتب کی ہے جس میں ۲۴۳ اردو مخطوطات کا ذکر ہے۔

یہ سب فہرستیں چھپ گئی ہیں اور بعض کے دوسرے ایڈیشن بھی چھپے ہیں جن سے علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملتی ہے، دسمبر ۱۹۶۹ء میں پارلیامنٹ نے ایک قانون منظور کیا جس کے بعد یہ کتب خانہ قومی اہمیت کا حامل ادارہ بن گیا ہے اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار لائبریری کے ڈائرکٹر مقرر ہو کر آئے تو انھوں نے کئی مفید اور اصلاحی اقدامات کر کے لائبریری کو ہمہ جہتی ترقی دی۔ ان کی علمی لیاقت انتظامی صلاحیت اور تعمیری سرگرمیوں نے اس میں نئی جان ڈال دی، انھوں نے کتابوں کے ذخیرہ میں بھی اضافہ کیا اور لائبریری کی عمارت کو بھی توسیع و ترقی دی، نئی عمارتیں بنوانے کے علاوہ پرانی عمارتوں کو نئی آب و تاب عطا کی۔

اب یہ لائبریری ایک ایسا علمی مرکز بن گئی ہے جس کی چہل پہل اور علمی سرگرمیاں برابر جاری رہتی ہیں۔

سال میں بڑی تعداد میں علمی و تحقیقی کام کرنے والے اس سے استفادہ کرنے کے لیے آتے ہیں جن میں غیر مسلم اور باہر کے ملکوں کے ریسرچ اسکالر بھی ہوتے ہیں اور لائبریری کی جانب سے انھیں ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی جاتی ہے اور مخطوطات کے عکسی فوٹو بھی مہیا کیے

جاتے ہیں ان کے استفسارات اور دریافت طلب امور کے بارے میں خطوط کے جواب پابندی سے دیے جاتے ہیں۔ جن کتابوں کو تلاش کرنے میں بڑا وقت صرف ہوتا تھا وہ اب لائبریری کے نئے اصول وضوابط اور اچھے نظام کی وجہ سے بہت جلد اور آسانی سے مل جاتی ہیں۔

اکثر توسیعی خطبات اور لکچرز کا اہتمام کیا جاتا ہے، سال میں ایک بار اور کبھی دوبار بھی سمینار ہوتے ہیں گذشتہ کئی برسوں سے اہم ونادر مخطوطات پر خدا بخش جنوبی ایشیائی علاقائی سمینار کا سلسلہ اس غرض سے شروع کیا گیا ہے کہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش وغیرہ میں نجی اور عوامی ذخیروں میں محفوظ نایاب اور کمیاب مخطوطات میں سے اہم ترین کو منتخب کر کے ان کی تدوین کا کام شروع کیا جائے، اس سلسلے میں طب، تصوف، تاریخ ہند، تفسیر وقرآنیات، ہندی الاصل مذاہب اور اردو مخطوطات وغیرہ پر کامیاب سمینار ہو چکے ہیں۔ جن کے بعض خاص سیشن آزادی کے بعد اردو دانشوری، اسکولوں میں پڑھائی جانے والی تاریخ کی نصابی کتابوں اور مولانا آزاد کی قرآنی خدمات کے موضوعات کے لیے بھی وقف رہے۔

خدا بخش لائبریری کے سمینار پٹنہ کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، جامعہ ہمدرد نئی دہلی اور بعض دوسری جگہوں میں بھی ہوئے ہیں جن میں ان موضوعات کے ہندوستانی محققین و ماہرین کے ساتھ ہی پاکستانی اور بنگلہ دیش کے ارباب علم وقلم بھی شریک ہوتے رہے ہیں۔

سمینار میں پڑھے جانے والے مقالات بعد میں سہ ماہی خدا بخش جرنل میں شائع کیے جاتے ہیں، جس کی اشاعت کا فیصلہ خدا بخش لائبریری بورڈ نے ۱۹۷۷ء میں کیا تھا اور اسی سال کا پہلا شمارہ عابد رضا بیدار صاحب کی زیر ادارت نکلا جو اس وقت سے اب تک برابر شائع ہو رہا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا منفرد معیاری اور محققانہ رسالہ ہے جس کے مندرجات کا تعلق کسی نہ کسی حیثیت سے کتب خانہ خدا بخش سے ضرور ہوتا ہے، مضامین کی زبان اردو فارسی، انگریزی اور عربی ہوتی ہے۔

اس جرنل کی یہ خصوصیت بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں بعض نادر ونایاب کتب ورسائل اور مضامین کا زیراکس شائع کیا جاتا ہے۔ یہ بہت مفید سلسلہ ہے جس کی اہمیت اور قدر و قیمت کا

اندازہ محققین ہی کر سکتے ہیں۔ لائبریری بورڈ کی جانب سے ایوارڈ بھی دیا جاتا ہے جس کا آغاز ۱۰ اراگست ۹۳ء کو ہوا اور پہلا خدا بخش ایوارڈ صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے جناب بشمبر ناتھ پانڈے کو دیا جو ایک لاکھ روپے کا تھا اور اس کے ساتھ پلیک اور سند بھی تھی۔ یہ ایوارڈ راشٹر پتی بھون دہلی میں منعقدہ ایک تقریب میں دیا گیا۔

غرض خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ایک عظیم الشان کتب خانہ ہی نہیں ہے بلکہ ایک بڑا علمی و تحقیقی مرکز ہے جو پورے ہندوستان کے لیے مایۂ فخر ہے۔



مراجع

(۱)- خدا بخش لائبریری: سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل شمارہ ا (اردو حصہ)، لیتھو پریس رمنہ روڈ پٹنہ ۱۹۷۷ء۔

(۲)- ایضاً شمارہ ۲

(۳)- ایضاً شمارہ ۳

(۴)- ایضاً شمارہ ٦

(۵)- ایضاً مرآۃ العلوم (فہرست نسخ خطی فارسی خدا بخش)، صادق پریس پٹنہ ۱۹۲۵ء

(۶)- ایضاً، اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ (جلد اول)

(۷)- ایضاً مرآۃ العلوم (جلد دوم) صادق پریس پٹنہ ۱۹۴۲ء، جلد سوم یونین پریس پٹنہ ۱۹۶۷ء

(۸)- ایضاً، مفتاح الکنوز الخفیہ، اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور، فہرست دستی کتب قلمی عربی (جلد اول) صادق پور پریس پٹنہ ۱۹۱۸ء

(۹)- ایضاً، مفتاح الکنوز الخفیہ (جلد دوم) صادق پور پٹنہ ۱۹۲۲ء

(۱۰)- ایضاً، مفتاح الکنوز الخفیہ (جلد سوم) یونین پریس پٹنہ ۱۹۶۵ء

(۱۱)- ایضاً فہرست مخطوطات اردو خدا بخش، بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ ۱۹۶۲ء

(۱۲)- نثار احمد فاروقی، سہ ماہی ''ثقافۃ الہند'' دہلی (شمارہ ۴) ۱۹۹۰ء
(۱۳)- سید احسن شیر، نوادر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، دی آزاد پریس، سبزی باغ پٹنہ ۱۹۶۱ء
(۱۴)- سید شہاب الدین دسنوی: دیدہ وشنیدہ، لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج، دہلی ۱۹۶۳ء
(۱۵)- ڈاکٹر خلیق انجم: ہفت روزہ ہماری زبان، ثمر آفسٹ پرنٹنگ پریس دہلی، ۱۵ر ستمبر ۱۹۹۳ء



(قومی زبان، فروری ۱۹۶۶ء)

ماہ منیر خاں

نادرات کتب خانہ شرقیہ خدابخش خاں

خدابخش لائبریری کی انمول کتابیں اوراس کے نادرنمونوں کا تذکرہ کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند جملوں میں اس لائبریری کی تاریخ اوراس کی اہمیت بیان کردی جائے۔ ساتھ ہی ملک اور ملک سے باہر کے عالموں اور فاضلوں کے جو تاثرات اس لائبریری سے متعلق ہیں، ان کا بھی چند لفظوں میں ذکر کردیا جائے۔ تاکہ اصل موضوع کی اہمیت پر روشنی پڑ سکے اور سننے والوں کو خدابخش لائبریری کے انمول اور بیش قیمت نمونوں کی قدر و منزلت کا کما حقہٗ احساس ہو سکے۔

خان بہادر مولوی خدابخش خاں مرحوم نے ۲۹ر اکتوبر ۱۸۹۱ء میں اس لائبریری کو باضابطہ ایک وثیقہ کے ذریعہ قائم کیا۔ اس لائبریری کو قائم کرنے کے لیے ان کے والد مرحوم اور خود خدابخش خاں مرحوم نے اپنی ساری زندگی صرف کردی۔ مستقل ۱۸ سال تک ایک عرب اس کے لیے مامور کیا کہ وہ اسلامی دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں کو جا کر دیکھے اور وہاں سے انمول کتابوں اور مسودوں کو حاصل کرے۔

اٹھارہ سال کی لمبی مدت میں اس عرب نے قاہرہ، دمشق، بیروت، عرب اور ایران کے کتب خانوں اور وہاں کی لائبریریوں کی سیر کی اور جب جب وہ خدابخش خاں کے پاس آیا اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ بیش قیمت کتابیں اور مسودے لیتا آیا۔ خود ہندوستان میں بھی مختلف شہروں میں ان کے آدمی تعینات تھے اور جہاں جہاں انھیں کتابوں کی خبر ملتی وہ اسے حاصل کر لیتے۔ اس طرح سے چار ہزار بیش قیمت کتابیں، قلمی مسودے، خطاطی اور فن مصوری کے اعلیٰ نمونے انھوں نے حاصل کر لیے اور لائبریری کے قائم کرنے کے وقت چار ہزار کتابوں کا یہ ذخیرہ عوام کی نگاہوں کے سامنے آیا۔ خدابخش خاں مرحوم کو یہ لائبریری کس قدر عزیز تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا

ہے کہ ایک بار برٹش میوزیم نے ان کو ایک بہت بڑی رقم دے کر یہ لائبریری خریدنا چاہی تو انھوں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر یہ کہا کہ ہم بہت غریب آدمی ہیں ہم اتنے روپے لے کر کیا کریں گے ہمارے والد نے اور ہم نے اپنی ساری زندگی ان کتابوں کو اپنے اہل وطن کے لیے جمع کرنے میں لگائی ہے اور ہم اس کو اپنے اہل وطن کے قدموں میں ایک مقدس امانت کی طرح دے رہے ہیں۔

اس لائبریری میں آپ کو جہاں ہزاروں ہزار قلمی کتابیں اور انمول مسودے ملیں گے وہیں آپ اس کی "Visitor's Book" بھی دیکھیں گے جو اپنی جگہ خود ایک انمول کتاب ہو گئی ہے۔ اس میں لارڈ کرزن، مہاتما گاندھی، ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور، پنڈت جواہر لال نہرو اور اسی طرح کی بیسیوں عہد آفریں شخصیتوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں بھی ملیں گی۔ جو انھوں نے لائبریری کا معائنہ کرنے کے بعد اپنے تاثرات کے طور پر قلمبند کی ہیں۔

۱۹۰۳ء میں لارڈ کرزن نے لائبریری دیکھی اور اپنے خیالات معائنہ کی کتاب میں لکھے۔ آنجہانی ڈاکٹر سچید انند سنہا کی زبان میں "یہ لائبریری علم و ادب کے شیدائیوں کی ایک زیارت گاہ ہے"۔ مشہور مؤرخ سر جادو ناتھ سرکار نے اس لائبریری کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے خدا بخش خاں کو ہندوستانی بوڈلے کے نام سے یاد کیا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں اردو زبان کے بہت بڑے شاعر مولانا صفی لکھنوی نے اس لائبریری کو عظیم آباد یعنی پٹنہ کی کل کائنات اور ساری پونجی کہا ہے وہ اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں ؎

پہلے سب کچھ تھا عظیم آباد کا شانہ ترا ۔۔۔ اب تو جو کچھ ہے وہ ہے علمی کتب خانہ ترا

ایسے ایسے سیکڑوں حوالے دیئے جا سکتے ہیں۔ جن سے اس لائبریری کی اہمیت اور اس کی بڑائی پر مختلف طریقوں سے روشنی پڑ سکتی ہے۔ مگر ہم اس کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اور اب اصل بات کی طرف آپ کی توجہ موڑنا چاہتے ہیں وہ ہے خدا بخش لائبریری کی انمول کتابوں کی سیر۔

تو لیجیے سنتے جایئے یہ ہے "تاریخ خاندان تیموریہ"۔ یہ کتاب تیمور کے خاندان کی تاریخ ہے۔ آپ جب اس کتاب کو دیکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔ اور یہ سمجھنا کچھ دیر کے لیے مشکل ہو جائے گا کہ جن انگلیوں نے اپنے قلم سے اس کتاب پر اپنی تحریر لکھ چھوڑی ہے آخر وہ کیا

تھیں۔ان کی صفائی،ان کے حروف کی حسین اور خوبصورت سطریں مشینوں کو شرمار ہی ہیں۔اس پوری کتاب میں ۱۳۳ رنگا رنگ تصویریں بھی دکھائی دیتی ہیں۔جنھیں اکبر کے زمانہ میں نامور استادوں اور مصوروں نے تیار کیا تھا۔ان ہی میں سے ایک مشہور مصور عبدالصمد بھی تھے جنھوں نے ہمایوں کو یہ فن بتایا تھا۔بادشاہ نے ان کی قلم کاری دیکھ کر انھیں ''شیریں قلم'' کا خطاب عنایت کیا تھا۔واقعات کی تصویرکشی کرنے میں ان کا زیادہ تر حصہ جنگ وجدال اور سیر وشکار کی تصویروں پر شامل ہے ان پر سنہری کام کی چمک دمک اور رنگا رنگ قلم کاری آج بھی اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔جتنی محنت اور جتنے لمبے عرصے میں جس بھرپور اطمینان اور عافیت کے ساتھ یہ کتاب تیار ہوئی ہوگی اس کا صحیح اندازہ کرنا آج کل کی دنیا میں مشکل ہے۔

''تاریخ خاندان تیموریہ'' کے بعد جو دوسری کتاب آپ دیکھنا چاہیں گے تو عہد شاہجہانی کی مشہور کتاب ''شاہجہاں نامہ'' کو دیکھیے یہ کتاب انڈومغل پینٹنگ کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے وہ لوگ جو انڈومغل پینٹنگ پر ریسرچ کرنا چاہتے ہوں ان کے لیے یہ کتاب ''شاہجہاں نامہ''معلومات کا ایک ذخیرہ ثابت ہوگی۔

اسی کے ساتھ''شہنشاہ نامہ'' بھی دیکھتے چلیے اس کتاب کی اپنی خوبی کے ساتھ۔اس کی تاریخی اہمیت اس وجہ سے بھی بڑھ گئی ہے کہ اس پر اس وقت کے شاہزادوں کی مہریں بھی لگی ہوئی ہیں۔جن میں جہاں آراء بنت تاج کی بھی مہر ہے شاہجہاں کی یہی وہ چہیتی بیٹی تھی جو اس کے زمانہ قید میں اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔دنیا کی کسی لائبریری میں اس کا کوئی نسخہ اور اس کی کوئی نقل نہیں مل سکتی۔یہ کتاب اس لائبریری کے انمول رتن میں شمار کی جاتی ہے۔

اب آیئے''شاہنامہ فردوسی'' کو دیکھیے اگرچہ یہ نامکمل ہے پھر بھی اپنی اعلیٰ ترین خطاطی اور تاریخی حیثیت کی وجہ سے خاصی اہمیت رکھتا ہے فن نستعلیق کا یہ اعلیٰ ترین شاہکار ہے۔اس کی تاریخی خصوصیت یہ ہے کہ علی مردان جو کابل اور کشمیر کا گورنر تھا اس نے شاہجہاں کو یہ شاہنامہ پیش کیا تھا۔ایرانی قلم کاری اس کے ایک ایک حرف سے جھانک رہی ہے۔

ایران کے مشہور اور لافانی شہرت کے مالک آقائے میر عمادالحسینی جیسے عظیم المرتبت

خطاط کے ہاتھوں کی تحریریں بھی یہاں آپ کو دکھائی دیں گی جو صدیوں بعد بھی اپنے حرفوں میں وہی پائیداری اور زندگی رکھتی ہیں۔ اسی کے ساتھ شیخ عبدالرشید دیلمی کے قلم کے معجزے اگر آپ دیکھنا چاہیں تو ان کے ہاتھ کی وصلیاں اور ان کی طغرانویسی اور خطاطی کے نمونے بھی آپ کی نگاہوں کو محوِ حیرت بنا دیں گے، ان کے علاوہ میر علی تبریزی، سید علی خاں جواہر رقم بن آقا مقیم کے نمونۂ خطاطی بھی یہاں موجود ہیں۔

مشہور شعرائے ایران مثلاً جامیؔ، سعدیؔ اور حافظؔ کے دیوان اور ان کے کلام کے بہتیرے نسخے آپ کو ملیں گے جو مشہور فنکاروں اور بے نظیر خطاطوں کے ہاتھوں سے تیار ہوئے ہیں۔ خصوصیت سے دیوان حافظؔ کی تو کئی جلدیں اور کئی نسخے یہاں موجود ہیں۔ مگر ایک نسخہ جو خطاطی کا بہترین نمونہ ہے اور جو خاندان مغلیہ کے کئی بادشاہوں کے پاس رہا ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے۔

دیوان حافظؔ کی صرف ادبی اور شعری اہمیت ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک حد تک ترجمان غیب بھی ہے۔ یعنی بھوشیہ وانی بھی کرتا ہے اکثر بزرگوں اور باکمال لوگوں نے اگلے حالات جاننے کے لیے اس سے فال نکالی ہے۔ جو اکثر موقعوں پر پوری پوری صحیح ثابت ہوئی ہے۔

دیوان حافظؔ کا یہ نسخہ جس کا یہاں تذکرہ کیا جا رہا ہے وہ نسخہ ہے جس سے ہمایوں اور جہانگیر نے مشکل کے وقت فال نکالی ہے۔ اورنگ زیبؒ نے بھی اس نسخہ سے فالنامہ کا کام لیا تھا۔ اس کے حاشیہ پر ہمایوں اور جہانگیر کی تحریریں اور ان کے دستخط آج بھی موجود ہیں۔ جو تاریخ کے شائقین کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ کتاب بادشاہوں کے دستخطوں سے ایک غیر معمولی اہمیت کی حامل ہو گئی ہے۔

شاہانہ شان و شوکت اور جاہ و جلال کی گود میں جن کتابوں کے اوراق کھلتے اور بند ہوتے رہے انہی میں ایک نادر کتاب ''دیوان کامران'' ہے۔ کامران بابر کا بیٹا اور ہمایوں کا بھائی تھا۔ اس کتاب پر جہانگیر اور شاہجہاں کے دستخط موجود ہیں۔ دیوان کامران کا یہ اصل نسخہ ہے اور دنیا میں کہیں بھی نہیں پایا جاتا۔

اب آیئے قرآن مجید کے اس مقدس نسخے کو دیکھیے۔ یہ نسخہ اس لائبریری کا اصل سرمایہ ہے ۶۸۸ھ میں اس قرآن مجید کو جمال الدین یاقوت المستعصمی نے لکھا ہے۔

عربی مخطوطات میں تفسیر کبیر کی ضخیم جلدیں بھی یہاں موجود ہیں۔ اس لائبریری میں بہت قدیم مسودہ عربی زبان میں کتاب الحشائش کا ہے یہ فن باغبانی سے متعلق ہے۔ اس کے علاوہ عربی میں ایک قدیم نسخہ ہے جو جراحی کے آلات و اوزار سے متعلق ہے اسے عرب کے مشہور معالج زہراوی نے مرتب کیا تھا۔

اس لائبریری کی بیش قیمت امانت اور انمول نمونوں میں حضرت علیؑ کے ایک خط کا ایک ٹکڑا ہے جو آپ نے عمرو بن عاص فاتح مصر کے نام تحریر کیا تھا۔ یہ خط ہرن کی کھال کے ایک ٹکڑے پر ہے یہ خط پہلی صدی ہجری میں مطابق ساتویں صدی عیسوی کے لکھا گیا تھا۔

اپنے ان ہی نایاب اور بیش قیمت ذخیروں کی وجہ سے یہ لائبریری اسلامی علم وادب کا دنیا بھر میں پہلا خزینہ کہلاتی ہے یہ حقیقت ہے کہ مختصر سے عرصہ میں ان تمام بیش بہا مسودوں اور کتابوں کی سیر کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے اقبالؔ کا یہ مصرعہ پورے طور پر صادق آتا ہے۔

ع

ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

☆☆☆

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

(بہار کی خبریں، ۱۶؍مئی ۱۹۶۲ء)

محمد عثمان

ایک خواب کی زندہ تعبیر

پٹنہ کی خدا بخش لائبریری کی کہانی ایک باپ اور اس کے بیٹے کے خوابوں کی زندہ کہانی ہے۔

انیسویں صدی کے آخر میں چھپرہ کے ایک وکیل محمد بخش نے اپنے بیٹے خدا بخش سے کہا تھا "میرے بیٹے —— ساری عمر میں نے قلمی مسودات جمع کیے ہیں۔ ان کی تعداد اب چودہ سو کے لگ بھگ ہو چکی ہے۔ تم جب بھی اس قابل ہو کہ عوام کے لیے ایک بڑی لائبریری بنا سکو تو یہ کتابیں اس لائبریری میں محفوظ کر دینا"

اور علم دوست باپ کے علم دوست بیٹے نے بانکی پور پٹنہ میں ایک لائبریری قائم کر کے اپنے باپ کی یہ تمنا پوری کر دی۔

خدا بخش نے اپنی زندگی ایک معمولی وکیل کی حیثیت سے شروع کی تھی اور ترقی کرتے کرتے وہ ریاست حیدرآباد کی سپریم کورٹ میں چیف جسٹس ہو گئے تھے۔

خدا بخش بھی اپنے باپ کی طرح ساری عمر قلمی کتابیں جمع کرتے رہے تھے۔ انھوں نے اپنی لائبریری ۱۸۹۱ء میں قائم کی تھی۔ اس لائبریری کا نام انھوں نے اورینٹل پبلک لائبریری رکھا تھا۔ لیکن آج وہ خدا بخش لائبریری کے نام سے مشہور ہے۔

آج اس لائبریری میں عربی قلمی کتابوں کی تعداد ۴۲۲۱ اور فارسی قلمی کتابوں کی تعداد ۴۱۸۴ ہے۔ ان کے علاوہ یہاں اردو، ترکی، ہندی اور سنسکرت کے بے شمار قلمی نادر نسخے بھی موجود ہیں اور ایسے دو سو مسودے بھی ہیں جو کھجور کے پتوں پر لکھے ہوئے ہیں۔ لائبریری میں سات سو سے زائد قلمی تصویریں بھی محفوظ ہیں۔

یہ لائبریری کتنی عظیم ہے۔ اس کا اندازہ سر رابندر ناتھ ٹیگور کے ایک جملے سے لگایا جا

سکتا ہے۔وہ ۱۹۱۳ء میں یہ لائبریری دیکھنے کے لیے آئے تھے اور انھوں نے کہا تھا" میں نے اس لائبریری میں خدا کا جلوہ دیکھا ہے۔ میں نے یہاں جو کچھ دیکھا ہے اس کی مثال ناممکن ہے"۔

اس لائبریری میں قرآن پاک کا ایک ایسا نادر نسخہ بھی موجود ہے جو آخری عباسی خلیفہ کے دورِ حکومت میں ۱۲۶۹ء میں مشہور کاتب یاقوت نے لکھا تھا۔

لائبریری کا انتظام ایک وقف کے سپرد ہے۔ پرانی عمارت کے علاوہ اب ایک نئی عمارت بھی بن گئی ہے اور حکومت اس کی مالی امداد بھی کر رہی ہے۔

خدابخش لائبریری واقعی ایک باپ کے خوابوں کی زندہ تعبیر ہے۔

(شبستان اردو ڈائجسٹ، نئی دہلی فروری ۱۹۷۰ء)



شیریں ظہیر نیازی

خدا بخش لائبریری

اسلامی علوم کا گنجینۂ گراں مایہ

پٹنہ کی خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کا قیام ۱۹ ویں صدی کی آخری دہائی میں عمل میں آیا تھا۔ یہ لائبریری اسلامی علوم کا مخزن ہے اور یہاں فارسی اور عربی زبانوں کے نادر و نایاب قلمی مسودے موجود ہیں۔ اس لائبریری کا قیام ایک باپ کے خواب کی کہانی ہے جسے اس کے اسکالر بیٹے نے پورا کیا۔

کتابیں جمع کرنے کا شوق اسے اپنے باپ سے ورثے میں ملا تھا۔

خدا بخش کے والد محمد بخش کے دل میں ایک عرصے سے یہ خواہش تھی کہ وہ ایک لائبریری قائم کریں۔ محمد بخش چھپرہ کے ایک وکیل تھے۔ جنھوں نے اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ قلمی مسودوں کے حصول میں صرف کیا۔ ان قلمی مسودوں کی تعداد ۱۴۰۰ تک پہنچتی ہے۔ خدا بخش نے انیسویں صدی میں اسلامی لائبریری کے موضوع پر ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ''جس وقت میرے والد بستر مرگ پر تھے تو انھوں نے ان قلمی مسودوں کو میرے حوالے کیا تھا اور وصیت کی تھی کہ میں جب بھی اس قابل ہو جاؤں، ان کی قائم کردہ لائبریری کو ایک ایسی لائبریری میں بدل دوں جو عوام الناس کے استعمال کے لیے ہو''۔

کافی عرصہ ہوا کہ محمد بخش کا بیش قیمتی کتابی ذخیرہ بانکی پور (پٹنہ) میں منتقل کیا گیا تھا۔ مغلیہ دور میں بھی پٹنہ علماء اور شعراء کی آماجگاہ تھا۔ اسے علم و ثقافت کا مرکز ہونے کا شرف حاصل تھا۔ لائبریری کے پٹنہ منتقل ہو جانے کے بعد خدا بخش نے اسے نایاب تصانیف سے مالا مال کرنا شروع کر دیا۔

ڈاکٹر سچدانند سنہا نے اپنی تصنیف ''بہار کے کچھ ممتاز معاصرین'' میں خدا بخش کو ''باوقار، بااثر اور پُرشکوہ شخصیت'' کا حامل بتایا ہے۔ خدا بخش (۱۹۰۸ء-۱۸۴۲ء) چھپرا میں

پیدا ہوئے تھے اور ان کی تعلیم و تربیت کلکتہ میں ہوئی تھی۔ تنگ دستی اور دوسری مشکلات سے گزر کر وہ ایک وکیل ہو گئے اور پٹنہ میں بغرض وکالت سکونت اختیار کر لی۔ انھوں نے پیشۂ وکالت میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور آخر کار وہ نظام کی عدالت عالیہ میں چیف جسٹس مقرر ہوئے۔ عوامی سرگرمیوں کے سلسلے میں انھیں خان بہادر کے خطاب سے نوازا گیا اور بعد ازاں انھیں سلطنت برطانیہ کے آرڈر کی کمپینین شپ عطا کی گئی۔

اسلامی علوم سے گہرا لگاؤ

ممتاز مورخ جادو ناتھ سرکار خدا بخش سے ذاتی طور پر واقف تھے اور انھوں نے مسلم حکمرانوں کے دور کے ہندوستان کے متعلق اپنی تاریخی واقفیت میں اضافہ کرنے کے لیے خدا بخش کی لائبریری سے کافی استفادہ کیا۔ جادو ناتھ سرکار خدا بخش کی اس عقیدت کا جو انھیں اپنی لائبریری سے تھی، تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''خدا بخش کو سوتے اور جاگتے اپنی لائبریری کا خیال رہتا تھا ان کی لائبریری ان کے خوابوں کا مرکز تھی۔ ہندوستانی اسکالروں اور قارئین کی آنے والی نسلیں خدا بخش کو یاد رکھیں گی اور کہیں گی کہ ان کا نام خدا بخش نہایت مناسب رکھا گیا تھا''۔

خدا بخش اسلامی ادب اور علوم کے دلدادہ تھے ان کی لائبریری ان کی فرہنگیاتی ذہانت کی زندہ یادگار ہے۔ خدا بخش لائبریری عوام کے لیے ۱۸۹۱ء میں کھولی گئی تھی۔ یہ رسم سر چارلس ایلیٹ نے انجام دی تھی جو اس وقت بہار، بنگال اور اڑیسہ کے لفٹیننٹ گورنر تھے۔ خدا بخش یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ اس لائبریری کا نام اپنے نام پر رکھیں اسی لیے انھوں نے اسے اورینٹل پبلک لائبریری کا نام دیا لیکن آج ہندوستان اور غیر ممالک میں یہ صرف خدا بخش لائبریری کے نام سے جانی جاتی ہے۔

جادو ناتھ سرکار کے قول کے مطابق ''اس لائبریری کی تاریخ اور اور اس کے ارتقاء

کے ساتھ روحانیت سے بھرپور کئی واقعات وابستہ ہیں۔اس لائبریری میں موجود سب سے قیمتی قلمی مسودے دہلی کے مغلیہ کتب خانے سے آئے ہیں جس کا شیرازہ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد بکھر گیا تھا۔خدابخش نے محمد مکّی کو اپنے یہاں ملازم رکھا تھا۔ جسے اس وقت کتابیں جمع کرنے والوں میں نمایاں مقام حاصل تھا۔محمد مکّی شام،عرب،مصراورایران سے متعدد بیش بہا قلمی مسودے لائے۔ خدابخش چونکہ قلمی مسودوں کی اچھی قیمت دیتے تھے اس لیے اس کی شہرت سارے ملک میں تھی اور جہاں کہیں بھی کوئی مسودہ برائے فروخت ہوتا تھا سب سے پہلے خدابخش کے پاس لے جایا جاتا تھا۔ایک دفعہ ایک جلد ساز نے، جو خدابخش کے ہاں ملازم رہ چکا تھا، لائبریری میں نقب لگایا اور سرقہ شدہ قلمی مسودے لاہور کے ایک سوداگر کے ہاں فروخت کے لیے بھیج دیئے۔سوداگر کو حقیقت کا علم نہ تھا اس نے ان مسودوں کو واپس خدابخش کے ہاں بھیج دیا کیونکہ اس کا خیال تھا ان مسودوں کا سودا خدابخش سے بہتر کوئی نہیں کرسکتا''۔

خدابخش لائبریری میں عربی اور فارسی کے قلمی نسخوں کی تعداد علی الترتیب ۴۲۲۱ اور ۱۸۴۳ ہے۔ان کے علاوہ اس لائبریری میں اردو، ترکی، ہندی اور سنسکرت کے نادر قلمی نسخے موجود ہیں۔یہاں کھجور کے پتوں پر مشتمل دوسو مسودے اور سات سو نفیس قلمی تصاویر موجود ہیں۔

۱۸۹۱ء میں جب اس لائبریری کا افتتاح ہوا تھا اس وقت اس لائبریری میں ۲۵۰۰ کتابیں اور چار ہزار قلمی مسودے موجود تھے اور آج اس لائبریری میں موجود مطبوعہ کتابوں، جریدوں، رسالوں اور قلمی مسودوں کی کل تعداد تقریباً باون ہزار ہے۔کتابوں کا یہ ذخیرہ اسلامی دینیات، فلسفہ، تصوف، علم الاخلاق، علم قانون، تواریخ، سیرت نگاری، سائنس اور دیگر ادبی تصانیف پر مشتمل ہے۔ہندوستانی علوم کے ایک مغربی ماہر نے خدابخش لائبریری کو دیکھ کر ایک جگہ لکھا ہے کہ اس لائبریری میں موجود تصانیف کی کتابت، منقش و مطلا کتابوں اور رنگا رنگ مسودوں کا دنیا میں کوئی جواب نہیں ہے۔ ۱۹۱۳ء میں رابندر ناتھ ٹیگور نے لائبریری دیکھ کر اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا ''اس لائبریری میں، جہاں متعدد کتابیں موجود ہیں، میں نے اس خدا کا جلوہ دیکھا جو نرا کار ہے۔یہاں جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس کا جواب ملنا ناممکن ہے''۔

بارہ سال بعد جب مہاتما گاندھی نے اس لائبریری کو دیکھا تو انھوں نے لکھا ''القرآن'' اور'' شاہنامہ'' کی شاندارتزئین نگاہوں کو ہمیشہ دعوت نظارہ دیتی رہتی ہے۔ میں اس لائبریری کے بانی کوخراج عقیدت پیش کرتا ہوں جس نے موجودہ ہندوستان کو کتابوں کا ایسا ذخیرہ عطا کیا جو دولت سے بھی افضل ہے۔ ۱۹۵۳ء میں جواہر لال نہرو نے لکھا'' میں نے اس لائبریری کو اپنی توقعات سے زیادہ پایا۔ ہندوستانی تاریخ پر مشتمل یہ ادبی تصانیف واقعی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں''۔

نایاب قلمی نسخے

خدابخش لائبریری میں قرآن شریف کا ایک ایسا نسخہ موجود ہے جو ۱۲۶۹ء میں لکھا گیا تھا۔ اسے خط نسخ، خط ریحان اور خط ثلث میں تحریر کیا گیا ہے۔ یہ قرآن شریف آخری عباسی خلیفہ کے دربار سے منسلک مشہور ومعروف کاتب یاقوت نے لکھا تھا۔ قرآن شریف کا یہ نسخہ پھول پتیوں سے مزین ہے۔ اس کے علاوہ یہاں بڑی تختی کے ۱۳۳ صفحات پر مشتمل '' تاریخ خاندان تیمور'' بھی ہے۔ تاریخی قلمی مسودوں میں '' بادشاہ نامہ'' نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اسے محمد امین نے خط نستعلیق میں تحریر کیا تھا۔ بادشاہ نامہ میں شاہجہاں کی پیدائش سے وفات تک کی پوری تاریخ لکھی گئی ہے۔ بادشاہ نامہ کے تمام صفحات منقش ہیں اور حاشیوں پر گل بوٹے بنائے گئے ہیں۔ ادبی موضوعات سے متعلق قلمی مسودوں میں خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی کا '' دیوان حافظ'' قابل ذکر ہے۔ یہ دیوان نویں صدی ہجری میں لکھا گیا تھا۔ اس دیوان کے حواشی پر ہمایوں اور جہانگیر کی لکھی ہوئی تفسیر موجود ہے۔

لائبریری کی عظیم الشان عمارت کو جسے خدابخش نے ۵۰۰۰ ۷ ہزار روپیہ کی لاگت سے گنگا ندی کے کنارے بنوایا تھا، ۱۹۳۴ء میں خوفناک زلزلے کے باعث شدید نقصان پہنچا۔ اس کے کچھ حصوں کو گرادیا گیا تھا۔ اوران کی جگہ علاحدہ عمارتیں بنادی گئی تھیں۔

۱۸۹۱ء میں خدابخش نے حکومت بہار (سابق حکومت مغربی بنگال) کو لائبریری کا

واحد متولی قرار دیا تھا۔ حکومت بہار نے ایک قرارداد مجریہ ۱۹۶۲ء کے تحت حکومت ہند سے منظوری حاصل کر کے لائبریری کا انتظام اور کنٹرول ایک اعلیٰ طاقتی انتظامی بورڈ کے سپرد کر دیا۔ بورڈ مذکور کا صدر بہار کے گورنر کو مقرر کیا گیا۔ بورڈ مرکزی حکومت اور حکومت بہار کے دو دو نامزد ارکان پر مشتمل ہے ان کے علاوہ خدابخش کے خاندان کا ایک فرد بھی اس بورڈ کا رکن ہوتا ہے جس کا تقرر بہار سرکار اور بہار کے اکاؤنٹنٹ جنرل کے ذریعہ ہوتا ہے۔

خدابخش لائبریری کے اخراجات کی تکمیل کے لیے پچاس ہزار روپے کی رقم مختص ہے۔ فاضل اخراجات کی ادائیگی حکومت بہار کرتی ہے جس کی تکمیل ۱۹۶۲ء سے مرکزی حکومت کر رہی ہے۔ لائبریری کو مرکزی حکومت سے اب تقریباً ایک لاکھ روپے کی مالی امداد ملتی ہے۔ اس کے علاوہ لائبریری کی موجودہ عمارت میں اضافے اور تبدیلی کے لیے مرکزی حکومت نے ۱۲۵۰۰۰ روپے دیئے ہیں۔

خدابخش لائبریری اپنے نایاب قلمی مسودوں اور آرٹ کے بہترین نمونوں کی وجہ سے قومی اہمیت کی حامل ہے۔



(بہار کی خبریں، یکم جنوری ۱۹۷۰ء)

سلمان شمسی ندوی

خدابخش لائبریری، پٹنہ

اسلامی علوم کے ذخیروں میں یہ ذخیرہ دنیا بھر میں منفرد ہے، صدیوں پرانے قلمی نسخے ایسے بھی ہیں جو دنیا میں اور کہیں موجود نہیں ہیں۔

اسلامی علوم کے اس بیش بہا ذخیرے کے مالک کا نام محمد بخش تھا، وہ شمالی بہار کے رہنے والے تھے اپنے وقت کے نامور عالم اور شاعر تھے، نادر قلمی نسخے جمع کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا، انھوں نے اپنی زندگی ہی میں چودہ سو نسخے جمع کر لیے تھے ان میں سے تین سو نسخے ایسے تھے جو اپنے آباء واجداد سے ورثہ میں ملے تھے جب محمد بخش صاحب کا آخری وقت قریب آیا تو انھیں اپنی زندگی سے بھی عزیز متاع کا خیال آیا، انھیں ڈر تھا کہ کہیں یہ ذخیرہ منتشر نہ ہو جائے، چنانچہ انھوں نے وصیت کی کہ ان نادر کتابوں کو علوم شرقیہ کی لائبریری کی شکل دے دی جائے۔

محمد بخش صاحب کے صاحبزادے جناب خدابخش نے اپنے والد مرحوم کی آخری خواہش کو پورا کرنا اپنی زندگی کا مشن بنالیا، انھوں نے اس مقصد کے لیے ۱۸۸۸ء میں خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری کی بنیاد رکھی اور نئے نسخوں کی تلاش میں لگ گئے۔ ایک دوست نے ان سے پوچھا کہ وہ اتنی نادر کتابیں کس طرح حاصل کر لیتے ہیں؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ ''حصول کتب کا فن مروجہ ضابطہ تعزیر کی تصریحاً خلاف ورزی کا درجہ رکھتا ہے''۔ اس کے بعد انھوں نے کہا ''اندھوں کی تین قسمیں ہیں، ایک وہ جنھیں دکھائی نہیں دیتا، دوسرے وہ جو اپنی قیمتی کتابیں دوسروں کو پڑھنے کے لیے دے دیتے ہیں اور تیسرے وہ جو ایسی کتابیں ہاتھ آنے کے بعد لوٹا دیتے ہیں''۔ خدابخش خاں کو قلمی نسخے حاصل کرنے کا جنون تھا، ان کے اس جنون کی کئی دلچسپ کہانیاں مشہور ہیں۔

سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں ایران دنیائے عرب اور وسطی ایشیا کے علاقوں

میں کشت وخون کا بازار گرم تھا، اور طوائف الملو کی پھیلی ہوئی تھی، مگر اس زمانہ میں مغل بادشاہوں کے زیر انتظام ہندوستان میں امن کا دور دورہ تھا، اس وجہ سے مشرق وسطٰی کے ممتاز عالم اور نامور گھرانے ہندوستان کا رخ کرنے لگے، وہ اپنے ساتھ خاندانی علمی خزانے بھی لیتے آئے، اٹھارہویں صدی میں ان میں سے بیشتر مخطوطے نوابان اودھ کے کتب خانوں میں پہنچ گئے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد شاہان دہلی اور نوابان اودھ کے قیمتی کتب خانے بھی مٹ گئے، عین ممکن تھا کہ یہ سارے خزانے انگریزوں کے ذریعہ ہندوستان سے باہر چلے جاتے، لیکن اس دور پُر آشوب میں ایک علم دوست مسلمان آگے بڑھا، یہ نواب رامپور تھے، انھوں نے قلمی نسخہ لاکر پیش کرنے والے ہر شخص کو انعام دینے کا اعلان کیا، اس زمانہ میں خدا بخش خاں بھی اس مہم میں شامل ہوگئے، یوں نواب صاحب اور خدا بخش خاں میں ایک طرح کا مقابلہ شروع ہوگیا، خدا بخش خاں نے ہندوستان سے قلمی نسخے اکٹھے کرنے کے ساتھ بلاد اسلامیہ سے بھی قلمی نسخے حاصل کرنے کے لیے ایک ماہر کتب شناس محمد مکی کے لیے پچاس روپے ماہوار اور حاصل شدہ کتابوں پر خاص کمیشن مقرر کیا اس شخص نے ۱۸ برسوں میں دمشق، بیروت اور سکندریہ کے تمام علمی خزانے چھان مارے اور وہاں سے نہایت بیش قیمت اور نادر مخطوطات لاکر خدا بخش خاں کو پیش کیے، خدا بخش خاں کے جنون کا یہ عالم تھا، کہ نادر نسخوں کے تاجروں کو نسخوں کی قیمت ادا کرنے کے ساتھ آنے جانے کا کرایہ بھی دیتے تھے، وہ کتابوں کی قیمت تجویز کرنے میں اتنے دریا دل تھے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونی ممالک کے تاجران بھی سب سے پہلے انہی کی خدمت میں پہنچتے تھے اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ سنیے:

کوئی شخص پٹنہ میں خدا بخش خاں کے کتب خانہ سے چند نادر کتب چرا لے گیا اور انھیں لاہور لے جاکر کسی تاجر کے ہاتھ بیچ دیا، اس تاجر کو خوب علم تھا کہ ایسی کتابوں کے بہترین خریدار خدا بخش خاں ہیں، چنانچہ اس نے وہ کتب پٹنہ بھیج دیں، خدا بخش خاں کو گم شدہ متاع واپس مل جانے سے بے حد مسرّت ہوئی، تاہم انھوں نے لاہوری تاجر کو پوری قیمت ادا کردی۔

اب تک کتابوں کی تلاش اور خریداری اکیلے خدا بخش ہی کرتے تھے، رفتہ رفتہ ان کے

خزانے میں اضافہ ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ ان کے لیے اس نجی کتب خانے کی تنظیم بحال ہوگئی ان ہی دنوں عربی زبان کے مغربی ماہر سر چارلس لائل کو خدا بخش نجی کتب خانے کی زیارت کا موقع ملا وہ اس کی قدر و قیمت سے بے حد مرعوب ہوئے اور آخر کار حکومت بنگالہ کو خدا بخش خاں کی معاونت پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ۱۸۸۸ء میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری معرض وجود میں آئی، پھر ۱۸۹۱ء میں صوبائی حکومت نے اسے مکمل طور پر اپنی تحویل میں لے لیا۔

اس وقت لائبریری میں کتابوں کی کل تعداد ۶۵۰۰ تھی، جن میں چار ہزار قلمی نسخے تھے، اس لائبریری میں نہایت گراں قدر اضافہ یوں ہوا کہ دیسنہ کی اصلاح لائبریری کی کتابیں خدا بخش لائبریری میں منتقل کر دی گئیں۔

ان میں بے شمار نادر مخطوطے، رسائل اور جرائد شامل تھے، خدا بخش کے صاحبزادے صلاح الدین خدا بخش کو بھی کتابیں جمع کرنے کا شوق ورثہ میں ملا تھا، وہ عربی اور فارسی کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی اور جرمن کے بھی متبحر عالم تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی بیوہ نے ساری کتابیں لائبریری کو پیش کر دیں۔ یوں یورپی زبانوں کا ایک شعبہ بھی وجود میں آ گیا اس وقت لائبریری میں موجودہ کتابوں کی تعداد پچاس ہزار سے تجاوز کر چکی ہے۔ اس کتب خانہ میں گذرے ہوئے عالموں اور گزرے ہوئے بادشاہوں کی یاد محفوظ ہے، ایک ایسی ثقافت کی یاد محفوظ ہے جس نے دنیا پر گہرا اثر ڈالا تھا، ایسی ثقافت جس نے قرطبہ سے لے کر دلی تک اس کے بہت بڑے شاہکاروں کو جنم دینے میں تخیل کا ہاتھ بٹایا تھا، جو لوگ قدیم اسلامی دنیا کے تصورات سے آشنا ہونا چاہتے ہیں، ان کی آرزو سے کچھ زیادہ ہی یہ کتب خانہ ان کو نہال کر دینے کے لیے کافی ہے

اس کتب خانہ کا تعارف وی، بی، اسکاٹ او کونز ان الفاظ میں کراتا ہے:

"یہاں اصلاً مبالغہ سے کام لینا مقصود نہیں، پر مشرق کے ایک ایسے تابناک کارنامے کے ذکر میں تخیل کی تھوڑی سی گرمی معاف رکھی جائے

گی، کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں پرکار خطاطی، سونے کی مینا کاری، لاقیمت کتابی نقاشی اور لاجوردی، شنگرفی، گلابی، زعفرانی، نیلے، سرخ اور سبز رنگوں سے بعض صفحوں پر تصویر کاری سے بڑھ کر اور چیز ہو نہیں سکتی۔ ان کی سادگی اور پُرکاری سے بڑھ کر دل پر اثر کرنے والی کوئی چیز دیکھی گئی اور نہ سنی گئی، جن انقلابوں میں ان چیزوں نے اپنا حصہ ادا کیا ہے ان سے کہیں زیادہ یہ خود اصلی معلوم ہوتی ہیں، یہ دیکھیے یہ ازہر یا دمشق کے کسی غریب عالم کی لکھی ہوئی کتاب کا دنیا میں ایک ہی نسخہ ہے، یہ دیکھیے یہ کتاب کسی شہنشاہ یا کسی بادشاہ کو تحفہ میں پیش کی گئی ہے، یہ دیکھیے یہ کتاب کسی خانخاناں یا شاہان مغلیہ کے کسی امیر کی خدمت میں بطور نذر پیش کی گئی ہے، یہ دیکھیے اس کتاب نے کسی بادشاہ کو عین مایوسی اور بے بسی کے عالم میں اس کی قسمت کا حال بتایا ہے، یہ دیکھیے یہ کتاب ہیروں سے آراستہ پیراستہ کسی شہزادی کا دل پسند کھلونا رہی ہے، یہ شہزادی اپنی نسل کے اور لوگوں کی طرح شاعرہ تھی اور سچ مچ اونچے درجہ کی شاعرہ تھی۔ یہ دیکھیے یہ کتاب مال غنیمت کا ایک حصہ ہے جو کسی فاتح کے ہاتھ لگا ہے، جو ہیروں، کپڑوں اور سونے چاندی کی چیزوں کے ساتھ اس کے قبضہ میں آیا ہے اور اس کے پچھلے مالک نے ابھی ابھی قبر کا کونا آباد کیا ہے، یہ دیکھیے یہ ایک اجڑے دربار کا آخری خزانہ چرایا گیا، چھپا کر رکھا گیا، ہاتھوں ہاتھ ایک سے دوسرے تک پہنچایا گیا، پانی میں بھیگا، دیمک نے چاٹا اور کیڑوں نے اس سے اپنا پیٹ بھرا، پھر کسی بھوکے خاندان کے پیٹ پالنے کے لیے بیچا گیا، اور اب آخر کار آرام کے دن پورے ہونے اور پھر ایک نئی گردش شروع ہونے کی درمیانی مدت کے لیے ہی سہی، یہ راحت اور آرام کے ایک مامن میں محفوظ ہو گیا ہے"۔

اس کتب خانے میں قرآن شریف کے بعض نسخے انتہائی نایاب ہیں، میں خاص طور پر

مشہور خطاط یاقوت مستعصمی کے لکھے ہوئے ایک نسخہ کا ذکر کروں گا، اس کے آخر میں اس کے دستخط اور ۶۶۸ھ کی تاریخ درج ہے۔ اس جلد کے ہر صفحہ پر متن کی عبارت خطاطی کے تین طرزوں میں لکھی گئی ہے، یہ خط نسخ، ریحان اور ثلث ہیں پہلا طرز خط یعنی نسخ خود یاقوت کا ایجاد کیا ہوا ہے، میرے لیے تو خط کے حسن کے اظہار کا اس سے بہتر اور اس سے حسین تر نمونے کا تصور کرنا بھی مشکل ہے، قرآن مجید کا ایک اور نسخہ اپنی ماہرانہ خطاطی کے لحاظ سے تو نہیں، البتہ اپنی غیر معمولی تزئین کے لحاظ سے اس نسخہ سے بھی ممتاز ہے، قرآن شریف کا یہ نسخہ جو حد درجہ سجا سجایا ہے اور بہت بڑی تقطیع پر لکھا گیا ہے، اس کے چوڑے حاشیہ پر ایک فارسی تفسیر نیلے حرفوں میں لکھی گئی ہے، کتابوں کی حد تک اس سے زیادہ مرصع اور آراستہ پیراستہ کتاب کا تصور بھی مشکل ہے، ہر سورہ دہرے سے شروع ہوتی ہے اس پر نیلا اور طلائی کام ہے، لاجورد، فیروزی اور معدنی لاجورد کے نازک گل بوٹے بنائے گئے ہیں اور سرخ اور شنگرفی رنگوں کے ملاپ سے ایک نئے رنگ میں گلکاریاں کی گئی ہیں، ہر سورہ کا عنوان سفید حرفوں میں لکھا گیا ہے، ہر سورہ کی ابتدا سفید حرفوں سے ہوتی ہے جو گہری نیلی زمین پر لکھے گئے ہیں، حاشیوں کے کئی سلسلے ہیں اور ان کے اندر یہ مقدس الفاظ لکھے گئے ہیں، جیسے انھیں عام دنیا سے الگ کر کے ایک احاطے میں رکھا گیا ہے، اسی طرح قرآن شریف کی تفسیر ہے۔ اس کے گوشوں پر گل کاری کی پٹیاں ہیں جو طلاء سے بنائی گئی ہیں، ان کے سوا چھوٹے چھوٹے طغرے ہیں۔ نیلے، سرخ اور سنہرے اس کے بعد مقدس متن ہے، بڑے بڑے واضح حروف سیاہی سے لکھے ہوئے اور ایک انچ چوڑے اس قرآن شریف کا کاغذ جلادار ہے اور ریشم کی طرح ہلکا اس کے باوجود اس شاہانہ جلد کا وزن جس پر خالص سونا مڑھا گیا ہے، دس سیر سے کم نہ ہوگا، یہ پتہ نہیں یہ نسخہ کہاں سے اور کیسے یہاں آیا، پر اتنا یقین ہے کہ یہ نسخہ کسی عظیم ترین پُرشکوہ عہد میں عالم وجود میں آیا ہوگا۔

یہاں تاریخ خاندان تیموریہ کا ایک نہایت نادر انتہائی مطلا اور نفیس نسخہ بھی ہے، مصوری اور صناعی کے لحاظ سے یہ کتاب آرٹ کا ایک بے بہا خزانہ ہے، اس کے کم از کم ۱۳۳ ورق مصور ہیں۔

یہ تصویریں اکبر کے زمانے کے بعض نہایت مشہور مصوروں کے قلم کی ہیں، ہر ورق کے نیچے اس مصور کا نام لکھا ہے جس نے یہ تصویر بنائی ہے۔

اکبر اور جہانگیر کے درباروں میں مصوروں کو بڑی اونچی جگہ ملتی تھی ان میں سب سے زیادہ نامور مصور ایران کے شہر شیراز کا رہنے والا خواجہ عبدالصمد تھا، اس نے ہمایوں کو خطاطی اور مصوری سکھائی تھی، عبدالصمد کو اکبر کے عہد میں بہت بڑا منصب عطا ہوا، اکبر نے اسے شیریں قلم کا خطاب بھی دیا تھا، ان تصویروں میں چاہے کوئی تصویر لے لیجیے، ہر ایک میں بس واقعات ہی واقعات دکھائے گئے ہیں، ان پر سونے کا کام کیا گیا ہے، پھر رنگ برنگ کی مینا کاری سے انھیں مزین کیا گیا ہے، یہ ایسے لوگوں کا کارنامہ ہے جن کے پاس وقت کا سوال کچھ اہم نہ تھا بلکہ اپنے آقا کی خوشنودی ہی سب کچھ تھی، جملہ تصویروں میں سے ۹۷ تصویریں تیمور کی زندگی سے متعلق ہیں، یہ اس تیمور کی تصویریں ہیں جو فتنہ تھا، یہ تصویریں تیمور کی زندگی کے اس دور سے شروع ہوتی ہیں، جب وہ چھوٹا سا بچہ تھا، اور ایک معصوم اور نونہال بچے کی طرح اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھیلتا تھا، پھر یہ تصویر اس کی موت پر ختم ہو جاتی ہے، جب کہ وہ ایک جہاں کا خون اپنی گردن پر لیے اس دنیا سے چلا ہے، محاصرے اور لڑائیاں مصوروں کا مرکزی موضوع رہا ہے، لیکن جہاں انھوں نے فاتح کے بچپن اور اس کی جوانی، مسجدوں اور باغوں کے پُرسکون چاردیواریوں کے اندرونی منظر کو دکھایا ہے جن میں چڑیاں چہچہا رہی ہیں نہروں کا پانی سریلے الاپ کے ساتھ بہہ رہا ہے اور جن میں مؤذن کی اذان مسلمانوں کو نماز کے لیے بلا رہی ہے، وہاں ان مصوروں نے ان تصویروں میں اپنے قلم کا پورا زور صرف کر دیا ہے، اور انھیں جی جان سے بنایا ہے۔

پھر تاریخ اس فاتح کے بیٹوں پوتوں سے گذر کر بابر کی زندگی اور اس کی مہموں تک لے آتی ہے، بابر ان لوگوں میں تھا جن کی ذات میں مشرق اور مغرب دونوں یکجا ہو جاتے ہیں، اس لیے سب ہی اس کی صحبت سے لطف اندوز ہوتے ہیں، ایک حد درجہ مرصع صفحہ پر اس کے بیٹے ہمایوں کی جشن ولادت کا منظر دکھایا گیا ہے، یہ وہی ہمایوں ہے جس کے لیے آگے چل کر خود بابر اپنی جان صدقے میں دینے والا تھا ایک اور رنگین صفحہ پر اس سے بھی زیادہ ایک اہم واقعہ کو

پیش کیا گیا ہے، یہ شہنشاہ اکبر کی ولادت کا منظر ہے ایک اور شاندار صفحہ پر خود ہمایوں کی زندگی کے ایک خوش نصیب لمحے کی عکاسی کی گئی ہے، یہ قلعہ چمپانیر کی فتح کی تصویر ہے، آخر میں ان رنگین صفحوں سے ایک اور تصویر پیش کی جاتی ہے، یہ اکبر کی جوانی کی تصویر ہے، اس تصویر میں چتوڑ کے قلعہ کے محاصرہ کا منظر پیش کیا گیا ہے۔

اس کتاب پر شاہجہاں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک عبارت بھی درج ہے اس میں شاہجہاں نے بتایا ہے کہ یہ تاریخ شاہ بابا کے عہد میں لکھی گئی، شاہ بابا سے مراد شہنشاہ اکبر ہے، شاہجہاں اپنے دادا کو ہمیشہ اسی پیار کے نام سے یاد کیا کرتا تھا۔

اس کتب خانہ میں حسینی کا شہنشاہ نامہ بھی موجود ہے، یہ نفیس اور بے نظیر کتاب سلطان محمد سوم کے نام معنون کی گئی تھی، پھر نہیں معلوم کس طرح شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان پہنچ گئی، یہاں پھر وہ شاہی خزانے میں داخل ہوگئی، اس کتاب پر شاہزادی جہاں آرا، بنت شاہجہاں کی تحریر پڑھی جا سکتی ہے، جہاں تک معلوم ہو سکا ہے، دنیا میں شہنشاہ نامہ کا اور کوئی نسخہ موجود نہیں، اس میں جو تصویریں بنائی گئی ہیں وہ ہندوستانی یا ایرانی قلم سے بالکل ہی مختلف ہیں، ان تصویروں پر بازنطینی اثر نمایاں ہے، ان میں کے بعض مناظر تو عالمی تاریخ سے متعلق ہیں، یہاں ہمیں سلطان محمد ثانی (فاتح) کی کمان میں اسلامی فوجیں قسطنطنیہ پر حملہ کرتی نظر آتی ہیں پھر باسفورس سے ان کے گزرنے کا منظر دکھائی دیتا ہے، ایک تصویر میں سلطان سلیم عثمانی کو مصر کے آخری عباسی خلیفہ متوکل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پرچم اور حضور کی ردائے مبارک حاصل کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

یہاں فردوسی کے شاہنامہ کا ایک شاندار نسخہ بھی ہے یہ نسخہ مشہور ایرانی امیر علی مردان خاں نے شہنشاہ شاہجہاں کے حضور میں بطور نذر پیش کیا تھا، جس نے یہ نذر پیش کی ہے، اور جس کے حضور میں پیش کی گئی ہے، یہ کتاب دونوں کے شایان شان ہے، اسے نہایت حسین طلا کار ایرانی تصویروں سے مزین کیا گیا ہے، متن نہایت خوبصورت واضح اور پختہ نستعلیق خط میں سنہری خط کھینچ کر چار جدولوں میں لکھا گیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ شاہوں کے لائق چیز ہے اس کا مسحور کن

حسن دیکھنے والوں کو اس کے اپنے ماحول سے اٹھا کر گویا دو سواتی سال پہلے کی دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔ جب یہ کتاب دربار میں اس شہنشاہ کے حضور میں نذر گذاری گئی تھی، کہ شان وشکوہ میں اس سے بڑھ کر کوئی شہنشاہ دنیا کے کسی تخت پر نہ بیٹھا ہوگا، ۱۹۱۱ء میں دہلی دربار کے موقع پر یہ تاریخی کتاب شاہ جارج پنجم کے سامنے پیش کی گئی تھی، اس پر بادشاہ کے دستخط بھی ہیں۔

اس کتب خانہ میں جامی کی کتاب سلسلۃ الذہب کا ایک نسخہ ہے، قدر شناسوں کے نزدیک اس نسخہ کی اہمیت بہت زیادہ ہے کیونکہ یہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس میں مصنف نے اپنے فرزند کی ولادت کی تاریخ درج ہے۔

جامی کی شہرۂ آفاق کتاب مثنوی یوسف زلیخا بھی یہاں ہے۔ مثنوی کا یہ نسخہ حد درجہ مرصع ہے اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مشہور خطاط میر علی ہروی کے قلم کا اعجاز ہے، ہروی نے اسے ۹۳۰ھ میں لکھا تھا۔ عبدالرحیم خانخاناں نے اسے شہنشاہ جہانگیر کے حضور میں پیش کیا تھا، مثنوی کا ایک اور نسخہ بھی یہاں موجود ہے جو خطاطی کے نامور استاد میر عماد کے قلم کا کرشمہ ہے، اس کے رنگین اور مصور ورق جو اس کتاب کی جان ہیں غیر معمولی حسن اور خوبی کے حامل ہیں۔

اس کتب خانہ میں ایک بڑی ہی نادر چیز ہے کچھ اپنی خصوصیات ہی کی وجہ سے نہیں بلکہ شہنشاہوں سے وابستہ رہنے کی وجہ سے بھی، یہ دیوان حافظ کا ایک نسخہ ہے اس کتاب کے حاشیوں پر شہنشاہوں نے جو عبارتیں لکھی ہیں وہ ان حالات کو پیش کر دیتی ہیں جس میں اس چھوٹی سی کتاب سے قسمت کا بھید پوچھا گیا تھا۔ بوستاں کا انتخاب بھی یہاں موجود ہے نہایت مطلا اور مذہب ہے اس کی لوح کے دونوں ورق ایسی ایسی گلکاریوں سے سجائے گئے ہیں جیسے محلوں کے ایرانی قالین۔ اس سے بھی زیادہ دل کش اس کا آخری ورق ہے، ہر غزل کی ابتدا نازک نازک طلائی پھولوں سے مزین، اس کی خطاطی میر عماد کے قلم کا اعجاز ہے۔

عربی مخطوطات میں مندرجہ ذیل نسخے نایاب ہیں۔

(۱) الجامع الصحیح للامام البخاری: یہ نسخہ ۹۱۱ھ کا مخطوطہ ہے جب بنگال کے بادشاہ سلطان حسین کے لیے لکھا گیا ہے، یہ بڑی تقطیع کا نہایت نفیس نسخہ ہے تین

جلدوں میں نہایت پاکیزہ خط نسخ میں لکھا ہوا ہے۔ ہرنئی عبارت ایک سنہری لوح کے ساتھ شروع کی گئی ہے جو حاشیہ پر بنائی گئی ہے، یہ لوح کچھ اس طرح بنائی گئی ہے جیسے اس کے چاروں طرف شعاعیں نکل رہی ہیں، متن میں ہر فصل کا عنوان نہایت نازک سنہرے حروف میں لکھا گیا ہے، ہر حدیث کی ابتداء سرخی سے کی گئی ہے اور کلام پاک کی آیتیں نیلے حروف میں لکھی ہیں، بڑے بڑے سنہرے وقف اس شاہانہ نسخہ کا حسن بڑھا رہا ہے، یہ کتاب یہاں کیسے آئی؟ معلوم ہوتا ہے بہت سے انقلابوں کے بعد جب بنگال کی سلطنت ختم ہوگئی تو یہ کتاب عرب کے ایک ممتاز عالم اور زمیندار کے قبضہ میں آئی۔ ہندوستان میں انگریزوں نے وہابی تحریک کے نام سے جس اسلامی تحریک کو کچلنے کے لیے سرفروش مجاہدوں کو تباہ و برباد کیا ہے، ان میں یہ ایک زمیندار بھی تھے۔ انگریزی حکومت نے وہابیت کے الزام میں ان کی جائداد کو ضبط کر لیا، اسی انقلاب میں یہ کتاب یہاں پہنچ گئی۔

(۲) التیسیر فی القرأة: تجوید و قرأة پر امام ابوعمر بن سعید الدانی کی تصنیف مخطوطہ ۸۴۵ھ عنوان اور وقف کی علامتیں مطلا ہیں، کاغذ ہلکے زرد رنگ کا ہے، مصر کے مملوک سلطان ظاہر جقمق کے شاہی کتب خانہ کے لیے لکھی گئی تھی۔

(۳) التهذیب فی القرأة: تجوید و قرأة پر مذکورہ بالا مصنف امام ابوعمر سعید الدانی کی ایک اور تصنیف۔ یہ کتاب نایاب ہے، اس کا دوسرا نسخہ کتب خانہ ایا صوفیہ کے سوا اور کہیں نہیں ہے۔ بہترین خط نسخ میں اس کی کتابت کی گئی ہے، مخطوطہ ۷۲۶ھ۔

(۴) شرح التاویلات: امام ابومنصور ماتریدی نے حنفی نقطۂ نظر سے ایک تفسیر تاویلات لکھی ہے جس کی یہ شرح ہے۔ شارح چھٹی صدی ہجری کے ایک عالم ابوبکر محمد بن احمد السمر قندی ہیں، اس کتاب کا دوسرا نسخہ ابھی تک کہیں دستیاب نہیں ہوسکا مخطوطہ ۶۳۱ ہجری۔

(۵) الاتقان فی علوم القرآن: امام سیوطی کی مشہور کتاب ہے، موجودہ نسخہ مصنف کے وفات کے چار سال بعد ان کے شاگرد محمد بن علی الدوادی متوفی ۹۴۵ھ نے لکھا ہے۔

(۶) الملخص: مؤطا کی تلخیص، ابوالحسن علی بن محمد بن خلف متوفی ۴۰۳ھ کے قلم سے کتاب نایاب ہے، مخطوطہ ۶۲۸ھ۔

(۷) النکات و الطرائف: حافظ ابن حجر عسقلانی ۸۵۲ھ کی تصنیف کا دنیا میں واحد نسخہ مخطوطہ ۸۵۷ھ۔

(۸) الاشارات: (ابن سینا) مخطوطہ ۵۳۶ھ۔

(۹) نہایت الادراک: (نصیرالدین طوسی) مخطوطہ ۶۹۰ھ۔

(۱۰) التجرید فی المنطق: (نصیرالدین طوسی) یہ نسخہ واجد علی شاہ کی ملک میں رہ چکا ہے۔

(۱۱) غنیة الحساب: علم الحساب پر چھٹی صدی کے ایک ریاضی داں علی بن ثابت کی تصنیف کا دنیا میں واحد نسخہ۔ مخطوطہ ۷۸۶ھ۔ اس پر گولکنڈہ کے فرماں روا سلطان محمد قطب شاہ کی مہر ثبت ہے۔

(۱۲) الرسالة القشیریة: مخطوطہ ۴۳۸ھ۔ مصنف کی زندگی میں اس نسخہ کی کتابت کی گئی (قدیم ترین نسخہ)۔

(۱۳) مرآۃ الزمان: (سبط ابن الجوزی متوفی ۶۵۴ھ) موجودہ نسخہ سیرت پر مشتمل ہے (آٹھویں صدی کا مخطوطہ)۔

(۱۴) ذیل طبقات الحنابلہ: یہ ذیل تیرہویں صدی کے ایک عالم محمد بن علی النجدی کے قلم سے ہے اس میں ۷۵۸ھ سے ۱۲۹۵ھ تک کے مشاہیر کا تذکرہ ہے۔ (نادر نسخہ)۔

(۱۵) المضحکات: مولفہٗ ابوالحسن بن احمد المقدسی التوفی ۶۹۰ھ ساتویں صدی ہجری کا مخطوطہ (نادر)۔

(۱۶) جامع العلوم و الحکم شرح خمسین حدیثا من جوامع الکلم: مولفہ

امام ابن رجب حنبلی۔ مصنف کی زندگی میں لکھا گیا مخطوطہ ۷۹۰ھ۔

(۱۷) اربعین: حافظ ابن حجر عسقلانی، مصنف کی زندگی میں لکھا گیا مخطوطہ ۸۳۶ھ۔

(۱۸) مختصر النهایه: مولفہ عبداللہ بن محمد ہبۃ اللہ متوفی ۵۸۵ھ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ مخطوطہ ۵۶۵ھ۔

(۱۹) منهاج السنه: (شیخ الاسلام ابن تیمیہ) مخطوطہ ۸۱۱ھ۔

(۲۰) المقابسات: (ابوحیان توحیدی) ساتویں صدی کا مخطوطہ۔

(۲۱) شرح فصوص الحکم: (جامیؔ) خود مصنف کا نسخہ۔ مخطوطہ ۸۹۶ھ۔

(۲۲) القول البدیع فی الصلوٰۃ علی الحبیب الشفیع: مولفہ امام شمس الدین السخاوی المتوفی ۹۰۲ھ مخطوطہ ۸۶۶ھ۔

(۲۳) جوامع الکلم (شیخ علی متقی) خود مصنف کا نسخہ۔

(۲۴) کتاب التصریف (زہراوی) مخطوطہ ۵۸۴ھ۔

(۲۵) کتاب الجامع (ابن بیطار) مخطوطہ ۶۸۹ھ۔

(۲۶) کتاب القانون (ابن سینا) مخطوطہ ۶۲۷ھ۔

(۲۷) کتاب الوبا (قسطا بن لوقا) مخطوطہ ۱۰۵۳ھ۔

(۲۸) کتاب الکاشف (امام ذہبی) مخطوطہ ۷۳۲ھ۔

(۲۹) کتاب الایضاع (ابوعلی فارسی) مخطوطہ ۵۹۹ھ۔

(۳۰) المثل السائر (ابن اثیر) مخطوطہ ۶۲۸ھ۔

نوٹ: روزنامہ قومی آواز لکھنؤ میں اب سے ۴ ماہ قبل ایک مضمون اس عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کی تیاری میں مرتب نے اس سے بعض اقتباسات نقل کیے تھے، لیکن افسوس کہ حوالہ گم ہو جانے کی وجہ سے مقالہ نگار کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

☆☆☆

(ہندوستان کے مشرقی کتب خانے از سلمان شمسی ندوی لکھنؤ ۱۹۷۳ء)

ڈی۔سی اسکاٹ او کونر
مترجم: سید مبارز الدین رفعت

ایک مشرقی کتب خانہ

کتب خانہ خدا بخش یا جیسا کہ وقف نامہ میں اس کے بانی نے انکسار کے ساتھ اسے ''دی پٹنہ اورینٹل پبلک لائبریری'' کا نام دے دیا ہے، دنیا میں اسلامی ادبیات کے بے بہا خزانوں میں ایک نفیس ترین خزانہ ہے۔

یہ کتب خانہ ہمیشہ کے لیے۔۔۔ جہاں تک انسان کے بس میں مستقبل کی صورت گری ہے۔۔۔ پٹنہ میں قائم کیا گیا ہے۔ پٹنہ وہ شہر ہے جو پچیس سو سال سے زمانے کے کتنے ہی تماشے دیکھتا آیا ہے۔ پٹنہ نیک دل شہنشاہ اشوک کا شہر رہا جس نے اپنی دنیا پر مہر و محبت کے ساتھ حکمرانی کی کوشش کی۔ پٹنہ اس کے دادا مہم پسند چندر گپت موریا کا شہر رہا۔ اسی چندر گپت نے دریائے جہلم کے ساحل سے لوٹتے ہوئے سکندر سے مشرقی مملکت کے راز سیکھے۔ پٹنہ سفیر میگاستھنیز کا شہر رہا جس نے یہاں اپنی زندگی کے آٹھ سال بسر کیے اور جو حضرت عیسیٰ کی ولادت سے تین سو سال پہلے کے ایک ہندوستانی شہر کی زندگی کی ایک جیتی جاگتی تصویر بنا کر یورپ والوں کے لیے چھوڑ گیا۔

اور یہیں اسی شہر کی گلیوں میں، اس شہر کے بننے سے پہلے، اور ایسے وقت جب کہ اس کے بنانے والے اس کی بنیادیں ہی اٹھانے میں لگے ہوئے تھے، لوگوں نے مہاتما بدھ کو آتے جاتے دیکھا۔ ان کا فکر مند اور اترا ہوا مکھڑا دیکھا۔ ان کو نجات دلانے والی دنیا کی کھوج میں گھومتے دیکھا۔ اسی لیے تو آج بھی دنیا کے چار کروڑ سے زیادہ انسان اس شہر کو ایک مقدس مقام مانتے ہیں۔

اس طرح اس کتب خانے کو بڑا اچھا ماحول ملا ہے۔ خود کتب خانہ بھی کچھ کم امتیاز کا

حامل نہیں اس کے اندر گزرے ہوئے عالموں اور گزرے ہوئے بادشاہوں کی یاد محفوظ ہے۔ اس کے اندر نامعلوم ہاتوں کی یاد محفوظ ہے۔ ایک ایسی ثقافت کی یاد محفوظ ہے جو اب اگرچہ مر رہی ہے یا بڑی حد تک مرچکی ہے، لیکن اسی ثقافت نے دنیا پر بڑا گہرا اثر ڈالا تھا۔ اسی ثقافت نے قرطبہ سے لے کر دلی تک اس کے بہت بڑے شاہکاروں کو جنم دینے میں تخیل کا ہاتھ بٹایا تھا۔ اتنا ہی نہیں، اخلاق اور آداب کا ایک ایسا دبستان پیش کرنے میں اس کی کارفرمائی اب بھی جاری ہے ___ اگرچہ افسوس اس کا ہے کہ یہ کارفرمائی کم سے کم ہوتی جاتی ہے ___ جو اپنی امتیازی دل کی آویزی کے لحاظ سے بے مثال ہے۔ اس ثقافت کا اثر حسنِ اخلاق کے مکمل نمونے پیش کرنے میں اب بھی جاری وساری ہے۔

جو لوگ قدیم اسلامی دنیا کے تصورات سے آشنا ہونا چاہتے ہیں، ان کی آرزو سے کچھ زیادہ ہی یہ کتب خانہ ان کو نہال کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس طرح یہاں اس تاریخی مقام پر، ایک افسانوی ندی کے کنارے ایک محفوظ بندرگاہ میں اس کے بچے کھچے تمام حصے جمع کر دیے گئے ہیں جو کبھی ایک زبردست بیڑا تھا۔ یہ بیڑا کبھی اپنے گلابی، شنگرفی اور سنہری بادبان کو گرم سلطنی کے بادشُرط پر اڑاتا جاتا اور شہنشاہوں کے لیے باعث فخر خزانے لاتا تھا۔ یہ خزانے اپنے زمانے میں ایسے تابناک تھے کہ ان کا دنیا میں کہیں جواب نہ تھا۔

یہاں اصلاً مبالغہ سے کام لینا مقصود نہیں، پر مشرق کے ایک ایسے تابناک کارنامے کے ذکر میں تخیل کی تھوڑی سی گرمی معاف رکھی جائے گی کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں پرکار خطاطی، سونے کی مینا کاری، لاقیمت کتابی نقاشی اور لاجوردی، شنگرفی، گلابی، زعفرانی اور نیلے، سرخ اور سبز رنگوں سے بعض صفحوں پر تصویر کاری سے بڑھ کر اور چیز ہو نہیں سکتی۔ ان کی سادگی اور پُرکاری سے بڑھ کر دل پر اثر کرنے والی کوئی چیز دیکھی گئی اور نہ سنی گئی۔ جن انقلابوں میں ان چیزوں نے اپنا حصہ ادا کیا ہے ان سے کہیں زیادہ یہ خود اصلی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ دیکھیے۔ یہ دمشق یا ازہر کے کسی غریب عالم کی لکھی ہوئی کتاب کا دنیا میں ایک ہی نسخہ ہے۔ یہ دیکھیے۔ یہ کتاب کسی شہنشاہ یا کسی بادشاہ کو تحفہ میں پیش کی گئی ہے۔ یہ دیکھیے۔ یہ کتاب کسی خانخاناں یا شاہانِ مغلیہ

کے کسی امیر کی خدمت میں بطور نذر پیش کی گئی ہے۔ یہ دیکھیے۔ اس کتاب نے کسی بادشاہ کو عین مایوسی اور بے بسی کے عالم میں اس کی قسمت کا حال بتایا ہے۔ یہ دیکھیے۔ یہ کتاب ہیروں سے آراستہ پیراستہ کسی شہزادی کا دل پسند کھلونا رہی ہے۔ یہ شہزادی اپنی نسل کے اور لوگوں کی طرح شاعرہ تھی، اور سچ مچ اونچے درجے کی شاعرہ تھی۔ یہ دیکھیے۔ یہ کتاب مال غنیمت کا ایک حصہ ہے جو کسی فاتح کے ہاتھ لگا ہے جو عورتوں، ہیروں، کپڑوں اور سونے چاندی کی چیزوں کے ساتھ اس کے قبضہ میں آیا ہے۔ اور اس کے پچھلے مالک نے ابھی ابھی قبر کا کونا آباد کیا ہے۔ یہ دیکھیے۔ یہ ایک اجڑتے دربار کا آخری خزانہ —— چرا گیا، چھپا کر رکھا گیا، ہاتھوں ہاتھ ایک سے دوسرے تک پہنچایا گیا، پانی میں بھیگا، دیمک نے چاٹا، اور کیڑوں نے اس سے اپنا پیٹ بھرا۔ پھر کسی بھوکے خاندان کا پیٹ پالنے کے لیے بیچا گیا۔ اور اب آخر کار —— آرام کے دن پورے ہونے اور پھر سے ایک نئی گردش شروع ہونے کی درمیانی مدت کے لیے ہی سہی —— یہ راحت اور آرام کے ایک مامن میں محفوظ ہو گیا ہے۔

نوادرات کے اس مجموعہ کی تاریخ بھی سن لیجیے۔ انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں مغلوں کی شاندار سلطنت کا محل زمین کے برابر ہو چکا تھا، اور انگریزی راج کی لائی ہوئی شانتی جس کی قدر و قیمت کو اب کچھ گھٹا کر ہی دیکھا جانے لگا ہے —— اپنی پوری چمک دمک کے ساتھ اس ملک میں پھیل رہی تھی۔ اسی زمانے کا ذکر ہے بہار کے شمال میں ایک شریف مسلمان محمد بخش رہتے تھے۔ ان کا گھرانا عالموں اور قاضیوں کا گھرانا تھا۔ کہتے ہیں اس خاندان کے ایک عالم نے بھی فتاویٰ عالم گیری کی تالیف میں حصہ لیا تھا۔ محمد بخش خود بھی عالم تھے، شاعر تھے اور اپنی فرصت کے اوقات میں مشرقی ادب کی کتابیں جمع کرتے تھے۔ مرتے وقت وہ اپنے بیٹے اور کتب خانہ کے بانی خدا بخش کے لیے چودہ سو کتابیں چھوڑ گئے۔ ان چودہ سو کتابوں میں سے صرف تین سو کتابیں انھیں اپنے اسلاف سے ورثے میں ملی تھیں اور باقی گیارہ سو کتابیں خود انھوں نے جمع کی تھیں۔ سن رسیدہ محمد بخش نے بستر مرگ پر جو آخری درخواست کی وہ یہ تھی کہ ان کے بعد یہ کتابیں منتشر نہ ہونے پائیں بلکہ ہو سکے تو شہر پٹنہ میں ایک بڑے کتب خانہ کا مرکز بن

جائیں اور یہ کتب خانہ مشرقی علوم کی اشاعت کا سبب بنے۔ کیونکہ مشرقی علوم کی تحصیل کا شوق میکالے کے زبانی حملوں کی وجہ سے اور کچھ انگریزی زبان کے بڑھتے ہوئے اثر کی وجہ سے پھیکا پڑتا جا رہا تھا جوان ہمت بیٹے نے جسے ورثے میں ان کتابوں کے سوا اور کچھ نہ ملا تھا، اپنے باپ کی یہ تمنا پوری کر دکھائی۔ تلاش معاش کے دوران میں پہلے وکیل کی حیثیت سے اور پھر جج کی حیثیت سے وہ سیکڑوں آدمیوں سے ملے۔ اور پورے ہندوستان میں خوب گھومے پھرے۔ دہلی، حیدرآباد اور لکھنؤ جیسے بڑے بڑے شہروں سے وہ خوب واقف تھے۔ نایاب کتابوں کے جمع کرنے والے کی حیثیت سے ان کی شہرت نادر اور کمیاب کتابوں کے مالکوں تک پہنچ چکی تھی۔ ہندوستان کی سرحدوں سے باہر اسلامی مشرق ان کے دائرۂ عمل سے باہر تھا۔ لیکن جہاں پکا ارادہ ہوتا ہے وہاں راستہ نکل ہی آتا ہے۔ بے تاب جذبہ اپنے مقاصد کی تکمیل میں سرحدوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ خدابخش اپنی ایک پڑوسی ریاست کے والی سے جو کتابیں جمع کرنے کے بڑے شائق تھے، کسی طرح پیچھے رہنا نہیں چاہتے تھے۔ اپنے دل کی یہ آرزو پوری کرنے کے لیے انھوں نے اپنا ایک قاصد مقرر کیا۔ یہ قاصد ایک عرب تھا جو اٹھارہ سال تک قاہرہ، دمشق، بیروت، مصر اور ایران کے کتب خانے کھنگالتا رہا۔ اور ہر بار اپنے آقا کے لیے جو جو قلمی کتابیں اس کے پلے پڑیں ان سے لدا پھندا شاداں و کامراں واپس آتا رہا۔

یہ واقعہ ہے کہ اس عرب نے جس طرح کتابیں جمع کی ہیں وہ عام طریقہ سے بڑھ کر رومانس اور مہم پسندی کی دلکش داستان معلوم ہوتی ہے۔ اگر اس عرب کی زندگی کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھے جاتے تو ایک نہایت جاندار اور دلچسپ سوانح عمری ہوتی۔ کیونکہ نہ تو وہ خود کوئی امیر آدمی تھا اور نہ جس کی نمائندگی وہ کرتا تھا وہ کوئی دولت مند شخص تھا۔ ان مہموں کے لیے اسے ماہانہ پچاس روپے سے زیادہ تنخواہ نہ ملی۔ بہلانے پھسلانے، سازش اور چاپلوسی کے فن (اور اس جانفشانی کو کیا کہیے جو ہر مشکل پر فتح پا لیتی ہے)، انتہائی صبر اور ان انتھک جستجو پر ہی اس ادبی قاصد نے اپنی کامیابیوں کے لیے تکیہ کیا ہوگا۔ ایسی بے پناہ مشقت کی مثال دیکھنی ہو تو قرون وسطیٰ کے یورپ کے بعض اولیاء کے تذکرے پڑھ کر دیکھیے جن میں بعض نصرانی اولیاء کی

ہڈیوں کی منتقلی کا حال درج ہے۔ یہاں مجھے ایسا ہی ایک قصہ یاد آ گیا۔ اس قصہ میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح پرودنگل کے پادری کی متبرک ہڈیاں قطلاں کے گرجے کو مقدس بنانے کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی گئیں۔ یہ کام راہبوں اور سپاہیوں کی ایک جماعت نے مل کر کیا تھا، جنھیں اس کام کے لیے خاص طور پر مقرر کیا گیا تھا۔ اس بڑے کام کو ہاتھ میں لیتے وقت کسی نے بھی یہ نہ سوچا کہ اس کو پورا کرنے کے ذرائع ان کے پاس موجود بھی ہیں یا نہیں۔ کچھ کم یا زیادہ ہزار سال لڑائی لڑی تھی۔ اور آج بھی تو ہمارے چھوٹے ہمسائے جو افغانی سرحد کے اس پار رہتے ہیں، ان کا یہ حال سننے میں آتا ہے کہ اگر ان کے گاؤں کے پیر وہ گاؤں چھوڑ کر کسی اور جگہ آباد ہونا چاہیں تو وہ پیر صاحب کو مار کر گاؤں میں ان کی درگاہ بنالیں گے لیکن پیر صاحب کی متبرک ہڈیوں سے محروم ہونا گوارا نہ کریں گے۔

کتب خانے کے بانی کے صاحبزادوں نے بڑے فخر اور کچھ مزاح کے ساتھ بتایا کہ اس کتب خانے کی بہت سی قلمی کتابیں چرائی ہوئی ہیں۔ کتب خانے کے بانی اور اس کے بہت سے قاصدوں کے دل میں علم کی محبت اس درجہ گہری تھی کہ وہ ایک شخص کی ملک اور دوسرے شخص کی ملک کے درمیان جو باریک ـــــ اسے اگر معمولی کہا جائے تو کیسا رہے ـــــ خط ہوتا ہے اس کو نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔

بہر حال سابق میں جو کچھ ہوا ہو، اب تو کتابیں یہاں رکھی ہیں۔ نہایت شاندار اور قابل تعریف مجموعہ! یہ کتابیں شہر پٹنہ کی عظمت کو چار چاند لگاتی ہیں۔ دوسری طرف یہ واقعہ ہے کہ ان کتابوں کا مالک ایک غریب آدمی کی موت مرا۔ اس نے اپنا پورا سرمایہ ان کتابوں کے حاصل کرنے اور ان کی حفاظت کے لیے ایک خوشنما عمارت بنانے پر صرف کر دیا اور ہمیشہ کے لیے ان سب کو اپنے ہم وطنوں کے لیے وقف کر گیا۔ اب کتب خانے کے بانی کے تقدس کے بارے میں بہت سے قصے سننے میں آتے ہیں۔ ایسی باتیں بڑی حد تک قابل معافی ہوتی ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ کتب خانے کے بانی اور ان کے رفیقوں کے صوفیانہ رجحان کے بغیر ایسے شاندار مجموعہ کا حاصل کرنا بڑی حد تک مشتبہ ہی نظر آتا ہے۔

آپ قصے سنیں گے کہ کتب خانے کے بانی کے پاس فرشتے آتے تھے، خواب میں انھیں بشارتیں دیتے اوران کے کام میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے ایک بار تو خود رسول صلعم اس کتب خانے میں جلوہ فرما ہوئے تھے۔ عہد اورنگ زیب کی تاریخ کے ماہر جادوناتھ سرکار نے اس واقعہ کو قلم بند کیا ہے۔ ہم یہ واقعہ وہیں سے نقل کرتے ہیں۔

خدابخش صاحب نے کہا:

''ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ کتب خانے سے لگی ہوئی گلی میں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے ہیں۔ میں بھی گھر سے نکل پڑا۔ لوگ چلانے لگے:

''رسول اللہ (صلعم) تمہارے کتب خانے کی سیر کے لیے تشریف لارہے ہیں۔ تم کہاں ہو؟''

''میں اس کمرے کی طرف دوڑا جہاں قلمی کتابیں رکھی تھیں۔ اس وقت تک رسول اللہ صلعم تشریف لے جاچکے تھے۔

''لیکن یہاں حدیث کی دو قلمی کتابیں میز پر کھلی رکھی تھیں۔ لوگوں نے بتایا کہ ان دونوں کو رسول اللہ صلعم ملاحظہ فرما رہے تھے''۔

ان دونوں قلمی کتابوں پر کتب خانے کے بانی نے ایک نوٹ لکھا ہے۔ وہ یہ کہ کسی حالت میں بھی ان کتابوں کو کتب خانے سے باہر نہ لے جایا جائے۔

میرے دوست سرعلی امام لکھتے ہیں:

''خدا بخش مرحوم بڑی دلکش شخصیت کے مالک تھے اور قدیم اسلامی تہذیب کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ انھیں دیکھ کر مجھے وہ تصویریں یاد آجاتی تھیں جو داستان الف لیلہ کی ایک مصوّر جلد میں میں نے کہیں دیکھی تھیں۔ عجیب اتفاق ہے جب میں پہلی بار ان سے ملا ہوں اسی دن ہندوستان کے مشہور عالم مولانا شبلی نعمانی سے بھی میری ملاقات ہوگئی جو اس

وقت خدا بخش مرحوم کے مہمان کی حیثیت سے ان کے پاس ٹھیرے ہوئے تھے۔ ہم سب نے مل کر ایک کھلے میدان میں چائے پی۔ یہاں سے لہلہاتی فصلوں کے بڑے بڑے کھیت نظر آتے تھے۔ ان کے پرے دریائے گنگا کا پانی لہریں لے رہا تھا۔ ان کا نایاب خزانہ بہترین قلمی کتابوں کی صورت میں مولانا شبلی نعمانی کے ملاحظہ کے لیے پھیلا ہوا تھا۔ اور مولانا ایسی چیزوں کے مانے ہوئے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ ایک کے بعد دوسری نایاب و نادر کتاب اٹھائی گئی اور اس کا معائنہ ہوتا رہا۔ جب تک یہ شغل جاری رہا میں گویا مبہوت و مسحور انھیں بیٹھا دیکھتا رہا۔ نادر چیزوں کے جمع کرنے کا فخر، انھیں پرکھنے کا جوش وخروش اور قدیم چیزوں کی محبت سے خدا بخش مرحوم کا چہرہ دمک رہا تھا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت مولانا شبلی نعمانی کے چہرہ سے جھلکتی تھی جو اس وقت مجھے اسلامی تہذیب اور علمی تبحر کا مجسمہ نظر آتے تھے''۔

''اس کے بعد میں بارہا خدا بخش مرحوم کے دولت کدے پر حاضر ہوا۔ ایک بار جب میں نے کچھ ہچکچاتے ہوئے ان ذریعوں کی طرف اشارہ کیا جن سے انھوں نے یہ کتابیں جمع کی تھیں تو وہ مسکرا کر میری طرف دیکھنے لگے۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں ایک دلنواز دمک پیدا ہوگئی تھی''۔ انھوں نے کہا:

''نادر چیزیں جمع کرنے کا فن ہر چیز سے مستثنٰی اور فوجداری قانون سے بالا ہے، اپنی یہ گفتگو انھوں نے یہ کہہ کر ختم کی کہ'' اندھے تین قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کی بصارت زائل ہو جاتی ہے۔ ایک وہ جو اپنے دوست کو کوئی قیمتی کتاب دیکھنے کے لیے دیدیتے ہیں۔ اور ایک اندھے وہ ہیں جو ایک بار ایسی کتابوں پر قبضہ پانے کے بعد انھیں لوٹا دیتے ہیں''!

''خدا بخش مرحوم کو اپنی کتابوں سے بڑی گہری محبت تھی۔ ایک بار

برٹش میوزیم نے ان کتابوں کے لیے بڑی بھاری رقم پیش کی تھی۔لیکن خدا بخش مرحوم نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ایک بار انھوں نے مجھ سے کہا تھا' میں غریب آدمی ہوں،اور برٹش میوزیم والوں نے جو رقم پیش کی تھی وہ بہت بڑی اور بھاری رقم تھی۔لیکن کیا میں صرف پیسے کے لیے اس چیز سے دست بردار ہو جاؤں جس کے پیچھے میں نے اور میرے والد نے اپنی زندگیاں صرف کر دی ہیں'۔جب وہ یہ باتیں کر رہے تھے تو اس وقت ان کا نمایاں خدوخال والا چہرہ ایک اندرونی خوشی سے تمتما رہا تھا۔ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو کھیل رہے تھے۔

انھوں نے پھر کہا" میرا یہ کتب خانہ پٹنہ کے لیے ہے۔یہ تحفہ پٹنہ کے عوام کے لیے ہے،اور انھیں کی خدمت میں پیش کیا جائے گا"۔

۱۹۰۸ء میں خدا بخش مرحوم کی زندگی کے چھیاسٹھ سال پورے ہو گئے وہ بہار کے ضلع چھپرہ میں پیدا ہوئے تھے۔یہ ضلع دریا گنگا کے دامن میں واقع ہے۔کہتے ہیں اسی علاقے میں وید مقدس کی مناجاتیں لکھی گئی تھیں۔اپنی چھیاسٹھویں سالگرہ کے کچھ ہی دنوں بعد خدا بخش پٹنہ میں اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے۔انھیں کتب خانے کے احاطے ہی میں ایک چھوٹے سے کھلے مقام پر سپرد خاک کیا گیا۔یہ مقام کتب خانے کی دو الگ عمارتوں کے بیچ میں واقع ہے۔ان کی سیدھی سادی قبر کے اطراف ہری ہری گھاس کا ایک تختہ ہے اور مشرق کی تیز دھوپ میں نظریں اس تختہ پر بس ٹھٹھک کر رہ جاتی ہیں۔ان کی قبر کی زعفرانی ریشمی چادر پر روز گلاب، گیندے اور دوسرے رنگ برنگی پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ان کے صاحبزادے صلاح الدین(۱) کے قول کے مطابق" یہاں وہ اپنی زندگی کے سفر کے ختم پر اسلام کے بڑے بڑے مصنفوں کی یادگاروں کے جوار میں آرام کی نیند سو رہے ہیں۔

کتب خانے کے بانی کی وصیت ہے کہ کسی حالت میں بھی یہ کتب خانہ اس کے موجودہ مقام سے نہ ہٹایا جائے۔ان کتابوں کے رکھنے کے لیے یہ کتب خانہ ہے بھی نہایت

موزوں مقام۔لیکن ان کی اس وصیت میں اس سے زیادہ معنی پوشیدہ ہیں۔ہندوستان کی تاریخ میں جتنے بھی انقلاب آئے ہیں، ان میں یہ بات بار بار دہرائی جاتی رہی ہے اور شاید پھر دہرائی جائے کہ لوگ صرف ایک بات پر بھروسہ کرتے تھے ـــــ اگر چہ بار ہا اس میں انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے ـــــ اور وہ ہے گوشۂ قبر کے آرام کا یقین ہندوستان میں یکے بعد دیگرے حکمراں خاندانوں کے جاہ وجلال کا آفتاب جس عام تباہی میں گہنا تار ہا اس میں پچھلے شاہوں کی قبروں کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا۔مسلمانوں کی حد تک ان کی کچھ عبادت گاہیں باقی رہ گئیں جہاں وہ اپنے خدا کی عبادت کرتے تھے۔

اس لحاظ سے خدا بخش مرحوم کی قبر یہاں آنے والے لوگوں کے لیے ایک خاموش درخواست ہے۔ایک بے زبان التجا ہے کہ مرحوم کی یہ تمنا پوری ہوتی رہے۔ہمیں امید ہے ـــــ امید ہے کہ مرحوم کی یہ درخواست قبول ہوتی رہے گی۔

یہ ہے اس عجیب وغریب کتب خانے کی ابتداء اور اس کے اندر کا حال لیکن کتابوں کا حال آدمیوں جیسا ہے۔اور جو انھیں جاننا چاہتے ہیں انھیں چاہئے کہ وہ ان کتابوں کو ایک کے بعد ایک لیں، دیکھیں اور پڑھیں اس کے لیے جتنی محنت لگے گی اس کا تھوڑا سا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ سنہ ۱۹۰۴ء سے اس کتب خانے کی کتابوں کی مفصل فہرست تیار ہونی شروع ہوئی اور ابھی تک یہ مکمل ہونے نہیں پائی (۲) اس فہرست کے مرتب کرنے والوں کا ذکر اس کی چھپی ہوئی پہلی چار جلدوں کے مقدموں میں ''نوجوان طالب علموں'' کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔اس کام کی تیاری کے دوران میں یہ لوگ اب ادھیڑ عمر کو پہنچ چکے ہیں اور اس کام کے مکمل ہونے تک شاید بالکل ہی بوڑھے ہو جائیں ان کے کام کی نوعیت کا اندازہ ان ضخیم جلدوں سے لگایا جاسکتا ہے جنھیں مولوی عبدالمقتدر اور ڈاکٹر عظیم الدین (ان کے ساتھ اب مولوی عبدالحمید کا نام بھی شریک کرنا چاہیے) نے مل کر ڈاکٹر (بعد میں سراڈورڈ) ڈینی سن راس کی عمومی نگرانی میں تیار کیا ہے۔

ان فہرستوں کی مدد اور کتابوں کے معائنہ سے میرے لیے ان کتابوں کی ندرت، ان

کے حسن و جمال، ان کی عجیب و غریب بلکہ خوفناک گردش، انسانیت کی نسبت سے ان کی بے پناہ دلکشی اور ان کی سحر کاری کا حال بیان کرنا آسان ہو گیا ہے۔

یہاں تاریخ خاندان تیموریہ ـــــ یعنی ہندستان کے مغل بادشاہ جس خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس خاندان کی تاریخ ـــــ کا ایک نہایت نادر، انتہائی مطلا اور نفیس نسخہ بھی ہے۔ یہ خاندان مہم پسندوں کی جماعت سے ترقی کرتے کرتے اس مرتبہ پر پہنچا تھا، اور اس بات پر اسے فخر بھی تھا۔ اس فخر کا مظاہرہ آپ ان کتابوں پر لگی ہوئی بہت سی مہروں میں دیکھیں گے۔ ان مہروں میں تیمور ـــــ تاتاری تیمور لنگ ـــــ سے لے کر آخر تک پورا نسب نامہ کندہ ہے۔ بلکہ ان کا نسب نامہ تو اس سے بھی آگے جاتا ہے۔ ایک شاعر نے تند خو تیمور کی یہ کہہ کر مدح کی ہے کہ وہ چنگیز خاں کے گلستاں کا مہکتا گلاب ہے۔ اس عظیم الشان خاندان کی تاریخ کی حیثیت سے اس میں کوئی نئی اور نادر بات نہیں کیونکہ اس کے مطالب بڑی حد تک شرف الدین علی یزدی اور بابر کی مشہور خود نوشت ''تزک بابری'' سے نقل کیے گئے ہیں۔ لیکن اکبر کے دور کے آخری انیس سالوں کا جو حال اس میں ملتا ہے وہ مصنف نے عینی شاہد کی حیثیت سے لکھا ہے۔ مصوری اور صنائع کے لحاظ سے یہ کتاب آرٹ کا ایک بے بہا خزانہ ہے۔ اس کے کم سے کم (۱۳۳) ورق مصورہ ہیں۔ یہ تصویریں اکبر کے زمانے کے بعض نہایت مشہور مصوروں کے قلم کی ہیں۔ ہر ورق کے نیچے اس مصور کا نام لکھا ہے جس نے یہ تصویر بنائی ہے۔ مشرق میں یہ چیز بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ یہاں ان مصوروں اور ان تعمیر کاروں کے نام بہت کم یاد رکھے جاتے ہیں جنھوں نے بڑے بڑے شہنشاہوں کے ناموں کو لافانی بنانے میں بہت بڑا حصہ ادا کیا ہے۔ لیکن اکبر اور جہانگیر کے درباروں میں مصوروں کو بڑی اونچی جگہ ملتی تھی۔ ان میں سب سے زیادہ نامور مصور ایران کے شہر شیراز کا رہنے والا خواجہ عبدالصمد تھا۔ اس نے ہمایوں کو خطاطی اور مصوری سکھائی تھی۔ عبدالصمد کو اکبر کے عہد میں بہت بڑا منصب عطا ہوا۔ اس کی باریک بینی اور اس کے قلم کی پُر کاری ـــــ اسی چیز نے اسے اپنے ہم عصروں سے ''شیریں قلم'' کا لقب دلایا تھا ـــــ کچھ ایسی حیرت ناک تھی کہ کہتے ہیں اس نے خشخاش کے ایک دانہ پر قُل کی سورۃ لکھ دی

تھی۔ قُل کی یہ سورۃ قرآن کی ایک سو بارہویں سورۃ ہے اور اتنی مقدس اور متبرک ہے کہ خود قرآن کے ایک تہائی کے برابر سمجھی جاتی ہے۔ اسی مصور عبدالصمد کا بیٹا اور اس کا جانشین اس درجہ ترقی کر گیا کہ شہنشاہ اکبر کے بیٹے جہانگیر کا وزیر اور خانخاناں بنا۔ اس کتاب میں خود عبدالصمد کے قلم کی کوئی تصویر نہیں۔ لیکن اس میں عبدالصمد کے شاگردوں کی بنائی ہوئی بہت سی تصویریں ہیں اور بہت ممکن ہے کہ یہ اس کی نگرانی میں تیار ہوئی ہوں۔ یا پھر یہ بات ہو کہ اسے اپنے سے کم درجے کے لوگوں کے ساتھ اپنا نام ثبت کرنا اپنی شان سے گری ہوئی بات معلوم ہوئی ہو۔ بہت سی تصویریں ایسی ہیں جن کا نقشہ ایک مصور نے تیار کیا ہے اور دوسرے مصور نے اس میں رنگ بھرا ہے۔ بعض نہایت اچھی تصویروں پر بسون اور مسکین کے نام لکھے ہیں۔ ہر مصور کا کام ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ اس کتاب کا پڑھنے والا اگر اس کتاب سے مانوس ہو جائے تو بہت جلد ہر مصور کے قلم پہچان لے گا۔ ان ورقوں کے اندر تیس مصوروں کے نام نظر آتے ہیں۔ ان میں سے تیرہ نام تو ایسے مصوروں کے ہیں جو ابوالفضل کی مرتب کی ہوئی اکبری دربار کے سترہ مصوروں کی فہرست میں ملتے ہیں۔

ان تصویروں میں چاہے کوئی تصویر لے لیجیے، ہر ایک میں بس واقعات ہی واقعات دکھائے گئے ہیں۔ ان پر سونے کا کام کیا گیا ہے۔ پھر رنگ برنگ کی مینا کاری سے انھیں مزین کیا گیا ہے۔ یہ ایسے لوگوں کا کارنامہ ہے جن کے پاس وقت کا سوال کچھ اہم نہ تھا بلکہ اپنے آقا کی خوشنودی ہی سب کچھ تھی۔ جملہ تصویروں میں سے اُناسی (۷۹) تصویریں تیمور کی زندگی سے متعلق ہیں۔ یہ اس تیمور کی تصویریں ہیں جو ''فتنۂ عالم'' تھا۔ یہ تصویریں تیمور کی زندگی کے اس دور سے شروع ہوتی ہیں۔ جب وہ چھوٹا سا بچہ تھا، اور ایک معصوم اور نونہال بچے کی طرح اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھیلتا تھا پھر یہ تصویریں اس کی موت پر ختم ہو جاتی ہیں جب کہ وہ ایک جہاں کا خواب اپنی گردن پر لیے اس دنیا سے چلا ہے۔ محاصرے اور لڑائیاں مصوروں کا مرکزی موضوع رہا ہے۔ ان کی فہرست ہی سے ایک طرف دمشق سے لے کر دہلی تک اور ایک طرف برف پوش بدخشاں سے لے کر رتیلی وادی نیل تک ایشیا کے ایک بڑے حصہ کا جغرافیہ نظروں کے سامنے

پھر جاتا ہے۔ یہ انسانوں کے قتل عام اور بھالے برچھے گھونپنے کی کہانی ہے۔ یہ لڑائی میں جوانمردی اور فتح کے بعد قصابی کی کہانی ہے، یہ ندیوں کو پار کرنے اور قلعوں پر زغوں کی کہانی ہے۔ دربار کے مصوروں نے ان کی ٹھیک ٹھیک عکاسی کی پوری پوری کوشش کی ہے۔ لیکن جہاں انھوں نے فاتح کے بچپن اور اس کی نوجوانی کو مسجدوں اور باغوں کی چاردیواریوں کے اندر دکھایا ہے جن میں چڑیاں چہچہارہی ہیں، نہروں کا پانی سریلے الاپ کے ساتھ بہہ رہا ہے اور جن میں مؤذن کی اذان مومنوں کو نماز کے لیے بلا رہی ہے، وہاں ان مصوروں نے ان تصویروں میں اپنے قلم کا پورا زور صرف کر دیا ہے اور انھیں جی جان سے بنایا ہے۔ ایسی ہی تصویروں کو دیکھ کر ـــــ ہر وہ شخص جو لڑائی کے اس غم انگیز پہلو کر دیکھ چکا ہے ـــــ ایک طرح کی تازگی اور ایک طرح کی خوشی اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔

لڑائی کی جتنی تصویریں ہیں ان میں سے ایک تصویر پر ان دنوں کافی بحث ہوئی ہے۔ یہ تصویر سنہ ۱۴۰۰ء سے متعلق ہے اور اس میں تیمور کے محاصرۂ بغداد کا منظر دکھایا گیا ہے۔

اس تصویر میں تیمور کو دجلہ کے اوپر بنے ہوئے ایک پُل پر دکھایا گیا ہے۔ بغداد کا والی اور اس کی بیٹی ـــــ جس کی صورت پردے کے پیچھے سے مدھم سی نظر آتی ہے کیونکہ ایسے وقت میں بھی اس نے پردہ کرنا ضروری جانا تھا ـــــ ایک کشتی میں بیٹھ کر فرار ہو رہے ہیں۔ ان پر تیمور کے تیر اندازوں کے تیر برس رہے ہیں۔ باپ بیٹی دونوں پانی میں کود پڑتے ہیں اور ڈوب جاتے ہیں۔ ملاح فاتح کی خدمت میں بغداد کے والی سراج کی لاش پیش کرتے ہیں۔ وحشی بتوں کی طرح بے رحم تیمور بغداد کے لوٹنے کا حکم دیتا ہے۔ اس محاصرے کے ایک عینی شاہد نظام شامی نے اپنے ظفرنامے میں لکھا ہے کہ بغداد کے محاصرے میں اتنے آدمی مارے گئے کہ ان کی لاشوں سے دجلہ کا پاٹ پٹ گیا۔ اس وجہ سے دریا کے اس پار جو فتح مند فوج پڑی ہوئی تھی۔ اس کی نظر سے ایک بار دریا ہی اوجھل ہو گیا۔ اسے دریا اور میدان میں کوئی فرق نظر نہ آتا تھا۔ اس نے اپنے دل میں کہا ''یہ کیسے لوگ ہیں کہ ان کے نزدیک دریا اور میدان دونوں ایک ہیں''؟

ایک اور صفحہ پر اسے دکھایا گیا ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کا دل جوانی

میں اتنا نرم تھا کہ اس کو پیروں تلے ایک چیونٹی کا روندا جانا تک گوارا نہ تھا۔ یہاں وہ اپنے بیٹے سلطان محمد کے ماتم میں نالہ کناں نظر آتا ہے۔ پھر کہیں اسی شہنشاہ کی موت کا منظر دکھایا گیا ہے جس نے لاکھوں بندگان خدا کا خون بہایا تھا۔ پھر تاریخ اس کے بیٹوں پوتوں سے گزر کر بابر کی زندگی اور اس کی مہموں تک آتی ہے۔ بابر ان لوگوں میں تھا جن کی ذات میں مشرق اور مغرب دونوں یکجا ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے سب ہی اس کی صحبت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس کی کامرانیوں پر اس کے ساتھ خوش ہوتے ہیں اور اس کی ناکامیوں پر اس کے ساتھ دل مسوستے ہیں۔ ایک حد درجہ مرصع صفحہ پر اس کے بیٹے ہمایوں کی ولادت کا منظر دکھایا گیا ہے۔ یہ وہی ہمایوں ہے جس کے لیے آگے چل کر خود بابر اپنی جان صدقے میں دینے والا تھا۔ شہنشاہ بابر ایک تخت پر جلوس کیے ہوئے ہے۔ یہ تخت ایک چھتر کے نیچے رکھا ہے۔ طرح طرح کے رنگوں اور سنہرے کام سے چھتر جگمگا رہا ہے۔ بابر کچھ ایسے دلکش انداز سے آگے کی طرف جھکا ہوا ہے جو ایک بادشاہ اور ایک شریف آدمی کے شایان شان ہے۔ اس طرح آگے کی طرف جھک کر وہ اپنے ساتھیوں سے باتیں کر رہا ہے۔ اس کے یہ ساتھی ایک ایرانی قالین پر نیم دائرے کی صورت میں اس کے قریب ہی بیٹھے ہیں۔ ان کے آگے شراب کے پیالے رکھے ہیں اور خادم لذیذ کھانوں کی کشتیاں لا رہے ہیں۔ پاس ہی ایک دیوار پر ایک مور کھڑا اپنے جواہر نگار پروں کی نمائش کر رہا ہے۔ قلعہ کے دروازے کے باہر رعایا خوشیاں منا رہی ہے۔ غریبوں میں خیرات بانٹی جا رہی ہے۔ شہنائی اور قرنوں کی آواز سے پوری فضا معمور ہے۔ یہاں جو منظر پیش کیا گیا ہے وہ ہندوستان کا نہیں وسط ایشیا کا ہے۔

ایک اور رنگین صفحہ پر اس سے بھی زیادہ ایک اہم واقعہ کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ شہنشاہ اکبر کی ولادت کا منظر ہے۔ اس تصویر میں ایک عورت کے درد زہ اور ایک مرد کی سنجیدہ مسرت کی پوری کہانی نہایت سیدھے سادے لیکن بڑے دلکش انداز میں بیان کی گئی ہے۔ ماں اپنے سادے سے سبز رنگ کے لباس میں تھکی ماندی ایک پلنگ پر پڑی ہے۔ اس وقت وہ خود بھی اپنی عمر کے لحاظ سے بچی ہی تھی نومولود بچہ کپڑوں میں لپٹا ہوا کئی مشتاق خادماؤں میں گھرا ہوا ہے۔ تصویر کے ایک

گوشے میں خوابگاہ کے بغیر ایک پالنا ناچتی، گاتی اور خوشی مناتی عورتوں کے درمیان رکھا گیا ہے۔
تصویر کے بیچ میں کچھ نجومی آیندہ ہونے والے شہنشاہ کا زائچہ کھینچتے دکھائے گئے ہیں۔
ایک طرف چند سوار یہ خوشخبری پہنچانے کے لیے باپ کے پاس دوڑے جا رہے ہیں۔ ہمایوں کو اپنے خیمے کے اندر دکھایا گیا ہے۔ وہ ایک مسند پر بیٹھا ہے اور مسند ایک نہایت ہی شاندار قالین پر بچھی ہے۔ بظاہر وہ نہایت پُرسکون اور مطمئن نظر آتا ہے اور بڑی دلچسپی کے ساتھ اپنے وزیر تردی بیگ کی باتیں سن رہا ہے۔ ہمایوں اور تردی بیگ کے کپڑوں کی نقاشی میں مصور نے اپنی فن کاری کے جوہر خوب دکھائے ہیں۔ غرض جہاں سادگی کے اظہار کی ضرورت تھی اور جہاں آرائش دکھانے کی ضرورت تھی، مصور نے دونوں اپنے موقع محل سے دکھائی ہیں۔ تصویر کی حد تک تو یہ باتیں ٹھیک ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اکبر کی ولادت اس سے کہیں زیادہ مصیبت کے ماحول میں ہوئی تھی۔ بلکہ بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ وہ ایک کھیت میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ ابھی بادشاہ تھا، لیکن جب اسے اس بیٹے کی ولادت کی خبر ملی ہے، اس وقت وہ انتہائی افلاس اور تنگ دستی کے عالم میں اس ملک سے فرار ہو رہا تھا۔ ہمایوں کے جام بردار کا بیان ہے کہ یہ خبر سن کر ہمایوں نے ''ایک چینی کی رکابی اور مشک کا ایک نافہ طلب کیا۔ اس کے بعد اس نے مشک کے نافہ کو توڑا، اور اسے اونچے درجے کے ساتھیوں میں یہ کہہ کر تقسیم کر دیا، اپنے فرزند کی ولادت کے موقع پر فی الحال جو کچھ میں دے سکتا تھا، وہ بس یہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس بچے کا نام بہت بلند ہوگا اور اس کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل جائے گی، بالکل ایسے ہی جیسے اس وقت مشک کی خوشبو اس کمرے میں پھیل گئی ہے۔

ایک اور شاندار صفحہ پر خود ہمایوں کی زندگی کے ایک خوش نصیب لمحے کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ قلعہ چمپانیر کی فتح کی تصویر ہے۔ شہنشاہ ہمایوں خود بھی اپنی نسل کے پچھلے لوگوں کی طرح ایک بہادر آدمی تھا۔ اس نے اگر ذرا بھی کمزوری دکھائی ہوتی تو وہ اور اس کا خاندان دونوں ہمیشہ کے لیے ہندوستان کے تخت و تاج سے محروم ہو جاتے۔ اس تصویر میں شہنشاہ قیمتی زرہ بکتر پہنے فصیل کے اوپر کھڑا ہے۔ رات کے وقت اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ ایک بڑی اونچی

ڈھلوان چٹان پر چڑھ کر وہ یہاں پہنچا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا وزیر بیرم خاں بھی ہے۔ یہ بیرم خاں اس خاندان کا گویا بسمارک تھا۔ قلعہ کے عظیم الشان دروازے کے اندر ہمایوں کی فوج کے بڑے بڑے سردار جو شاندار زرہ بکتر پہنے ہوئے ہیں، اور گھوڑوں پر سوار ہیں اور پیدل فوج کے سپاہی جو تلواروں اور ڈھالوں سے لیس ہیں، حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہ قرون وسطی کا ایک منظر ہے۔ ایسے ہی لیکن شان وشکوہ میں اس سے کہیں کمتر مناظر اس سے کچھ پہلے کے زمانے کے یورپ میں عام طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

آخر میں ان (۱۳۳) رنگین صفحوں سے جو کتاب کی جان ہیں، ایک اور تصویر پیش کی جاتی ہے۔ یہ اکبر کی جوانی کی تصویر ہے اور اس تصویر میں چتوڑ کے قلعہ کے محاصرہ کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ یہ سی سودھیا خاندان کے قابل فخر پائے تخت کی تصویر ہے جب اس پر مصیبت کی گھٹائیں چھا گئی تھیں اور جب خود شہنشاہ نے اپنی بندوق سے مقابل کی دیوار پر کھڑے ہوئے بہادر جے مل کو مار گرایا تھا۔ اور یہی جے مل مدافعت کی روح رواں اور اس کی جان تھا۔ اسی جے مل کی ایک تصویر جس میں وہ ہاتھی پر بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے۔ دہلی کے لال قلعہ کے ایک شاندار دروازہ کی زینت بنی ہوئی ہے۔ اس تصویر کو ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کرزن کے حکم پر میکنزی نامی ایک مصور نے وہاں پھر سے بنا کر محفوظ کیا ہے۔ اس تصویر میں راجپوت عورتیں جو جلد ہی جوہر کی خوفناک رسم ادا کرنے والی ہیں جے مل کا ماتم کرتی ہوئی رو رہی ہیں۔ قلعہ کے باہر محاصرہ کرنے والوں کی بڑی بڑی توپیں اپنا منہ کھولے آگ برسا رہی ہیں۔ ہاتھی اور سوار ہجوم کر کے حملہ کرنے کے لیے بڑھ رہے ہیں۔ تصویر میں قرون وسطی کے محاصرے کی ساری پھرتی پوری پوری دکھائی دیتی ہے اور مشرق کی شان وشوکت اس کے سوا ہی ہے۔

ایسے مناظر ہمیں اس زندگی کے قلب تک پہنچا دیتے ہیں جو اب برِاعظم ہند سے مٹ چکی ہے۔ اب چتوڑ کا قلعہ اپنی پچھلی شان وشوکت کے مناظر کے درمیان فکرمند اور اداس کھڑا ہے اور مغلوں کا نام بھی اب کسی زمانے کی کڑک کی مدھم سی بازگشت کے سوا اور کچھ نہیں رہا۔ رہے نام اللہ کا!

اس کتاب پر جس کے اندر ایسی ایسی چیزیں پیش کی گئی ہیں، شاہجہاں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک عبارت بھی درج ہے۔ اس میں شاہجہاں نے بتایا ہے کہ تیمور اور اس کے جانشینوں کی یہ تاریخ جو اکبر کے جلوس کے انیسویں سال پر ختم ہوتی ہے '' شاہ بابا '' کے عہد میں لکھی گئی۔ '' شاہ بابا '' سے مراد خود شہنشاہ اکبر ہے۔ اور اسی پیار کے نام سے شاہجہاں بچپن سے لے کر بڑھاپے تک اپنے دادا کا ذکر کرتا رہا۔ تحویل کی کئی مہریں اور '' عرض دیدہ شد '' کی عبارتیں اس کتاب کے مستند ہونے کی تصدیق کرتی ہیں۔ خاں صاحب عبدالمقتدر خاں نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ کتاب وہی چنگیز نامہ ہے جس کا ذکر ابوالفضل نے شہنشاہ اکبر کے لیے مصور کی ہوئی نو اہم کتابوں میں کیا ہے۔ وارن ہسٹنگز کے زمانے کے ایک مستشرق اور مؤرخ فرانسس گلاڈون کا نام اس ورق کے ایک گوشے میں نظر آتا ہے جس پر شہنشاہ شاہجہاں کی تحریر درج ہے۔ ایک اور فارسی عبارت میں لکھا ہے کہ اس کتاب کی قیمت آٹھ ہزار روپے ہے۔ آج ہزاروں پونڈ میں بھی اس کا خریدنا ممکن نہیں۔ اگرچہ اس کی تصویریں آرٹ کی ان بلند ترین سطحوں تک نہیں پہنچ سکی ہیں جیسی راجہ منوہر سنگھ کی بنائی ہوئی تصویر '' شاہجہاں کی جہانگیر سے رخصتی '' جیسے شاہکار پیش کر سکے ہیں، پھر بھی اپنی نفاست اور رنگ کاری کے لحاظ سے یہ تصویریں بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہیں۔

اس بے بہا خزانے کے بعد آرٹ کا ایک شاہکار ملاحظہ ہو، یہ کچھ اور بعد کے زمانے کی کتاب ہے۔ یہ شاہجہاں کے عہد کی تاریخ '' بادشاہ نامہ '' ہے۔ اس کے اندر مصوروں نے اپنی انتھک محنت سے جو تصویریں بنائی ہیں ان پر ایک نظر ڈالتے ہی سے آپ یہ محسوس کر لیں گے کہ مغلوں کی نسل میں کتنی تبدیلی پیدا ہو چکی ہے۔ یہاں جو لوگ ہرمزا اور ہندستان کی بے حساب دولت کے درمیان دکھائے گئے ہیں، اب بابر، ہمایوں اور اکبر جیسے دکھائی نہیں دیتے۔ بلکہ یہ لوگ ایسی نسل کے آدمی معلوم ہوتے ہیں جو آب و ہوا کی تبدیلی اور ہندوؤں میں شادی بیاہ کی وجہ سے ہندوستانی بن چکی تھی۔ یہ بات ان کے چہروں سے بھی صاف ٹپکی پڑتی ہے۔ مغل بچے کی وہ زندہ دل مردانگی جس کے ساتھ وہ ایک بڑی مملکت کی تلاش میں ہندوستان آیا تھا۔ اور اپنی مہموں کے دوران میں اس نے یہاں کے ہر ندی نالے کو تیر کر پار کر لیا تھا۔ اب اس مغل بچے کی اس مردانگی کی

جگہ ہندوستان کے شہنشاہ کی شان وشکوہ نے لے لی ہے۔شاہجہاں کے چہرے پرایک سنجیدہ اداسی برس رہی ہے۔اور رزم کے پُر خطر مناظر کی جگہ اب بزم کی شاندار رسوم کی جھلکیوں نے لے لی ہے۔چتوڑ کے محاصرے میں جہاں اکبر زرہ بکتر پہنے میدان کارزار میں ڈٹا نظر آتا تھا اب وہاں داراشکوہ کے بیاہ کا منظر سامنے آتا ہے۔سخت کوش ترک کی جگہ اب ہندستان کے تخت پر اس کا پوتا متمکن نظر آتا ہے جس کی رگوں میں تین چوتھائی ہندوستانی خون دوڑ رہا ہے۔اس کتاب کی آخری تصویروں میں عظیم المرتبت شہنشاہ شاہ جہاں کے جنازے کے مناظر پیش کیے گئے ہیں۔شہنشاہ کا جنازہ تاج محل کی طرف جارہا ہے۔اسی تاج محل کی طرف جارہا ہے جس کے اندروہ زمانے کے انقلابوں سے بے نیاز اپنی محبوب بیوی کے پہلو میں ابدی نیند سو رہا ہے۔

ان خالص ہندوستانی مناظر کے بعد آیئے اب حسینی کے شہنشاہ نامے کی سیر کریں یہ کتاب ہمیں ترکی کے عثمانی سلطانوں کے ساتھ میدان کارزار میں پہنچا دیتی ہے۔یہ نفیس اور بے نظیر کتاب جو سلطان محمد سوم کے نام معنون کی گئی ہے،سولہویں صدی عیسوی کے آخر میں بمقام قسطنطنیہ اسی سلطان کے لیے لکھی گئی ہے۔یہ کتاب اس سلطان کے شاہی کتب خانے میں داخل رہی۔پھر نہیں معلوم کس طرح وہ شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان پہنچ گئی۔یہاں پھر وہ شاہی خزانے میں داخل ہوگئی۔اس کتاب کے اوپر کئی مہریں اور تحریریں ثبت ہیں۔ان میں شہزادوں اور بادشاہوں کی تحریریں اور مہریں بھی ہیں۔ایک اپنے باپ کی دیوانی اور مقبرۂ تاج محل میں آرام کرنے والی بیگم کی بیٹی جہاں آراء کی تحریر ہے۔شاہجہاں کی اس دُلاری بیٹی نے اپنے نامور باپ کی زندگی کے آخری دنوں میں اس کی اسیری کی مصیبت کو اپنی بے لوث خدمت سے قابل برداشت بنا دیا تھا۔جہاں آراء بیگم کا فانی جسم دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاء کے پائیں خاک کے ایک تودے کے نیچے خوابیدہ ہے۔خاک کے اس تودے پر سبزہ اُگا ہوا ہے۔ اور سرہانے مرمر کا ایک کتبہ لگا ہے جس پر یہ مشہور شعر کندہ ہے ؎

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزار مرا
کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

روشن آراء بیگم خود بھی ادیبہ اور شاعرہ تھی۔ اس کی لکھی ہوئی چھوٹی سی فارسی کتاب ''مونس الارواح'' جو حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے سوانح حیات پر ہے، آج بھی ہندوستان میں شوق سے پڑھی جاتی ہے۔

جہاں تک معلوم ہوسکا ہے دینا میں شہنشاہ نامہ کا اور کوئی نسخہ موجود نہیں۔ اس لیے بھی کتب خانے کے بے بہا جواہرات میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اس میں جو تصویریں بنائی گئی ہیں وہ ہندوستانی یا ایرانی قلم سے بالکل ہی مختلف ہیں۔ ان تصویروں پر بازنطینی اثر نمایاں ہے۔ ان میں کے بعض مناظر تو عالمی تاریخ سے متعلق ہیں۔ یہاں ہمیں سلطان محمد (ثانی) فاتح کی کمان میں اسلامی فوجیں قسطنطنیہ پر حملہ کرتی نظر آتی ہیں۔ پھر باسفورس سے ان کے گزرنے کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ ایک تصویر میں سلطان سلیم کو مصر کے آخری عباسی خلیفہ محمد متوکل باللہ سے رسول اللہ صلعم کا پرچم اور حضور کی ردا حاصل کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اسی پرچم اور اسی ردا کی بنا پر عثمانی ترک سلاطین کو اسلام کی دینی قیادت یعنی خلافت کا حق حاصل ہوا تھا۔ یورپی زرہ بکتر پہنے ہوئے فوجی سردار اور جاں نثاری جن کے لباس یونانی کلیسا کے چغوں کی یاد تازہ کرتے ہیں، مشرق کے عمامے نیچے پہنے ہوئے لوگوں میں گھلے ملے نظر آتے ہیں۔ اس لیے اگر یہ کتاب مغلوں کے خزانے میں داخل رہی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

اس کے بعد اب ذرا فردوسی کے شاہنامے کے ایک شاندار نسخے کو پیش کرنے کی اجازت ہو۔ فارسی کی یہ شاندار نظم دنیا کی بڑی بڑی رزمیہ داستانوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس کی ابتداء، بخت واتفاق سے اس کے مواد...... پینتیس سال کی محنت کے بعد شاعر کی عمر کے اسی ویں سال میں اس کی تکمیل کی کہانی سرتاسر رومان سے بھری ہے۔ سلطان محمود غزنوی نے یہ شاہنامہ لکھنے کا حکم دیا تھا۔ اسی سلطان نے ہندوستان پر بارہ سے زیادہ حملے کر کے اپنے خزانے خوب بھرے تھے۔ کہتے ہیں سلطان نے جتنا انعام دینے کا وعدہ کیا تھا، اتنا انعام نہ دیا۔ پھر ایک مدت کے بعد اپنے کیے پر پچھتایا اور انعام بھیجا تو اس وقت شاعر بستر مرگ پر پہنچ چکا تھا۔ ادھر سلطان کے قاصد شاعر کے شہر طوس میں سلطان کے انعام سے لدے پھندے اونٹوں کو لیے داخل

ہوئے ادھر شہر کے دوسرے دروازے سے اس کا جنازہ قبرستان جارہا تھا۔ شاعر کی عالی ہمت بیٹی نے سلطان کا انعام لینے سے انکار کر دیا۔ یہ ایک بہت پرانی کہانی ہے لیکن ایسی کہانی ہے جو کبھی بھلائی نہ جاسکے گی۔ جب تک کتابیں پڑھی جاتی رہیں گی اور جب تک انسانیت کے شاہزادوں کے پاس قابل اور لائق لوگوں کی قدر باقی ہے، اس کہانی کو بھلانا ممکن نہ ہوگا۔

اس کتب خانے میں شاہنامہ کا یہ نسخہ دس ہزار شعر کے بعد نامکمل ہے اور سنہ ۱۵۳۹ء سے زیادہ پرانا نہیں۔ یہ نسخہ مشہور ایرانی امیر علی مردان خاں نے شہنشاہ شاہجہاں کے حضور میں بطور نذر پیش کیا تھا۔ یہ علی مردان خان کابل اور کشمیر کا صوبہ دار تھا اور اسی نے مغلوں کی بنائی ہوئی نہروں کا نقشہ تیار کیا تھا۔ آج بھی اس کی قبر لاہور کی فصیل کے باہر تباہ حالت میں موجود ہے۔ جس نے یہ نذر پیش کی ہے اور جس کے حضور میں پیش کی گئی ہے۔ یہ کتاب دونوں کے شایان شان ہے۔ اسے نہایت حسین طلاکار ایرانی تصویروں سے مزین کیا گیا ہے۔ متن نہایت خوبصورت واضح اور پختہ نستعلیق خط میں سنہری خط کھینچ کر چار جدولوں میں لکھا گیا ہے۔ ابتداء میں دو عنوان حد درجہ آراستہ اور حد درجہ پیراستہ ہیں۔ پھر دو صفحوں پر پھیلی ہوئی ایک طلاکار منقش تصویر ہے۔ اس کے گرداگرد بہت ہی خوبصورت بوقلمون حاشیے دیے گئے ہیں۔ اس کے آخری دو صفحے شروع سے آخر تک سنہری عنوانوں کے ساتھ سونے سے لکھے گئے ہیں اور ان پر ہر طرف رنگارنگی پھول بنائے گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ شاہوں کے لائق چیز ہے۔ اس کا مسحور کن حسن دیکھنے والوں کو اس کے اپنے ماحول سے اٹھا کر گویا تخت سلیماں پر بٹھا کر اڑاتا اور آج سے دوسو ساٹھ سال پہلے کی دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔ اس دنیا میں پہنچاتا ہے۔ جب یہ کتاب دربار عام میں اس شہنشاہ کے حضور میں نذر گزرانی گئی تھی کہ شان وشکوہ میں اس سے بڑھ کر کوئی شہنشاہ دنیا کے کسی تخت پر نہ بیٹھا ہوگا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں دہلی دربار کے موقع پر یہ تاریخی کتاب ملک معظم شہنشاہ جارج پنجم کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ آنے والے زمانے کے لیے ملک معظم کے دستخط اس واقعہ کی شہادت دے رہے ہیں۔

یہاں شاہنامہ کا ایک اور نسخہ بھی ہے۔ یہ نسخہ پہلے نسخے سے زیادہ پرانا اور اس سے بھی

زیادہ خوبصورت ہے۔ اس کے صفحوں کے اطراف چینی نقاشی کا چوڑا حاشیہ دیا گیا ہے۔ اس حاشیہ میں کیکڑے، اژدہے، چڑیاں، بھیڑیے اور طرح طرح کے پھول بنائے گئے ہیں۔ اس کا ابتدائی صفحہ یا ''عنوان'' زیتونی رنگ کے سونے سے لکھا گیا ہے اور اپنی قدیم چرمی جلد کی طرح جونہایت درجہ طلاکار ہے، حد درجہ خوبصورت ہے۔ اس کتاب میں اور اس سے پہلے کی کتاب میں جو تصویریں بنائی گئی ہیں، ان دونوں میں تصویروں کے پرکھنے والے کو کئی بار انتخاب کے سلسلہ میں بڑی دشواری پیش آئے گی۔ عام طور پر یہ تصویریں ایک ہی موضوع کو پیش کرتی ہیں اور ان دونوں کا آپس میں مقابلہ کرنا بڑا دلچسپ اور دلکش مشغلہ ہے۔ شان وشکوہ کی دلکش دنیا، بادشاہوں اور درباروں کی دنیا، اور رزمگاہوں کی دنیا، بوستانوں کی دنیا، اور مشرق کے روایتی گلستانوں میں بہار کی آمد کی دنیا —— کیسی کیسی دنیاؤں کی یہ تصویریں سیر کراتی ہیں۔ کہیں چوگان بازی اور شکار کے مناظر، کہیں شیروں اور برفستانی چیتوں کی تصویریں خزاں میں چنار کے پیڑ، اور سنہرے پیڑوں پر پھدکتی ہوئی چڑیاں، ہلاکت خیز لڑائی لڑتے ہوئے سہراب اور رستم، شبدیز پر سوار شعلوں سے گزرتا ہوا شاؤس، نیلے آسمان کی طرف کھلنے والے دریچوں سے جھانکتی ہوئی مہ لقائیں، عجیب وغریب چینی بادل جو کہیں سفید ہیں تو کہیں سنہری پھریروں جیسے سرو وصنوبر سے پٹے ہوئے گلستان بڑے بڑے دروازے اور ایوان، اور ان پر شنگرفی اور ارغوانی آسمانی، بادامی اور چھینٹ نما ٹائیل، محاصرے اور لڑائیاں، فصیلوں پر چڑھتے ہوئے آدمی، تلواروں اور بھالوں کی تیز کاٹ سے مرتے ہوئے زخمی، اور مدافعت کرنے والوں کے لڑھکائے ہوئے بڑے بڑے پتھروں کے نیچے کچل کر مرنے والے بدنصیب!

اس کتاب خانہ کی ایک برکت یہ ہے کہ ان نفیس اوراق کی سیر کے دوران میں انسان ان میں کچھ ایسا ڈوب جاتا ہے کہ اپنے وجود تک سے بےخبر ہو جاتا ہے۔

شاہنامہ کے بعد اب ایک ایسے مصنف کی کتابیں دیکھیے جو فردوسی کے بہت بعد گزرا ہے۔ یہ مشہور عارف اور صوفی شاعر مولانا عبدالرحمٰن جامی ہیں۔ جامی ایران کے کلاسیکل شعراء میں آخری بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ ہمارے کتب خانے میں جامی کی کتابوں کے کئی

نفیس نسخے موجود ہیں۔ ان کتابوں کی خوبیاں بیان کرنے کے لیے باریک چھپی ہوئی فہرست کے کم سے کم بتیس (۳۲) صفحے چاہئیں پہلی بڑی لڑائی سے پہلے سنٹ پیٹرز برگ (موجودہ لینن گراڈ) کے کتب خانے میں دیوان غزلیات جامی کا جو نسخہ تھا، اس کی بڑی شہرت ہوئی تھی، پتہ نہیں بادِ صرصر کے جھونکے اب اسے کہاں سے کہاں پہنچا چکے ہیں۔ کہتے ہیں اسی نسخے کا آدھا حصہ یہاں رکھا ہے۔ ان کتابوں میں سلسلۃ الذہب کا ایک نسخہ بھی ہے۔ قدرشناسوں کے نزدیک اس نسخہ کی اہمیت بہت زیادہ ہے کیونکہ یہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں مصنف نے اپنے فرزند کی ولادت کی تاریخ درج کی ہے اور سچے اسلامی انکسار کے ساتھ اپنی مغفرت چاہی ہے۔ اس چھوٹی سی نایاب کتاب کے پچھلے مالکوں کی تمام مہریں اور تحریریں یہاں پہنچنے تک ان ماخذوں کو چھپانے کے لیے مٹادی گئی ہیں جہاں سے یہ چرائی جاتی رہی ہے۔ ایک اور کتاب مثنوی سلمان وابسال کا نسخہ ہے جو کچھ ایسا اہم نہیں۔ لیکن یہ وہی مثنوی ہے جسے اڈورڈ فزجرالڈ نے سنہ ۱۸۷۹ء میں انگریزی کا جامہ پہنایا تھا۔

یہ لیجیے، یہ مثنوی یوسف و زلیخا کا ایک نسخہ ہے۔ یوسف زلیخا کی داستان حضرت یوسف علیہ السلام اور فرعون مصر کی بیوی کی داستان الفت کی اسلامی روایت ہے۔ یہ مثنوی جامی کی تصانیف میں سب سے زیادہ مقبول ہے۔ مثنوی کا یہ نسخہ حد درجہ مرصع ہے۔ لیکن اہل مشرق کی نظر میں اس کی سب سے بڑی خوبی اس کی خطاطی کا کمال ہے۔ اور یہ مشہور خطاط میر علی ہروی کے قلم کا اعجاز ہے۔ خطاطوں کے اس بادشاہ نے یہ کتاب سنہ ۱۵۲۳ء میں لکھی تھی اور عبدالرحیم خانخاناں نے اسے شہنشاہ جہانگیر کے حضور میں بطور نذر پیش کیا تھا۔ یہ واقعہ ایسا اہم تھا کہ اسے شاہی دربار کے ایک ہم عصر مؤرخ نے بھی ضبط تحریر میں لانا ضروری جانا ہے۔ اس وقت ـــــ یعنی شہنشاہ کے حضور میں پیش ہو کر اس کی اہمیت میں مزید اضافہ ہونے سے بھی پہلے ـــــ اس کی قیمت ایک ہزار طلائی مہریں قرار پائی تھی۔ خانخاناں، اکبر کے وزیر بیرم خاں کا بیٹا تھا۔ جیسا رزم کا دھنی اور جیسا بساط سیاست کا شاطر تھا، ویسا ہی اپنے اعلیٰ علمی اور ادبی ذوق کے لیے مشہور تھا۔ اس کی تصانیف میں ترکی سے بابر کی تزک کا فارسی میں ترجمہ بھی شامل ہے۔ جو کوئی اس کے

مقبرے کی زیارت کا آرزومند ہے وہ اس کی موجودہ ویرانی اور بربادی کو دیکھ کر ضرور دلگیر ہوگا اس پر لگا ہوا سارا سنگ مرمر اتار لیا گیا ہے اور جائے عبرت ہے۔ یہ کام اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں جیسے عظیم المرتبت شہنشاہوں کے جانشین شہنشاہ شاہ عالم نے چند ٹکوں کے لیے کیا ہے۔ اسی یاس انگیز حالت میں یہ مقبرہ دہلی میں ہمایوں کے مقبرے کے قریب کھڑا ہے۔

اس مثنوی کا ایک ہی نسخہ نہیں۔ یہاں اس کا ایک اور نسخہ بھی ہے جو یہاں کے لحاظ سے کم اہم ہوتے ہوئے بھی نوادرات کے کسی بھی شائق کے دل کا سرور بن سکتا ہے۔ یہ خطاطی کے نامور استاد میر عماد کے قلم کا کرشمہ ہے۔ میر عماد خطاط ایران کے مشہور صفوی شہنشاہ شاہ عباس اعظم کا ہم عصر تھا، اور اس کتاب کی تکمیل کے سات سال بعد سنہ ۱۶۱۵ء میں مارا گیا تھا۔ اس کے رنگین اور مصور ورق جو اس کتاب کی جان ہیں، غیر معمولی حسن وخوبی کے حامل ہیں۔ ایک تصویر میں حضرت یوسف غلام کی حیثیت سے ایک نوعمر لڑکے کے روپ میں، مسافروں سے بھری کشتی میں سوار، دریائے نیل کو پار کرتے دکھائے گئے ہیں۔ اس کے نیچے ایک اور تصویر ہے۔ اس میں حضرت یوسف رسیوں میں بندھے مصر کے وزیر کے حوالے کیے جارہے ہیں۔ کچھ تصویریں ایسی ہیں جن سے وسط ایشیا کی مہک آرہی ہے۔ یہ تصویریں ہمارے تخیل کو پر لگا کر ہمیں باغوں میں پہنچا دیتی ہیں، جہاں بہتی نہریں پتھر کی جالیوں سے گزر کر عجیب سریلا راگ سناتی ہیں، جہاں نرگس کے پھول کھلتے ہیں۔ جہاں ثمردار پیڑوں پر بہار اپنا جوبن نکھارتی ہے۔

اب کچھ دیر کے لیے اپنی تابنا کی سے آنکھوں کو چکاچوند کرنے والی ان کتابوں سے اپنی نظریں ہٹا کر میں ایک اور کتاب اُٹھاتا ہوں۔ بے نظیر خطاطی کو چھوڑ کر اندرونی آرائش سے محروم یہ چھوٹی سی کتاب، جو زمانے کے اثر سے پیلی پیلی اور بھوری بھوری سی ہوگئی ہے، ایک بڑی ہی نادر چیز ہے کچھ اپنی خصوصیات ہی کی وجہ سے نہیں بلکہ بڑے بڑے شہنشاہوں سے وابستہ رہنے کی وجہ سے بھی، یہ ''دیوان حافظ'' کا ایک نسخہ ہے۔ کئی نازک موقعوں پر جب کہ خود ان کی اور ان سے وابستہ لوگوں کی جان کی بازی لگی ہوئی تھی، ہمایوں اور جہانگیر نے اس سے اسی طرح فال لی ہے جیسے ہومر اور ورجل سے یورپ میں فال لی جاتی تھی یا جیسے آج بھی غریب غربا انجیل مقدس سے

فال لیتے ہیں۔ اورنگ زیب جیسے زاہد خشک نے بھی لسان الغیب حافظ سے مدد مانگی تھی۔

اس کتاب کے حاشیوں پر شہنشاہوں نے جو عبارتیں لکھی ہیں وہ ان حالات کو پیش نظر کر دیتی ہیں جن میں اس چھوٹی سی کتاب سے قسمت کا بھید پوچھا گیا تھا۔ ایک جگہ ہمایوں نے ایک شعر کے مقابل ایک عبارت لکھی ہے۔ یہ شعر حضرت یوسف اور برادران یوسف پر ہے، یہ عبارت پڑھ کر ہر شخص پوری طرح اندازہ لگا سکتا ہے کہ شہنشاہ ہمایوں خود اپنے بھائیوں کی جفاؤں کو کیسی تلخی کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ ان ہی بھائیوں کی بے وفائی کی وجہ سے وہ اپنا تخت و تاج تقریباً کھو چکا تھا۔ پھر سنہ ۱۵۵۳ء میں جب وہ ہندستان کو دوبارہ فتح کرنے چلا ہے تو اس کی نظر ایک شعر پر پڑی، جس نے اس کی ہمت بندھائی، اور اسے اپنی خطرناک مہم پر جانے کے لیے اور اُبھارا۔

ہمایوں کے پوتے جہانگیر نے اس کتاب کو اکثر استعمال کیا ہے۔ ایک جگہ اس نے لکھا ہے کہ سنہ ۱۶۰۹ء میں اس کتاب کی ایک فال نے اس کے ایک درباری کی جان بچالی۔ یہ درباری اس خاندان کے ایک پرانے خادم کا بیٹا تھا اور جہانگیر نے اسے غداری کے جرم میں قتل کر دینے کا حکم دیا تھا۔ لیکن مجرم کو گدھے پر دُم کی طرف منھ کر کے بٹھایا گیا اور اسے بازاروں میں ذلت و رسوائی کے ساتھ گھمانے کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ حاشیہ پر شہنشاہ جہانگیر نے لکھا ہے۔

"یہ شعر فتح اللہ کی برأت کے لیے نکلا، اور میں نے اس کے قصور معاف کیے"۔

ہمایوں کی واضح اور مدور تحریر، شاہجہاں کی کھلی کھلی بانکی تحریر، اور جہانگیر کی رواں دواں ڈانواں ڈول مگر خوبصورت تحریر ــــــ جس کے لکھتے وقت وہ اکثر اتنے سرور میں ہوتا تھا کہ ہاتھ کانپ جاتا تھا ــــــ ان سب تحریروں میں امتیاز کرنے کے لیے تحریر کے ماہر ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔ اکبر، ہمایوں اور جہانگیر کے درمیان ہوا ہے۔ اس کے قبضے میں بھی یہ کتاب رہی ہوگی۔ اس کے قوی دل نے اگر اسے اس بات کی اجازت دی ہوگی تو اس نے بھی اس چھوٹی سی قیمتی کتاب سے استخارہ کیا ہوگا۔ لیکن اس پر ایسی کوئی تحریری شہادت موجود نہیں

جس سے اس پر اکبر کی ملکیت ثابت ہو۔ یہ تو یہ، دوسری تمام نفیس اور زیبا کتابیں جن پر دوسرے بادشاہوں کے نام لکھے نظر آتے ہیں لیکن اکبر کا نام ان پر کہیں نہیں آتا۔ شاید اس لیے نظر نہیں آتا کہ اکبر، جو ان تمام شہنشاہوں میں سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ عظیم المرتبت گزرا ہے۔ نہ پڑھنا جانتا تھا نہ لکھنا۔

اس کتب خانے میں ''دیوان حافظ'' کے اور کئی نسخے ہیں۔ ظاہری حیثیت سے یہ شاندار تو بہت ہیں، لیکن پہلے نسخے کی سی ندرت ان میں کہاں۔ دیوان حافظ کا ایک نسخہ گولکنڈے کے سلطان محمد قطب شاہ کے شاہی کتب خانہ کا ہے اور سلطان محمد قطب شاہ کے ہاتھ کی تحریر اس پر ثبت ہے۔ اس میں سلطان نے بتایا ہے کہ یہ نسخہ حیدر آباد دکن میں اس کے لیے محمد محسن نے سنہ ۱۰۲۳ھ میں لکھا۔ اس کا پہلا صفحہ بڑا مرصع ہے، اور اس پر نیلی زمین میں طلا کاری کی گئی ہے۔ جس کاغذ پر یہ لکھا گیا ہے، اس کا رنگ گہرا بادامی ہے۔ عنوان سفید ے سے، سرخی سے اور سونے سے لکھے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے یہ نسخہ دکن کے قطب شاہی خاندان پر فتح پانے کے بعد شہنشاہ اورنگ زیب کے قبضہ میں آیا تھا۔ یہاں میں تزک جہانگیری کے نسخہ کا بھی ذکر کردوں۔ یہ نسخہ بھی دکن کی فتح میں ہاتھ لگا تھا۔ اس نسخہ کے بارے میں خیال ہے کہ یہ تزک جہانگیری کے ان اولین چار نسخوں میں سے ایک ہے جو خود شہنشاہ نے اپنے ہم عصر سلاطین کے پاس تحفۃً بھیجے تھے۔ اس پر گولکنڈے کے انہی قطب شاہی سلاطین کی مہریں بھی ثبت ہیں۔ ایک جگہ ایک عبارت بھی لکھی ہے۔ غالباً یہ عبارت فاتح کے بیٹے (شہزادہ معظم؟) نے اپنے قلم سے لکھی ہے۔ لکھا ہے کہ یہ کتاب سلطان کے کتب خانے سے ''ضبط'' کی گئی۔

شہزادوں اور شاہوں کی بدنصیبیوں کی تصویر تو کچھ دیوان کامران کے دنیا میں ایک ہی اور اصلی نسخے کو دیکھ کر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ یہ کامران بابر کا بیٹا اور ہمایوں کا وہی خطا کار بھائی ہے جسے ہمایوں نے بے حساب معافیاں دیں اور آخر کار خود اپنی اور تخت و تاج کی سلامتی کے لیے اس کی آنکھیں نکلوانے پر مجبور ہوا تھا۔ اس کا قصہ ان لوگوں نے بیان کیا ہے جو کامران سے بہت اچھی طرح واقف تھے، اس واقعہ کو شہنشاہ کی جوانی کے جام بردار جوہر نے

اختصار کے ساتھ لیکن غمناک انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کو بابر کی بیٹی گلبدن بیگم نے بھی بیان کیا ہے۔ اس بیگم کا لکھا ہوا ہمایوں نامہ ایک عورت کے قلم سے ان بےکل مردان کارزار کا ایک نہایت اچھا مرقع ہے۔

گلبدن بیگم نے لکھا ہے:

''تمام خواتین اور سلاطین، اونچے درجے کے لوگ، نیچے درجے کے لوگ، امیر و غریب، سپاہی، عام لوگ، غرض وہ سب جن پر مرزا کامران کا دستِ تعدی دراز ہوا تھا، جمع ہوئے۔ اور انھوں نے ایک آواز ہو کر اعلیٰحضرت سے عرض کیا: برادری اور اخوت کے مراسم کا حکومت اور سلطنت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اگر آپ ایک بھائی کا سا سلوک کرنا چاہتے ہیں تو تختِ سلطنت چھوڑ دیں۔ اور اگر بادشاہ رہنا چاہتے ہیں تو برادرانہ جذبہ کو بالائے طاق رکھیں۔ یہ بھائی نہیں۔ یہ اعلیٰحضرت کا دشمن ہے۔ حکومت کے غدار کا سر قلم کر دینا ہی قرین انصاف ہے''۔

ہمایوں نے جواب دیا ''اگرچہ میرا دماغ تمھاری باتوں کی صداقت تسلیم کرتا ہے۔ لیکن میرا دل ان باتوں کو نہیں مانتا''۔

اور یہ تو سب کو معلوم ہے کہ یہ واقعہ تھا۔ لیکن وہ اپنے امیروں کی بات ماننے پر مجبور ہو گیا تھا۔ رہتاس کے قریب پہنچا تو سید محمد کو حکم دیا، مرزا کامران کی دونوں آنکھوں میں تیل پھیر کر اسے اندھا کر دیا جائے۔

جوہر کا بیان ہے ''شاہی حکم کے صادر ہوتے ہی ہم شہزادے کے پاس گئے۔ غلام علی نے ادب اور تاسف کے ساتھ شہزادے سے عرض کیا کہ ہمیں آپ کو اندھا کر دینے کا قطعی حکم ملا ہے۔ شہزادے نے جواب دیا ''بہتر ہوتا کہ تم یکبارگی مجھے مار ڈالتے''۔ غلام علی نے عرض کیا۔ ''حکم سے بڑھ کر کچھ اور کرنے کی ہمیں مجال نہیں''۔ اس کے بعد غلام علی نے ایک رومال کا گولا بنایا اور شہزادے کے منہ میں ٹھونس دیا۔ اس کے بعد وہ اور ایک فراش دونوں شہزادے کا

ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اسے خیمے سے باہر لے گئے۔ اسے زمین پر لٹا دیا اور اس کی آنکھوں میں ایک نیزہ گھونپ دیا، خدا کی یہی مرضی تھی۔

یہی عمل انھوں نے کوئی پچاس مرتبہ دہرایا۔ لیکن اس نے مردانہ وار اس عذاب کو سہا اور کراہا تک نہیں۔ جب اس کے گھٹنوں پر بیٹھا ہوا آدمی اسے زور سے دبانے لگا تو اس نے کہا۔

''تم میرے گھٹنوں پر کیوں بیٹھے ہو۔ اس عذاب میں اور اضافہ کرنے سے کیا حاصل''؟

''بس اتنا ہی اس نے کہا اور بڑی بہادری کا ثبوت دیا۔ اس کے بعد وہ لوگ تھوڑا سا لیموں کا رس اور نمک لے کر آئے اور آنکھوں کے گھیرے میں یہ چیزیں ڈال کر آنکھیں مل دیں۔ اب اس سے زیادہ وہ برداشت نہ کر سکا، اور چلا اٹھا''۔

''اے خدا، اے میرے مالک، جو جو گناہ مجھ سے سرزد ہوئے تھے، ان سب کی پوری پوری سزا مجھے اس دنیا میں مل گئی۔ دوسری دنیا میں مجھ پر رحم فرما''۔

پھر یہ اندھا حج کے لیے چلا گیا، اور کوئی چار سال بعد مکہ میں اس دنیا سے چل بسا۔ مسز بیورج جنھوں نے اس کی بہن کی لکھی ہوئی تزک کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے، لکھتی ہیں کامران نے بھی کوئی تزک لکھی ہوتی تو وہ کتنی دلچسپ ہوتی۔ اسی میں وہ اپنی زندگی کو اپنے نقطۂ نظر سے پیش کرتا۔ اپنے عزائم، اپنی امنگوں کا حال بتاتا۔ درست اور نادرست پر اپنی رائے دیتا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ مذہبی فرائض کے بارے میں اپنے دل کی بات بتاتا جنھیں وہ اپنی موت سے پہلے اپنی شکست اور اپنی ذلت وخواری کی وجہ سے ادا کر سکا۔ ہمیں اس کے بارے میں تمام سچی باتیں معلوم نہ ہو سکیں''۔

تاہم اس کے دل کا حال ہم اس کی غزلوں کی اس چھوٹی سی کتاب سے معلوم کر سکتے ہیں جو اس دنیا میں اس دور کا لکھا ہوا ایک ہی نسخہ ہے کیونکہ وہ بھی بڑا لائق فائق عالم تھا۔ اور اپنی نسل کی ذہانت اور ذکاوت کا اسے کافی حصہ ملا تھا۔ اس کی غزلوں کا یہ دیوان مشہور خطاط محمد بن الشہابی ہروی کے قلم کی یادگار ہے۔ خطاطی میں اس محمد بن اسحاق الشہابی کا درجہ اپنے نامور ہم عصر میر علی کے بعد ہی تھا۔ یہ نسخہ کامران کی زندگی ہی میں لکھا گیا تھا۔ اس کے اندر شہنشاہ جہانگیر

اور شہنشاہ شاہجہاں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے حاشیے ہیں۔ اسے ملکہ عالم نور جہاں نے پڑھا تھا۔ پھر اس کے بعد یہ مختلف شہزادوں اور شاہی دربار کے امیروں کے پاس رہا۔

اس نسخہ کے ساتھ ساتھ اس خوش ذوق لیکن بدنصیب خاندان کے ایک اور شہزادے کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخہ کا ذکر نامناسب ہوگا۔ یہ دارا شکوہ کی تصنیف اولیاء کا تذکرہ ''سفینۃ الاولیاء'' ہے۔ یہ دارا شکوہ، شاہجہاں کا سب سے چہیتا بیٹا اور اس کا پسند کیا ہوا جانشین تھا۔ لیکن اس کی قسمت میں تو اپنے بیٹے اورنگ زیب کے ہاتھوں بڑی بڑی مصیبتیں اٹھا کر جان دینا لکھا تھا۔ ہندوستان میں اس کی دردناک کہانی سبھی جانتے ہیں۔ یہی کہانی ایک فرانسیسی نے ایسے الفاظ میں بیان کی ہے کہ کوئی اسے بھلا نہیں سکتا۔ یہ فرانسیسی، دارا شکوہ سے اس وقت ملا ہے جب وہ بھاگا بھاگا راجپوتانہ کے تپتے ہوئے صحرا سے گزر رہا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ عجیب ملاقات تھی۔ اس کے بعد اس فرانسیسی نے دارا کو پھر پایۂ تخت میں اس کے آخری لمحوں میں دیکھا۔

موسیو برنیر اپنے پیرس کے ایک دوست کو لکھتے ہیں ''عوام کو خوفزدہ اور مرعوب کرنے اور ان کے دلوں میں اورنگ زیب کی مطلق اور بے پناہ طاقت کا سکہ بٹھانے کے لیے ضروری سمجھا گیا تھا۔ اس لیے بدنصیب قیدی کو ایک ہاتھی پر بٹھایا گیا اس کے پہلو میں اس کا نوعمر بیٹا تھا۔ یہ ہاتھی پیگو یا لنگا کے ان شاندار ہاتھیوں میں نہ تھا جن پر اکثر دارا شکوہ کی سواری نکلتی تھی۔ اور جنھیں ہر طرح سجایا جاتا تھا، جن پر سونے کی عماری اور شہزادے کو دھوپ سے بچانے کے لیے خوبصورت چھتر ہوتا تھا۔ جس ہاتھی پر اب دارا شکوہ کو بٹھا کر نکالا گیا تھا وہ ایک مکروہ سا بوڑھا ہاتھی تھا۔ سر سے پیر تک غلاظت میں اٹا ہوا۔ دارا کے گلے میں اب وہ بڑے بڑے موتیوں کے مالے نہ تھے جن سے ہندوستانی شہزادے اپنے آپ کو سنوارتے ہیں۔ سر پر شاندار پگڑی نہ تھی۔ جسم پر جگمگاتے کپڑے نہ تھے۔ دارا اور دارا کے بیٹے کو بڑے ہی خراب کپڑے پہنائے گئے تھے۔ پگڑی کی جگہ سر پر ایک کشمیری شال اس طرح لپیٹ دی گئی تھی جیسے ادنیٰ اور معمولی لوگ باندھتے ہیں۔ میں نے ہر سمت سے اٹھتی ہوئی دلدوز چیخیں سنیں، کیونکہ ہندوستان کے لوگ بڑے نرم دل ہوتے ہیں۔ مرد، عورتیں اور بچے ایسے بلک بلک کر رو رہے تھے جیسے خود ان پر کوئی

بھاری مصیبت ٹوٹ پڑی تھی''۔

یہ سب ذلتیں اس کے قتل کا مقدمہ تھیں

اس کا سر فوراً اورنگ زیب کے سامنے پیش کیا گیا۔ اورنگ زیب نے حکم دیا کہ اسے ایک طشت میں رکھا جائے اور پانی لایا جائے۔ دارا کے چہرے سے خون صاف کیا گیا۔ اور جب اس بات میں کوئی شبہ نہ رہا کہ یہ داراہی کا سر ہے تو اورنگ زیب کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اس نے کہا، بدبختو! اب ایسے دل دکھانے والے منظر سے میری آنکھوں کو زخمی نہ کرو۔ اس سر کو لے جاؤ اور اسے ہمایوں کے مقبرے میں دفن کر دو''۔

یاد رہے یہ دونوں قاتل اور مقتول ایک ہی ماں کے بیٹے تھے۔ اسی نازک ارجمند بانو بیگم (ممتاز محل) کے بیٹے تھے جس کے مزار پر اپنے لازوال حسن کے ساتھ آج بھی مرمریں خواب تاج کھڑا ہوا ہے۔

ان دردناک یادوں والی کتابوں سے اب صرف نظر کیجیے۔ ادھر کچھ اور کتابیں رکھی ہیں۔ ان کا بے عیب رنگ اور ان کی بے مثال صناعی دیکھیے۔ ان کے دیکھنے سے دل میں سرور، اور آنکھوں میں نور پیدا ہوتا ہے اس کے سوا دل میں اور کوئی بات پیدا نہیں ہوتی۔

یہ دیکھیے یہ سعدی کے دیوان غزلیات کے کئی نسخے رکھے ہیں۔ سعدیؒ تیرہویں صدی عیسوی کے شاعر ہیں۔ کہتے ہیں وہ شاہی درباروں سے وابستہ ضرور تھے ایک بادشاہ نے تو ان کی تعلیم کا انتظام کیا تھا اور ایک بادشاہ ان کے کلام سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ ایک ملاقات کے موقع پر اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی قلندرانہ زندگی کا یہ حال تھا کہ چودہ حج پیدل کیے تھے، اور بیت المقدس میں غریب زائروں کی خدمت کے لیے سقہ کی خدمت خوشی خوشی بجالاتے تھے۔ ان نسخوں میں ایک نسخہ'' کلیات سعدی'' کا ہے اور پندرہویں صدی عیسوی کا لکھا ہوا ہے۔ اسے طرح طرح سے سجایا گیا ہے اور اس میں ہر رنگ کی تصویریں ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی تصویریں اس وقت کی بہترین ایرانی طرز میں بنائی گئی ہیں۔ اس کے پہلے دو صفحوں پر مطالب کی فہرست سفید حرفوں میں لکھی گئی ہے۔

ایک اور نسخہ اس کتب خانے کی تمام نسخوں میں سب سے پرانا ہے۔ یہ نہایت واضح اور بڑے دلکش خط میں لکھا گیا ہے۔ کاغذ رنگ برنگی ہے اور اس پر افشاں چھڑکی ہوئی ہے، اور یہ کسی شیرازی خطاط کا کارنامہ ہے۔

ایک اور نسخہ۔ یہ بوستاں کا انتخاب ہے۔ نہایت مطلا اور مذہب، اس کی لوح کے دونوں ورق ایسے طلاء کار اور ایسی ایسی گلکاریوں سے سجائے گئے ہیں جیسے محلوں کے ایرانی قالین۔ ان سے بھی زیادہ دلکش اس کا آخری ورق ہے۔ نیلا نیلا، پیلا پیلا، اودا اودا، ہرا ہرا، ہر غزل کی ابتداء نازک نازک طلائی پھولوں سے مزین۔ کہتے ہیں اس کی خطاطی میر عماد کے قلم کا اعجاز ہے۔

اور اس کے ساتھ کی کتاب پر جب نظریں دوڑتی ہے تو بس ٹھٹک کر رہ جاتی ہیں۔ اس کے ہر ورق پر جو بیل بوٹے بنے ہیں، وہ سب ایک دوسرے سے بالکل الگ، اپنی نرالی شان لیے ہوئے۔ ایک اور جلد میں گلستاں اور بوستاں دونوں کے متن درج ہیں۔ گلستاں کی طرز تو ایسی ہے کہ اس میں نثر و نظم دونوں ملے جلے اور گتھے ہیں۔ یہ کتاب مصوّر ہے، اور کئی تصویریں ایسی ہیں جو خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ ایک تصویر میں خود حضرت سعدیؒ ایک درویش کے روپ میں دکھائے گئے ہیں۔ ایک سن رسیدہ بزرگ، نورانی چہرہ، سفید براق داڑھی، نیلا جلابیہ پہنے ہوئے، آستینیں لمبی لمبی، اس میں ان کے ہاتھ چھپے ہوئے، ایک سرو کے درخت کے گرد گانے والوں اور بہت سے ناچنے والوں کے ساتھ رقص کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ ہاتھ سے تال دے رہے ہیں۔ کچھ بڑی دلچسپی اور گہری عقیدت سے اس منظر کو دیکھ رہے ہیں۔ عورتیں سفید یشمک (نقاب) ڈالے، دریچوں سے جھانک رہی ہیں۔ ایک اور تصویر میں پھلوں سے لدے ہوئے بوستاں دکھائے گئے ہیں۔ ایک بڑا سا دروازہ، اُڑتے ہوئے بادل اور تیر انداز اپنی کمانیں چڑھاتے صاف دکھائی دیتے ہیں۔

ایک اور جلد لیجیے۔ اس میں "عمر خیام" اور "حافظ" دونوں کا کلام یکجا کر دیا گیا۔ عمر خیام کا کلام متن میں درج ہے اور حاشیہ میں حافظ کا کلام نہایت باریک خط میں لکھا گیا ہے۔ یہ کلام کسی خوش ذوق نے انتخاب کیا ہے اور دونوں شاعروں کا تقابل پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں

جو تصویریں پیش کی گئی ہیں ان کا مقابلہ اسی عہد (سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی) کی ایک اور کتاب ''حملۂ حیدری'' کی تصویروں سے کیجیے۔ یہ کتاب رسول اللہ صلعم اور خلفائے کرام کی سیاسی زندگی پر لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کی تصویریں اور حملۂ حیدری کی تصویریں مذاق کے انحطاط اور ایرانی مکتب کے دلنواز حسن سے دوری کا مرثیہ پڑھ رہی ہیں۔ یہ ہندوستانی قسم ہے اور گھٹیا قسم کا ہے۔ خاص کر حملۂ حیدری میں جو تصویریں بنائی گئی ہیں وہ بھدی ہیں اور کچھ ٹھیک نہیں بنائی گئی ہیں۔ گلکاری سطحی قسم کی اور بے جان سی ہے۔ لاجورد کے نیلے رنگ کی جگہ کسی گھٹیا رنگ نے لے لی ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب نہ صرف ایرانی آرٹ اپنی قوت کھوتا جاتا تھا۔ بلکہ خود آل تیمور کی پُرشکوہ سلطنت بھی زوال کے زینے تیزی سے طے کرتی جاتی تھی۔ ایک اور کتاب ''مجالس العشاق'' کو لیجیے۔ یہ کتاب ایران کے آخری تیموری بادشاہ سلطان حسین باتقیر (۸۴۲ھ-۹۱۱ھ) سے منسوب کی گئی ہے۔ اس کے ایک ہی صفحہ سے مذاق کے اس انحطاط کا اندازہ کر لیا جا سکتا ہے۔ عنوان با ابتدائی صفحے سنہری اور لاجوردی کام سے مزین ہیں۔ آپ سیدھے ہاتھ کے صفحے کے کام میں پوری صفائی اور بڑی نزاکت پائیں گے۔ لیکن بائیں ہاتھ کے صفحے پر آپ کو اسی کام کی بھونڈی سی نقل ملے گی اور یہ نقل اصل کے گم ہو جانے یا چرائے جانے کے بعد اس کی جگہ لگائی گئی ہے۔ یہاں آپ خط اور رنگ کے حسن اور اس کی بھونڈی نقل کا فرق اچھی طرح محسوس کر سکیں گے۔ لیکن باقی پوری کتاب اسی قدیم طرز میں ہے۔ اس کی خطاطی کسی شیرازی استاد کے قلم کا اعجاز ہے۔ اس کے پورے صفحے پر بنی ہوئی تصویریں بڑی دلکش اور دلچسپ ہیں۔ یہ تصویریں لاجوردی، سنہری، شنگرفی، سبز اور سرخ اور بادامی رنگوں میں بنائی گئی ہیں۔ ان کے گرد بڑا ہی خوبصورت سنہری حاشیہ دیا گیا ہے۔ یہاں پھولوں کی جاندار عکاسی کی گئی ہے۔ پیڑوں کو اپنے جوبن کے پورے ابھار کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ یہ تصویریں ایسے مصور نے بنائی ہیں جس نے ان کے حسن کا نظارہ کیا ہے، ان پر سو جان سے فدا ہوا ہے اور آسمان کبود کے پس منظر میں ان کی دلنواز اور نازک پرچھائیاں دیکھی ہیں۔ جو لوگ ان صفحوں پر دکھائے گئے ہیں، ان کے لباس ان کے چہرے، طرح طرح کے مرد اور طرح طرح کی عورتیں

یہ سب کے سب نہایت دلچسپ چیزیں ہیں۔ خوبصورت باغ ہیں، بیش قیمت قالین ہیں۔ رنگین اور کاشی کار دیواریں اور سجے سجائے دروازے ہیں۔ ان تصویروں پر چینی مصوری کا اثر نمایاں ہے اور اسی چینی مصوری سے ایرانی تصویر کاری سے اپنے چینی اصول سیکھے ہیں۔ کہیں تو لڑائی کے منظر ہیں۔ زرہ بکتر پہنے ہوئے سوار ایک قلعہ پر حملہ کر رہے ہیں۔ چنگیز خاں تبریز پر حملہ کر رہا ہے اسی جاندار تصویر کے ایک گوشے میں حضرت نجم الدین کبریٰ ہاتھوں میں اپنا منہ چھپائے الحاح وزاری کے ساتھ شہر کے لیے دعا کر رہے ہیں۔ ایک تصویر میں شیریں اور اس کی سہیلیاں گھوڑوں پر سوار فرہاد کو ڈھونڈ رہی ہیں اور یورپ کی مشہور عشقیہ داستان کی ہیروئن نکولیٹ کی طرح راستے کی مصیبتیں جھیل رہی ہیں۔ کہیں بارہ سنگھے، ہرن اور چیتے دکھائے گئے ہیں۔ کہیں بندر بڑی بڑی چٹانیں راہ گیروں پر لڑھکاتے نظر آتے ہیں۔ متن کے لیے شربتی رنگ کا کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔ اور اس پر ہلکی سی افشاں بھی چھڑکی گئی ہے۔

اس کتاب کے بعد اب یہ کتاب اٹھایئے۔ یہ تیرہ شاعروں کے کلام کا انتخاب ہے۔ یہ انتخاب گولکنڈے کے قطب شاہی سلطان کے لیے لکھا گیا ہے۔ یہ واقعہ ایک سنہری طغرے کے اندر درج کیا گیا ہے جس کے اطراف کے حاشیے پر چند منتخب شاعروں کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ یہ ایک نہایت نزاکت سے لکھا ہوا بڑا ہی مرصع نسخہ ہے۔ اس کے ہر ورق پر وقت کا ساحرانہ اثر ثبت ہے۔

ایران کے ان شاعروں کے مجموعۂ غزلیات کے ساتھ ساتھ بہت سے ہندوستانی شاعروں کی کئی کتابوں کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ ادھر طوطیٔ شکر مقال ہند امیر خسروؒ ہیں جن کی پُرگو شاعری آج ہندوستانیوں کے دلوں میں دھڑکن پیدا کر دیتی ہے۔ جن کا مزار حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی بارگاہ میں آج بھی موجود ہے۔ اور یہ وہ آستانہ ہے جس پر بڑے بڑے شہنشاہ جبہ سائی کرتے آئے ہیں۔ چھ سو سال ہونے آئے، پر یہ مزار آج بھی موجود ہے، اور اب بھی گلاب کے پھولوں سے ڈھکا رہتا ہے۔ اس مقدس بارگاہ میں حضرت امیر خسروؒ کے بازو بابر کا چہیتا مورخ اور ابتداء سے ایشیا کی ایک عام تاریخ ''خلاصۃ الاخبار'' کا مصنف خوندمیر محوِ خواب ہے۔

اب اجازت ہو تو اسلامی مشرق کی ایک بہت بڑے مؤرخ امام ابوجعفر محمد طبری کی تاریخ کے فارسی ترجمہ کا ذکر کروں۔ یہ فارسی ترجمہ بلعمی نے کیا ہے۔ اس کتاب کے دو نسخے اس کتب خانے میں موجود ہیں۔ کہتے ہیں طبری کی تاریخ کبیر کا پہلا دو نسخہ اتنا زیادہ ضخیم تھا کہ ان کے صابر اور شاکر مشرقی شاگرد خلاصہ کی صورت کے سوا کسی اور طرح اسے پڑھنے پر راضی نہ ہوئے۔ اس پر مصنف نے دلگیر ہو کر کہا طلب علم کا شوق اب مردہ ہو چکا۔ اس ضخیم تاریخ کا کوئی مکمل نسخہ اب کہیں نہیں ملتا۔ لیکن اس کی الگ الگ جلدیں دنیا کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ہے(۱)

نسبتاً حالیہ زمانے کی عام دلچسپی کی کتابوں میں تزکی سے فارسی میں عبدالرحیم خانخاناں کا لکھا ہوا تزک بابری کا ترجمہ ہے۔ اس کے بعد امیر حیدر حسینی واسطی بلگرامی کی لکھی ہوئی سوانح اکبری ہے جو شہنشاہ اکبر کی پیدائش سے لے کر اس کے چوبیسویں سنہ جلوس تک کی تاریخ ہے۔ اس کے بارے میں کسی نے کہہ دیا تھا کہ ''ایک ہندوستانی کے قلم سے نکلی ہوئی غالبًا یہی ایک مستند تاریخی کتاب ہے''۔ لیکن مدت ہوئی یہ قول بالکل غلط ثابت ہو چکا ہے۔ کیونکہ اس مصنف کے سوا اور بھی کئی ہندوستانی مصنفوں نے مستند تاریخی کتابیں لکھی ہیں۔ پھر شہنشاہ جہانگیر کی تزک جہانگیری ہے جسے جہانگیر نے اپنے دور حکومت کے تیسرے سال لکھا تھا۔ پھر تین جلدوں میں اقبال نامۂ جہانگیری ہے جس کی پہلی دو جلدیں بہت کمیاب ہیں۔ غلام حسین کی تاریخ ''سیر المتاخرین'' کا ایک نسخہ بھی ہے جو خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اور یہ سلطنت مغلیہ کے عروج و زوال کی تاریخ ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ہے جو فرانسیسی مصنف موسیو ریماں نے کیا ہے۔ اس پر خود مترجم کے ہاتھ کے لکھے ہوئے حواشی ہیں۔ ''مرأۃ القدس'' کا ایک نسخہ بھی ہے جو حضرت عیسیٰ کی سوانح حیات ہے۔ یہ کتاب شہنشاہ اکبر کی فرمائش پر جوٹ فرقے کے ایک پادری جیروم زوائر نے لکھی ہے۔ یہ پادری شہنشاہ کا بڑا گہرا دوست بن گیا تھا۔ اس کی بڑی آرزو یہ تھی کہ کسی طرح اکبر کو نصرانی بنالے۔ ایک اور خوبصورت کتاب فارسی اور گورمکھی خط میں ملتی ہے۔ کاغذ شربتی اور کام سنہرا ہے۔ فارسی الفاظ سیاہ ہیں اور گورمکھی سرخ۔ یہ کتاب کبھی پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ملک تھی۔ اس میں بہت سے

افسروں، رجمنٹوں اور اس کے ملازموں کے نام ہیں۔ انھیں کیا تنخواہیں ملتی تھیں اور آج سے ایک صدی پہلے سکھ فوج کے مصارف کیا تھے۔ ان سب کی تفصیل اس میں لکھی ہے۔

اگر یہ فارسی کتابیں ہمیں شاہوں اور شاعروں کی محفل میں پہنچا دیتی ہیں جو محبت کرنے والے اور محبت کیے جانے والے لوگ تھے، اور جو سپاہی بھی تھے اور سیاس بھی، اور یہی کتابیں ہمارے سامنے پھولوں کے سادہ حسن اور درباروں کے پُرشکوہ بناؤ کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیتی ہیں تو عربی میں لکھی ہوئی کتابیں زیادہ ترسنجیدہ موضوعوں کی طرف ہمارا دامن کھینچتی ہیں۔ یہاں کروڑوں مسلمانوں کی رہنما کتاب مقدس قرآن کے کئی نسخے ہیں جو خود اللہ کا کلام ہے اور رسول اللہ صلعم کی حدیثوں کا وسیع ذخیرہ ہے۔ ان سے لے کر صالح عالموں کی تفسیریں ہیں، طب و جراحت، فلسفہ اور سائنس پر لکھے ہوئے عالمانہ مقالے ہیں۔ یہ سب کتابیں ایسے زمانے میں لکھی گئی ہیں جب عربی ثقافت یورپ کی ثقافت سے کہیں آگے اور کہیں تابناک تھی۔ اور یورپ ابھی تاریک زمانے کی ظلمتوں میں ٹھوکریں ہی کھا رہا تھا۔ ان سے بھی بڑھ کر ادبی سوانح کے میدان میں عربی زبان کے مصنفوں نے وہ وہ جوہر دکھائے ہیں کہ شاید ہی دنیا کا کوئی ادب اس موضوع پر اس زبان سے زیادہ مالا مال نکلے۔ ڈاکٹر اسپرنگر کا قول ہے کہ "دنیا میں کوئی ایسی قوم نہیں ہوئی ہے جس نے مسلمانوں کی طرح بارہ سو سال کی طویل مدت میں اپنے ہر اہل قلم کی زندگی کا حال محفوظ رکھا ہو۔ اگر مسلمانوں کی سوانح عمریاں اکٹھی کی جائیں تو ہمارے کم سے کم دس لاکھ ممتاز آدمیوں کی زندگی کے حالات جمع ہو جائیں۔ اور ہم پر یہ بھی روشن ہو جائے کہ تاریخ کا کوئی شعبہ ایسا نہیں یا اور کوئی اہمیت رکھنے والی چیز ایسی نہیں جو اس ذخیرے میں اپنی نمائندگی نہ کر رہی ہو۔

اب تک اس کتاب خانے کی فہرست کی جو چار جلدیں (۱) چھپی ہیں ان میں سے تین جلدیں فارسی کی قلمی کتابوں پر مشتمل ہیں اور ایک جلد صرف عربی میں لکھی ہوئی طب کی کتابوں پر مشتمل ہے۔ ان میں پہلی کتاب ابن ماسویہ کی لکھی ہوئی "کتاب المشجر" کا ایک نادر نسخہ ہے۔ اس میں فن طب کے عام اصول بیان کرنے کے بعد ان بیماریوں کی تفصیل درج ہے جو مصنف کے زمانے میں طبیبوں کو معلوم تھے۔ اس کتاب کا مصنف ایک شامی نصرانی تھا۔ اسے

خلیفہ ہارون الرشید نے قدیم کتابوں کے ترجموں کے کام کا نگراں مقرر کیا تھا۔ قدیم کتابوں کے ترجموں میں یونانی زبان کی بہت سی کتابیں بھی شامل بھی تھیں۔ وہ خلیفہ منصور اور اس کے کئی جانشینوں کا خانگی معالج بھی رہا۔ اس نے سنہ ۸۵۷ھ میں وفات پائی۔ موجودہ نسخہ جو آب زدہ اور کرم خوردہ ہے پندرہویں صدی کا لکھا ہوا ہے۔

اس کے بعد ابوبکر رازی کی لکھی ہوئی کتاب 'المنصوری' ہے۔ امام رازی عرب طبیبوں میں ابن سینا کے پائے کے طبیب ہیں اور یورپی مصنفوں کے پاس Rhozer کے نام سے کافی جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں لکھا ہے کہ جب بڑھاپے میں ان کی آنکھوں میں موتیابند آ گیا تو ان سے عمل جراحی کے ذریعہ ان کی بصارت بحال کرنے کی اجازت چاہی گئی۔ رازی نے افسوس کے ساتھ جواب دیا:

"میں نے اتنی دنیا دیکھی ہے کہ اب اس سے بالکل اُکتا گیا ہوں"۔

رازی کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ انھیں بغداد میں کسی جگہ ایک بیمارستان کے لیے جگہ منتخب کرنے کا حکم دیا گیا تو انھوں نے شہر کے مختلف محلوں میں گوشت کے ٹکڑے ٹانگ دیئے۔ اور صرف اسی محلے کا انتخاب کیا جس میں معینہ مدت کے بعد گوشت میں کم سے کم سڑاند پیدا ہوئی تھی۔ اس طرح رازی نے گویا سب سے اول خوردبینی تعدیہ کے بارے میں ہماری موجودہ معلومات کی رہنمائی کی ہے۔ رازی ہی سے چیچک اور خسرہ پر قدیم ترین بیانات منسوب کیے گئے ہیں۔

اسی ضمن میں "کتاب الحشائش" کا تذکرہ نامناسب ہوگا۔ یہ گیارہویں صدی عیسوی کا لکھا ہوا نسخہ ہے۔ اصل میں یہ نیرو کے عہد کے ایک عالم نباتات ڈایاس کوری ڈس کی لکھی ہوئی، قرابادین کا عربی ترجمہ ہے۔ ڈایاس کوری ڈس، صقلیہ کا رہنے والا تھا۔ جوانی میں اس نے ایک سپاہی کی حیثیت سے یونان، ایشیائے کوچک اور گال کا سفر کیا تھا، اور ساتھ ساتھ نباتات کے مختلف نمونے جمع کرتا جاتا تھا۔ اس کے بعد کے عہدوں میں اس کی لکھی ہوئی قرابادین، قرابادین نگاری کا نمونہ بن گئی۔ موجودہ نسخے میں کئی رنگین تصویریں ہیں جو بالکل سیدھی سادی ہیں۔ یہ سب

پودوں کی تصویریں ہیں۔ان کے یونانی نام عربی رسم خط میں لکھے گئے ہیں اور کہیں کہیں عربی کے ساتھ ساتھ یونانی رسم خط میں بھی یہ نام لکھ دیے گئے ہیں۔

دیکھنے میں یہ عربی مخطوطے تکلف سے عاری اور سیدھے سادے ہیں۔لیکن ان میں قرآن کے نسخے استثنائی حیثیت رکھتے ہیں۔ بلکہ اس کتب خانے میں قرآن کے دو ایک نسخے ایسے ہیں جو بعض لوگوں کی نظر میں پورے کتب خانے کے نادر اور نایاب خزانوں میں سب پر فائق اور سب سے نفیس تر ہیں۔میں خاص طور پر مشہور خطاط یاقوت مستعصمی کے لکھے ہوئے ایک نسخہ کا ذکر کروں گا۔اس کے آخر میں اس کے دستخط اور سنہ ۶۶۸ ہجری (مطابق سنہ ۱۲۵۴ء) کی تاریخ درج ہے۔اس جلد کے ہر صفحہ پر متن کی عبارت خطاطی کی تین طرزوں میں لکھی گئی ہے۔یہ خط نسخ، ریحان اور ثلث ہیں پہلا طرز خط یعنی نسخ خود یاقوت کا ایجاد کیا ہوا ہے۔میرے لیے تو خط کے حسن کے اظہار کا اس سے بہتر اور اس سے حسین تر نمونے کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔اس کے سوا اس پر طلا کاری کی گئی ہے اور اسے نازک گلکاری سے سجایا گیا ہے۔ ہر سورۃ کا عنوان طلائی حرفوں میں لکھا گیا ہے۔ ہر صفحہ پر متن کے گرداگرد ایک حاشیہ سرخ، نیلے اور سنہری رنگ میں دیا گیا ہے۔اور بیرونی حاشیہ بھی طلائی ہے۔آپ یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ یہ حاشیہ کچھ اس طرح بنایا گیا ہے کہ جہاں کہیں کوئی حرف اوپر کی آڑی لکیر سے آگے بڑھ گیا ہے، وہاں بھی اس کے اطراف ایک چھوٹا سا حاشیہ بنا دیا گیا ہے۔

کتاب کے پہلے صفحہ پر نیلا اور طلائی طغرا ہے۔ یہ مشہور تزئینی طرز تاج محل کی پچی کاری اور دوسری مشہور عمارتوں میں بھی دکھائی دیتی ہے۔اپنی مزین اور منقش دستخطی عبارت میں خلیفہ مستعصم باللہ کے زمانے کا یہ بغدادی خطاط اپنی خطاؤں اور گناہوں کے لیے مغفرت کا طالب ہے۔اندر کے ورقوں کا رنگ ہلکا زردی مائل ہے۔

قرآن کا ایک اور نسخہ اپنی ماہرانہ خطاطی کے لحاظ سے تو نہیں البتہ اپنی غیر معمولی تزئین کے لحاظ سے اس نسخہ سے بھی بازی لے جاتا ہے۔قرآن کا یہ نسخہ جو حد درجہ سجا سجایا ہے بہت بڑی تقطیع پر لکھا گیا ہے۔اس کے چوڑے حاشیے پر ایک فارسی تفسیر نیلے حرفوں میں لکھی گئی ہے۔ کتابوں کی حد

تک اس سے زیادہ مرصع اور اس سے زیادہ مزین اور آراستہ پیراستہ کتاب کا تصور بھی مشکل ہے۔ ہر سورۃ دہرے صفحوں سے شروع ہوتی ہے۔ اس پر نیلا اور طلائی کام ہے۔ لاجورد، فیروزہ اور معدنی لاجورد سے نازک گل بوٹے بنائے گئے ہیں اور سرخ اور شنگرفی رنگوں کے ملاپ سے ایک نئے رنگ میں گلکاریاں کی گئی ہیں۔ ان دہرے صفحوں پر جو گلکاری کی گئی ہے وہ ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہر دہرے صفحے کی گلکاری اپنی انفرادی شان رکھتی ہے۔ ہر سورۃ کا عنوان سفید حرفوں میں لکھا گیا ہے ہر سورۃ کی ابتدا سفید حرفوں سے ہوتی ہے جو گہری نیلی زمین پر لکھے گئے ہیں۔ حاشیوں کے کئی سلسلے ہیں اور ان کے اندر یہ مقدس الفاظ لکھے گئے ہیں جیسے انھیں عام دنیا سے الگ کر کے ایک احاطے میں رکھا گیا ہے۔ اسی طرح قرآن کی تفسیر ہے۔ اس کے گوشوں پر گلکاری کی پٹیاں ہیں جو طلاء سے بنائی گئی ہیں اور ہر صفحہ کی گلکاری کی پٹیاں دوسرے صفحے کی پٹیوں سے بالکل ہی الگ ہیں یہ نازک گلکاری رنگین بھی ہے۔ پھر ایک چوڑا سا حاشیہ ہے۔ چوڑائی میں کوئی ایک انچ کے قریب سفید اور سنہرا۔ ان کے سوا چھوٹے چھوٹے طغرے ہیں نیلے، سرخ اور سنہرے۔ اس کے بعد مقدس متن ہے، بڑے بڑے واضح حروف، سیاہی سے لکھے ہوئے اور کوئی ایک انچ چوڑے۔

اس جلد میں آپ کو ماہر فن کار کا ہاتھ ـــــ ہر صفحے اور ہر حرف کے پیچھے اس کی آنکھ، اس کا دماغ اور اس کا دل ـــــ کارفرما نظر آئے گا اور ماہر فن کار کے ہاتھ کی نزاکت اور چھاپے کی اکتا دینے والی اکسانیت اور مشین کی بے رسی کا فرق صاف نظر آئے گا۔ اس کا کاغذ جلادار ہے۔ اور ریشم کی طرح ہلکا۔ اس کے باوجود اس شاہانہ جلد کا وزن جس پر خالص سونا مڑھا گیا ہے، دس سیر سے کم نہ ہوگا۔ یہ پتہ نہیں یہ نسخہ کہاں سے اور کیسے یہاں آیا۔ پر اتنا یقینی ہے کہ یہ نسخہ کسی مرفہ الحال اور پُرشکوہ عہد ہی میں عالم وجود میں آیا ہوگا۔ شاید اس کے لیے جس نے تاج محل بنایا ہے۔

ان نسخوں کے ساتھ ہی میرے سامنے نہایت چھوٹی تقطیع کا ایک نسخہ رکھا ہے۔ یہ زمانے کے ہاتھوں سیاہ پڑ چکا ہے۔ اس کی ساری تزئین بس سادے سے پھول دار حاشیے ہیں، جو

ایک یا کہیں دو ہر صفحے پر بنائے گئے ہیں۔ یہ کتاب ایک کرم خوردہ چرمی جلد کے اندر بندھی ہے اور شیرازہ تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ عربی حروف کے اوپر نقطوں کے نہ ہونے سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ کتاب تیسری صدی ہجری کی لکھی ہوئی ہے۔ اور یہ کتاب اس کتب خانہ میں سب سے پرانی کتاب ہے۔ قرآن چاہے شاندار لکھے ہوئے ہوں یا سیدھے سادے، ان میں سچے مرد مومن کی نجات کا وہ راستہ معین کر دیا گیا ہے جو اسے اس دارالمحن کے پُر خار راستوں سے بچاتا سیدھا اپنے مولا تک پہنچا دیتا ہے، اس مولا تک پہنچا دیتا ہے جو اللہ ہے، رحمٰن ہے، رحیم ہے۔

ان قرآنوں کے سوا یہاں حدیث کی بھی بے شمار کتابیں رکھی ہیں حدیث نبوی علم کا وہ شعبہ ہے جس سے مسلمان عالموں کو گہری دلچسپی رہی ہے۔ پروفیسر نکلسن کے الفاظ میں ''رسول اللہ صلعم کی سوانح حیات لکھنے والا کوئی بوسویل (۱)'' نہ تھا، لیکن جیسے ہی آپ نے تبلیغ شروع کی آپ کی شخصیت نمایاں ہوگئی تھی، اور آپ کے قول و فعل کو آپ کے صحابہ احتیاط کے ساتھ یاد رکھنے لگے اور آپ کے عمل کو توجہ کے ساتھ دیکھنے لگے۔ اس طرح اسلام کی پہلی صدی میں ایسے بہت سے زندہ گواہ موجود تھے جن سے حدیثیں جمع کی جا سکتی تھیں، اور جو انھیں یاد کر کے زبانی دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ اس طرح جہاں ایک غیر جانبدار طالب علم ابن قتیبہ کے اس دعوے کی صداقت کو تسلیم کرے گا کہ کسی دین کو اتنی تاریخی صداقت نصیب ہوئی ہے جتنی کہ اسلام کو، وہاں اس کے ساتھ ہی وہ ایک اور مسلمان کے اس قول کی سچائی بھی ماننے پر مجبور ہوگا کہ ''ہم کسی چیز میں اہل تقویٰ کو اس درجہ دروغ گوئی کا مرتکب نہیں پاتے جتنی کہ حدیث میں'' یہاں میرے سامنے حدیث کی ایک کتاب رکھی ہے یہ سنہ ۹۱۱ ہجری کی مکتوبہ ہے اور ڈھاکے کے قریب اقدلہ میں بنگال کے بادشاہ سلطان حسین شاہ کے لیے لکھی گئی ہے۔ یہ ایک بڑی تقطیع کا نہایت نفیس نسخہ ہے، تین جلدوں میں نہایت پاکیزہ خط نسخ میں لکھا ہوا۔ اور ان کے لیے ایک نمونہ ہے جو غیر معمولی صبر طلب قلم، صفائی اور مہارت کا کام کرتے ہیں۔ ہر نئی عبارت ایک سنہری لوح کے ساتھ شروع کی گئی ہے جو حاشیہ پر بنائی گئی ہے۔ یہ لوح کچھ اس طرح بنائی گئی ہے جیسے اس سے چاروں طرف شعاعیں نکل رہی ہیں۔ خود متن میں ہر فصل کا عنوان نہایت نازک سنہرے حروف

میں لکھا گیا ہے۔ ہر حدیث کی ابتدا سرخی سے کی گئی ہے۔ اور کلام مجید کی آیتیں نیلے حروف میں لکھی ہیں۔ بڑے بڑے سنہرے وقف اس شاہانہ نسخے کا حسن بڑھا رہے ہیں اور ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے محبوب کے چہرے پر خال!

یہ کتاب یہاں کیسے آئی؟ معلوم ہوتا ہے بہت سے انقلابوں کے بعد جب بنگال کے سلطان کی سلطنت ختم ہوگئی تو یہ کتاب عربی کے ایک ممتاز عالم اور زمیندار کے قبضہ میں آئی۔ ہندوستان میں انگریزی راج کی ابتدا میں انگریزوں نے وہابی تحریک کے نام سے جس اسلامی تحریک کو کچلنے کے لیے سرفروش مجاہدوں کو تباہ و برباد کیا ہے ان میں یہ ایک زمیندار بھی تھے۔ انگریزی حکومت نے اسی نام نہاد وہابیت کے الزام میں ان کی زمینوں اور ان کے مال و اسباب کو ضبط کر لیا ان کی اور جائداد کے ساتھ ساتھ یہ کتاب اوروں کے قبضے میں چلی گئی اور پھر کسی طرح اس گنجینۂ عام میں داخل ہوگئی۔

اسی موضوع پر ایک اور کتاب جو تزئین کے لحاظ سے اس کا مقابلہ تو نہیں کر سکتی البتہ اس سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ یہ کتاب مسند ابی عوانہ ہے۔ یہ کتاب حال ہی میں صوبہ سرحد کے ایک مفلس عالم سے خریدی گئی ہے۔ یہ عالم شمالی مغربی صوبہ سرحد سے اس کتاب خانے کا حال سن سن کر اسے دیکھنے آئے تھے۔ ممکن ہے یہ کتاب انھوں نے کسی کتب خانے سے یوں لے لی ہو یا یہ ان کی جائز ملک ہو اور صرف تنگ دستی کی وجہ سے اسے بیچا ہو۔ اس کتاب پر عربی کے کئی مشہور عالموں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں ہیں اور یہ تحریریں مختلف صدیوں کی لکھی ہوئی ہیں۔

اسی قسم کی ایک اور کتاب رکھی ہے۔ یہ کتاب سنہ ۱۸۷۰ء میں شمس الدین بن علاء الدین نامی کسی دمشقی عالم اور کاتب نے خود دمشق کے شاہی کتب خانے کے لیے تحفۃً پیش کی تھی۔ ایک منقش صفحہ پر اس تحفہ کو اس شرط پر پیش کیا گیا ہے کہ یہ کتاب اس کتاب خانے سے کبھی نہ ہٹائی جائے۔ کتاب کا معطی خداوند عالم کی بارگاہ میں ملتجی ہے کہ اس کی اس خواہش کو نظر انداز کرنے والے کو سزا دے۔ یہ ایک چھوٹی تقطیع کی کتاب ہے اور ایک پرانے بھورے چمڑے سے اس کی جلد باندھی گئی ہے۔ جلد کے اوپر کچھ اس طرح کے نقش و نگار کیے گئے ہیں جیسے نقش و

نگار اسلامی اندلس کی ٹائیلوں اور دیواری تزئین میں نظر آتے ہیں۔ اس کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ اور جگہ جگہ کیڑے اسے چاٹ گئے ہیں۔ کسی کو خبر نہیں یہ کتاب یہاں کیسے آئی۔ لیکن ہم اپنے قیاس کا گھوڑا دوڑا سکتے ہیں۔ یہ کتابوں کے متلاشی اسی عرب کا کارنامہ ہوگا، جو اپنے آقا اور پٹنہ کے علم دوست مسلمان صاحب کتب خانہ کے لیے اتنی دور دراز ملکوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔

یہاں میں ایک اور کتاب ''سواطع الالہام'' کا ذکر کروں گا۔ یہ کتاب تفسیر پر لکھی گئی ہے۔ اس کا مصنف اکبر کے دربار کا مشہور ادیب اور اکبر کے گہرے دوست اور خادم ابوالفضل کا بھائی فیضی ہے۔ اس کتاب کی غیر معمولی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے ایسے فارسی حروف استعمال نہ کرنے کا التزام کیا ہے، جن پر نقطے ہوتے ہیں (فارسی حروف تہجی کے آدھے سے زیادہ حروف ایسے ہی ہیں) اس طرح یہ خوبصورت صفحے جانے پہچانے نقطوں سے محروم ہیں، الا جہاں خود قرآن مجید کی آیتیں نقل کی گئی ہیں۔ قرآن خود خدا کا کلام ہے۔ اور اس میں کسی طرح کی تحریف ممکن نہیں۔ اس پابندی کے باوجود مصنف کی زبان اور بیان دونوں بالکل بے خطا ہیں۔ یہ ذہنی کرتب کا شاہکار ہے۔ یہ ایک ایسے سطحی لیکن محنتی آدمی کا کارنامہ ہے جو اپنے زمانے کے ممتاز ترین عالموں میں شمار ہوتا اور نہایت محنتی مصنفوں میں گنا جاتا تھا۔ اس کے سوا بھی فیضی ہندوستان کے ایسے مصنفوں کی ردیف میں آتا ہے جنھوں نے بے حساب کتابیں لکھی ہیں۔ فیضی کے اس صبر طلب کام اور اعجوبہ پرستی کے لیے اس کی ایسی محنت کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ موجودہ نسخہ اصل کی ایک نہایت نفیس نقل ہے۔ یہ نسخہ سرخ اور نیلے قلم سے لکھا گیا ہے۔ اس کا منقش پہلا صفحہ نیلے اور سنہرے حرفوں میں لکھا گیا ہے۔

اس کے بعد میں رازی کی لکھی ہوئی ایک عربی نحو کا ذکر کروں گا یہ ایک زبردست عالم اور کاتب، عینی کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ہے جو ایک رات کے اندر ایک جلد لکھ ڈالتے تھے۔ ان کے ہاتھ کے لکھے اس نسخہ میں بھی ان کے قلم کی صبا رفتاری کا نشان ملتا ہے۔ ان کا قلم ایسا چلتا ہے جیسے سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے کے پیچھے رواں دواں تیر! اس کتاب پر ان کا نام لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اسے انھوں نے سنہ ۸۲۲ھ میں لکھ کر مکمل کیا ہے۔ مدرسۂ عینیہ اور جامعۂ ازہر

(کاتب نے اپنی ساری کتابیں اسی جامع ازہر کے لیے وقف کر دی تھیں) کی مہریں مٹ گئی ہیں۔صرف ایک دو مقام ایسے ہیں جہاں ان مہروں کے حروف پڑھ لیے جاسکتے ہیں۔اس کے بعد تصوف پر ایک کتاب کتاب فی التصوف لیجیے۔یہ مشہور صوفی بزرگ بشیر عارفی کی لکھی ہوئی ہے جو اولیاء بغداد میں سے تھے۔جن کا زمانہ تیسری صدی ہجری کا ہے۔کتاب کا موجودہ نسخہ سنہ ۲۸۳ ہجری میں ملک مصر میں لکھا گیا تھا۔یہ نسخہ بڑا نادر اور نایاب نسخہ ہے۔اس کا اور کوئی نسخہ کسی اور کتب خانہ میں موجود نہیں۔چھوٹے سے قرآن کے ساتھ یہ اس کتب خانہ کی قدیم ترین کتاب ہے۔اس کے باوجود یہ نہایت اچھی حالت میں ہے اور اس نے مرور زمانہ کا بڑی پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔

میں اپنی اس سیر کو صحابہ کے حالات پر ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ کی لکھی ہوئی کتاب الاصابہ فی تمییز الصحابہ کے ذکر پر ختم کروں گا۔اس نسخہ کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اسے مصر کے ایک مملوک سلطان نے مکہ میں اپنے بنائے ہوئے ایک مدرسہ کے لیے سنہ ۱۴۹۴ء میں وقف کیا تھا۔ایک مزین اور منقش صفحہ پر سلطان کا یہ وقف نامہ درج ہے۔اس کے سوا اس پر مدرسہ کے مہتمم کے بھی دستخط ہیں۔سرورق پر دو مہریں بھی ثبت ہیں۔انھیں مٹانے کی کوشش کی گئی ہے۔تاہم ایک مہر اب بھی پڑھی جاسکتی ہے۔اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود سلطان اشرف کا تحفہ تھا۔

اس کتب خانہ میں داخل ہونا گویا اس کے گیٹ سے لگے ہوئے بازار کی عام دنیا سے نکل کر امیروں اور درویشوں کی محفل میں جا بیٹھنا ہے۔ایک ایسی دنیا سے جو وقت کے پُر خطر ہنگاموں میں ہچکولے کھا رہی ہے،ایک ایسی دنیا میں پہنچ جانا ہے جو خود اپنے دنوں میں بھی ایسی ہی ہنگامہ خیز تھی،پر اب نہایت پرسکون ہے۔اس کتب خانہ میں داخل ہونا ان لوگوں کی صنعت گری کی داد دینا ہے جن کی جی جان سے کی ہوئی محنت کا کہیں جواب نہیں۔یہاں آ کر یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ اب بھی انسان کے اندر دو توام دھارے خدا پرستی اور شیطان دوستی کے بہ

رہے ہیں یہاں آنا گویا حیات کے عجیب مظہر کا ایک خاموش گوشے سے نظارہ کرنا ہے اور انسانیت کے انجام کے معمہ کا حل تلاش کرنا ہے جولا ینحل نظر آتا ہے۔ یہاں بڑی بڑی سلطنتوں کا زوال پردے پر چھوٹی چھوٹی تصویروں سے بڑھ کر نہیں معلوم ہوتا۔ آپ ان کی ابتداء ان کے عروج اور ان کے زوال کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ ایک ایسے ملک میں جہاں ارواح کے دوسرے روپ میں جنم لینے کا عقیدہ عام ہے، جس میں بڑے بڑے دریا پانی جمع کرتے ہیں۔ پھیلتے ہیں اور پھر غائب ہو جاتے ہیں۔ جہاں لگا تار تعمیر اور مسلسل بربادی عام ہے۔ اس عمل کا نظارہ ہر روز کتب خانہ کی چھت سے کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد یہ حقیقت بڑی بری طرح محسوس ہونے لگتی ہے کہ ان کتابوں کی صحبت کا لطف ایک وقت کی بات ہے۔ اور ایک وقت کے لیے ہی یہ سب یہاں اکٹھی ہوگئی ہیں۔ ان کے اس شاندار اجتماع کی مدت وقت کے ناپید اکنار سمندر کے مقابل ایک لحہ کے لیے ہے۔ اس اجتماع میں بعض کتابیں حد درجہ تابدار ہیں اور بعض چھوٹی موتی بھی ہیں۔ اس تھوڑی مدت کے بعد وہ کسی دن اتفاقات کے وسیع سمندر میں پھر اپنے سفر پر روانہ ہو جائیں گی۔ ان کے اس ہنگامہ سے خالی اور خاموش زندگی کے دور میں ان سے مل کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ ان کے بنانے والوں کے انہاک اور شغف کو دیکھ کر جی نہال ہو جاتا ہے صناع کی محبت، شاعر کے جذبہ اور امیروں کی شائستگی کے لیے دل سے واہ واہ نکلتی ہے۔ یہ لوگ لڑائیوں کے ہنگاموں طبل وکوس کے غل غپاڑوں اور ہتھیاروں کی جھنکاروں میں بھی اپنی تہذیب کے باغ کی آبیاری کو فراموش نہ کرتے تھے اور انسانیت کے دشوار گزار سفر میں انسان کی مدد کرنا نہ بھولتے تھے۔

☆☆

کتب خانے کے بانی کے سوا ایسے لوگوں کے ناموں کی فہرست جنھوں نے کتب خانے کو کتابیں دی ہیں

(۱) دیوان حافظ: یہ وہی نسخہ ہے جو شہنشاہوں کے قبضہ میں رہا۔ یہ نسخہ مولوی سبحان اللہ خاں رئیس و زمیندار گورکھ پور نے کتب خانہ کو عطا کیا ہے۔

(۲) مطلع الانوار: یہ نسخہ کتب خانہ کو شہر پٹنہ کے سید خورشید نواب صاحب نے عطا کیا ہے۔ اس کے اندر مشہور ایرانی مصور محمود کے قلم کی چار تصویریں ہیں اور یہ سر اڈورڈ ڈنی سن راس کی نظر میں کتب خانے کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔

(۳) کپڑے پر لکھا ہوا ایک قرآن شریف۔ یہ قرآن شریف نہایت باریک نسخ میں لکھا گیا ہے اور شروع سے آخر تک اس پر سنہری افشاں چھڑکی گئی ہے۔ یہ قرآن شریف بھی سید خورشید نواب صاحب نے پیش کیا ہے۔ آخر میں سید خورشید نواب صاحب نے اپنی کتابوں کا پورا مجموعہ جن میں ۱۲۵ قلمی کتابیں تھیں، سنہ ۱۹۰۴ء میں کتب خانہ کو عطا کر دیا۔

(۴) فارسی اور عربی کی چھپی ہوئی اور قلمی کتابوں کے دو اور مجموعے سنہ ۱۹۰۴ء اور سنہ ۱۹۱۵ء میں پٹنہ کے سید صفدر نواب صاحب مرحوم اور مولوی سید عبدالمجید صاحب کی طرف سے کتب خانے کو ملے۔ پہلے مجموعہ میں ۶۶ کتابیں ہیں اور دوسرے مجموعہ میں ۶۸ قلمی نسخے ہیں۔

☆☆

خطاطی کے استادوں پر ایک نوٹ

(۱) جمال الدین ابوالمذ یاقوت مستعصمی بن عبداللہ رومی، جس کے ہاتھ کے (سنہ ۶۸۸ھ کا لکھا ہوا) قرآن مجید کا ایک نسخہ اس کتب خانہ کے نہایت اہم خزینوں میں شمار کیا جاتا ہے، تیرہویں صدی عیسوی کے آخری عباسی خلیفۂ بغداد المستعصم باللہ کے دربار کا خطاط تھا۔ اگر چہ خط نسخ کی ایجاد ابن مقلہ کا کارنامہ ہے لیکن اس خط کو مکمل کرنے اور اس میں نازک نوک پلک بنا بنا کر اسے دوسرے تمام خطوں سے ممتاز بنانے کا سہرا یاقوت کے سر ہے۔

(۲) میر علی تبریزی، جس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک مجموعہ (یا منتخب اشعار کا مجموعہ) اس کتب خانہ میں موجود ہے، شہید کربلا حضرت حسینؓ کی اولاد میں تھا۔ غلام محمود نے اپنے تذکرۂ خوش نویساں میں لکھا ہے کہ اس خطاط نے نسخ اور تعلیق دونوں خطوں کو ملا کر وہ خوشنما خط ایجاد کیا جسے نستعلیق کہا جاتا ہے۔ یہ طرز میر علی سے پہلے کے خطاطوں کو بھی معلوم تھی اور اس طرز میں وہ لکھتے بھی تھے۔ لیکن یہ کوئی باقاعدہ خط نہ تھا۔ ان کے برخلاف میر علی نے قطعی اصولوں پر کام کیا اور اپنے پیش رو خطاطوں کے کام میں جو خامیاں پائیں تھیں ان کو دور کیا۔ میر علی کی اس اصلاح اور اس بدعت کو اس کے ہم عصر بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے میر علی کی اصلاحوں کی بنیاد پر خطاطوں کے ایک نئے مکتب کی بنیاد رکھی گئی اور اس مکتب کے خطاطوں میں آگے چل کر میر عماد اور دوسرے خطاطوں نے بڑا نام پیدا کیا۔

میر علی تبریزی، تیمور (۱۳۵۲ء-۱۴۰۵ء) کا ہم عصر تھا۔ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں بہت ہی نادر اور نایاب ہیں۔ اس کتب خانے کے ایسے ہی ایک نسخے پر شاہجہاں کی تحریر ثبت ہے۔

(۳) میر عماد حسینی قزوینی، جس کی خطاطی کے اعجاز کے نمونے اس کتب خانے میں موجود ہیں. بڑے نفیس اور نہایت دیدہ زیب نستعلیق خط کا ماہر تھا، ایران کے صفوی بادشاہ شاہ عباس اول کو میر عماد کے ہاتھ کے لکھے ہوئے شاہنامہ کے نسخہ کی بڑی خواہش تھی۔ اس خواہش کی تکمیل کے لیے اس نے میر عماد خطاط کے پاس ستر تومان (سونے کا سکہ) بھیجے، ایک سال گزر

گیا۔ کاتب کے پاس شاہی قاصد یہ پوچھنے کے لیے پہنچا کہ شاہنامہ لکھنے کا کام پورا ہوا یا نہیں؟ میر عماد نے ستر شعر قاصد کے حوالے کیے۔ یہ ستر شعر اس نے شاہنامہ کے ابتدائی حصہ سے نقل کیے تھے۔ اور کہلا بھیجا کہ جو معاوضہ اسے ملا تھا وہ بس اتنے ہی کے لیے تھا۔ یہ جواب سن کر شاہ عباس بہت برہم ہوا۔ اس نے میر عماد کے لکھے ہوئے ورق واپس کر کے اپنے بھیجے ہوئے تومان کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ میر عماد نے ان ستر شعروں کے ستر ٹکڑے کیے، اور انھیں اپنے ستر شاگردوں میں تقسیم کر دیا۔ ہر شاگرد نے ایک ایک تومان استاد کے نذر کیا اور اس طرح بادشاہ کی بھیجی ہوئی رقم واپس کر دی گئی۔ اس ذرا سی بدتمیزی پر شاہ عباس اور بھڑکا، اور اس کے بدلے میں بدنصیب خطاط کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ شاہ عباس کے ایک غلام منصور مسں گر نے اسے سنہ ۱۰۲۴ھ (م ۱۶۲۵ء) میں مار ڈالا۔ کہتے ہیں شاہ جہاں جو میر عماد کے خط کا بڑا شیدائی تھا، ہر اس شخص کو جو میر عماد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کوئی چیز پیش کرتا، یک ہزاری کا منصب عطا کرتا تھا۔

(۴) عبدالرشید دیلمی جس کے خوبصورت نستعلیق قلم کے نمونے اس کتب خانے میں دکھائی دیتے ہیں۔ عام طور پر آقا رشید کے نام سے مشہور تھا۔ یہ عماد کا بھانجا اور اس کا شاگرد تھا اس نے میر عماد کی طرز کو اور ترقی دی اور اپنی فن کاری کے لیے ایران میں بڑی شہرت حاصل کی۔ میر عماد کے قتل کے بعد وہ ہندستان چلا آیا۔ یہاں شاہجہاں کے دربار میں اسے رسائی حاصل ہوئی شاہجہاں نے اسے اپنے کم نصیب بیٹے دارا کو خطاطی سکھانے پر مقرر کیا۔ رشید نے سنہ ۱۰۸۱ھ میں وفات پائی۔

سید علی خاں جواہر رقم ابن آقا ابن مقیم تبریز سے ہندوستان آیا۔ شہنشاہ اورنگ زیب نے اسے شاہی خاندان کے بچوں کو خطاطی سکھانے پر مقرر کیا۔ یہ میر عماد اور آقا رشید کی طرز ہی میں لکھا کرتا تھا۔ اور اپنے خط کی خوبی کے لحاظ سے ان سے کسی طرح کم نہ تھا۔ کچھ دنوں تک جواہر رقم شاہی کتب خانہ کا منتظم بھی رہا۔ عمر کے آخری دور میں اس کے حواس جواب دے گئے تھے، اور وہ دیوانہ ہو گیا تھا۔ سنہ ۱۰۹۴ھ (۱۶۸۳ء) میں اس نے دکن میں وفات پائی۔

☆☆

دوسرا حصہ

نادر فارسی مخطوطات کی فہرست (۱)

تاریخ

(۱) تاریخ طبری: طبری (متوفی ۳۱۰ھ م ۹۲۱ء) کی عام تاریخ کا فارسی ترجمہ از بلعمی (ترجمہ کا زمانہ سنہ ۳۵۲ھ م ۹۶۳ء) دو جلدوں میں مکتوبہ سنہ ۷۴۰ھ۔

(۲) مجمل فصیحی: اہم واقعات کا ایک دلچسپ مجموعہ اس میں ولادت نبوی سے لے کر سنہ ۸۵۴ھ م ۱۴۴۱ء کے کے اہم واقعات کو ترتیب زمانی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کا مصنف مجمل فصیحی خوافی ہے۔ یہ نسخہ نہایت درجہ صحیح، خوشخط اور نایاب ہے اور سنہ ۹۹۳ھ کا مکتوبہ ہے (نمبر ۴۵۵)۔

(۳) خلاصۃ الاخبار: ایشیا کی تاریخ کا ایک بہترین خلاصہ از خوندمیر (متوفی ۹۴۱ھ/ ۱۵۳۴ء) ایک قدیم اور صحیح نسخہ، ۹۲۶ھ کا مکتوبہ (نمبر ۴۶۳)۔

(۴) تاریخ ابوالخیر خانی: عام تاریخ۔ اس میں ابوالخیر خاں قبچاق کے دور حکومت کا تفصیلی حال بھی درج ہے۔ اسے ازبک سلطان عبد اللطیف بہادر خاں (۹۴۷ھ/ ۱۵۴۰ء-۹۵۹ھ/۱۵۵۱ء) کے حکم پر مسعود بن عثمان خزستانی نے تصنیف کیا ہے۔ ایک نہایت نایاب اور صحیح نسخہ مکتوبہ سنہ ۹۹۹ھ (نمبر ۴۶۸)۔

(۵) تحفۃ الکرام: ایک عمومی تاریخ اور سندھ کی خصوصی تاریخ (سنہ تصنیف ۱۱۸۰ھ/۱۷۶۶ء) از میر علی شیر خاں ٹھٹھوی۔ ایک صاف ستھرا اور خوبصورت نسخہ اسے سنہ ۱۲۳۳ھ میں محمد اسماعیل شیرازی نے محمد ناصر خاں ایرانی کے لیے لکھا تھا (نمبر ۴۷۹)۔

(۶) ترجمہ مولود النبی: فارسی ترجمہ (سنہ تصنیف ۷۲۰ھ/۱۳۵۸ء) یہ سعید بن مسعود

الکازرونی (متوفی ۷۵۸ھ/ ۱۳۵۶ء) کی لکھی ہوئی سیرۃ النبی کا ترجمہ ہے جو سعید کے بیٹے عفیف نے کیا ہے۔ یہ ایک قدیم اور صحیح نسخہ ہے اور سنہ ۸۴۱ھ کا لکھا ہوا ہے۔

(۷) درج الدرر: مفصل سیرت النبی۔ از علاء الدین عبداللہ (متوفی ۸۸۳ھ/ ۱۴۷۸ء) ایک بہت نایاب نسخہ۔

(۸) مناقب مرتضوی: چوتھے خلیفہ امیر المؤمنین حضرت علیؓ کے سوانح و مناقب۔ از کاشفی (متوفی ۱۰۶۱ھ/ ۱۶۵۰ء)۔ یہ ایک بیش قیمت نسخہ ہے۔ مصنف کی وفات کے صرف تیرہ سال بعد سنہ ۱۰۷۶ھ میں لکھا گیا ہے (نمبر ۴۹۴)۔

(۹) روضۃ الشہداء: رسولؐ خدا، حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ اور دوسرے شہداء کی سیرت۔ از ملا حسین واعظ کاشفی (متوفی ۹۱۰ھ/ ۱۵۰۴ء) نہایت نفیس نسخہ۔ مکتوبہ ۹۷۶ھ۔

(۱۰) حیات القلوب: انبیاء کا تذکرہ از باقر مجلسی (متوفی ۱۱۱۱ھ/ ۱۶۹۸ء) نہایت بیش قیمت نسخہ۔ مصنف کی زندگی یعنی ۱۰۹۰ھ کا مکتوبہ (نمبر ۵۰۱)۔

(۱۱) مختار نامہ: بنتقم حسین ابن علی، مختار کی تاریخ (سنہ تصنیف ۹۷۶ھ/ ۱۵۹۳ء) از ابوذر سلمان۔ نہایت نادر، صحیح اور قیمتی نسخہ۔ مشہور کاتب مرشد الکاتب شیرازی کے ہاتھ کا لکھا ہوا۔ مکتوبہ ۹۷۴ھ (نمبر ۵۰۴)۔

(۱۲) تاریخ عالم آرائے عباسی: (صحیفہ دوم)۔ ایران کے شاہ عباس کبیر کے دور حکومت کے ابتدائی تیس سالوں کی تاریخ ۹۹۶ھ/ ۱۵۸۸ء تا ۱۰۲۵ھ/ ۱۶۱۶ء) ایک نادر نسخہ سنہ ۱۰۴۳ھ کا یعنی تصنیف کے چار سال بعد کا مکتوبہ نسخہ (۵۲۱)۔

(۱۳) ہشت بہشت: عثمانی ترک خاندان کے پہلے آٹھ حکمرانوں کی تاریخ۔ از حکیم الدین ادریس البدلیسی (متوفی ۹۲۶ھ/ ۱۵۲۰ء)۔ تین جلدوں میں خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ۔ نہایت نادر اور بیش قیمت (۵۳۲-۵۳۴)۔

(۱۴) سیرت فیروز شاہی: فیروز شاہ کے دور حکومت کے ابتدائی سالوں کی ایک بے مثل

تاریخ فیروز شاہ کی خوبیوں، اس کے خلق دوستی، اس کے تعمیری کاموں، یادگاروں اور عوامی بھلائی کے کاموں وغیرہ کی تفصیل، مصنف کا نام معلوم نہیں۔ تصنیف کا سنہ ۷۷۲ ہجری (م ۱۳۷۰ء) ہے یعنی اس شہنشاہ کے دور حکومت کے بیسویں سال لکھی گئی ہے۔ یہ نسخہ سنہ ۱۰۰۲ء کا مکتوبہ ہے۔ (نمبر ۵۴۷)

(۱۵) تاریخ داؤدی: بہلول لودھی سے لے کر داؤد شاہ کی وفات (۹۶۸ھ/۱۵۶۰ء) تک لودھی اور سور خاندانوں کی تاریخ۔ اسے شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں عبداللہ نامی کسی مصنف نے تصنیف کیا ہے۔ یہ ایک نایاب کتاب ہے (نمبر ۵۴۸)۔

(۱۶) واقعات بابری: بابر کی تزک کا فارسی ترجمہ از عبدالرحیم خانخاناں۔ یہ ایک عمدہ نسخہ ہے اور غزنی میں کسی امیر کے کتب خانہ کے لیے لکھا گیا ہے (نمبر ۵۴۹)۔

(۱۷) تاریخ خاندان تیموریہ: ایران میں تیمور اور اس کے جانشینوں اور بابر، ہمایوں اور اکبر کے بائیسویں سنہ جلوس تک کی تاریخ۔ اس کا دوسرا نسخہ اب تک کہیں اور دریافت نہیں ہوا ہے۔ نہایت بیش قیمت اور حد درجہ دلچسپ نسخہ۔ اس کے اندر ۱۱۲ تصویریں ہیں۔ ان تصویروں کو شہنشاہ اکبر کے دربار کے ساٹھ مصوروں نے خود شہنشاہ کے لیے تیار کیا تھا۔ نسخہ پر شہنشاہ شاہجہاں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی عبارت موجود ہے۔ اس کے سوا فرانسس گلاڈون کے دستخط بھی اس پر ثبت ہیں۔

(۱۸) سوانح اکبری: اکبر کی ولادت سے لے کر اس کے چوبیسویں سنہ جلوس (۹۸۷ھ/۱۵۷۹ء) تک کی تاریخ۔ از میر حیدر حسینی بلگرامی۔ نایاب کتاب، اس نسخہ پر جے، ایچ، بلوخ مان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے بہت سے کارآمد حواشی درج ہیں۔ (نمبر ۵۵۶)

(۱۹) جہانگیر نامہ: تزک جہانگیری کا ابتدائی متن۔ جو جہانگیر کے دور حکومت کے تیسرے سال لکھا گیا ہے۔ یہ مخطوطہ ۱۰۲۰ھ یعنی چھٹے سال جلوس کا مکتوبہ ہے۔ اس پر شہزادہ محمد سلطان (اورنگ زیب کے سب سے بڑے بیٹے) کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک عبارت

درج ہے۔ یہ کتاب شہزادہ سلطان محمد کے قبضے میں گولکنڈے کے قطب شاہی بادشاہوں کے کتب خانہ سے آئی تھی۔ کتاب کے پہلے صفحہ پر سلطان محمد قطب شاہ اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کی مہریں ثبت ہیں۔ (۵۵۷)

(۲۰) اقبال نامہ جہانگیری: عہد جہانگیر کی تاریخ۔ از معتمد خاں (متوفی ۱۰۴۹ھ/ ۱۶۳۹ء) یہ کتاب تین جلدوں پر منقسم ہے۔ اس کی پہلی دو جلدیں جو جہانگیر کے اسلاف کی تاریخ پر ہیں، حددرجہ نایاب ہیں۔

(۲۱) شاہجہاں نامہ: شاہجہاں کے دورِ حکومت کی مکمل تاریخ چار جلدوں میں ہر جلد الگ الگ مصنف کی لکھی ہوئی، یہ نسخہ ایک قیمتی اور صحیح نسخہ ہے اور عہد اورنگ زیب کے مرزا سلطان کی فرمائش پر لکھا گیا ہے۔ اس پر لوئی دی کاسٹا، فرانسس گاڈون اور میجر پولر کے دستخط ثبت ہیں۔

(۲۲) بادشاہ نامہ: شاہجہاں کے دور کی ایک اور مکمل تاریخ اس کے دو حصے ہیں۔ اور دونوں الگ الگ مصنفوں کے قلم سے نکلے ہیں۔ اس میں بارہ قلمی تصویریں بھی ہیں اور متاخر عہد مغل قلم کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کے سوا شاہجہاں کے عہد کی عمارتوں اور مسجدوں کے سات رنگین نقشے بھی ہیں۔ دہلی دربار سنہ ۱۹۱۱ء کے موقع پر انگلستان کے بادشاہ سلامت اور ملکہ نے اسے ملاحظہ فرمایا تھا۔

(۲۳) سیر المتاخرین: کوروؤں اور پانڈوؤں کے عہد سے لے کر ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء) تک کے بنگال کی تفصیل۔ سنہ تصنیف ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء) از غلام حسین طباطبائی بہت صحیح نسخہ اور غالباً خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

(۲۴) فاتحۂ عبریتہ: میر جملہ نے اورنگ زیب کے عہد میں کوچ بہار اور آسام پر جو چڑھائی کی تھی اور یہ مہم کس طرح ناکام رہی اس کا تفصیلی حال (سنہ تصنیف ۱۰۷۳ھ) از شہاب الدین تابش۔ یہ نسخہ مصنف کے پوتے اعتصام الدین نے سنہ ۱۱۸۱ھ کے لگ بھگ اپنے قیام لندن کے دوران میں آر چالڈسون کن کے گھر میں لکھا تھا۔

سوانح

(۲۵) تذکرۃ الاولیاء: (حصہ اول) مشہور صوفیہ کے حالات ان میں کے پیشتر صوفیاء پہلی تین ہجری صدیوں کے ہیں۔ از شیخ فرید عطار (متوفی ۶۲۷ھ/ ۱۲۲۹ء) ایک قدیم اور صحیح نسخہ۔ مکتوبہ ۷۲۴ھ۔

(۲۶) اسی کتاب کا ایک اور نسخہ خوبصورت اور واضح خط نسخ میں لکھا ہوا مکتوبہ ۸۳۰ھ۔

(۲۷) اسی کتاب کا ایک اور خوبصورت اور نہایت صحیح نسخہ جس کے حاشیوں پر بہت سے مفید نوٹ درج ہیں۔ مکتوبہ ۹۳۹ھ۔

(۲۸) آثار الوزراء: عہد قدیم سے لے کر سنہ ۸۷۳ھ تک کے مشہور وزیروں کے حالات (سنہ تصنیف ۸۳۳ھ) از سیف الدین حاجی۔ کمیاب، صحیح اور عمدہ نسخہ۔ مکتوبہ ۱۰۴۴ھ۔

(۲۹) رشحات: طریقۂ نقشبندیہ کے شیوخ کے حالات اور خاص کر مصنف کے پیر خواجہ عبیداللہ احرار کے حالات۔ سنہ تصنیف ۹۰۹ھ۔ (از فخر الدین علی صفی)۔

(۳۰) مراۃ القدس: حضرت عیسیٰ کی سیرت۔ اسے شہنشاہ اکبر کی فرمائش پر ۱۰۱۰ھ/ ۱۶۰۲ء میں پادری جرنی موز وایر نے لکھا۔ ایک عمدہ اور صحیح نسخہ۔ مکتوبہ سنہ ۱۱۳۷ھ۔

(۳۱) مجالس العشاق: ایسے ستر مشہور صوفیاء کے حالات جو دوسری صدی ہجری سے لے کر مصنف کے زمانے تک گزرے ہیں۔ اس کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ یہ کتاب سلطان حسین بالقیرا کی لکھی ہوئی ہے۔ لیکن دوسرے باوثوق مصنفوں کا بیان ہے کہ یہ کتاب کمال الدین حسین کی تصنیف ہے۔

(۳۲) اسی کتاب کا ایک اور نہایت درجہ قیمتی اور خوبصورت نسخہ۔ اس میں نفیس ترین ایرانی قلم کی (۳۲) تصویریں ہیں۔ متن نہایت خوبصورت نستعلیق خط میں کاتب احمد الحافظ شیرانی نے لکھا ہے۔

(۳۳) سفینۃ الاولیاء: ابتدائے اسلام سے لے کر مصنف کے زمانے تک کے مشہور شیوخ کے سوانح۔ سنہ تصنیف ۱۰۴۹ ہجری۔ از شاہزادہ داراشکوہ۔ نہایت درجہ بیش قیمت نسخہ۔ خود مصنف نے اس کی نظر ثانی اور تصحیح کی ہے۔ کتاب کی ابتداء میں مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک عبارت بھی درج ہے۔

(۳۴) مآثر رحیمی: (آخری حصہ) ۔عبدالرحیم خانخاناں کے ہم عصر حکیموں، طبیبوں، عالموں، فاضلوں، خطاطوں، خانخاناں کے فوجی سرداروں اور اس کے دربار کے مدح گو شاعروں کا تذکرہ۔ زمانۂ تصنیف سنہ ۱۰۲۵ ہجری۔ ازعبداللہ الباقی نہاوندی۔

(۳۵) اسی کتاب کا ایک اور نہایت بیش قیمت نسخہ۔ اس کے حاشیوں پر کئی اہم نوٹ درج ہیں۔ یہ نسخہ کسی وقت اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے دور کے مشہور امیر مہابت خاں کے بیٹے فیروز جنگ کی ملک میں رہ چکا ہے۔

(۳۶) کلمات الصادقین: دہلی میں آسودۂ خاک اولیاء کے حالات۔ زمانۂ تصنیف سنہ ۱۰۲۳ھ از صادق ہمدانی۔ نہایت درجہ نادر اور قیمتی نسخہ۔

(۳۷) مراۃ مداری: ہندوستان کے مشہور بزرگ حضرت شاہ مدار کی سوانح عمری زمانۂ تصنیف سنہ ۱۰۶۴ھ۔ ام عبدالرحمٰن چشتی۔ نایاب۔

(۳۸) ید بیضا: متقدمین اور متاخرین شعرائے ایران کا تذکرہ زمانۂ تصنیف سنہ ۱۱۴۸ھ۔ از غلام علی آزاد بلگرامی۔ ایک قیمتی اور صحیح نسخہ۔ اس کا بیشتر حصہ خود مصنف نے لکھا ہے۔

(۳۹) عقد ثریا: عہد محمد شاہ سے شاہ عالم بادشاہ کے عہد تک کے بیشتر فارسی گو ہندوستانی شاعروں کا تذکرہ۔ زمانۂ تصنیف سنہ ۱۱۹۹ھ اردو کے مشہور شاعر مصحفی کی تصنیف، نادر۔

(۴۰) گل رعنا: ہندوستان کے ہندو مسلم شاعروں کا تذکرہ۔ ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے زمانۂ تصنیف سنہ ۱۱۸۲ھ از لچھمی نارائن شفیق، نہایت نادر۔

(۴۱) مخزن الغرائب: (۳۱۴۸) فارسی گو شاعروں کا نہایت ضخیم تذکرہ زمانۂ تصنیف ۱۲۱۸ ہجری۔ از احمد علی ہاشمی۔ دو جلدوں میں مکتوبہ سنہ ۱۲۲۴ھ۔ یعنی تصنیف کے

پانچ سال بعد کا لکھا ہوا۔

(۴۲) خلاصۃ الاشعار: تقی کاشی (متوفی ۱۰۱۶ھ) کے تذکرۃ الشعراء کا ایک حصہ۔ اس حصہ میں حافظ (متوفی ۷۹۴ھ) سے لے کر فغانی (متوفی ۸۹۳ھ) تک کے شعراء کے حالات درج ہیں۔ یہ کتاب بہت نایاب ہے۔

(۴۳) عرفات العاشقین: فارسی گو شاعروں کا ایک نہایت ضخیم تذکرہ۔ زمانہ تصنیف سنہ ۱۰۲۲ھ از تقی اوحدی۔ یہ کتاب حد درجہ نایاب ہے۔

(۴۴) سفینۂ خوشگو: (جلد سوم)۔ از خوش گو۔ مصنف کے ہم عصر شاعروں کا تذکرہ۔ زمانہ تصنیف ۱۱۴۷ھ/ ۱۷۳۴ء۔ یہ قیمتی نسخہ اس کتاب کی نہایت نایاب اور اہم تیسری جلد کا دوسرا حصہ ہے۔ یہ نسخہ غلام علی آزاد بلگرامی کی فرمائش پر سنہ ۱۱۸۲ھ میں لکھا گیا تھا۔

نظم

(۴۵) شاہنامہ: از فردوسی طوسی (متوفی ۴۱۱ھ/ ۱۰۲۰ء) نہایت خوبصورت اور مصور نسخہ۔ ایرانی قلم کی تصویریں طلائی اور رنگین بنائی گئی ہیں۔ نہایت نفیس اور واضح نستعلیق میں مشہور خطاط مرشد الکاتب شیرازی نے سنہ ۹۴۲ ہجری میں لکھا ہے۔ یہ قلمی نسخہ شہنشاہ شاہجہاں کی خدمت میں کابل اور کشمیر کے صوبہ دار علی مردان خاں نے بطور نذر پیش کیا تھا (نمبر ا)۔

(۴۶) شاہ نامہ: شاہ نامہ کا ایک خوبصورت اور مرصع نسخہ۔ ایرانی قلم کی نفیس تصویریں طلا کار مرصع حاشیوں کے اندر بنائی گئی ہیں۔ ان تصویروں میں صحرائی مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ (نمبر ۲)

(۴۷) منطق الطیر: از شیخ فرید الدین عطار (متوفی ۶۲۷ھ/ ۱۲۲۹ء) بہت قدیم نسخہ۔ مکتوبہ سنہ ۸۴۳ ہجری۔

(۴۸) رباعیات سیف الدین: سیف الدین (متوفی ۶۵۸ھ/ ۱۲۵۹ء) کی رباعیاں نایاب

اور نہایت نفیس قلم میں لکھا ہوا نسخہ۔ بظاہر نویں صدی ہجری کا مکتوبہ (نمبر ۵۶)۔

(۴۹) دیوان اسیر: اسیر (متوفی ۶۶۵ھ/ ۱۲۶۶ء) کا دیوان۔ خوبصورت اور نایاب نسخہ۔ مکتوبہ سنہ ۱۰۱۵ ہجری۔ اس نسخہ پر گولکنڈے کے چھٹے قطب شاہی سلطان عبداللہ قطب شاہ کی مہر ثبت ہے۔ (نمبر ۵۷)

(۵۰) مثنوی مولوی معنوی: از مولانا جلال الدین رومی (متوفی ۶۷۴ھ/ ۱۲۷۳ء) نہایت باریک نستعلیق خط میں محمد بن حسن کرمانی نے سنہ ۸۵۶ ہجری میں لکھا ہے۔ (نمبر ۵۹)

(۵۱) دیوان امامی: امامی ہروی (متوفی ۶۸۶ھ/ ۱۲۷۷ء) کی رباعیوں کا کمیاب نسخہ۔ (نمبر ۸۸)

(۵۲) کلیات سعدی: شیخ سعدی (متوفی ۶۹۱ھ/ ۱۲۹۱ء) کے کلیات کا ایک خوبصورت نسخہ۔ اس میں کشمیری قلم کی نفیس تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ شروع سے آخر تک حاشیہ حددرجہ مرصع اور طلا کار ہے۔ (نمبر ۹۲)

(۵۳) شش رسالہ سعدی: سعدی کے چھ رسالوں کا ایک قیمتی نسخہ۔ اس نسخہ پر شہنشاہ شاہجہاں اور عبدالرحیم خانخاناں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی عبارتیں درج ہیں اس کو مشہور کاتب میر علی کے بیٹے باقر نے لکھا ہے۔ (نمبر ۹)

(۵۴) گلستان و بوستاں: (ایک جلد میں مجلد)۔ نہایت واضح اور نفیس خط نسخ میں ہدایت شیرازی نے لکھا ہے۔ اس کے اندر تصویریں بھی دی گئی ہیں۔

(۵۵) بوستاں: بوستاں سعدی کا انتخاب۔ حددرجہ باریک اور خوبصورت نستعلیق خط میں لکھا ہوا نسخہ۔ اسے غالباً میر عماد (متوفی سنہ ۱۰۲۴ ہجری) نے لکھا ہے۔ (نمبر ۹۹)

(۵۶) گلستاں: گلستاں سعدی کا ایک قیمتی نسخہ۔ نہایت باریک نستعلیق خط میں سنہری افشاں کیے ہوئے مختلف رنگ کے کاغذوں پر محمد القوام شیرازی نے سنہ ۹۹۰ھ میں لکھا ہے۔ (نمبر ۱۰۲)

(۵۷) گلستاں: گلستاں کا ایک اور نفیس نسخہ۔ اسے ہدایت اللہ زرین قلم نے سنہ ۱۱۱۵ھ میں لکھا ہے۔ (نمبر ۱۰۳)

(۵۸) شرح گلستاں: سروری (متوفی ۹۶۹ھ/ ۱۵۶۱ء) کی شرح گلستاں کا ایک نہایت درجہ قیمتی نسخہ۔ خود مصنف نے نہایت پختہ اور عالمانہ خط نسخ میں ۹۶۱ ہجری کے قریب یعنی اپنی وفات سے کوئی آٹھ سال پہلے لکھا ہے۔ (نمبر ۱۰۷)۔

(۵۹) نورستاں: گلستاں سعدی کی شرح۔ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ۔ مصنفۂ محمد واصلی کردی سالاری۔ عہد بہادر شاہ کی تصنیف مکتوبہ ۱۱۲۴ھ/ ۱۷۱۲ء (نمبر ۱۰۸)

(۶۰) ہفت بند کاشی: مشہور مرثیہ گو شاعر محتشم کاشانی (متوفی ۱۰۰۷ھ/ ۱۳۱۰ء) کے ''ہفت بند'' کا ایک نہایت خوبصورت نسخہ۔ نہایت واضح نستعلیق خط میں محمد علی اعجاز رقم نے سنہ ۱۲۰۰ھ میں لکھا ہے۔

(۶۱) ہفت بند کاشی: ہفت بند کاشی کا ایک اور خوبصورت نسخہ جو اس کتب خانہ کے بانی کے لیے لکھا گیا ہے۔ اس نسخہ کا قلم موجودہ ہندستانی خطاطی کا نفیس نمونہ ہے۔

(۶۲) گلشن راز: مولانا محمود شبستری (متوفی ۷۲۰ھ/ ۱۳۲۰ء) کی مثنوی گلشن راز کا ایک نہایت خوبصورت نسخہ۔

(۶۳) دیوان خسرو: امیر خسرو (متوفی ۷۲۵ھ/ ۱۳۲۴ء) کے دیوان کا ایک نہایت شاندار اور دلچسپ نسخہ۔ یہ نسخہ کسی وقت شہنشاہ ہمایوں کی بیٹی شہزادی سکینہ بانو کی ملک میں رہ چکا ہے۔ مکتوبہ ۹۷۸ھ۔ (نمبر ۱۲۷)

(۶۴) خمسۂ خسرو: خمسۂ خسرو کا ایک نفیس اور مصوّر نسخہ جسے دو کاتبوں نے مل کر سنہ ۹۷۴ھ میں لکھا ہے۔ (نمبر ۱۲۸)

(۶۵) مطلع الانوار: خسرو کی مثنوی مطلع الانوار کا ایک نہایت بیش قیمت نسخہ۔ اسے مشہور کاتب میر علی نے بخارا میں سنہ ۹۴۷ھ کے قریب سلطان بخارا عبدالعزیز کے لیے لکھا ہے۔ اس مخطوطے کے اندر پورے صفحہ کی چار تصویریں بھی ہیں۔ یہ تصویریں

بہترین ایرانی طرز کی نمائندگی کر رہی ہیں۔ (نمبر ۱۲۹)

(۶۶) دول رانی و خضر خاں: حضرت امیر خسرو کی مثنوی دول رانی و خضر خاں کا ایک نہایت دلچسپ نسخہ۔ اس مثنوی میں سلطان علاء الدین محمد شاہ خلجی کے بیٹے خضر خاں اور گجرات کے راجہ رائے کرو کی بیٹی دول رانی کی داستان محبت بیان کی گئی ہے۔ مثنوی کا یہ نسخہ دور اکبری کے صوبہ دار گجرات شہاب الدین احمد خاں کے حکم پر احمد آباد میں سنہ ۹۹۵ھ کے قریب لکھا گیا ہے۔ اس نسخہ کی تصحیح اور مقابلے کا کام شاعر محمد شریف وقوعی نے کیا ہے۔ (نمبر ۱۳۱)

(۶۷) دیوان حسن: حسن دہلوی۔ (متوفی ۷۲۷ھ/ ۱۳۲۷ء) کا دیوان غزلیات۔ یہ نسخہ مشہور خطاط محمد حسین کاشمیری نے سنہ ۱۰۱۰ھ میں اکبر کے ایک سپہ سالار فرید بخاری کے کتب خانہ کے لیے لکھا ہے (نمبر ۱۳۲)۔

(۶۸) دیوان سلمان: سلمان ساؤجی (متوفی ۷۷۸ھ/ ۱۳۷۶ء) کے دیوان کا قدیم ترین معلومہ نسخہ۔ نہایت باریک خط نسخ میں لکھا گیا ہے۔ اور سنہ ۸۱۱ھ میں یعنی شاعر کی وفات کے کوئی (۳۳) سال بعد اس کی کتابت ہوئی ہے۔ (نمبر ۱۴۷)

(۶۹) مہر و مشتری: اثر (متوفی ۷۸۴ھ/ ۱۳۸۲ء) کی مثنوی مہر و مشتری کا ایک نہایت خوبصورت نسخہ۔ یہ نسخہ محمود بخاری نے سنہ ۱۰۱۷ھ میں ولی محمد کے لیے لکھا تھا۔ خیال ہے کہ یہ شخص وہی ولی محمد ہے جو استرا خاں خاندان کا دوسرا بادشاہ گزرا ہے۔ (نمبر ۱۴۸)

(۷۰) دیوان رکن سائن: رکن الدین سائن ہروی (متوفی ۷۶۴ھ/ ۱۳۶۲ء) کے دیوان کا ایک نادر اور نہایت خوبصورت خط میں لکھا ہوا نسخہ۔ مکتوبہ سنہ ۸۸۳ھ۔

(۷۱) دیوان حافظ: خواجہ شمس الدین حافظ (متوفی ۷۹۱ھ/ ۱۳۸۸ء) کے دیوان غزلیات کا نہایت نادر اور دلچسپ نسخہ۔ اس نسخہ کے حاشیہ پر شہنشاہ ہمایوں اور شہنشاہ جہانگیر نے اپنے قلم سے عبارتیں لکھی ہیں۔ ان عبارتوں میں بتایا گیا ہے کہ کن کن

موقعوں پر اس دیوان سے فال نکالی گئی تھی۔ اس فال کے بعد کیا عمل کیا گیا اور ان کے کیا نتائج نکلے۔ (نمبر ۱۵۱)

(۷۲) دیوان حافظ: دیوان حافظ کا ایک اور دلچسپ نسخہ۔ اس نسخہ میں غزلیات کے مشکل الفاظ کی ایک فرہنگ بھی دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ رباعیات عمر خیام کا مجموعہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ غزلیات حافظ پر بعض نفیس تضمینیں بھی ہیں۔ اور کہیں کہیں نفیس ہندوستانی طرز میں تصویریں بھی دی گئی ہیں۔

(۷۳) دیوان حافظ: دیوان حافظ کا ایک اور خوبصورت نسخہ اس مشہور خطاط نورک نے سنہ ۹۷۱ھ میں لکھا ہے۔ (نمبر ۱۵۲)

(۷۴) دیوان حافظ: دیوان حافظ کا ایک اور نایاب نسخہ۔ یہ نسخہ مشہور خطاط محمد حسن نے سنہ ۱۰۲۳ھ میں گولکنڈے کے فرماں روا سلطان محمد قطب شاہ کے لیے لکھا۔ اس کے پہلے صفحہ پر سلطان محمد قطب شاہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی عبارت بھی موجود ہے۔ (نمبر ۱۵۳)

(۷۵) دیوان کمال خجندی: مشہور ایرانی شاعر کمال الدین خجندی (متوفی ۸۰۳ھ/ ۱۴۰۰ء) کا دیوان غزلیات۔ نہایت درجہ خوبصورت اور واضح نستعلیق خط میں شاعر کی وفات سے کوئی (۸۳) سال بعد سنہ ۸۸۶ھ میں لکھا گیا ہے۔ (نمبر ۱۶۳)

(۷۶) دیوان قاسم انوار: فارسی کے مشہور شاعر قاسم انوار (متوفی ۸۳۷ھ/ ۱۴۳۳ء) کا دیوان اشعار سنہ ۹۳۳ھ میں لکھا گیا ہے اور اسے خطاط عابدی نیشاپوری نے نہایت واضح نستعلیق خط میں لکھا ہے۔ (نمبر ۱۷۰)

(۷۷) حال نامہ: عارفی ہروی (متوفی ۸۵۳ھ/ ۱۴۴۹ء) صوفیانہ تمثیلی مثنوی کا ایک نہایت شاندار نسخہ اسے خطاطی کے نامور استاد میر علی الکاتب نے دبیز کاغذ پر کھلے اور واضح نستعلیق خط میں لکھا ہے۔ عنوان سفید اور سنہری گل بوٹوں کے اندر لکھے گئے ہیں۔ حاشیے مختلف رنگوں کے ہیں اور انھیں شروع سے آخر تک طرح طرح کے سنہری

گل بوٹوں سے سجایا گیا ہے (نمبر ۱۷۲)۔

(۷۸) دیوان امیر شاہی: امیر شاہی (متوفی ۸۵۷ھ/ ۱۴۵۴ء) کے دیوان کا ایک نفیس نسخہ۔ مکتوبہ سنہ ۹۱۵ ہجری۔ یہ نسخہ بھی مذکورہ بالا استاد میر علی الکاتب نے لکھا ہے۔ حاشیہ رنگ برنگی گل بوٹوں کا ہے اور اس کے اندر جنگل کے مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ (نمبر ۱۷۴)۔

(۷۹) دیوان امیر شاہی: امیر شاہی کے دیوان کا ایک اور نسخہ۔ اس نسخہ پر جہانگیر اور عالمگیر کے بعض امیروں کی مہریں ثبت ہیں۔ (نمبر ۱۷۵)

(۸۰) دیوان بنائی: بنائی (متوفی ۹۱۸ھ/ ۱۵۱۲ء) کے دیوان غزلیات کا ایک نادر نسخہ۔ (نمبر ۲۱۵)

(۸۱) دیوان امیر حاج انسی: امیر حاج النسی (متوفی ۹۲۳ھ/ ۱۵۱۷ء) کا حددرجہ نادر لیکن قدرے ناقص نسخہ۔

(۸۲) کلیات جامی: مولانا عبدالرحمٰن جامی (متوفی ۸۹۸ھ/ ۱۴۹۲ء) کے کلیات نظم ونثر کا ایک نہایت نفیس اور مصور نسخہ۔ یہ نسخہ سنہ ۱۰۷۰ھ کا مکتوبہ ہے اور اس پر سنہ ۱۱۵۱ھ میں امیر الامراء غازی الدین عماد الملک فیروز جنگ بہادر کی مہر ثبت ہے۔ (نمبر ۱۸۰)۔

(۸۳) کلیات جامی: کلیات جامی کا ایک اور نسخہ جو پہلے نسخہ کی طرح تصویروں سے مزین ہے۔ یہ نسخہ سنہ ۹۷۰ھ کا مکتوبہ ہے۔ (نمبر ۱۸۱)

(۸۴) ہفت اورنگ: مولانا عبدالرحمٰن جامی کی ہفت اورنگ کا ایک نفیس نسخہ۔ اسے مشہور خطاط شاہ محمد الکاتب نے سنہ ۹۰۸ھ میں مصنف کی وفات کے کوئی دس سال بعد لکھا ہے۔ (نمبر ۱۸۲)

(۸۵) ہفت اورنگ: ہفت اورنگ جامی کا ایک اور عمدہ نسخہ۔ مکتوبہ سنہ ۹۲۸ھ (نمبر ۱۸۳)۔

(۸۶) سلسلۃ الذہب: مولانا عبدالرحمٰن جامی کی تصنیف سلسلۃ الذہب کا ایک نہایت

نفیس نسخہ۔مکتوبہ سنہ ۹۹۵ھ(نمبر ۱۸۴)

(۸۷) سلسلۃ الذہب: خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ (پہلا دفتر) اور دیوان۔ (نمبر ۱۸۵)

(۸۸) سلسلۃ الذہب: مولانا جامی کی تصنیف سلسلۃ الذہب کا ایک نہایت نفیس نسخہ۔اس پر تاریخ کتابت درج نہیں۔(نمبر ۱۸۶)

(۸۹) تحفۃ الاحرار: مولانا عبدالرحمٰن جامی کی مثنوی تحفۃ الاحرار کا ایک نہایت قدیم نسخہ گو نسخہ پر تاریخ کتابت درج نہیں۔(نمبر ۱۸۸)

(۹۰) تحفۃ الاحرار: تحفۃ الاحرار کا ایک اور نفیس نسخہ(نمبر ۱۸۹)۔

(۹۱) سبحۃ الابرار: مولانا جامی کی تصنیف سبحۃ الابرار کا ایک بیش قیمت نسخہ۔اس کے اندر نہایت نازک تصویریں بھی شامل کی گئی ہیں۔یہ نسخہ مولانا جامی کے ہمعصر خطاط سلطان محمد نور نے سنہ ۹۱۹ھ میں لکھا ہے۔(نمبر ۱۹۱)

(۹۲) سبحۃ الابرار: سبحۃ الابرار کا ایک اور عمدہ لیکن قدرے ناقص نسخہ مکتوبہ سنہ ۹۲۷ھ (نمبر ۱۹۲)

(۹۳) سبحۃ الابرار: سبحۃ الابرار کا ایک اور عمدہ نسخہ۔مکتوبہ سنہ ۹۳۵ھ(نمبر ۱۹۳)۔

(۹۴) سبحۃ الابرار: سبحۃ الابرار کا ایک اور نسخہ مصنف کے ایک ہم وطن خطاط نے ۹۸۰ھ میں لکھا ہے۔(نمبر ۱۹۴)۔

(۹۵) مثنوی یوسف زلیخا: مولانا عبدالرحمٰن جامی کی مثنوی یوسف زلیخا کا حد درجہ بیش قیمت نسخہ۔اس نسخہ کی قیمت کسی وقت ایک ہزار مہر تھی۔یہ نسخہ عبدالرحیم خانخاناں نے جہانگیر کی خدمت میں بطور نذر پیش کیا تھا۔خطاطی کے نامور استاد میر علی الکاتب نے سنہ ۹۳۰ھ میں لکھا ہے۔(نمبر ۱۹۶)

(۹۶) مثنوی یوسف زلیخا: مثنوی یوسف زلیخا کا ایک اور نہایت نفیس نسخہ۔یہ نسخہ خطاطی کے ایک اور نامور استاد میر عماد نے سنہ ۱۰۱۸ھ میں لکھا ہے۔(نمبر ۱۹۷)

(۹۷) نفحات الانس: مولانا عبدالرحمٰن جامیؔ کی تصنیف نفحات الانس کا ایک نادر نسخہ، یہ نسخہ سمرقند کے فرماں رواسلطان دین محمد کے کتب خانے کے لیے سنہ ۱۰۰۳ھ میں لکھا گیا تھا۔ (نمبر ۲۰۴)

(۹۸) مثنوی شیریں خسرو: مولانا جامیؔ کے پوتے ہاتفی خرجردی (متوفی ۹۲۷ھ/ ۱۵۲۱ء) کی مثنوی شیریں خسرو کا ایک نفیس نسخہ۔ مکتوبہ سنہ ۹۷۶ھ۔ (نمبر ۲۲۳)۔

(۹۹) مثنوی شیریں خسرو: ہاتفی کی شیریں خسرو کا ایک اور نفیس نسخہ۔ مکتوبہ سنہ ۹۷۳ھ۔ (نمبر ۲۲۴)

(۱۰۰) تیمور نامہ: ہاتفی کی تصنیف تیمور نامہ کا ایک نہایت شاندار نسخہ۔

(۱۰۱) فتوح الحرمین: محی لاری (متوفی ۹۳۳ھ/ ۱۵۲۶ء) کی تصنیف یہ نسخہ مکہ معظمہ میں لکھا گیا ہے۔ اس کے اندر نہایت خوبصورت طلا کار نقشے اور تصویریں دی گئی ہیں۔ یہ نقشے اور تصویریں حرم، مساجد، کنوؤں، پہاڑیوں اور صحابہ اور اہل بیت کے مقبروں کی ہیں۔ مکتوبہ سنہ ۹۷۹ھ۔ (نمبر ۲۲۶)

(۱۰۲) دیوان لسانی: لسانی (متوفی ۹۴۱ھ/ ۱۵۳۴ء) کا نایاب دیوان مکتوبہ سنہ ۹۷۴ھ۔ یہ نسخہ شاعر کی وفات کے صرف اکتیس سال بعد واضح نستعلیق خط میں لکھا گیا ہے

(۱۰۳) دیوان شریف تبریزی: شریف تبریزی (متوفی ۹۵۶ھ/ ۱۵۴۹ء) کے دیوان غزلیات کا ایک نہایت نایاب و نادر نسخہ۔ مکتوبہ ۹۹۴ھ۔ (نمبر ۲۳۳)

(۱۰۴) دیوان حیدر قلوج: اَن پڑھ شاعر حیدر قلوج (متوفی ۹۵۹ھ/ ۱۵۵۱ء) کے دیوان کا نایاب اور عمدہ نسخہ۔ سنہ ۹۶۷ھ میں شاعر کی وفات کے صرف سات سال بعد لکھا گیا ہے۔ خط نہایت باریک اور خوبصورت نستعلیق ہے۔ عبدالرشید دیلمی، عنایت خاں اور شاہجہاں کے دربار کے امیروں کی مہریں اس کے صفحہ اول پر ثبت ہیں۔ (نمبر ۲۳۴)

(۱۰۵) دیوان کامران: شہنشاہ ہمایوں کے بھائی شہزادے کامران کا ایک حد درجہ بیش قیمت

اور منفرد نسخہ۔ اس پر شہنشاہ جہانگیر اور شہنشاہ شاہجہاں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی عبارتیں اور اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے دربار کے بہت سے ممتاز امیروں کے دستخط اور مہریں ثبت ہیں۔ یہ نسخہ خطاطی کے مسلم استاد میر علی کے شاگرد استاد محمود نے لکھا ہے۔ (نمبر ۲۳۷)

(۱۰۶) دیوان شرف جہاں: شرف جہاں قزوینی کے دیوان کا ایک نہایت شاندار نسخہ۔ یہ نسخہ استاد محمد رضا مشہدی نے لکھا ہے۔ (نمبر ۲۳۸)

(۱۰۷) دیوان شرف جہاں: دیوان شرف جہاں قزوینی کا ایک اور بیش قیمت نسخہ۔ یہ نسخہ خطاطی کے مشہور استاد عنایت اللہ شیرازی نے شاعر کی وفات کے بارہ سال کے بعد سنہ ۹۸۱ھ میں لکھا ہے۔ (نمبر ۲۳۹)

(۱۰۸) دیوان قاسم ارسلان: قاسم ارسلان (متوفی ۹۹۵ھ/ ۱۵۸۲ء) کے دیوان کا ایک نادر اور خوبصورت نسخہ۔ (نمبر ۲۴۹)

(۱۰۹) دیوان غزلیات فیضی: فیضی (متوفی ۱۰۰۴ھ/ ۱۵۹۵ء) کے دیوان غزلیات کا ایک شاندار نسخہ جو نواب شیر جنگ بہادر کی فرمائش پر لکھا گیا ہے۔ (نمبر ۲۶۱)

(۱۱۰) شہنشاہ نامہ: شہنشاہ نامہ کا واحد اور نہایت بیش قرار نسخہ۔ اس کتاب میں ترکی کے سلطان محمد ثالث کے کارنامے نظم کئے گئے ہیں اور اسی سلطان کے لیے یہ نسخہ لکھا گیا تھا۔ اس نسخہ میں ایرانی طرز کی بہت سی تصویریں بھی ہیں۔ اس پر دربار مغلیہ کے بہت سے امیروں کی مہریں ثبت ہیں اور ان میں سب سے زیادہ دلچسپ مہر شاہجہاں کی بیٹی شہزادی جہاں آراء بیگم کی مہر ہے۔ (نمبر ۲۶۵)

(۱۱۱) دیوان عجزی: عجزی (متوفی ۱۰۰۴ھ/ ۱۵۹۵ء) کے دیوان کا نہایت نایاب اور نادر نسخہ۔

(۱۱۲) رباعیات شہابی: شہابی (متوفی ۱۰۱۰ھ/ ۱۶۰۱ء) کی رباعیوں کا ایک نہایت شاندار نسخہ۔ مکتوبہ سنہ ۱۰۸۱ھ۔ (نمبر ۲۶۷)

(۱۱۳) رباعیات علی نقی کمروی: علی نقی کمروی (متوفی ۱۰۱۲ھ/ ۱۶۰۳ء) کے دیوان کا نہایت نادر نسخہ۔ (نمبر ۲۷۱)

(۱۱۴) رباعیات مومن حسن: مومن حسن (متوفی ۱۰۱۹ھ/ ۱۶۱۱ء) کی رباعیات کا ایک نہایت نادر نسخہ۔ (نمبر ۲۷۳)

(۱۱۵) خسرو شیریں: مرزا اصغر بیگ (متوفی ۱۰۲۱ھ/ ۱۶۱۲ء) کی لکھی ہوئی مثنوی خسرو شیریں کا ایک عمدہ نسخہ۔ یہ نسخہ مشہور خطاط ملا محمد حسین کشمیری نے لکھا ہے۔ (نمبر ۲۷۴)

(۱۱۶) حلیہ شاہجہاں: شہنشاہ شاہجہاں کا منظوم حلیہ۔ نادر اور نہایت شاندار نسخہ۔

(۱۱۷) بیاض: فارسی کے منتخب اشعار کی بیاض۔ نہایت درجہ مصور و مزین نسخہ۔ میر علی تبریزی نے نہایت خوبصورت خط میں لکھا ہے۔ اس پر شاہجہاں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی عبارت بھی ثبت ہے۔

(۱۱۸) بیاض: منتخب فارسی اشعار کا ایک اور بیش قرار اور خوبصورت نسخہ۔ اس پر شہزادۂ خرم (بعد میں شہنشاہ شاہجہاں) کے ہاتھ کی لکھی ہوئی عبارت ثبت ہے۔ یہ عبارت شہزادہ نے اس وقت لکھی ہے جب اس کی عمر چودہ سال کے لگ بھگ تھی۔

متفرقات

(۱۱۹) کیمیائے سعادت: دنیائے اسلام کے لیے بے نظیر عالم امام غزالی (متوفی سنہ ۵۰۵ھ) کی مشہور تصنیف جو تہذیب نفس اور تصوف پر لکھی گئی ہے۔ کیمیائے سعادت کا یہ نسخہ حد درجہ بیش قیمت ہے۔ کیونکہ اس کا بیشتر حصہ خود مصنف نے لکھا ہے۔ اس کتب خانے میں غالباً یہی سب سے قدیم فارسی مخطوطہ ہے۔

(۱۲۰) فصل الکتاب: خواجہ محمد بخاری (متوفی ۸۲۲ھ) کی صوفیانہ تصنیف۔ یہ ایک نہایت قیمتی نسخہ ہے کیونکہ بہت سے نامور عالموں کے قلم کے لکھے ہوئے حاشیے اس پر ثبت ہیں۔ مکتوبہ ۸۴۵ھ۔

(۱۲۱) روح الجنان: حسین محمد رازی کی تفسیر قرآن تین جلدوں میں (نامکمل) مکتوبہ سنہ ۷۳۴ھ۔

(۱۲۲) انیس الطالبین: ایک صوفیانہ تصنیف جو سنہ ۷۹۱ھ میں صالح بن مبارک نے تصنیف کی ہے۔ یہ نسخہ سنہ ۸۵۶ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اور اسے مشہور صوفی شاعر مولانا عبدالرحمن جامی نے اپنے قلم سے لکھا ہے۔

(۱۲۳) شرح سفر سعادت: تصوف کی مشہور کتاب سفر سعادت کی شرح۔ از مولانا عبدالحق محدث دہلوی۔ یہ نسخہ خود حضرت مصنف ممدوح کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ مکتوبہ سنہ ۱۰۳۳ھ۔

(۱۲۴) ترجمۂ اربعین: دینیات اور تصوف وغیرہ کے سات رسالوں کا ترجمہ۔ از مولانا عبدالحق محدث دہلوی۔ خود مصنف ممدوح نے اس نسخہ کی نظر ثانی کی تصحیح فرمائی ہے۔ اس کے ابتدائی ورق پر مصنف علیہ الرحمہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی عبارت بھی ثبت ہے۔

نادر عربی کتابیں (۲)

(۱)

قرأۃ و تجوید

(۱) التیسیر فی قرأۃ: تجوید و قرأۃ پر ابو عمر بن سعید الدانی (متوفی ۴۴۴ھ/۱۰۵۳ء) کی تصنیف۔ یہ نسخہ ۸۴۵ھ کا مکتوبہ ہے۔ اس کے عنوان اور وقف کی علامتیں مطلا ہیں۔ کاغذ ہلکے زرد رنگ کا ہے۔ پہلا صفحہ طلا کار ہے اور اس میں یہ عبارت درج ہے کہ اس نسخہ کو مصر کے مدرسۂ منصوریہ کے امام احمد بن حسین بن علی نے مملوک خاندان کے ایک فرماں روا سلطان الظاہر جقمق (۸۴۲ھ/۱۴۳۸ء تا ۸۵۷ھ/۱۴۵۳ء) کے شاہی کتب خانے کے لیے لکھا ہے۔

(۲) التھذیب فی القرأۃ: تجوید وقرأۃ پر مذکورہ بالا مصنف ابوعمر بن سعید الدانی (متوفی ۴۴۴ھ/ ۱۰۵۳ء) کی ایک اور تصنیف۔ یہ کتاب بہت نایاب ہے۔ اس کا ایک اور نسخہ کتب خانہ ایا صوفیہ استنبول کے سوا اور کہیں دریافت نہیں ہوا ہے۔ بہترین خط نسخ میں اس کی کتابت کی گئی ہے اور سنہ ۲۶ ۷ھ کا مکتوبہ ہے۔ ظاہری حیثیت سے یہ چھوٹی سی کتاب آنکھوں میں سماتی بھی نہیں ہے۔ معمولی سے زرد رنگ کے کاغذ پر لکھی گئی ہے اور تزئین وآرائش سے بالکل عاری ہے۔ کافی استعمال ہوئی ہے اور اس کے حاشیے پر بہت سی عبارتیں بھی درج ہیں۔

(۳) الکحل الناصح: قرأۃ پر مشہور عالم اور مصنف ابراہیم الجبیری (متوفی ۷۳۳ھ ۱۳۳۲ء) کی تصنیف ہے۔ اس نسخہ پر مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اور ان کے دستخط سے مزین سند بھی ثبت ہے۔ یہ سند سنہ ۷۲۶ھ کی لکھی ہوئی ہے۔ اور مصنف نے اپنے شاگرد شہاب الدین البابی (متوفی ۷۴۶ھ/ ۱۳۴۵ء) کو عطا کی ہے۔ یہ نسخہ خود شہاب الدین کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ ایک نہایت ہی چھوٹی جیبی قلمی کتاب ہے اور اس کی ساری قدر و قیمت مصنف کے دستخطی عبارت کی وجہ سے ہے۔

تفسیر

(۱) المجاز القرآن: قرآن مجید کی تفسیر۔ ازعزالدین عبدالسلام (متوفی ۶۶۰ھ ۱۲۶۲ء) یہ نسخہ سنہ ۶۸۷ھ کا لکھا ہوا ہے اور کاتب نے خود مفسر کے لکھے ہوئے نسخہ سے اس کا مقابلہ کیا ہے۔ یہ کتاب نایاب ہے اور اس کا صرف ایک ہی نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں پایا گیا ہے۔

(۲) شرح التاویلات: ماتریدی (متوفی ۳۳۳ھ/ ۹۴۴ء) نے قرآن مجید کی فقہی نقطۂ نظر سے ایک تفسیر تاویلات کے نام سے لکھی ہے۔ یہ تفسیر ایک ہی تفسیر ہے جو حنفی فقہ کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔ موجودہ کتاب اسی تاویلات کی شرح ہے۔ یہ شرح ابوبکر محمد بن

احمد السمر قندی نے لکھی ہے جو چھٹی صدی ہجری کے ایک عالم ہوئے ہیں۔ اس کتاب کے دوسرے نسخہ کا ابھی تک کسی اور کتب خانے میں پتہ نہیں چلا۔ شرح کے اس نسخے پر تاریخ کتابت درج نہیں۔ لیکن سرورق پر سنہ ۶۳۱ھ کی لکھی ہوئی ایک عبارت ثبت ہے۔ اسی عبارت کی وجہ سے خیال ہوتا ہے کہ یہ نسخہ سنہ ۶۳۱ھ سے پہلے کا لکھا ہوا ہے۔

(۳) الاتقان: تفسیر قرآن۔ از مولانا جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ/ ۱۵۰۵ء) یہ کتاب کئی بار چھپ چکی ہے۔ لیکن یہ نسخہ جو سنہ ۹۱۵ھ کا مکتوبہ ہے خاص اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اسے مصنف کے ایک شاگرد محمد بن علی الداؤدی (متوفی ۹۴۵ھ/ ۱۵۳۸ء) نے اپنے قلم سے لکھا ہے۔

حدیث

(۱) الملخص: امام مالک (متوفی ۱۷۹ھ/ ۷۹۵ء) کے مجموعہ احادیث مسند موطا کی تلخیص۔ از ابوالحسن علی بن محمد بن خلف (متوفی ۴۰۳ھ/ ۱۰۱۲ء) ملخص کے مصنف نابینا تھے۔ اور ان کے شاگردوں اور دوستوں نے اس کتاب کی تیاری میں انھیں مدد دی ہے۔ یہ کتاب بہت نایاب ہے اور مشہور کتب خانوں کی کسی ایک فہرست میں بھی اس کا ذکر نہیں ملتا۔ موجودہ نسخہ سنہ ۶۲۸ھ کا مکتوبہ ہے اور کسی زمانے میں مصر کے مدرسۂ سلطانیہ کمالیہ کی ملک رہ چکا ہے۔ نہایت خوبصورت خط نسخ میں لکھا گیا ہے۔

(۲) النکات و الظرائف: حدیث پر شہاب الدین حجر عسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ/ ۱۴۴۹ء) کی تصنیف کا دنیا میں واحد نسخہ۔ موجودہ نسخہ زرد رنگ کا ہے اور کرم خوردہ ہے۔ سنہ ۸۵۷ھ کا مکتوبہ ہے اور اس کا کچھ حصہ مصنف کے ایک شاگرد فضل المکی (متوفی ۸۵۸ھ/ ۱۴۸۰ء) نے لکھا ہے۔

(۳) شرح المقدمہ: ابن صلاح (متوفی ۶۴۳ھ/ ۱۲۴۵ء) کی تصنیف مقدمہ کی شرح۔ مقدمہ فن حدیث کی مشہور کتاب ہے اور اس کی یہ شرح مشہور عالم عبدالرحیم العراقی

(متوفی ۸۰۶ھ/ ۱۴۰۴ء) نے لکھی ہے موجودہ نسخہ کی تصحیح مصنف کے صاحبزادے احمد بن عبدالرحیم نے کی ہے۔

حکمت وفلسفہ

(۱) الاشارات: دنیائے اسلام کے زبردست فلسفی ابوعبداللہ ابن سینا (متوفی ۴۲۸ھ ۱۰۳۶ء) کی تصنیف۔ یہ کتاب اور نصیر الدین طوسی (متوفی ۶۷۲ھ/ ۱۲۷۳ء) نے اس کی جوشرح لکھی ہے کئی بار چھپ چکی ہے۔لیکن موجودہ نسخہ صرف الاشارات کے متن پر مشتمل ہے۔ یہ نسخہ سنہ ۶۵۳ھ کا مکتوبہ ہے اور اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ طوسی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے شرح کے نسخہ سے اس کا چار بار مقابلہ کیا گیا ہے۔

(۲) حکمۃ العین: طبعیات اور مابعد الطبعیات پر علی ابن محمد القزوینی (متوفی ۶۷۲ھ/ ۱۲۷۳ء) کی تصنیف۔ اس کی شرح کے لیے ملاحظہ ہو ریو کی مرتب کی ہوئی کتب خانہ برٹش میوزیم کے عربی مخطوطات کی فہرست (صفحہ ۲۷۶) موجودہ نسخہ سنہ ۷۲۳ھ کا مکتوبہ ہے اور دمشق کے ایک امیر عمادالدین (متوفی ۷۵۷ھ/ ۱۳۵۵ء) کتب خانہ کے لیے لکھا گیا ہے۔

ہیئت

(۱) نہایۃ الادراک: ہیئت پر مشہور ایرانی عالم نصیر الدین طوسی (متوفی ۶۷۲ھ/ ۱۲۷۳ء) کی تصنیف۔ سنہ ۶۹۰ھ میں اس نسخہ کی مقابلہ نصیر الدین طوسی کے ایک شاگرد اور مشہور مصنف محمد بن مسعود الشیرازی (متوفی ۷۱۰ھ/ ۱۳۱۲ء) کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخہ سے کیا گیا تھا۔

منطق

(۱) التجرید فی المنطق: نصیر الدین طوسی (متوفی ۶۷۲ھ/ ۱۲۷۳ء) کی تصنیف اور اس کی

شرح ازحلّی (متوفی ۷۲۶ھ/ ۱۳۲۵ء) منطق پر ایک نایاب کتاب۔ اس کا صرف ایک اور نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں موجود ہے۔ موجودہ نسخہ اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ کی ملک رہ چکا ہے۔

(۲) قسطاس فی المنطق: ساتویں صدی ہجری کے ایک عالم شمس الدین محمد بن اشرف کی تصنیف۔ منطق پر ایک نادر کتاب۔ اس کا صرف ایک اور نسخہ برلن کے کتب خانہ میں پایا گیا ہے۔ اس نسخہ پر سنہ ۷۱۶ھ کی لکھی ہوئی ایک سند بھی درج ہے۔ یہ سند محمد بن محمد بن یوسف الزنگی نے اپنے شاگرد یحییٰ بن علی کو عطا کی ہے۔ اور یہ دونوں آٹھویں صدی ہجری کے علم ہوئے ہیں۔

نجوم

نجم العلوم: علم نجوم پر بیجاپور کے فرماں روا سلطان علی عادل شاہ (متوفی ۹۸۷ھ/ ۱۵۸۹ء) کے عہد کے ایک عالم ابوسید شریف کی تصنیف۔ مقدمہ میں مصنف نے بیان کیا ہے کہ اس نے یہ کتاب علی عادل شاہ کے لیے لکھی ہے۔ اس تصنیف کا یہ واحد معلومہ نسخہ ہے اور کہیں اور دریافت نہیں ہوا۔ سلطان کا نام مطلا حروف میں لکھا گیا ہے۔

علم الحساب

(۱) غنیۃ الحساب: علم الحساب پر چھٹی صدی ہجری کے ایک ریاضی داں علی بن ثابت کی تصنیف کا دنیا میں واحد نسخہ۔ موجودہ نسخہ سنہ ۷۸۶ھ کا مکتوبہ ہے اور اس پر گولکنڈے کے فرماں روا سلطان محمد قطب شاہ کی مہر ثبت ہے۔

تصوف

(۱) کتاب فی التصوف: مشہور صوفی بزرگ بشر حافی (۳) کی تصنیف۔ بشر حافی نے ۲۲۷ھ/ ۸۴۱ء میں بمقام بغداد وفات پائی۔ یہ نسخہ سنہ ۴۸۳ھ کا مکتوبہ ہے اور

خیال ہے کہ دنیا میں اس کتاب کا یہ ایک ہی نسخہ ہے۔

(۲) الرسالات القیشیر یہ: تصوف پر عبدالکریم القشیری (متوفی ۴۶۵ھ/ ۱۰۷۴ء) کی تصنیف۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے۔ لیکن موجودہ نسخہ سنہ ۴۳۸ھ کا مکتوبہ ہے اور خود مصنف کی زندگی میں لکھا گیا ہے۔ یہ نسخہ اس کتب خانہ کا سب سے قدیم نسخہ ہے۔ یہ ایک بڑی تختی کی کتاب ہے اور بادامی رنگ کے کاغذ پر نہایت خوبصورت قلم سے لکھی گئی ہے۔ ہر باب کا عنوان جلی قلم سیاہی سے اور قرآن مجید کی آیتیں سرخی سے لکھی گئی ہیں۔

اخلاق

(۱) معاردالکلم: اخلاق پر شہنشاہ اکبر کے درباری فیضی کی تصنیف۔ یہ کتاب بے نقط صنعت میں لکھی گئی ہے اور ایک بھی لفظ ایسا استعمال نہیں کیا گیا ہے جس کے نقطے لگائے جاتے ہیں۔ سرورق پر خود مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی عبارت ثبت ہے۔ اس میں فیضی نے بتایا ہے کہ اس نے یہ کتاب احمد بن محمد یمنی کی خدمت میں تحفۃً پیش کی ہے۔

(۲) جوامع الکلم: اخلاق پر ہندوستان کے مشہور صوفی اور محدث بزرگ مولانا علی بن حسام الدین کی تصنیف۔ مولانا علی بن حسام الدین سنہ ۹۵۳ھ میں ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے جنھوں نے وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور ۹۷۵ھ/۱۵۶۷ء) میں وہیں وفات پائی۔ جوامع الکلم کا یہ نسخہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

عام تاریخیں

(۱) مرآۃ الزمان: یوسف بن قزوغلی (متوفی ۶۵۴ھ/ ۱۲۵۵ء) کی تصنیف جو آدم سے لے کر مصنف کے عہد تک کی تاریخ پر چالیس جلدوں میں لکھی گئی تھی۔ موجودہ نسخہ اسی تصنیف کی ایک نامکمل جلد ہے۔ موجودہ جلد سیرت النبیؐ سے متعلق ہے۔ اس پر تاریخ کتابت درج نہیں۔ لیکن بظاہر آٹھویں صدی ہجری کی لکھی ہوئی ہے۔ اس تصنیف کا

مکمل نسخہ اب تک کہیں دریافت نہیں ہوا۔ تاریخ بیان کرنے سے پہلے مصنف نے تخلیق کائنات آسمانوں، برجوں اور ستاروں جیسے موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے۔

سیرت النبی

(۱) راس المال الندیم: سیرت النبی صلعم اور سیرت صحابہ پر ابوالعباس احمد بن علی بن بنا کی نایاب تصنیف۔ خیال ہے کہ اس تصنیف کا دنیا میں یہ ایک ہی نسخہ ہے۔

(۲) المواہب اللدنیہ: سیرت النبی صلعم پر احمد بن محمد بن کاتب القطلانی (متوفی ۹۲۳ھ/ ۱۵۱۷ء) کی تصنیف۔ یہ کتاب کئی بار چھپ چکی ہے۔ لیکن خیال ہے کتاب کا یہ نسخہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

تاریخ اسکندریہ

(۱) کتاب الامم: اسکندریہ کی تاریخ پر محمد بن قاسم المالکی الاسکندرانی کی تصنیف (متوفی بعد ۷۰۰ھ)۔ مصنف نے اسکندریہ کی یہ تاریخ اسلامی فتح سے شروع کی ہے اور سنہ ۶۰ھ سے لے کر سنہ ۷۷۰ھ تک کے واقعات بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب بہت نایاب ہے اور اس کا بس ایک نسخہ برلن کے کتب خانہ میں پایا گیا ہے۔

مقامی سیرتیں

(۱) تاریخ ابن عساکر: دمشق کے مشاہیر کے سوانح حیات پر میر ابوالقاسم بن عساکر (متوفی ۵۷۱ھ/ ۱۱۷۶ء) کی تصنیف۔ پوری تصنیف اسی جلدوں میں لکھی گئی تھی۔ ان میں سے صرف حسب ذیل دو ہی جلدیں اس کتب خانہ میں موجود ہیں۔

جلد اول:- اس کے اندر حرف عین سے شروع ہونے والے نام ہیں۔

جلد دوم:- اس کے اندر حرف میم سے شروع ہونے والے نام ہیں۔ دنیا کے کسی بھی کتب خانہ میں اس کا مکمل نسخہ دریافت نہیں ہوا۔ اس کتاب پر ایسے عالموں کے حاشیے درج ہیں

جنھوں نے خود مصنف سے سنہ ۵٦۳ھ میں اس کتاب کا درس لیا تھا۔

اسماء الرجال

(۱) تہذیب الکمال: محدثوں کے سوانح حیات پر جمال الدین ابو الحجاج بن عبدالرحمن (متوفی ۷۴۲ھ/ ۱۳۱۴ء) کی تصنیف۔ پوری کتاب تیرہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ موجودہ نسخہ سے استفادہ مصنف کی موجودگی میں ذہبی کے اساتذہ میں سے ایک استاد محمد بن ابراہیم المحدث (متوفی ۷۴۰ھ/ ۱۳۴۸ء) نے کیا تھا۔

تذکرۂ صوفیاء

(۱) اختیار الرفیق: مشاہیر صوفیا کے تذکرہ پر احمد بن سلامہ المقدسی (متوفی ٦۹۷ھ/ ۱۳۷۷ء) کی تصنیف۔ اس تصنیف کا یہ نسخہ دنیا میں واحد نسخہ ہے اور کسی اور کتب خانہ میں پایا نہیں گیا ہے۔

اس کتب خانہ میں امام احمد بن حنبل (متوفی ۲۴۱ھ/ ۸۴۷ء) کے قائم کیے ہوئے مکتب عقائد کے مشہور پیروؤں کے تذکروں کے مکمل نسخے موجود ہیں صرف اسی کتب خانہ میں ان تذکروں کی مکمل جلدیں پائی جاتی ہیں۔

(۲) طبقات الحنابلہ: از ابویعلی محمد بن محمد بن حسن (متوفی ۵۲٦ھ/ ۱۱۳۱ء) موجودہ نسخہ جو نہایت درجہ صحیح ہے۔ سنہ ٦۳٦ھ کا مکتوبہ ہے۔ یہ کتاب بہت نادر ہے اور اس کا صرف ایک اور نسخہ امپیریل لائبریری کلکتہ سے ملحق بوہار لائبریری میں پایا گیا ہے بوہار لائبریری کا بظاہر تیرہویں صدی ہجری کا مکتوبہ ہے۔

(۳) طبقات الحنابلہ: مذکورۂ بالا کتاب کا ذیل از عبدالرحمن بن رجب (متوفی ۷۹۵ھ/ ۱۳۹۳ء) براکلمان نے اس کتاب کے اور دو نسخوں کا ذکر کیا ہے۔

(۴) ذیل طبقات الحنابلہ: مذکورۂ بالا کتاب کا ایک اور ذیل جو تیرہویں صدی ہجری کے ایک عالم محمد بن علی النجدی نے لکھا ہے اور اس میں نسخہ ۷۵۸ھ سے لے کر سنہ ۱۲۹۵ھ تک

کے مشاہیر کا ذکر ہے۔ اس کتاب کا کوئی اور نسخہ کہیں بھی دریافت نہیں ہوا۔

(ب)

(۱) الجہ: از عبدالعلی القارسی (متوفی ۳۷۷/ ۹۷۹ء) دو جلدوں میں بظاہر پانچویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔ نادر۔

(۲) العیون: از ابو طاہر اسماعیل المقری (متوفی ۴۵۵ھ/ ۱۰۶۳ء) مکتوبہ سنہ ۶۵۲ھ۔ نادر۔

(۳) شرح الشاطبیہ: از عبداللہ محمد بن حسن الفاسی (متوفی ۶۵۶ھ/ ۱۲۵۸ء) مکتوبہ سنہ ۶۶۹ھ۔ نادر

(۴) المستنیر: از ابو طاہر محمد بن علی البغدادی (متوفی ۴۹۶ھ/ ۱۱۰۴ء) ساتویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۵) العقد اللیالی: از ابو حیان محمد بن یوسف الاندلسی (متوفی ۷۴۵ھ/ ۱۳۴۵ء) مکتوبہ سنہ ۷۱۶ھ۔ نادر

(۶) النقط الامالی: از ابو حیان محمد بن یوسف الاندلسی (متوفی ۷۴۵ھ/ ۱۳۴۵ء) مکتوبہ سنہ ۷۱۶ھ۔

(۷) النزہۃ: از ابراہیم بن عمر الجباری (متوفی ۷۳۲ھ/ ۱۳۳۲ء) مکتوبہ سنہ ۷۱۶ھ۔

(۸) التہذیب: از ابو عمر بن سعید الدانی (متوفی ۴۴۴ھ/ ۱۰۵۳ء) مکتوبہ سنہ ۷۲۶ھ۔ نادر (نمبر ۱۶۳)

(۹) ابراز المعانی: از ابو احمد عبدالرحمٰن بن اسماعیل (متوفی ۶۶۵ھ/ ۱۲۶۷ء) مکتوبہ سنہ ۷۷۸ھ۔

(۱۰) مصطلحات الاشارات: ابو البقا علی بن عثمان (متوفی ۸۰۱ھ/ ۱۳۹۸ء) مکتوبہ سنہ ۸۷۷ھ۔ نادر

(۱۱) الواصلہ: از علم الدین علی بن محمد السقاوی (متوفی ۶۴۳ھ/ ۱۲۴۵ء) مکتوبہ سنہ ۸۰۷ھ۔

(۱۲) التیسیر: از ابوعمر بن سعید الدانی (متوفی ۴۴۴ھ/ ۱۰۵۳ء) نہایت صاف ستھرا اور خوبصورت نسخہ۔ مکتوبہ سنہ ۸۴۸ھ۔

(۱۳) الہدایہ الی تحقیق الروایہ: گیارہویں صدی ہجری کے ایک عالم عفیف الدین العدنانی کی تصنیف۔ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ۔ مکتوبہ سنہ ۱۰۵۲ھ۔

تفسیر

(۱۴) نزہۃ القلوب: از محمد بن عمر الجستانی (متوفی ۳۳۰ھ/ ۹۴۲ء)۔

(۱۵) المجاز: عز الدین بن عبد السلام (متوفی ۶۶۰ھ/ ۱۲۶۲ء) دو جلدوں میں۔ مکتوبہ سنہ ۶۸۷ھ۔

(۱۶) التبیان فی اعراب القرآن: از عبداللہ العکبر ی (متوفی ۶۱۴ھ/ ۱۲۱۷ء) بظاہر ساتویں صدی ہجری کا مکتوبہ۔ نادر

(۱۷) شرح التاویلات: ابومحمد بن احمد السمر قندی (متوفی ۵۴۰ھ/ ۱۱۶۴ء) بظاہر ساتویں صدی ہجری کا مکتوبہ۔ نادر

(۱۸) البرہان فی التوجیہ تشابہ القرآن: از محمد بن حمزہ (متوفی بعد ۵۰۰ھ/ ۱۱۰۶ء) مکتوبہ سنہ ۷۴۷ھ۔

(۱۹) الحاشیہ علی الکشاف: از طیبی (متوفی ۷۴۳ھ/ ۱۳۴۲ء) مکتوبہ سنہ ۷۶۷ھ۔

(۲۰) الکشاف: از محمود بن عمر الزمخشری (متوفی ۵۳۸ھ/ ۱۱۴۴ء) صاف ستھرا خوبصورت نسخہ۔ مکتوبہ سنہ ۸۳۴ھ۔

(۲۱) التذکار: از محمد بن احمد القرطبی (متوفی ۶۶۸ھ/ ۱۲۶۹ء) مکتوبہ سنہ ۸۴۰ھ۔

(۲۲) التبیان فی آداب حملۃ القرآن: از محی الدین النووی (متوفی ۶۷۶ھ/ ۱۲۷۸ء) مکتوبہ

سنہ ۸۴۷ھ۔

(۲۳) کشاف اسرار البیان: نویں صدی ہجری کے ایک عالم محمد بن حسن البقائی کی تصنیف۔خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ۔

(۲۴) حقائق السلامہ: از ابو عبدالرحمٰن بن محمد (متوفی ۴۱۲ھ/۱۰۲۱ء) نویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۲۵) الاتقان: از جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابوبکر السیوطی (متوفی ۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء) مکتوبہ سنہ ۹۱۵ھ۔

(۲۶) الدرر الناظم: از ابن حطاب (متوفی بعد ۶۵۰ھ/۱۲۵۲ء) مکتوبہ سنہ ۹۹۱ھ۔صاف ستھرا اور خوبصورت نسخہ۔

(۲۷) الجامع الاحکام القرآن: از محمد بن احمد القرطبی (متوفی ۶۶۸ھ/۱۲۶۹ء) بظاہر دسویں صدی ہجری کا لکھا ہوا نسخہ۔

(۲۸) احکام القرآن: از ابو بکر احمد الجساس (متوفی ۳۷۰ھ/ ۸۸۰ء) مکتوبہ سنہ ۱۱۳۶ھ۔نادر

(۲۹) بیان البرہان: از عبدالعظیم بن احمد (متوفی ۶۵۴ھ/ ۱۲۵۶ء) گیارہویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۳۰) جواہر البحار: بارہویں صدی ہجری کے ایک عالم احمد بن محمد کی تصنیف۔خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ۔

حدیث

(۳۱) السنۃ: از نسائی (متوفی ۳۰۳ھ/۹۱۵ء) مکتوبہ قبل سنہ ۵۴۱ھ۔

(۳۲) الجامع: از ترمذی (متوفی ۲۷۹ھ/۸۹۲ء) مکتوبہ سنہ ۵۷۲ھ۔

(۳۳) السنۃ: از ابوداؤد (متوفی ۲۷۵ھ/۸۸۸ء)۔مکتوبہ قبل سنہ ۵۸۴ھ۔

(۳۴) الجامع الصحیح: از مسلم (متوفی ۲۶۱ھ/ ۸۷۵ء) مکتوبہ قبل سنہ ۵۸۶ھ۔

(۳۵) الاشقیاء: از دارقطنی (متوفی ۳۸۵ھ/ ۹۹۴ء) بظاہر چھٹی صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔ نادر

(۳۶) الکفایہ: از کاتب البغدادی: (متوفی ۴۶۳ھ/ ۱۰۷۲ء) بظاہر چھٹی صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔ نادر

(۳۷) شرح معانی الاسرار: از ابوجعفر الطحاوی (متوفی ۳۳۱ھ/ ۹۴۳ء)۔ بظاہر چھٹی صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔ نادر

(۳۸) مشکل الحدیث: از ابوبکر محمد بن حسن (متوفی ۴۰۶ھ/ ۱۰۱۵ء) مکتوبہ سنہ ۶۰۷ھ۔ نادر

(۳۹) الملخص: از ابوالحسن علی بن محمد بن خلف (متوفی ۴۰۳ھ/ ۱۰۱۲ء) خوبصورت نسخہ۔ مکتوبہ سنہ ۶۲۸ھ۔

(۴۰) المسند: از امام احمد بن حنبل (متوفی ۲۴۱ھ/ ۸۴۷ء) مکتوبہ قبل سنہ ۶۳۳ھ۔

(۴۱) المقدمہ: از ابن صالح (متوفی ۶۴۳ھ/ ۱۲۴۶ء) مکتوبہ سنہ ۶۳۸ھ۔

(۴۲) شرح المسلم: از محی الدین النووی (متوفی ۶۷۶ھ/ ۱۲۷۸ء) مکتوبہ سنہ ۶۸۳ھ۔

(۴۳) شواہد التوحید: از جیانی (متوفی ۶۷۲ھ/ ۱۲۷۳ء) مکتوبہ سنہ ۶۹۱ھ۔

(۴۴) المسند: از ابو داؤد طیالسی (متوفی ۲۰۴ھ/ ۸۲۰ء) ساتویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۴۵) المضحکات: از ابوالحسن بن احمد المقدسی (متوفی ۶۹۰ھ/ ۱۲۹۱ء) ساتویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔ نادر

(۴۶) کتاب الفردوس از ابو شجاع (متوفی (۵۰۹ھ/ ۱۱۱۵ء) ساتویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۴۷) شرح السنۃ: از بغوی (متوفی (۵۱۶ھ/ ۱۱۲۲ء) ساتویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۴۸) الامام: از ابن دقیق (متوفی ۷۰۲ھ/ ۱۳۰۱ء) مکتوبہ ۷۱۵ھ۔

(۴۹) شرح الابن الماجہ: از مغلطی (متوفی ۷۶۲ھ/ ۱۳۶۱ء) خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا

ہوا نسخہ۔ مکتوبہ سنہ ۷۳۲ھ۔ نادر

(۵۰) الاعتبار: از حزمی (متوفی ۵۸۴ھ/۱۲۰۰ء) مکتوبہ سنہ ۷۳۲ھ۔ نادر

(۵۱) مصابیح السنۃ: از بغوی (متوفی ۵۱۶ھ/۱۱۲۲ء) مکتوبہ سنہ ۷۸۶ھ۔

(۵۲) جامع العلوم: از ابن رجب (متوفی ۷۹۵ھ/۱۳۹۳ء) مکتوبہ سنہ ۷۹۰ھ۔

(۵۳) ریاض الافہام: از فاکہانی (متوفی ۷۰۱ھ/۱۳۰۸ء) مکتوبہ سنہ ۷۹۲ھ۔ نادر

(۵۴) شرح الالفیہ: از عبدالرحمن بن حسین عراقی (متوفی ۸۰۶ھ/۱۴۰۴ء) مکتوبہ سنہ ۸۰۱ھ۔

(۵۵) الاربعین: از شہاب الدین ابن حجر (متوفی ۸۵۲ھ/۱۴۴۹ء) مکتوبہ سنہ ۸۳۶ھ۔

(۵۶) الاربعین: از احمد بن علی بن بکر الحنبلی (متوفی ۸۴۰ھ/۱۴۳۷ء) خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ۔

(۵۷) جامع الاصول: از ابن اثیر (متوفی ۶۰۶ھ/۱۲۰۹ء) دو جلدوں میں۔ صاف ستھرا اور خوبصورت نسخہ۔ مکتوبہ سنہ ۴۳-۸۴۲ھ۔ ایک نہایت مفید تصنیف جواب تک چھپی نہیں ہے۔

(۵۸) العقول المسدد: از ابن حجر (متوفی ۸۵۲ھ/۱۴۴۹ء) مکتوبہ سنہ ۸۴۸ھ۔

(۵۹) النکات الظریف: از ابن حجر (متوفی ۸۵۲ھ/۱۴۴۹ء) مکتوبہ سنہ ۸۵۰ھ۔ نادر

(۶۰) المقاصد الحسنہ: از شمس الدین السقاوی (متوفی ۹۰۲ھ/۱۴۹۶ء) مکتوبہ سنہ ۹۷۲ھ۔

(۶۱) الجامع الصحیح: از محمد بن اسماعیل البخاری (متوفی ۲۵۶ھ/۸۷۰ء) تین جلدوں میں۔ نہایت صاف ستھرا اور خوبصورت نسخہ مکتوبہ سنہ ۹۱۱ھ۔

فقہ

(۶۲) مختصر النہایہ: از عبداللہ بن محمد ہبۃ اللہ (متوفی ۵۸۵ھ/۱۱۵۹ء) خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ۔ مکتوبہ ۵۶۵ھ۔ نادر

(۶۳) شرح الزیادہ: از فخر الدین حسین بن منصور بن محمد قاضی خاں (متوفی ۵۹۲ھ/ ۱۱۹۵ء) مکتوبہ سنہ ۶۰۴ھ۔

(۶۴) استقصاء المحدب: از ضیاء الدین ابو عمر عثمان المرانی (متوفی ۶۰۲ھ/ ۱۲۰۵ء) مکتوبہ سنہ ۶۵۴ھ۔ نادر

(۶۵) الروضہ: از محی الدین النووی (متوفی ۶۷۶ھ/ ۱۲۷۸ء) مکتوبہ سنہ ۶۶۹ھ

(۶۶) مختصر الاصول: از جلال الدین ابو عمر عثمان بن حاجب (متوفی ۶۴۲ھ/ ۱۲۴۴ء) بظاہر ساتویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۶۷) الحاوی الکبیر: از ابو الحسن علی بن محمد الماوردی (متوفی ۴۵۰ھ/ ۱۰۵۸ء) بظاہر ساتویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۶۸) کفایت التنبیہ: از احمد ابو الرافع (متوفی ۷۱۰ھ/ ۱۳۱۰ء) مکتوبہ سنہ ۷۰۸ھ

(۶۹) الخزانۃ الاکمل: چھٹی صدی ہجری کے ایک فقیہ یوسف بن علی بن محمد الجور جانی کی تصنیف۔ مکتوبہ سنہ ۷۱۲ھ۔

(۷۰) شرح الحاوی: از علاء الدین علی بن اسمٰعیل القونوی (متوفی ۷۲۷ھ/ ۱۳۲۶ء) مکتوبہ سنہ ۷۳۸ھ۔

(۷۱) الاقلید: از تاج الدین عبد الرحمٰن بن ابراہیم (متوفی ۶۹۰ھ/ ۱۲۹۱ء) بظاہر سنہ ۷۴۲ھ سے پہلے کا لکھا ہوا نسخہ۔

(۷۲) تحفۃ المحتاج: از عمر بن علی بن احمد بن محمد الانصاری ملقب بہ ابو المعلقین (متوفی ۸۰۴ھ/ ۱۴۰۱ء)۔ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ۔ مکتوبہ سنہ ۷۵۳ھ۔ نادر

(۷۳) الحاوی المنظومہ: از محمد بن محمد اللولوئی (متوفی ۷۲۶ھ/ ۱۳۲۹ء) مکتوبہ سنہ ۷۷۰ھ۔

(۷۴) التکمیل: ساتویں صدی ہجری کے ایک عالم فضل اللہ بن مسعود کی تصنیف۔ مکتوبہ سنہ ۷۷۲ھ نادر

(۷۵) مجمع البحرین: از ابن ساعتی (متوفی ۶۹۴ھ/ ۱۲۹۴ء) مکتوبہ سنہ ۷۷۲ھ۔

(۷۶) شرائع الاسلام: از حلی (متوفی ۶۷۶ھ/ ۱۲۷۷ء) دو جلدوں میں۔ مکتوبہ سنہ ۷۷۲ھ۔

(۷۷) شرح التنبیہ: از محمد بن بہادر بن عبداللہ الزرکشی (متوفی ۷۹۴ھ/ ۱۳۹۸ء) مکتوبہ سنہ ۷۷۶ھ۔

(۷۸) الانوار الاعمال الابرار: از جمال الدین یوسف بن ابراہیم الشافعی (متوفی ۷۹۹ھ/ ۱۳۹۵ء) مکتوبہ سنہ ۷۷۶ھ۔

(۷۹) الجامع الصغیر: از امام محمد (متوفی ۱۸۱ھ/ ۸۰۴ء) سنہ ۷۸۳ھ کا مکتوبہ۔ صاف ستھرا خوبصورت نسخہ۔

(۸۰) المنتخب: از حسام الدین محمود بن محمد (متوفی ۶۴۴ھ/ ۱۲۴۶ء) مکتوبہ سنہ ۷۸۹ھ۔

(۸۱) المحصل فی الاصول الفقہ: از فخر الدین رازی (متوفی ۶۰۶ھ/ ۱۲۰۹ء) بظاہر آٹھویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۸۲) کنز الدقائق: از نسفی (متوفی ۷۱۰ھ/ ۱۳۱۰ء) بظاہر آٹھویں صدی ہجری کا مکتوبہ صاف ستھرا خوبصورت نسخہ۔

(۸۳) التحقیق: از عبدالعزیز (متوفی ۷۳۰ھ/ ۱۳۳۰ء) مکتوبہ سنہ ۸۰۱ھ۔

(۸۴) تقریر الفوائد: از ابن رجب (متوفی ۷۹۵ھ/ ۱۳۹۳ء) مکتوبہ سنہ ۸۰۹ھ

(۸۵) المختار: از مجد الدین الموصلی (متوفی ۶۷۲ھ/ ۱۲۷۳ء) سنہ ۸۵۳ھ کا مکتوبہ صاف ستھرا خوبصورت نسخہ۔

(۸۶) الفتح القدیر: از ابن ہمام (متوفی ۸۶۱ھ/ ۱۴۵۶ء) مکتوبہ سنہ ۸۵۴ھ۔

(۸۷) شرح المختصر الاصول: از قاضی عز الدین (متوفی ۷۵۶ھ/ ۱۳۵۵ء) مکتوبہ سنہ ۸۶۰ھ۔

(۸۸) شرح المختصر: ساتویں صدی ہجری کے ایک عالم سلیمان بن احمد بن زکریا کی تصنیف۔ بظاہر ساتویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۸۹) شرح المنار: نویں صدی ہجری کے ایک عالم عبداللطیف بن فرشتہ کی تصنیف۔ مکتوبہ سنہ ۹۲۱ھ۔ نادر

(۹۰) التعبیر: از علاء الدین المرزاوی (متوفی ۸۸۵ھ/ ۱۴۷۷ء) مکتوبہ سنہ ۹۲۴ھ۔ نادر

(۹۱) افادۃ الانوار: گیارہویں صدی ہجری کے ایک عالم محمد علاء الدین کی تصنیف خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ۔

دینیات

(۹۲) شفاء الاسقام: از تقی الدین السبکی (متوفی ۷۵۶ھ/ ۱۳۵۵ء) مکتوبہ قبل سنہ ۷۴۰ھ۔

(۹۳) مطالع الانظار: از محمود الاصفہانی (متوفی ۷۴۹ھ/ ۱۳۴۸ء) مکتوبہ سنہ ۷۴۰ھ۔

(۹۴) شرح الطوالع: از عبداللہ بن محمد العبری (متوفی ۷۴۳ھ/ ۱۳۴۲ء) مکتوبہ سنہ ۷۷۲ھ۔ نادر

(۹۵) المفصل: از قزوینی: (متوفی ۶۷۵ھ/ ۱۲۷۳ء) بظاہر آٹھویں صدی ہجری سے پہلے کا مکتوبہ نسخہ۔ نادر

(۹۶) منہاج السنۃ: از امام ابن تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ/ ۱۳۲۷ء) مکتوبہ سنہ ۸۱۱ھ

(۹۷) الرد الوافی: از ابوعبداللہ محمد بن علی بن ابی بکر الشافعی (متوفی ۸۴۲ھ/ ۱۴۳۸ء) مکتوبہ سنہ ۸۶۵ھ۔

(۹۸) شرح المواقف: از سید شریف الجرجانی (متوفی ۸۱۶ھ/ ۱۴۱۳ء) مکتوبہ سنہ ۸۶۶ھ۔

(۹۹) الحاشیہ علی شرح التجرید: از محقق الدوانی (متوفی ۹۰۷ھ/ ۱۵۰۱ء) مکتوبہ سنہ ۹۷۴ھ۔

(۱۰۰) عمدۃ العقائد: از ابوالبرکات عبداللہ بن احمد النسفی (متوفی ۷۱۰ھ/ ۱۳۱۰ء) مکتوبہ سنہ ۹۸۱ھ۔

(۱۰۱) الحاشیہ علی القادمہ: از مرزا جان شیرازی (متوفی ۹۹۴ھ/ ۱۵۸۶ء) مکتوبہ سنہ ۹۸۲ھ۔

تصوف

(۱۰۲) الرسالہ: ازعبدالکریم القشیری (متوفی ۴۶۰ھ/ ۱۰۶۷ء) مکتوبہ ۵۳۳ھ

(۱۰۳) کتاب فی التصوف: ازسید بشر حافی (متوفی ۲۲۷ھ/ ۸۴۲ء) مکتوبہ سنہ ۴۳۸ھ۔ دنیا میں اس کتاب کا یہ ایک ہی نسخہ ہے۔

(۱۰۴) قوۃ القلوب: از ابو طالب حریصی ابن اسد (متوفی ۲۴۳ھ/ ۸۵۷ء) مکتوبہ سنہ ۵۰۱ھ۔

(۱۰۵) کتاب الصبر: از حارث بن اسد (متوفی ۲۴۳ھ/ ۸۵۷ء) مکتوبہ سنہ ۶۲۱ھ۔ نادر تصنیف۔ کتب خانہ میں اس کتاب کے صرف آخری تین ورق ہی محفوظ ہیں۔

(۱۰۶) المقابساۃ: از ابن حیان توحیدی (متوفی ۴۰۰ھ/ ۱۰۰۹ء) بظاہر ساتویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۱۰۷) ریاض الصالحین: از محی الدین النووی (متوفی ۶۷۶ھ/ ۱۲۷۸ء) مکتوبہ سنہ ۷۰۵ھ۔

(۱۰۸) العقلات المستوفضہ: از محی الدین العربی (متوفی ۶۳۸ھ/ ۱۲۴۰ء) مکتوبہ سنہ ۷۷۳ھ۔ نادر

(۱۰۹) کتاب الکنہ: از محی الدین العربی (متوفی ۶۳۸ھ/ ۱۲۴۰ء) بظاہر آٹھویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۱۱۰) حال الرموز: از جارم المقدسی (وفات قبل ساتویں صدی ہجری) مکتوبہ سنہ ۸۳۹ھ۔ نادر

(۱۱۱) منازل السائرین: از ابو اسماعیل الانصاری (متوفی ۴۸۱ھ/ ۱۰۲۰ء) مکتوبہ سنہ ۵۳۹۔

(۱۱۲) شرح الفصوص الحکم: ازعبدالرحمن جامی (متوفی ۸۹۸ھ/ ۱۵۲۰ء)۔ خود مصنف

کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ۔مکتوبہ سنہ ۸۹۶ھ۔

(۱۱۳) آداب المریدین: از ابوالنجیب السہروردی (متوفی ۵۷۳ھ/ ۱۱۰۹ء)۔مکتوبہ سنہ ۸۸۸ھ۔

اخلاق

(۱۱۴) کتاب التوابین: از موافق الدین (متوفی ۶۲۰ھ/ ۱۲۲۳ء) بظاہر ساتویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔نادر

(۱۱۵) الفخر المنیر: ساتویں صدی ہجری کے ایک عالم قمی کی تصنیف۔خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ۔نادر

(۱۱۶) مواعظ الابرار: از بیبرس المنصوری (متوفی ۷۲۵ھ/ ۱۳۲۵ء) مکتوبہ سنہ ۷۳۸ھ۔

(۱۱۷) کتاب الطائف: از ابن رجب (متوفی ۷۹۵ھ/ ۱۳۹۳ء) مکتوبہ سنہ ۸۴۰ھ۔نادر

(۱۱۸) القول البدیع: از سقاوی (متوفی ۹۰۲ھ/ ۱۴۹۷ء) مکتوبہ سنہ ۸۶۶ھ۔

(۱۱۹) قمع النفوس: از تقی الدین (متوفی ۸۲۹ھ/ ۱۴۲۶ء) مکتوبہ سنہ ۸۸۷ھ۔

(۱۲۰) جواہر العقدین: از عبداللہ الحسینی (متوفی ۹۱۱ھ/ ۱۵۰۵ء) مکتوبہ سنہ ۸۹۷ھ۔

(۱۲۱) جوامع الکلم: از علی متقی (متوفی ۹۷۵ھ/ ۱۵۶۸ء) خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ۔نادر

(۱۲۲) موارد الکلم: از فیضی (متوفی ۱۰۰۴ھ/ ۱۵۹۴ء)

فلسفہ وحکمت

(۱۲۳) الاشارات: از عبداللہ بن سینا (متوفی ۴۳۸ھ/ ۱۰۳۷ء) مکتوبہ سنہ ۵۲۰ھ۔

(۱۲۴) شرح الاشارات: از امام فخر الدین الرازی (متوفی ۶۰۶ھ/ ۱۳۰۹ء) بظاہر ساتویں

صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۱۲۵) شرح التاویلات: از ابن کوریہ (متوفی ۶۷۶ھ/ ۱۲۷۸ء) دو جلدوں میں۔ بظاہر ساتویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۱۲۶) حکمت العین: از قزوینی (متوفی ۶۷۵ھ/ ۱۲۷۶ء) مکتوبہ ۷۳۲ھ۔

(۱۲۷) شرح الہیاکل النور: از جلال الدین الدوانی (متوفی ۹۰۸ھ) مکتوبہ سنہ ۹۱۷ھ۔

(۱۲۸) القسطاس المنطق: ساتویں صدی ہجری کے ایک عالم شمس الدین السمر قندی کی تصنیف۔ مکتوبہ سنہ ۷۱۶ھ۔ نادر

(۱۲۹) شرح القسطاس: مذکورۂ بالا مصنف شمس الدین السمر قندی کی تصنیف۔ نویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔ نادر

(۱۳۰) الجواہر النضید: (شرح التجرید) ام حلّی (متوفی ۷۲۶ھ) دسویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔ نادر

علم الحساب

(۱۳۱) غنیۃ الحساب: از علی بن ثابت (وفات قبل چھٹی صدی) مکتوبہ سنہ ۷۸۶ھ۔ نادر

(۱۳۲) شرح المقنی: از ابن حاتم (متوفی ۸۱۵ھ/ ۱۵۱۲ء) مکتوبہ سنہ ۸۱۰ھ۔ نادر

(۱۳۳) اثر القواعد: آٹھویں صدی ہجری کے ایک مصنف کمال الدین الفارسی کی تصنیف۔ مکتوبہ سنۃ ۹۸۱ھ۔ نادر

(۱۳۴) شرح: دسویں صدی ہجری کے ایک مصنف ابو اسحاق عبداللہ کی تصنیف۔ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ۔ مکتوبہ سنہ ۹۶۳ھ۔ نادر

ہیئت

(۱۳۵) نہایت الادراک: از نصیر الدین طوسی (متوفی ۶۷۲ھ/ ۱۲۷۳ء) مکتوبہ سنہ ۶۰۹ھ۔

(۱۳۶) شرح التذکرہ: از سید شریف الجرجانی (متوفی ۸۱۶ھ/ ۱۴۱۳ء) مکتوبہ سنہ ۸۴۲ھ۔

نجوم

(۱۳۷) المثل: چوتھی صدی ہجری کے ایک ماہر نجوم ابو الحسن قشیر کی تصنیف۔ مکتوبہ سنہ ۸۷۱ھ۔

(۱۳۸) المدخل: از ابومعشر البلخی (متوفی ۲۷۲ھ/ ۸۸۵ء) نویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۱۳۹) نجم العلوم: دسویں صدی ہجری کے ایک ماہر نجوم ابوسید شریف کی تصنیف۔ دسویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔ نادر

طب

(۱۴۰) کتاب الحشائش: ایک یونانی تصنیف کا اضافہ اور نظر ثانی کے ساتھ ترجمہ جو تیسری صدی ہجری کے ایک عالم حسین بن ابراہیم الطبری نے کیا ہے۔ پانچویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۱۴۱) تذکرۃ الکحالین: از علی بن عیسیٰ (متوفی بعد قرن چہارم) مکتوبہ سنہ ۵۵۰ھ

(۱۴۲) کتاب التصریف: از زہراوی (متوفی ۴۰۴ھ/ ۱۰۱۳ء) تیسواں مقالہ۔ مکتوبہ سنہ ۵۸۴ھ۔

(۱۴۳) کتاب القانون: از ابوعلی الحسین بن عبداللہ بن سینا (متوفی ۴۲۸ھ/ ۱۰۳۷ء)۔ صرف ایک حصہ۔ مکتوبہ سنہ ۶۲۷ھ۔

(۱۴۴) شرح القانون: از ابو اسحاق السلامی (متوفی ۶۱۸ھ/ ۱۲۲۱ء) مکتوبہ سنہ ۶۷۹ھ۔ نادر

(۱۴۵) الجامع: از ابن بیطار (متوفی ۶۴۷ھ/ ۱۳۲۸ء) مکتوبہ ۶۸۹ھ۔

(۱۴۶) کتاب الخیل والبیطرہ: از نصیر الدین محمد بن یعقوب (متوفی سنہ تخمینا

۹۰۰ء/۲۸۸ھ) مکتوبہ سنہ ۷۵۳ھ۔ نادر

(۱۴۷) قرابادین القلانسی: ساتویں صدی ہجری کے ایک مصنف بدرالدین القلانسی کی تصنیف۔ مکتوبہ سنہ ۷۸۲ھ۔ نادر

(۱۴۸) کتاب المشجر: از ابوزکریا یوحنا (متوفی ۲۴۳ھ/ ۸۵۷ء) بظاہر آٹھویں صدی ہجری کا مکتوبہ۔

(۱۴۹) شرح الفصول الابخارات: از علاء الدین القرشی (متوفی ۶۸۷ھ/ ۱۲۵۵ء) مکتوبہ سنہ ۹۱۴ھ۔ نادر

(۱۵۰) کتاب الاغذیہ: از ابوزید حسین بن اسحاق (متوفی ۲۶۰ھ/ ۸۷۳ء) مکتوبہ سنہ ۹۱۴ھ۔ نادر

(۱۵۱) کنز الفوائد: از ابوزید حسین بن اسحاق مکتوبہ ۹۱۴ھ۔ کتاب الاغذیہ کے ساتھ اس کتاب کی جلد بندی کی گئی ہے۔

(۱۵۲) کتاب الاقوال الکافیہ: یمن کے فرماں روا رسولیہ خاندان کے پانچویں سلطان الملک المجاہد علی بن داؤد (۷۲۱ھ/ ۱۳۲۱ء تا ۷۶۴ھ/ ۱۳۶۳ء) کی تصنیف۔ مکتوبہ سنہ ۹۹۲ھ۔ نادر

(۱۵۳) کتاب المنصوری: از ابومحمد زکریا الرازی (متوفی ۳۲۰ھ/ ۹۳۲ء)۔ دسویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۱۵۴) کتاب الوباء: چوتھی صدی ہجری کے آخر کے ایک طبیب قسطا بن لوقا کی تصنیف۔ مکتوبہ سنہ ۱۰۵۳ھ۔ نادر

(۱۵۵) کتاب فی حفظ الصحت: قسطا بن لوقا کی تصنیف گیارہویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔ نادر

(۱۵۶) کتاب من لا یحضر الطبیب: از زکریا الرازی (متوفی ۳۲۰ھ/ ۹۲۳ء) بظاہر گیارہویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۱۵۷) شرح الکلیات القانون: آٹھویں صدی ہجری کے ایک مصنف سدید الدین قازرونی کی تصنیف۔ دو جلدوں میں مکتوبہ سنہ ۱۱۰۲ھ۔ نادر

(۱۵۸) دستور العجایب: از داؤد انطاکی (متوفی ۱۰۰۸ھ/ ۱۵۹۹ء) بظاہر بارہویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔ نادر

(۱۵۹) کتاب الحلوتج الطب: آٹھویں صدی ہجری کے ایک مصنف فخر الدین الجندی کی تصنیف۔ مکتوبہ سنہ ۱۳۱۲ھ۔

(۱۶۰) کتاب التدبیر الحبلی: از ابو العباس احمد بن محمد (متوفی ۳۸۰ھ/ ۹۹۰ء) بظاہر تیرہویں صدی ہجری کا لکھا ہوا نسخہ۔ نادر

علم الحیوان والنباتات والمعدنیات

(۱۶۱) کتاب الاحجار: تیسری صدی ہجری کے ایک مصنف عطارد بن محمود الحسیب کی تصنیف۔ بظاہر ساتویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔ نادر

(۱۶۲) اظہر الافکار: از ابو العباس احمد بن یوسف التفاشی (متوفی ۶۵۱ھ/ ۱۲۵۳ء) مکتوبہ سنہ ۸۳۹ھ۔

(۱۶۳) حیات الحیوان: از کمال الدین الدمیری (متوفی ۸۰۸ھ) مکتوبہ سنہ ۹۵۳ھ۔

تاریخ

(۱۶۴) واصلات المتعبدین: چھٹی صدی ہجری کے ایک عالم عمر بن محمد الموصلی کی تصنیف۔ گیارہ جلدوں میں سے صرف چھ جلدیں۔ بظاہر چھٹی صدی ہجری کا لکھا ہوا نسخہ۔ نادر

(۱۶۵) دلیل النبوۃ: از حافظ ابو نعیم (متوفی ۴۳۰ھ/ ۱۰۳۷ء) مکتوبہ سنہ ۶۰۲ھ

(۱۶۶) کتاب الامام: آٹھویں صدی ہجری کے ایک عالم محمد بن قاسم النویری کی تصنیف۔ بظاہر آٹھویں صدی ہجری کا لکھا ہوا نسخہ۔ نادر

(۱۶۷) مراۃ الزمان: از یوسف الابن جوزی (متوفی ۶۵۴ھ/ ۱۲۵۶ء)۔ تیرہ جلدوں میں

سے صرف ایک جلد۔ بظاہر آٹھویں صدی ہجری کا لکھا ہوا نسخہ۔ نادر

(۱۶۸) مختصر مراۃ الزمان: آٹھویں صدی ہجری کے ایک عالم کی تصنیف۔ بظاہر آٹھویں صدی ہجری کا لکھا ہوا نسخہ۔ نادر

(۱۶۹) کتاب المعراج: ابو القاسم القشیری (متوفی ۴۶۰ھ/ ۱۰۶۷ء) مکتوبہ سنہ ۸۸۰ھ۔ نادر

(۱۷۰) المختصر من سیرۃ سید البشر: از عبدالمومن الدمیاطی (متوفی ۷۰۵ھ/ ۱۳۰۵ء) پانچ جلدوں میں سے صرف پانچواں حصہ۔ مکتوبہ سنہ ۷۸۶ھ۔ نادر

(۱۷۱) البدایہ: از ابن کثیر الدمشقی (متوفی ۷۷۴ھ/ ۱۳۷۶ء) دس جلدوں میں سے صرف ایک جلد۔ مکتوبہ سنہ ۸۹۲ھ۔

(۱۷۲) المواہب اللدنیہ: از قسطلانی (متوفی ۹۲۳ھ/ ۱۵۷۳ء) خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ۔ مکتوبہ سنہ ۸۹۸ھ۔ نادر

(۱۷۳) مراۃ الجنان: از یافعی (متوفی ۷۶۸ھ/ ۱۳۶۹ء) نویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۱۷۴) جمہرۃ الانساب: از ابو محمد علی الفاسی (متوفی ۴۵۶ھ/ ۱۰۶۴ء) نویں صدی ہجری کا لکھا ہوا نسخہ۔ نادر

(۱۷۵) تاریخ سلاطین آل عثمان: دسویں صدی ہجری کے ایک نامعلوم مصنف کی تالیف۔ مکتوبہ سنہ ۹۲۷ھ۔ نادر

(۱۷۶) بہجت المحافل: از ابوزکریا العامری (متوفی ۸۹۳ھ/ ۱۴۸۷ء) مکتوبہ سنہ ۹۳۲ھ۔

(۱۷۷) روضۃ المناظر: از محب الدین (متوفی ۸۱۵ھ/ ۱۴۱۲ء) مکتوبہ سنہ ۹۹۲ھ۔

(۱۷۸) تذکرۃ الخواص الامت: از سبط ابن الجوزی (متوفی ۶۵۴ھ/ ۱۲۵۶ء)۔ مکتوبہ سنہ ۱۰۷۰ھ۔ نادر

(۱۷۹) راس المال الندیم: پانچویں صدی ہجری کے ایک مصنف ابوالعباس احمد بن علی بن بنا کی تصنیف۔ بظاہر گیارہویں صدی کا مکتوبہ نسخہ۔ نادر

(۱۸۰) عقد الجمان: از بدرالدین العینی (متوفی ۸۵۵ھ/ ۱۴۵۱ء) چھ جلدوں میں سے دوسری جلد۔ مکتوبہ سنہ ۱۱۴۳ھ۔

السیر والمدائح

(۱۸۱) محدثوں کے سوانح حیات پر کسی نامعلوم مصنف کی تصنیف کا ایک جزو۔ گیارہویں صدی ہجری کا لکھا ہوا نسخہ۔

(۱۸۲) تاریخ ابن عساکر: از ابن عساکر (متوفی ۵۷۱ھ/ ۱۱۷۵ء) آٹھ جلدوں میں سے صرف دو جلدیں۔ مکتوبہ سنہ ۶۱۴ھ۔

(۱۸۳) طبقات الحنابلہ: از ابویعلیٰ (متوفی ۵۲۶ھ/ ۱۱۳۱ء) مکتوبہ سنہ ۶۳۷ھ۔

(۱۸۴) اسد الغابہ: از عزالدین الجاتری (متوفی ۶۳۰ھ/ ۱۲۳۲ء) صرف ایک جلد۔ مکتوبہ سنہ ۶۳۹ھ۔

(۱۸۵) الکامل: از عبدالغنی (متوفی ۶۰۰/ ۱۲۰۳ء) ساتویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۱۸۶) تہذیب الکمال: از جمال الدین ابو الحجاج بن عبدالرحمن (متوفی ۷۴۲ھ/ ۱۳۴۱ء)۔ تیرہ جلدوں میں سے صرف ایک جلد مکتوبہ سنہ ۷۱۸ھ۔

(۱۸۷) الکاشف: از ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ/ ۱۳۲۷ء) مکتوبہ ۷۳۲ھ۔

(۱۸۸) منتخب التہذیب الاسماء واللغات: آٹھویں صدی ہجری کے ایک مصنف ابراہیم کی تصنیف۔ آٹھویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۱۸۹) تبصیر التنبیہ: از ابن حجر (متوفی ۸۵۲ھ/ ۱۱۴۸ء) مکتوبہ سنہ ۸۴۱ھ۔

(۱۹۰) الاشباہ: از ابن حجر (متوفی ۸۵۲ھ/ ۱۱۴۸ء) نویں صدی ہجری کی مکتوبہ ایک خوبصورت نسخہ۔

(۱۹۱) العلماء: از سقاوی (متوفی ۹۰۰ھ/ ۱۴۹۴ء) مکتوبہ ۸۹۴ھ۔

(۱۹۲) اختیار الرفیق: از احمد بن سلامہ (متوفی ۷۶۹ھ/ ۱۳۶۷ء) مکتوبہ سنہ ۹۱۳ھ۔

(۱۹۳) مختصر کتاب وفیات الاعیان: نویں صدی ہجری کے ایک مصنف محمد بن ناجی کی تصنیف۔مکتوبہ سنہ ۹۹۹ھ۔

(۱۹۴) دستور العلم: از جمال الدین الطوسی (متوفی ۸۹۱ھ/ ۱۴۸۵ء) مکتوبہ سنہ ۱۱۲۲ھ۔نادر

(۱۹۵) نکات الحمیان: از صلاح الدین الصفدی (متوفی ۷۶۴ھ/ ۱۳۶۲ء) مکتوبہ سنہ ۱۲۲۳ھ۔

(۱۹۶) طبقات المفسرین: از محمد بن علی الداودی (متوفی ۳۳۴ھ/ ۹۴۵ء) مکتوبہ سنہ ۱۲۲۳ھ۔نادر

(۱۹۷) طبقات الحنابلہ: ابن رجب (متوفی ۷۹۵ھ/ ۱۳۹۲ء)۔ دوجلدوں میں مکتوبہ سنہ ۱۲۹۷ھ۔نادر

(۱۹۸) طبقات الحنابلہ: تیرہویں صدی ہجری کے مصنف محمد بن عبداللہ النجدی کی تصنیف۔نادر

(۱۹۹) تاریخ الطبقات: تیرہویں صدی ہجری کے مصنف محمد بن عبداللہ النجدی کی تصنیف۔دوجلدوں میں۔پہلی صدی ہجری سے لے کر تیرہویں صدی ہجری تک۔ تیرہویں صدی ہجری کا لکھا ہوا نسخہ۔نادر

(۲۰۰) رفع العصر: از ابن حجر (متوفی ۸۵۲ھ/ ۱۴۴۸ء) مکتوبہ سنہ ۱۳۱۰ھ۔نادر

صرف نحو

(۲۰۱) شرح الجمل: کسی نامعلوم مصنف کی تصنیف مکتوبہ ۹۷۵ھ۔

(۲۰۲) الایضاح: از ابوعلی حسین الفارسی (متوفی ۳۷۷ھ/ ۹۷۹ء) مکتوبہ سنہ ۵۹۹ھ۔نادر

(۲۰۳) شرح اللمع: از عکبری (متوفی ۶۱۶ھ/ ۱۲۱۹ء) مکتوبہ سنہ ۶۱۱ھ۔

(۲۰۴) اللمع: از ابن جنی (متوفی ۳۹۳ھ/ ۱۰۰۲ء) مکتوبہ سنہ ۶۲۰ھ۔

(۲۰۵) الایضاح: شرح المفصل: از ابن حاجب (متوفی ۶۴۶ھ/ ۱۲۴۴ء) مکتوبہ سنہ ۶۹۰ھ۔نادر

(۲۰۶) المحصول فی شرح المفصول: از حسین بغدادی (متوفی ۶۸۱ھ/ ۱۲۸۲ء) مکتوبہ سنہ ۶۷۴ھ۔

(۲۰۷) بغیۃ الامل: از ابوجعفر احمد بن یوسف بن علی (متوفی ۶۹۱ھ/ ۱۲۹۲ء) مکتوبہ سنہ ۶۹۰ھ۔ نادر

(۲۰۸) شرح الکافیہ: از جمال الدین جیانی (متوفی ۶۷۲ھ/ ۱۲۷۳ء) مکتوبہ ۷۱۶ھ۔

(۲۰۹) المقرب: از ابن عصفور (متوفی ۶۶۳ھ/ ۱۲۶۴ء) مکتوبہ ۷۵۲ھ

(۲۱۰) شرح اللباب: ساتویں صدی ہجری کے ایک مصنف قطب الدین محمد بن مسعود کی تصنیف۔ مکتوبہ سنہ ۷۵۷ھ۔

(۲۱۱) شرح الکافیہ: از رازی۔ یہ کتاب رازی نے ۶۸۳ھ/ ۱۲۸۴ء میں لکھی ہے۔ تین جلدوں میں۔ مکتوبہ سنہ ۸۲۲ھ مشہور عالم عینی (متوفی ۸۵۵ھ/ ۱۴۵۱ء) نے اس نسخہ کی کتابت کی ہے۔

عروض و بلاغت

(۲۱۲) الجامع الکبیر: از ابن اثیر (متوفی ۶۳۸ھ/ ۱۲۴۰ء) ساتویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔ نادر

(۲۱۳) مفتاح العلوم: از سکاکی (متوفی ۶۲۶ھ/ ۱۲۲۹ء) مکتوبہ سنہ ۷۲۲ھ۔

(۲۱۴) المصباح: از جمال الدین الجیانی (متوفی ۶۷۲ھ/ ۱۲۷۳ء) مکتوبہ سنہ ۷۳۲ھ۔ نادر

(۲۱۵) المطول: از سعد الدین تفتازانی (متوفی ۷۹۱ھ/ ۱۳۸۸ء) مکتوبہ سنہ ۷۹۹ھ۔

(۲۱۶) التبیان: از طیبی (متوفی ۷۴۳ھ/ ۱۳۴۲ء) آٹھویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔ نادر

(۲۱۷) الحاشیہ علی المطول: از سید شریف (متوفی ۸۱۶ھ/ ۱۴۱۳ء) مکتوبہ سنہ ۸۵۴ھ۔

(۲۱۸) الحاشیہ علی المطول: از حسین بن محمد (متوفی (۸۸۶ھ/ ۱۴۸۱ء) مکتوبہ سنہ ۹۶۲ھ۔

(۲۱۹) الحاشیہ علی المطول: از نظام الدین عثمان (متوفی ۹۰۱ھ/ ۱۴۹۵ء) مکتوبہ سنہ ۹۶۷ھ۔

لغت

(۲۲) تہذیب اللغات: از ابو منصور محمد بن احمد ازہری (متوفی ۳۷۰ھ/ ۹۸۰ء) نو جلدوں میں سے صرف دو جلدیں۔ چھٹی صدی ہجری کا لکھا ہوا نسخہ۔ نادر

(۲۲۱) الصحاح: از ابو نصر جوہری (متوفی ۳۹۳ھ/ ۱۰۰۲ء) مکتوبہ سنہ ۶۳۲ھ۔

(۲۲۲) کتاب الصفات: از ابو عباللہ محمد بن عیسٰی (متوفی ۶۲۰ھ/ ۱۲۲۳ء) مکتوبہ سنہ ۶۴۸ھ۔ نادر

(۲۲۳) الجامع بین الغریبین: از ابو عبداللہ الہروی (۴) (متوفی ۴۰۱ھ) مکتوبہ سنہ ۶۶۷ھ۔ نادر

(۲۲۴) المقدمہ: از زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ/ ۱۱۴۳ء) مکتوبہ سنہ ۶۷۷ھ۔

(۲۲۵) الحلیہ: ساتویں صدی ہجری کے ایک مصنف محمد بن علی بن کامل کی تصنیف۔ مکتوبہ سنہ ۶۹۷ھ۔

(۲۲۶) نظم الغریب: از عیسٰی بن ابراہیم (متوفی ۴۸۰ھ/ ۱۰۸۷ء) ساتویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۲۲۷) فقہ اللغہ: از ابو منصور عبدالملک بن محمد (متوفی ۳۸۵ھ/ ۹۹۵ء) آٹھویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۲۲۸) دستور الغواص: از حریری (متوفی ۵۱۶ھ/ ۱۱۲۲ء) مکتوبہ ۸۹۰ھ۔

(۲۲۹) شمس العلوم: از نشوان بن سعید (متوفی ۵۷۳ھ/ ۱۱۷۰ء) مکتوبہ سنہ ۱۰۸۳ھ۔

(۲۳۰) الجمہرہ: از ابن درید (متوفی ۳۲۱ھ/ ۹۳۲ء) نویں صدی ہجری کا لکھا ہوا نسخہ۔

ادب

(۲۳۱) المثل السائر: از ضیاء الدین ابن اثیر الجزری، متوفی ۶۳۸ھ/ ۱۲۴۰ء)۔ دو جلدوں

میں۔مکتوبہ سنہ ۶۲۸ھ۔

(۲۳۲) المقامات:ازحریری(متوفی ۵۱۶ھ/ ۱۱۲۲ء)مکتوبہ سنہ ۶۳۰ھ۔

(۲۳۳) شرح الحماسہ:ازابوعلی المرزوقی(متوفی ۴۲۱ھ/ ۱۰۳۰ء)۔مکتوبہ سنہ ۶۷۸ھ۔

(۲۳۴) شرح المقامات: ساتویں صدی ہجری کے ایک مصنف مظہرالدین کی تصنیف۔مکتوبہ سنہ ۶۸۰ھ۔

(۲۳۵) شرح المعلقات: از ابن نحاس النحوی (متوفی ۸۳۸ھ/ ۱۴۲۴ء) ساتویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۲۳۶) نسیم الصبا:ازبدرالدین الحلبی (متوفی(۷۷۹ھ/ ۱۳۰۸ء)مکتوبہ سنہ ۷۹۵ھ۔

(۲۳۷) دیوان ابی وردی: از ابووردی (متوفی ۷۴۹ھ/ ۱۳۲۹ء) آٹھویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۲۳۸) شرح النہج البلاغہ: ازکمال الدین الجحریی (متوفی ۶۷۹ھ/ ۱۲۸۴ء) آٹھویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۲۳۹) الکواکب الدریہ: ازشرف الدین البوصیری (متوفی ۶۹۴ھ) آٹھویں صدی ہجری کا مکتوبہ ایک خوبصورت نسخہ۔

(۲۴۰) المقامات الجزاریہ: آٹھویں صدی ہجری کے ایک مصنف سید یدالدین الجزاری کی تصنیف آٹھویں صدی ہجری کا لکھا ہوا نسخہ۔

(۲۴۱) نہج البلاغہ: ازابوالحسن الرازی (متوفی ۳۹۵ھ/ ۹۷۱ء) آٹھویں صدی ہجری کا لکھا ہوا ایک خوبصورت نسخہ۔

(۲۴۲) سلوان المطع: ازشمس الدین الصقلی (متوفی ۵۶۵ھ/ ۱۱۷۰ء) مکتوبہ سنہ ۸۴۲ھ۔

(۲۴۳) انوارالربی: کسی نامعلوم مصنف کی تصنیف۔آٹھویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۲۴۴) دیوان ابوالعلا: ازابوالعلا المعری (متوفی ۴۴۹ھ/ ۱۰۵۷ء) مکتوبہ سنہ ۸۴۹ھ۔

(۲۴۵) الحاشیہ علی قصیدۃ البردہ: اززرکشی (متوفی ۷۹۴ھ/ ۱۳۹۲ء)۔مکتوبہ سنہ ۸۵۶ھ۔

(۲۴۶) انوار العقول: (معروف بہ دیوان علی) مرتبہ قطب الدین الراوندی۔ سنہ ۸۵۸ھ کا مکتوبہ خوبصورت نسخہ۔

(۲۴۷) نزہۃ النفوس: از علی بن سدون (متوفی قریب ۸۴۰ھ/ ۱۴۰۷ء) مکتوبہ سنہ ۸۶۳ھ۔

(۲۴۸) مراۃ الغزلان: از محمد بن حسن (متوفی ۸۵۹ھ/ ۱۴۵۴ء) مکتوبہ سنہ ۸۸۷ھ۔

(۲۴۹) عقلاء المجانین: از حسن بن محمد (متوفی ۴۰۶ھ/ ۱۰۱۵ء) نویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

(۲۵۰) دیوان الوفائی: از علی بن محمد الوفائی (متوفی ۸۰۷ھ/ ۱۴۰۵ء)۔ نویں صدی ہجری کا مکتوبہ نسخہ۔

ضمیمہ (۵)

(۱)

لغات

(۱) ادب الکاتب: از عبداللہ بن قتیبہ (متوفی ۲۷۶ھ/ ۸۸۹ء) بظاہر قدیم اور نہایت درجہ قابل اعتماد نسخہ۔ شروع سے آخر تک ہر لفظ پر اعراب دیے گئے ہیں۔

(۲) کتاب الجمہرہ: از محمد بن درید (متوفی ۳۲۱ھ/ ۹۳۴ء) قدیم اور قابل اعتماد نسخہ۔ شروع سے آخر تک ہر لفظ پر اعراب دیے گئے ہیں۔

(۳) تہذیب اللغۃ: از محمد بن احمد الازہری (متوفی ۳۷۰/ ۹۸۰ء) نامکمل نسخہ۔ لیکن بظاہر بہت ہی قدیم۔ شروع سے آخر تک اعراب دیے گئے ہیں۔

(۴) کتاب الغریبین فی القرآن والحدیث: از احمد بن محمد الہروی (متوفی ۴۰۱ھ) نہایت عمدہ نسخہ۔

(۵) شمس العلوم: از نشھوان بن سعید الحمیاری (متوفی ۵۷۳ھ/ ۱۱۱۷ء) نہایت عمدہ نسخہ۔ ضرورت ہے کہ یہ کتاب شائع کردی جائے۔

(۶) ضیاء العلوم: از محمد بن نشھوان۔ مذکورۂ بالا کتاب اور یہ کتاب دونوں مل کر مذکورہ بالا

کتاب کا مکمل نسخہ ہے۔

(۷) لوامع النجوم: مصنف نامعلوم۔

(ب)

صرف ونحو

(۸) کتاب الخصائص فی النحو: از ابو الفتح عثمان بن جنّی (متوفی ۳۹۲ھ/ ۱۰۰۲ء)۔
نہایت عمدہ نسخہ۔ قابل اشاعت۔

حواشی

(۱) یہ فہرست اس کتاب کے لیے خاں صاحب مولوی عبدالمقتدر صاحب نے خاص طور پر تیار کی ہے۔

(۲) نادر عربی کتابوں کی یہ موضوع واری فہرست اس کتب خانہ کی عربی کتابوں کے فہرست نگار مولوی عبدالحامد صاحب نے تیار کی ہے۔

(۳) حافی: ان کو حافی اس لیے کہا جاتا تھا کہ یہ ننگے پیر پھرا کرتے تھے کیونکہ عربی میں ننگے پیر پھرنے والے کو حافی کہتے ہیں۔

(۴) ضمیمہ ۴ پر اس کا نام کتاب الغریبین فی القرآن والحدیث لکھا ہے اور مصنف کا نام احمد بن محمد الہروی اور سال وفات ۴۰۱ھ لکھا ہے کتاب اور مصنف کے نام میں اختلاف۔ مقام موافق۔

(۵) یہ ضمیمہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد (پی ایچ۔ ڈی) نے مرتب کیا ہے۔

(انجمن ترقی اردو علی گڑھ ۱۹۵۰ء)

☆☆☆

خدابخش لائبریری——ایک مختصر رپورٹ

خدابخش لائبریری، پبلک لائبریری کی حیثیت سے ۱۸۹۱ء میں قائم ہوئی۔ ۱۴ر جنوری ۱۸۹۱ء میں صوبہ بہار کے فرزند خدابخش خاں نے ایک ڈیڈ آف ٹرسٹ کے ذریعہ کروڑوں روپے کی مالیت پر مشتمل مخطوطات ومطبوعات کے اس عظیم ذخیرہ کو جو انھیں اپنے والد کی جانب سے ورثہ میں ملا تھا اور جس میں خود انھوں نے بھی بڑی کد و کاوش کے بعد گرانقدر اضافے کیے تھے۔عوام کو بطور عطیہ عنایت کر دیا۔

دسمبر ۱۹۶۹ء میں پارلیمنٹ نے ایک ایکٹ کے ذریعہ لائبریری کو قومی اہمیت کا حامل ادارہ قرار دیتے ہوئے اس کا انتظام وانصرام حکومت ہند کے حوالے کر دیا۔

جولائی ۱۹۷۰ء میں اس ادارے کے انتظام وانصرام کے لیے حکومت ہند نے ایک بورڈ کی تشکیل کی جس کے سربراہ بہار کے گورنر ہیں۔ بورڈ کے دیگر ممبران (۱) کمشنر پٹنہ ڈویزن (۲) ایجوکیشن کمشنر بہار (۳) اکاؤنٹینٹ جنرل بہار (۴) ڈائرکٹر بیورو آف لائبریریز اینڈ لٹریچر حکومت ہند (۵) ڈاکٹر ستیہ پرکاش سابق ڈائرکٹر سالار جنگ میوزیم (۶) پروفیسر خورشید الاسلام علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ (۷) جناب ہاشم حسن کلکتہ (۸) ڈائرکٹر ادارہ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ (۹) پروفیسر سید حسن عسکری پٹنہ (۱۰) جناب قاضی عبدالودود بار ایٹ لاء۔ اور لائبریری کے ڈائرکٹر ہیں۔

بورڈ نے روزانہ کے انتظام وانصرام کے لیے ایک انتظامی کمیٹی (EXECUTIVE COMMITTE) بنائی ہے جس کے سربراہ کمشنر پٹنہ ڈویزن ہیں۔

حکومت ہند لائبریری کو ترقی دینے میں کافی دلچسپی لے رہی ہے۔ اس نے اس کی ترقیاتی پروگراموں کے لیے موجودہ پنج سالہ منصوبہ میں ۲۵ لاکھ روپے منظور کیے ہیں جو چار لاکھ

روپے کے سالانہ بجٹ کے علاوہ ہیں۔

لائبریری کے اندر، شہر میں اور پورے ملک میں کتابوں سے دلچسپی کا جو نیا شعور پیدا ہوا ہے۔اس نے لائبریری میں محفوظ اشیاء کے استعمال میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے اور اضافہ ہوتا ہی جا رہا ہے۔ لائبریری آنے والے مطالعہ کنندگان اور اسکالر بڑی تعداد میں لائبریری کے قیمتی اور بھرپور ذخیرہ سے مستفید ہو رہے ہیں۔

ہندوستان اور بیرونی ممالک کے اسکالروں کے لیے لائبریری میں محفوظ تحقیقی مواد کی فراہمی کا ذریعہ ریفرنس سروس ہے۔ ان کے علمی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں انھیں مخطوطات کی دستی نقلیں، مائکروفلمیں، فوٹو کاپیاں وغیرہ ان کی ضرورتوں کے مطابق مہیا کی جاتی ہیں۔اس ریفرنس سروس میں گزشتہ چند سالوں میں بیس گنا اضافہ ہوا ہے۔

مطالعہ کنندگان کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کے پیش نظر لائبریری ان تمام اہم مواد کو حاصل کرنے کی کوشش میں ہے جو لائبریری کے اپنے مخصوص میدان سے مطابقت رکھتے ہیں۔ مخطوطات و مطبوعات کے بہت بڑے ذخیرے گزشتہ چار پانچ سالوں کی مسلسل کد و کاوش کے بعد عاریتاً تحفۃً یا قیمتاً حاصل کیے گئے ہیں۔ان میں اہم اور قابل ذکر کھجوہ کلکشن (ضلع سارن) ادارۂ تحقیقات کلکشن (پٹنہ) سر فخر الدین کلکشن (پٹنہ) ڈاکٹر شمیم کلکشن (آرہ) اسلام پور کلکشن (فتوحہ) محل کلکشن (حسین آباد) ہیں تحفۃً حاصل کردہ ذخیرہ کی مالیت لاکھ روپے سے بیشتر ہے۔

علاوہ ازیں متعدد بڑی لائبریریوں مثلاً علی گڑھ، رامپور، پھلواری شریف اور فتوحہ کے نادر و اہم مخطوطات کے مائکروفلم حاصل کر لیے گئے ہیں۔ ہم نے اہم اور چنندہ مخطوطات کے مائکروفلم حاصل کر کے انڈیا آفس کلکشن کی تقسیم کے مسئلہ پر ہندو پاک تنازعہ کو بھی حاصل کر لیا ہے۔ تحفظ کے پیش نظر ہم نے خود اپنے کلکشن کے نادر و نایاب مخطوطات کا بھی مائکروفلم تیار کر لیا ہے۔

مخطوطات و مطبوعات کی مرمت و جلد بندی کی طرف فوری توجہ دی گئی ہے گزشتہ چند سالوں کے دوران مرمت و جلد بندی کے کاموں میں دس گنا اضافہ ہوا ہے۔ کتابوں کی حفاظت کے سلسلے میں اب پہلے سے کہیں زیادہ سائنٹفک طریقے اپنائے گئے ہیں اور ان کی نگرانی ایسے

لوگوں کے سپرد ہے جو نیشنل لائبریری کلکتہ اور نیشنل آرکائیوز آف انڈیا سے تربیت یافتہ ہیں۔

لارڈ کرزن، جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے علی الترتیب ۱۹۰۵ء، ۱۹۵۳ء اور ۱۹۵۷ء میں جب یہ لوگ لائبریری تشریف لائے تھے تو مشورہ دیا تھا کہ لائبریری کی قیمتی و نادر چیزوں کو جدید ترین تکنیک کے ذریعہ آفسٹ پر Reproduce کرایا جائے تاکہ ان نادر و نایاب چیزوں سے دوسرے لوگ بھی مستفید و مستفیض ہوسکیں۔

اس مشورے کو اب ہم عملی جامہ پہنا رہے ہیں۔ چنانچہ شہنشاہ اکبر کے ایما پر لکھی گئی مغلوں کی ایک مصور تاریخ تزک جہانگیری، دیوان مصحفی کا نایاب واحد نسخہ اور دیوان حافظ کا شاہی نسخہ جسے مغل بادشاہ فال نکالنے کے لیے استعمال میں لایا کرتے تھے اور جس کے حاشیے پر ان کے ذریعے نکالے گئے متعدد فال بھی درج ہیں فوٹو آفسٹ پر طبع کرائے جا رہے ہیں۔

ریسرچ و تحقیق کی بیرونی دنیا کو لائبریری میں محفوظ مواد سے متعارف کرانے کے لیے ایک سہ ماہی جرنل ۱۹۷۷ء سے جاری کیا گیا ہے۔ خدا بخش لائبریری جرنل میں لائبریری کی چھوٹی چھوٹی کم ضخامت کی نوادرات کو بھی شائع کیا گیا ہے۔ مثلاً خدا بخش لائبریری کا تعارف An Eastern Library (۲) شمس البیان، محاورات و مصطلحات کی ایک قدیم اردو ڈکشنری مصنفہ اٹھارویں صدی (۳) مجمع النفائس مولفہ خان آرزو، اٹھارہویں صدی کے ہندی، فارسی شعراء (ہم عصر شعراء) کا ایک تذکرہ (۴) باغ معانی، اٹھارویں صدی کے ہندی، فارسی شعراء کا ایک دوسرا تذکرہ (۵) آٹوگراف رجسٹر جلد۔ ا: ایلگن، کرزن، ریڈنگ، اروِن، ماؤنٹ بیٹن، لنلتھگو، واویل، جون سائمن، وہیلر، اے۔ اے۔ حکمت، رابندر ناتھ ٹیگور، ابوالکلام آزاد، سی۔ وی۔ رمن، جے۔ سی۔ بوس، ایم۔ کے۔ گاندھی، جواہر لال نہرو، ڈاکٹر ذاکر حسین، سیدنا طاہر سیف الدین، سیدنا برہان الدین، ہمایوں کبیر، لیاقت علی خاں سابق وزیر اعظم پاکستان، ظفر اللہ خاں اور اے۔ کے۔ فضل الحق کے آٹوگراف نوٹس (۶) صوفی ادب کے مآخذ (۷) فارسی اور ہندوستان از ڈاکٹر نذیر احمد (۸) ملفوظات اور مکتوب ادب سماجی تاریخ کے مآخذ کی حیثیت سے از پروفیسر سید حسن عسکری (۹) اسلامی کیلنڈر کی از سر نو ترتیب (انگریزی) از ہاشم

لائبریری کے عربی و فارسی کے نادر مخطوطات کی عالمی شہرت میں یہاں کے وضاحتی کٹیلاگ کا بڑا حصہ ہے۔ ان وضاحتی کٹیلاگ کی تیاری کا کام سب سے پہلے کرزن نے سر ڈینی سن راس کے زیر نگرانی ۱۹۰۵ء میں شروع کیا تھا۔ چنانچہ اب تک صرف نصف کلکشن کا کٹیلاگ تیار ہو سکا ہے۔ کام کی رفتار اگر اتنی ہی رہتی تو شاید ۲۰۴۵ء سے قبل سارے کا کٹیلاگ تیار ہونا مشکل تھا۔ لائبریری میں محفوظ بقیہ نصف ذخیرے سے اسکالروں کو آشنا و متعارف کرانے کے لیے اس بات کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا گیا کہ کٹیلاگ سازی کے کام کی رفتار میں غیر معمولی اضافہ کیا جائے۔ چنانچہ کٹیلاگ سازی کے کام کو ایک دہائی کے اندر مکمل کر دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اور اب نئی جلدوں کی ترتیب و تیاری اپنے آخری مرحلہ میں ہے۔

کٹیلاگ کی قدیم جلدیں جن کی کل تعداد ۳۰ ہے۔ بہت دنوں سے نایاب تھیں۔ ان کی از سر نو طباعت نیز ضروری اصلاحات و اضافہ کی فوری ضرورت تھی۔ چنانچہ اب تک چار جلدوں کا کام مکمل ہو چکا ہے اور چار جلدیں مزید زیر طبع ہیں۔

اسکالروں کو باریک سے باریک تر معلومات بہم پہنچانے کے لیے ہم نے لائبریری کے سارے رسائل جس میں دسنہ لائبریری کے رسائل کا بڑا حصہ ذخیرہ بھی شامل ہے، کا انڈکس تیار کرانے کا فیصلہ کیا تھا۔ چنانچہ اب تک لائبریری میں محفوظ رسائل کے ۸۰ ہزار مضامین کا انڈکس تیار کیا جا چکا ہے۔ اب دوسرا قدم ان انڈکسوں کو مضمون وار ترتیب دینے کا ہے تاکہ کسی بھی خاص موضوع پر مثلاً ''بہار میں آزادی کی تحریک'' یا ''اردو شاعری آزادی کے بعد'' ہر کام کرنے والے اسکالر کو دستیاب مواد محض پانچ منٹ کے اندر حاصل ہو جائے۔

ان روایتی سرگرمیوں کے علاوہ گاہے بگاہے لائبریری خدا بخش خطبات کا بھی انتظام کرتی ہے۔ ان خطبات کے لیے تاریخ اردو، فارسی عربی یا اسلامک اسٹڈیز کے ممتاز اسکالروں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں اب تک ڈاکٹر زبیر صدیقی (کلکتہ)، پروفیسر آصف فیضی (بمبئی)، جناب قاضی عبدالودود بارایٹ لا (پٹنہ)، ڈاکٹر عابدی (دہلی)، ڈاکٹر نذیر احمد (علی

گڑھ)، ڈاکٹر ہاشم امیر علی (حیدرآباد)، جناب عبدالسلام خاں (رام پور)، پروفیسر بروس لارنس (امریکہ)، پروفیسر کلیم الدین احمد (پٹنہ) اور پروفیسر سید مقبول احمد (علی گڑھ) نے اپنے علمی خطبات دیے ہیں۔

ان میں چند چھپ بھی چکے ہیں۔ تحقیق وریسرچ کی رفتار میں اضافہ کے لیے اور لوگوں کو مطالعہ کا عادی بنانے کے لیے لائبریری بعض اوقات سیمینار بھی منعقد کیا کرتی ہے۔

☆☆☆

(ہماری زبان۔ ۸، ۱۵ ستمبر ۱۹۷۸ء)

پروفیسر محمد اسلم صاحب
لاہور

عظیم آباد پٹنہ میں چار روز

خدا بخش لائبریری پر ایک نظر

میں ۲۳ راگست ۱۹۸۱ء کو نماز مغرب کے بعد پٹنہ پہنچا اور ریلوے اسٹیشن کے عقب میں کنکر باغ روڈ پر ہوٹل جسر مین میں قیام کیا۔ اگلے روز صبح ۹ بجے کے قریب خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پہنچا۔ یہ لائبریری ریلوے اسٹیشن سے اندازاً دو میل کے فاصلہ پر پٹنہ یونیورسٹی کے قریب بانکی پور میں واقع ہے۔ اس لائبریری کا شمار بھارت کی پانچ بڑی لائبریریوں میں ہوتا ہے۔ اس وقت اس لائبریری میں صرف مخطوطات کی تعداد پندرہ ہزار کے لگ بھگ ہے مطبوعات کا صحیح اندازہ لگانا آسان نہیں ہے۔ اس لائبریری میں ایسے علمی و ادبی رسائل کی مکمل فائلیں موجود ہیں جن کے نام سے بھی بہت سے لوگ ناواقف ہیں۔

اس لائبریری کے بانی جسٹس خدا بخش مرحوم کو کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ انھوں نے اپنی عمر بھر کی کمائی کتابوں کے حصول پر صرف کر دی۔ حتی کہ وہ آخری عمر میں بالکل کنگال ہو گئے تھے۔ جسٹس خدا بخش نے اپنی وفات سے قبل اپنی لائبریری وقف کر دی اور حکومت بہار اس کی نگراں بن گئی۔ آزادی کے بعد بھارتی پارلیمنٹ نے ایک خاص بل کی منظوری کے بعد اس لائبریری کو مرکزی حکومت کی تحویل میں دے دیا۔ اب اس لائبریری کو ۱۸ لاکھ روپے سالانہ گرانٹ ملتی ہے جس سے خرید کتب کے علاوہ عمارت میں توسیع بھی کی جا رہی ہے۔

میں نے لائبریری میں داخل ہوتے ہی استقبالیہ پر آغا عابد رضا بیدار کے بارے میں دریافت کیا۔ موصوف اردو زبان و ادب کے نامور ادیب اور اس لائبریری کے ڈائرکٹر ہیں۔ استقبالیہ کے انچارج نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھے کام کر رہے ہیں۔ ان کا گھر اور دفتر

لائبریری کے احاطے ہی میں ہے۔ میں ان کے گھر پہنچا تو مجھے دیکھتے ہی انھوں نے اندر بلا لیا۔ میں نے اپنا نام بتایا تو فرمانے لگے:

دیکھیے اب مولانا اکبرآبادی کا نام نہ لیجیے گا۔ آپ کا نام ہی تعارف کے لیے کافی ہے''۔

آغا صاحب نے چائے سے تواضع فرمائی اور میرے ساتھ لائبریری تک آئے۔ انھوں نے میرا تعارف [اسسٹنٹ لائبریرین] ڈاکٹر محمد عتیق الرحمن صاحب سے کرایا اور ان سے کہا کہ مجھے جس کتاب کی ضرورت ہو وہ فوراً مہیا کی جائے۔

میں نے لائبریری کے اوقات پوچھے تو آغا صاحب نے فرمایا کہ یوں تو صبح ۹ بجے سے شام چھ بجے تک لائبریری کھلی رہتی ہے۔ لیکن میں جب تک وہاں بیٹھنا چاہوں لائبریری کھلی رہے گی، میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

ڈاکٹر محمد عتیق الرحمن صاحب نے بہار کے شہرۂ آفاق محدث علامہ شوق نیموی (متوفی ۱۳۲۵ھ) پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔ میرے استفسار پر انھوں نے بتایا کہ نیمی پٹنہ سے دس گیارہ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہے۔ اور علامہ مرحوم وہیں کے رہنے والے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے میرا تعارف لائبریری کے عملہ سے کرایا۔ اور مجھے دارالمطالعہ میں بٹھا دیا۔ میری درخواست پر عملہ کے ایک رکن نے مجھے معارج الکمال کا خوبصورت مخطوطہ لا کر دیا (۱)۔

معارج الکمال، اسماعیل بن شاہ عالم عبدالعزیز کی تصنیف ہے اور اس کا کوئی دوسرا نسخہ میرے علم میں نہیں ہے۔ فاضل مصنف اکبری اور جہانگیری عہد کے نامور امیر نواب مرتضیٰ خاں فرید بخاری کا مصاحب تھا۔ نواب موصوف کا حضرت خواجہ باقی باللہ دہلوی، حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے ساتھ بڑا قریبی تعلق تھا۔ اور ان تینوں بزرگوں کی ان کے ساتھ خط و کتابت رہتی تھی۔

حضرت مجدد الف ثانی نے جن درباری امراء کو اکبر کی بے دینی اور الحاد کا قلع قمع کرنے کے لیے تیار کیا تھا۔ نواب مرتضیٰ خان ان کے سرخیل تھے۔ معارج الکمال میں نواب

موصوف کے بارے میں ایسی اہم معلومات ملتی ہیں جن کا ذکر مآثر الامراء اور ذخیرۃ الخوانین میں نہیں آیا۔ میں نے اس نادر مخطوطہ کی مدد سے نواب موصوف کی شخصیت اور کردار پر ایک مقالہ تیار کر کے ماہنامہ برہان دہلی میں چھپوایا ہے (۲)۔

اسی لائبریری میں ''سیرت فیروز شاہی'' کے عنوان سے ایک مخطوط محفوظ ہے۔ اس کا دوسرا نسخہ کسی لائبریری میں موجود نہیں۔ سیرت فیروز شاہی میں سلطان فیروز تغلق کے علاوہ محمد بن تغلق کے بارے میں بھی بڑی اہم معلومات ملتی ہیں۔ مصنف لکھتا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق کو باز پالنے کا بڑا شوق تھا اور وہ باز دیکھ کر یہ بتا دیا کرتا تھا کہ وہ پہاڑی علاقے کا رہنے والا ہے یا جنگل کا۔ نیز اس کی پیدائش اونچے گھونسلے کی ہے یا کسی نشیبی علاقے کی۔ اس تصنیف سے سلطان فیروز شاہ تغلق کی اصلاحات اور غیر شرعی ٹیکسوں کی موقوفی کے بارے میں بڑی اہم معلومات ملتی ہیں (۳)۔

اس لائبریری میں ''تاریخ حبیبی'' کے عنوان سے ایک مخطوطہ ہے (۴)۔ اس کا مصنف عبدالعزیز بن شیر ملک بن محمد واعظی، خواجہ عزیز اللہ محمد حسینی کا صحبت یافتہ تھا۔ تاریخ حبیبی کا سال تصنیف ۸۴۹ھ ہے اور اس میں حضرت بندہ نواز گیسو دراز اور ان کے فرزندوں اور خلفاء کے حالات درج ہیں۔ پروفیسر حسن عسکری نے راقم الحروف کو بتایا کہ تاریخ حبیبی کا اصل نسخہ جھوٹی درگاہ پھلواری شریف میں تھا۔ یہ اس کی نقل ہے۔ اصل نسخہ گم ہو گیا ہے۔ اس لیے اس نقل کی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے۔ دکن کے بہمنی سلاطین کو حضرت گیسو دراز اور ان کے جانشینوں کے ساتھ جو عقیدت تھی اس کا ذکر بار بار تاریخ حبیبی میں آتا ہے۔ میری درخواست پر آغا صاحب نے مجھے حضرت عین الدین عبدالباری شطاری المشتہر بہ شاہ رکن الدین کے ملفوظات مطالعہ کے لیے دیے۔ صاحب ملفوظات اورنگ زیب عالمگیر کے ہمعصر تھے۔ ان کے جد امجد شاہ قاخن علاء شطاری کا شمار برصغیر پاک و ہند میں شطاریہ سلسلہ کے اساطین میں ہوتا ہے۔ شاہ قاخن کے فرزند حضرت ابوالفتح سرمست کو بہار میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہمایوں جب بہار آیا تو بڑی عقیدت کے ساتھ انھیں ملا۔ اور ان کی پالکی کو کندھا دینے کی سعادت حاصل کی۔ ملفوظات کے اس مجموعہ میں اس عہد کے ایسے تاریخی واقعات آ گئے ہیں جو دوسری کتابوں میں

نہیں ملتے۔ راقم الحروف نے ان ملفوظات کی اہمیت پر ایک مقالہ لکھا تھا جو ماہ نامہ المعارف لاہور میں چھپ چکا ہے(۵)۔

میں جس وقت لائبریری میں بیٹھا کام کر رہا تھا تو ایک بزرگ جن کی عمر اسّی سال سے متجاوز تھی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دارالمطالعہ میں داخل ہوئے اور میرے بالمقابل میز پر بیٹھ گئے۔ دارالمطالعہ کے انچارج نے ایک مخطوطہ لاکر ان کے سامنے رکھ دیا اور وہ بزرگ اس کے مطالعہ میں محو ہو گئے۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ بزرگ پروفیسر حسن عسکری ہوں گے۔ میں نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے ایک نوجوان سے ان کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ وہ واقعی پروفیسر حسن عسکری ہیں۔ میں فوراً ان کے پاس گیا اور اپنا نام بتایا اور یہ بھی بتایا کہ میں ان کے ایک شاگرد عباس بن عبدالقادر کا شاگرد ہوں۔ انھوں نے فوراً عباس صاحب کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے عرض کیا کہ انھیں ایک طالب علم نے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ پروفیسر صاحب نے فوراً پوچھا کہ وہ مرتے وقت بھی قادیانی ہی تھا؟ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ عباس صاحب کی پھوپھی آنجہانی سارہ زوجہ مرزا بشیر الدین محمود، مرزا رفیع احمد کی ماں تھی۔

پروفیسر حسن عسکری ہر روز لائبریری میں تشریف لاتے اور بڑی شفقت سے پیش آتے۔ ان کے توسط سے ایک آسٹریلوی نوجوان فادر پال جیکسن سے ملاقات ہوئی۔ یہ نوجوان پٹنہ کے ایک مشن اسکول (سینٹ ژیویر) میں پڑھاتا ہے اور اردو بڑی روانی سے بولتا ہے۔ اس نے حضرت مخدوم شرف الدین یحیٰی منیری کے مکتوبات صدی کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے جو امریکہ میں چھپا ہے۔ ان دنوں وہ مخدوم صاحب کے ملفوظات، خوان پُر نعمت کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے تھے۔ میں نے بھی اس مخطوطہ کی زیارت کی۔ بلکہ ایک مطبوعہ نسخہ بھی مل گیا جو مطبع احمدی پٹنہ میں ۱۳۰۱ھ میں طبع ہوا تھا۔ اسی لائبریری میں مخدوم صاحب کے ملفوظات ''معدن المعانی'' کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا۔ ان کی اہمیت پر الحق میں میرا ایک مقالہ طبع ہو چکا ہے(۶)۔

خدا بخش لائبریری میں حضرت محی الدین چشتی فخری المتخلص بہ محمدی ساکن سنگرمن مضافات راولپنڈی کے ملفوظات احسن المجالس کا ایک نادر مخطوطہ محفوظ ہے(۷)۔ نواح

راولپنڈی کے کسی ریسرچ اسکالر کو اس تصنیف کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا چاہیے۔

میں مطالعہ میں مصروف تھا کہ ایک صاحب چائے کا ایک گلاس لے کر آئے۔ میرے استفسار پر انھوں نے بتایا کہ یہ چائے آغا صاحب نے بھیجی ہے۔ ساڑھے بارہ بجے آغا صاحب خود تشریف لائے۔ اور دوپہر کا کھانا اپنے ساتھ کھلانے پر اصرار کیا۔ ڈیڑھ بجے میں ان کے ساتھ کھانے کے لیے گیا اور لائبریری کے ایک کمرے میں نماز ظہر ادا کی۔ اور دوبارہ مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔

چھ بجے لائبریری بند ہوئی تو میں اپنی قیام گاہ پر واپس آیا۔ نماز عصر کے بعد تھوڑی دیر آرام کیا۔ مغرب کے وقت بارش شروع ہو گئی اس لیے میں باہر نہ جا سکا۔

اگلے روز صبح نو بجے لائبریری پہنچا۔ آغا صاحب سے مل کر دارالمطالعہ میں آیا اور شیخ پھول شطاری کی تصنیف بحرالانوار منگائی (۸)۔ یہ مختصر سا رسالہ شطاری سلوک پر ایک اہم تصنیف ہے۔ فاضل مصنف شیخ محمد غوث گوالیری کے بھائی اور ہمایوں بادشاہ کے مرشد تھے۔ ہمایوں کے ایک باغی بھائی مرزا ہندال نے انھیں دعوت کے بہانے محل میں بلا کر قتل کرا دیا۔

تاریخ بناکتی مصنفۂ ابوسلیمان داؤد المعروف بہ فخر بناکتی (۹)۔ تاریخ ابوالخیر خانی مصنفہ حافظ البخاری (۱۰)، مخلص بادشاہ نامہ (۱۱) از محمد طاہر آشنا اور صبح صادق مصنفہ صادق بن محمد صالح اصفہانی (۱۲) کی زیارت لندن میں کی تھی۔ اب دوبارہ انھیں دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اخبار الاصفیاء کا مخطوطہ بھی انڈیا آفس لائبریری لندن میں دیکھا تھا۔ اب دوبارہ اس لائبریری میں اس کی زیارت کی (۱۳)

شیخ علی حزیں (متوفی ۱۱۸۰ھ) کی جتنی تصانیف خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہیں اتنی شاید ہی کہیں ہوں۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں ان سے استفادہ کرتا۔

اس روز دوبارہ آغا صاحب نے اصرار کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھلایا۔ میں نے ان سے کہا کہ بہت تواضع ہو چکی ہے اب سہ بارہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ لائبریری کے عجائب خانہ میں چند اہم نوادرات نمائش کی غرض سے رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک خط بھارت کے

آنجہانی صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد کا ہے۔ یہ خط اردو میں لکھا ہوا ہے۔ اس لیے یہاں اس پورا متن دے رہا ہوں۔

بمقام بھاگلپور۔ ۱۹ر مئی ۱۹۴۲ء

مکرمی تسلیم! اتحاد کا پرچہ ملا مجھ سے جو کچھ ہوسکتا ہے میں کرر ہا ہوں۔ اس وقت لوگوں میں ہمت لانے کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایسے نظام کی جوان کے مصیبت کے وقت کام آوے۔ اس بنیاد پر میں زوروں سے دورہ کر کے لوگوں کو آمادہ ہونے کو کہہ رہا ہوں۔ امید ہے کہ سب لوگوں کا خیال مبذول ہوگا۔ اور وقت کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش میں سب کامیاب ہوں گے۔

نیازمند: راجندر پرشاد

ڈاکٹر راجندر پرشاد کا خط منشیانہ تھا اور اس خط میں عربی و فارسی کے الفاظ قابل غور ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر نے بیجاپور جیل سے ایک غزل لکھ کر کسی دوست کو بھیجی تھی۔ یہ پوری غزل ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک شوکیس میں موجود ہے۔ اس غزل کا مطلع ومقطع یوں ہے:

بے خوف غیر دل کی اگر ترجماں نہ ہو   بہتر ہے اس سے یہ کہ سرے سے زباں نہ ہو
جوہر اس ایک دل کے لیے اتنے مشغلے   کی ہے خدا کی چاہ تو عشق بتاں نہ ہو

ایک شوکیس میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ۲۵ر دسمبر ۱۹۰۶ء کا تحریر کردہ ایک خط رکھا ہوا ہے۔ ان دنوں مولانا کسی اخبار کے عملہ میں شامل تھے۔ مولانا نے مالک اخبار سے ایک ماہ کی پیشگی تنخواہ کا مطالبہ کیا تھا۔ راقم کے پاس اس خط کا عکس موجود ہے۔

اگلے روز آغا صاحب نے لائبریری کے ہال میں نماز مغرب کے بعد ملفوظات لٹریچر کی اہمیت کے موضوع پر میرا لیکچر رکھ دیا۔ پٹنہ یونیورسٹی اور مدرسۂ شمس الہدیٰ میں اس کی اطلاع کردی۔ آغا صاحب کی فرمائش پر فادر پال جیکسن نے اس تقریب کی صدارت کی اور صدارتی

خطبہ بھی دیا۔

لیکچر کے بعد آغا صاحب نے چیدہ چیدہ مہمانوں کو اپنے گھر چائے کی دعوت دی۔

اس لیکچر کا چرچا اگلے روز علمی حلقوں میں ہوا۔ میں لائبریری میں مصروف مطالعہ تھا کہ پٹنہ یونیورسٹی کے فارسی کے پروفیسر خواجہ افضل امام تشریف لائے اور اپنی ایک تالیف ''دیوان فائز'' عنایت کی۔ سید حسن پٹنہ یونیورسٹی کے فارسی کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔ انھوں نے دیوان صائن ہروی مرتب کیا ہے۔ موصوف نے میرا لیکچر تو نہیں سنا لیکن لوگوں سے اس کا چرچا ضرور سنا تو مبارک باد دینے آئے۔ میرے پاس دیوان صائن کا ایک نسخہ موجود تھا جو مجھے ڈاکٹر نذیر احمد صاحب، صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی نے عطا کیا تھا۔ میں نے سید حسن صاحب سے ایک کاغذ پر دستخط کرا لیے اور لاہور آ کر اس دیوان پر اسے چپکا دیا۔

اگلے دن میں وقت نکال کر یونیورسٹی گیا۔ شعبۂ تاریخ میں ڈاکٹر قیام الدین احمد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کی تصنیف ''ہندوستان میں وہابی تحریک'' کراچی سے طبع ہو چکی ہے۔ موصوف کا نسبی تعلق علماء صادق پور سے ہے۔ جنھوں نے صدق دلی کے ساتھ حضرت سید احمد بریلویؒ کا ساتھ دیا تھا۔ اسی روز شام کو وقت مدرسہ شمس الہدیٰ میں ایک نشست کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس مدرسہ میں قدیم اور جدید دونوں طرح کے علم پڑھائے جاتے ہیں۔ عصر اور مغرب کی نمازیں مدرسے کی مسجد میں ادا کیں۔ مسجد کے ایک گوشے میں جسٹس شمس الہدیٰ کی قبر ہے۔ ایک استاد نے مجھے بتایا کہ جج صاحب ایک بار کسی گاؤں میں اپنے کسی عزیز کی نماز جنازہ میں شرکت کی غرض سے گئے۔ اتفاق سے وہاں کسی کو بھی نماز جنازہ یاد نہ تھی۔ جج صاحب نے مسلمانوں کی دین سے یہ غفلت دیکھ کر مدرسہ قائم کیا۔ تاکہ مسلمان طلبہ جدید علوم کے ساتھ علوم اسلامیہ اور مسائل شریعت سے بھی واقفیت حاصل کر سکیں۔ مدرسہ شمس الہدیٰ کا شمار بہار کے عظیم مدارس میں ہوتا ہے۔ ہمارے فاضل دوست پروفیسر مختار الدین آرزو صاحب (۱۴) کے والد بزرگوار ملک العلماء ظفر الدین بہاری صاحب ''صحیح بہاری'' بھی اس مدرسہ کے پرنسپل رہ چکے ہیں۔

پٹنہ میں قیام کے آخری دن میں وقت نکال کر پھلواری شریف گیا۔ یہ علمی اور روحانی بستی پٹنہ سے چار پانچ میل دور ہوگی۔ پٹنہ ریلوے اسٹیشن سے بسیں اور یکے پھلواری شریف تک آتے جاتے رہتے ہیں۔

جس وقت میں پھلواری پہنچا تو ہر طرف کیچڑ ہو رہا تھا۔ گلیوں اور بازاروں سے گذرنا مشکل تھا۔ میں پوچھتے پوچھتے خانقاہ سلیمانیہ پہنچا۔ لیکن اب وہاں کون تھا؟ شاہ غلام حسنین فوت ہو چکے تھے۔ ان کے فرزند ریحان شاہ کراچی منتقل ہو چکے تھے۔ شاہ غلام حسنین کی بیوہ اور ایک بیٹی اب تک وہیں ہیں۔ شاہ سلیمان اور جعفر شاہ پھلواروی کی جمع کردہ کتابیں دیمک کی نذر ہو رہی ہیں۔ پھلواری کے ہر پڑھے لکھے شخص کو ان کتابوں کی تلفی کا رنج تھا۔

شاہ سلیمان اور ان کے جانشین شاہ غلام حسنین بستی کے مشرقی کنارے پر سنگی مسجد کے صحن میں مدفون ہیں۔ اس مسجد کو یہ شرف حاصل ہے کہ جب سید احمد بریلویؒ پھلواری تشریف لائے تو ان کا قیام اسی مسجد میں تھا۔ مسجد کی دیواروں پر ایسے پتھر نصب ہیں جن پر آیات قرآنی منقوش ہیں۔

شاہ سلیمان ۲۷ر صفر ۱۳۵۴ھ بمطابق ۳۱ر مئی ۱۹۳۵ء کو فوت ہوئے۔ ان کا مزار ان کے ایک مرید ساکن جہلم نے تعمیر کرایا تھا۔ شاہ غلام حسنین نے ان کے سوانح حیات خاتم سلیمانی کے نام سے قلم بند کیے تھے۔ شاہ صاحب کو حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی (۱۵)، سید الطائفہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور اپنے سسر شاہ محمد علی حبیب ابونصر سے فیض ملا تھا۔ ان کے اساتذہ میں میاں نذیر حسین محدث دہلوی، جناب احمد علی سہارنپوری اور مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی جیسے بزرگ قابل ذکر ہیں۔

پھلواری شریف کی شہرت خانقاہ مجیبیہ کی وجہ سے ہے۔ خانقاہ سے متعلق ایک مدرسہ بھی ہے۔ جہاں مقامی اور بیرونی طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔ ایک پرانی طرز کی مسجد اور اس سے ملحق ایک گنبد قابل دید ہیں۔ اس گنبد میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا موئے مبارک رکھا ہوا ہے۔ جس کی خاص خاص موقعوں پر زیارت کرائی جاتی ہے۔ خانقاہ مجیبیہ کی مسجد کے دروازے پر

یہ عبارت کندہ ہے:

''بسم اللہ الرحمن الرحیم

بعد صد سال گشت چوں پختہ	مسجد خانقاہ بایں ترتیب
سال او گفت ہاتفی از حق	مسجد خانقاہ پیر مجیب''

۱۲۳۹ھ

خانقاہ سے چند قدم کے فاصلہ پر شاہ محمد مجیب کی درگاہ ہے۔ شاہ صاحب اور ان کی اہلیہ ایک گنبد کے نیچے محو خواب ابدی ہیں۔ ان کی لوح مزار پر یہ عبارت درج ہے:

''عشقم آنست کز نام و نشانم باقیست
گرچہ فانی شدہ ام ذکر و بیانم باقیست''

شاہ محمد مجیب، اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں ۱۰۹۸ھ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے سید محمد وارث رسولنما بنارسی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اور روحانیت کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہوئے ان کا انتقال ۱۱۹۱ھ میں ۹۳ برس کی عمر میں ہوا۔ شاہ محمد نورالحق مجیبی تپاں نے ان کی تاریخ وفات کہی ہے جو درگاہ شریف کے ایک پتھر پر کندہ ہے۔

نوشت از خط نور ایں دو کلمہ را رضوان	بسال رحلت شیخ زمان بباب بہشت
ز بخت تیرہ شکایت مکن تپاں زنہار	کہ مہر روئے مجیب است آفتاب بہشت

۱۱۹۸ھ

حضرت شاہ محمد مجیب کی درگاہ سے متصل ایک دالان کے اندر کئی قبریں ہیں ان میں سے شاہ محمد جعفر پھلواروی کے نانا ابونصر محمد علی حبیب (متوفی ۱۲۹۵ھ) ان کے فرزند شاہ محمد عبدالحق اور شاہ محمد شعیب کی قبریں خاص طور پر نمایاں ہیں۔ ابونصر صاحب کی قبر کے سرہانے جو کتبہ نصب ہے وہ بدرالدین قادری صاحب کا نتیجۂ فکر ہے۔ اس پر یہ عبارت کندہ ہے۔

چوں بفردوس رفت مرشد ما	از تپ ہجر اوست دل بریاں
سن میلاد و جانشینی و عمر	با وصلالش کنم بخلق بیاں

شدہ شمس الضحیٰ سن میلاد　　وارث ثانی جانشینی داں
۱۲۴۹ھ　　۱۲۶۸ھ
وصل او شد بعین ذات نبی　　عدد عمر آں ولی بر خواں
۱۲۹۵ھ　　۴۶

ابونصر محمد علی حبیب کے فرزند شاہ عبدالحق کی قبر کے سرہانے دیوار پر ایک پتھر نصب ہے جس پر یہ اشعار کندہ ہیں۔

عبدالحق ست پور محمد علی حبیب　　خاک درش بمردم چشانم آرزوست
آں عبد نیک ہر نفس از روح پاک نصر　　گفتے کہ سیر گلشن عرفانم آرزوست
بعد از حصول علم چو شد سالک طریق　　گفت از رسول سایہ دامانم آرزوست
آمد چو زیر سایۂ داماں مصطفےٰ　　گفتا کہ وصل خالق ایمانم آرزوست
حیرتؔ چو وقت وصل خدا شد قریب تر　　می گفت از خدا کہ یک ارمانم آرزوست
آیند چار یار و رسولم بوقت نزع　　از ابتدا بدیدہ حیرانم آرزوست
حیرتؔ عجب مکن کہ بقول جناب نصر　　بہر وصال آنہمہ سامانم آرزوست
۱۳۰۲ھ

(نتیجہ فکر مولوی کبیر احمد حیرتؔ پھلواروی)

درگاہ پیرمجیب سے نکل کر میں امارت شرعیہ صوبہ بہار کا دفتر دیکھنے گیا وہاں قاضی مجاہد الاسلام صاحب سے ملاقات ہوئی گذشتہ سال دیوبند کے جشن صد سالہ پران سے تعارف ہوا تھا ان کے پاس نقیب کا ایک شمارہ پڑا تھا اس میں میرا بھی ایک مضمون تھا۔ قاضی صاحب نے مجھے رُکنے کو کہا۔ ان کی عدالت میں خلع کا ایک مقدمہ پیش ہونے والا تھا۔ قاضی صاحب نے مقدمہ کی کاروائی دیکھنے کے لیے کہا۔ مگر میں نے عدم فرصت کا عذر پیش کیا اور پٹنہ روانہ ہو گیا۔

آغا صاحب نے مجھے رخصت کرتے ہوئے خدا بخش لائبریری میں محفوظ عربی و فارسی اور اردو مخطوطات کی مکمل فہرست عنایت فرمائی اور خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے جرنل کا

مکمل سیٹ بھی دیا۔ میں پٹنہ میں شاد عظیم آبادی کی قبر اور خانقاہ عمادیہ دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن بارش کی وجہ سے وہاں نہ جاسکا۔ ۲۷؍ اگست کی شام کو میں سون بھدر ایکسپریس میں سوار ہو کر اگلے روز صبح ۹ بجے علی گڑھ پہنچ گیا۔

☆☆

حواشی:

(۱) مخطوطہ فارسی نمبر ۲۰۷۵۔
(۲) بابت ماہ ستمبر ۱۹۸۲ء۔
(۳) سیرت فیروز شاہی مخطوطہ فارسی نمبر ۹۹۔
(۴) مخطوطہ فارسی نمبر ۲۴۴۹۔
(۵) بابت ماہ اکتوبر ۱۹۸۲ء۔
(۶) ایضاً
(۷) مخطوطہ فارسی نمبر ۱۸۳۱۔
(۸) ایضاً نمبر ۲۹۹۲۔
(۹) ایضاً نمبر ۲۔
(۱۰) ایضاً نمبر ۱۔
(۱۱) ایضاً نمبر ۱۲۳۔
(۱۲) ایضاً نمبر ۲۲۔
(۱۳) ایضاً نمبر ۱۸۷۔
(۱۴) صدر شعبہ عربی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔
(۱۵) شاہ صاحب کے نام میں رحمٰن بغیر الف لام کے ہے۔

☆☆

(الحق۔ دسمبر ۱۹۸۲ء)

قاسم خورشید

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری

اس شہر کی اپنی ایک الگ روایت ہے۔ جب ہم ماضی کی طرف دیکھتے ہیں۔ بہت سی تصویریں ذہن کے اُفق پر نمودار ہو جاتی ہیں۔ گنگا ندی کے کنارے بسا ہوا یہ شہر اپنے اندر ایک کائنات سمیٹے ہوئے ادب کا مرکز رہا ہے۔ یہاں بہت سی ادبی شخصیتوں نے جنم لیا ہے۔ آج بھی یہاں کی فضا میں ادبی رنگ غالب ہے جسے ہم اس چھوٹے سے دائرے میں محدود نہیں رکھ سکتے۔ اس لیے کہ ایک طرف یہ گہوارۂ ادب رہا تو دوسری طرف ہندوستان کی تاریخ میں بھی اہم رول ادا کرتا رہا ہے۔ میرا اشارہ عظیم آباد کی طرف ہے جسے آج دنیا پٹنہ کے نام سے جانتی ہے۔

آج پٹنہ بہت ترقی کر چکا ہے۔ وہ جگہ جہاں صرف اشجار کے سائے تھے۔ آج نئی عمارتیں تعمیر ہو چکی ہیں۔ لیکن پرانی قدریں ان عمارتوں میں دفن نہیں ہوئی ہیں۔ آپ اس پُرشکوہ عمارت کو دیکھ رہے ہیں۔ دنیا اسے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے نام سے جانتی ہے۔ جہاں سے علم کا چشمہ جاری ہے اور تشنگانِ ادب اپنی پیاس بجھا رہے ہیں۔

علم کو دیکھو کہ ایجادیں لیے آتا ہے ساتھ
ہند میں منزل بہ منزل کارواں در کارواں

اے خدا بخش اے مرے خان بہادر آفریں
تیری ہمت پر کہ ہے ممنون جس کا اک جہاں

یہی ہے وہ لائبریری جسے خدا بخش نے پوری محنت اور لگن کے ساتھ قائم کیا تھا۔ آیئے ہم اس لائبریری میں داخل ہوں۔

آیئے بتائیں یہ لائبریری کس طرح وجود میں آئی؟

عظیم آباد کے مسلم رہنماؤں میں خدا بخش خاں کے والد محمد بخش خاں کو امتیازی

حیثیت حاصل تھی۔ انھیں قلمی کتابوں کے جمع کرنے کا غیر معمولی شوق تھا۔ ان کا اپنا خاندانی کتب خانہ تھا۔ انھوں نے اپنے لائق فرزند کو یہ وصیت کی تھی کہ اس کتاب خانہ کو ترقی دے کر کوشش یہ کی جائے کہ دوسرے لوگ بھی اس سے فائدہ حاصل کرسکیں۔

اس وقت علمی کتابوں کی تعداد پندرہ سو تھی اور جب سنہ ۱۸۸۱ میں ان مخطوطات کی تعداد ۳۰۰۰ ہوگئی تو ایک ماہر مخطوطات نے اس کی قیمت تقریباً ڈھائی لاکھ روپے لگائی۔

اس کے علاوہ مطبوعات کا ذخیرہ بھی فراہم کیا گیا۔ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کے اتنے مطبوعات جمع کیے گئے کہ اس وقت ان کی قیمت ایک لاکھ روپے لگائی گئی پھر ان تمام مطبوعات و مخطوطات کے لیے اسی ہزار روپے میں ایک شاندار عمارت بنائی گئی۔ یہ کام ایک وقف خانہ کی جانب سے حکومت کی سرپرستی میں ہو رہا تھا۔

یہ کتب خانہ ۲۹ ؍اکتوبر سنہ ۱۸۹۱ء کو قوم و ملک کے حوالہ کیا گیا۔

اس لائبریری کا نام اورینٹل لائبریری ہے۔ میں نے سنا ہے کہ بانی کتب خانہ یعنی خدابخش خاں کے نام سے یہ لائبریری قائم ہونے لگی تو انھیں اس میں اپنے نام کی آمیزش پسند نہ آئی اور انھوں نے اس کا نام صرف اورینٹل پبلک لائبریری رکھا۔

انھیں صرف اس بات کی دُھن تھی کہ کتب خانہ قائم ہو۔ انھیں کتب خانہ قائم کرنے یا کتابیں جمع کرنے کا شوق اپنے والدمحترم سے بھی زیادہ تھا۔ رفتہ رفتہ ان کے اس شوق نے جنون کی شکل اختیار کرلی اور یہ لائبریری وجود میں آئی۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ انھوں نے اپنی ساری کائنات اور زندگی بھر کی کمائی بھی اسی لائبریری کی نذر کردی۔

خدابخش خاں نے کتابیں کس طرح جمع کیں؟

یہ ایک لمبی داستان ہے۔ لیکن مختصراً اتنا کہا جاسکتا ہے کہ غدر کے زمانے میں رامپور کے نواب نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ اسی دوران انگریزی فوج میں اعلان کردیا کہ جو سپاہی کتابیں لاکر دے گا اسے اس کی اچھی قیمت دی جائے گی۔ حالانکہ ان دنوں خدابخش خاں کتابیں جمع کرنے میں اس قدر دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کررہے تھے۔ لیکن ایسا ہوا کہ نواب رامپور

سے ان کی رقابت ایک عرصہ تک جاری رہی ان کی رقابت سے انھیں کافی فائدہ ہوا۔ پٹنہ میں ان کی ملاقات کچھ ایسے لوگوں سے بھی ہوئی جن سے اس سلسلے میں مدد مل سکی۔ خدابخش خاں نے اچھی قیمت دے کر قلمی نسخے خریدنے شروع کیے۔ کہا جاتا ہے کہ بعد میں قلمی کتب فروش جوق در جوق ان کی طرف مائل ہونے لگے۔ اس دوران جو بھی کتب فروش پٹنہ آتا اسے ریلوے کرایہ دیے بنا واپس نہیں بھیجتے تھے۔ یہ کتب فروش تو ملک کے گوشے گوشے سے آتے اور میرے خیال میں ایسی ہی ان کی شہرت بڑھتی گئی۔

یہ جو سامنے والی عمارت نظر آرہی ہے پہلے دو منزلہ تھی۔ زلزلے میں تباہ ہونے کی وجہ سے اب صرف ایک منزل ہی رہ گئی ہے لیکن بغل میں بھی دو عمارتیں نظر آرہی ہیں۔ اس جگہ کرزن ریڈنگ ہال کندہ ہے۔

خدابخش خاں کے تعلقات پٹنہ کے مسٹر کیمپ بل سے کافی اچھے تھے۔ ایک بار انھیں کے توسط سے سر چارلس لائل نے کتب خانہ کا معائنہ فرمایا۔ سر چارلس لائل اردو فارسی کے زبردست عالم تھے۔ کتب خانہ کے بیش بہا نوادر کو دیکھنے کے بعد انھوں نے حکومت بنگالہ کی سرپرستی میں ۱۸۹۱ء میں ملک کے کتب خانہ کا باضابطہ افتتاح کیا۔ بعد میں دوسرے انگریز افسران بھی آتے رہے اور اس کی تعمیر و ترقی کے لیے کام کرتے رہے اور جب ہندوستان کے مشہور و معروف وائسرائے لارڈ کرزن معائنہ کے لیے یہاں آئے تو انھوں نے لائبریری میں قدم رکھتے ہی کہا

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

اور اس معائنہ کی یاد میں لارڈ کرزن ریڈنگ ہال وجود میں آیا۔

دیکھیے دروازہ کھل رہا ہے۔ لوگ لائبریری میں داخل ہو رہے ہیں تو آیئے ہم بھی......

ہاں کیوں نہیں۔

یہ لارڈ کرزن ہال کا اندرونی حصہ ہے۔
یہاں لوگ بیٹھ کر مطالعہ کرتے ہیں۔
اچھا...... بغل والے حصہ میں کوئی نہیں جاتا
ہاں جاتا کیوں نہیں۔ لیکن ہم وہاں مطالعے کی غرض سے نہیں جاتے بلکہ وہاں لائبریری کے ڈائرکٹر بیٹھتے ہیں۔
اس عمارت کو دیکھیے جو لوگ ریسرچ وغیرہ کی غرض سے آتے ہیں وہ یہیں مطالعہ کرتے ہیں۔
اچھا کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ قومی نقطۂ نظر سے اس کتب خانے کی کیا اہمیت ہے۔
آپ کو یہ اچھی طرح معلوم ہوگا کہ یورپین سیاح جہاں کہیں بھی جاتے ہیں اپنے قومی میوزیم اور لائبریری کے لیے نادر مخطوطات اور دلربا تصویریں حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں بھی سیاح آتے ہیں اور اب تو حالت یہ ہے کہ ان کی لائبریریوں کی بہت سی چیزیں ہمارے یہاں موجود ہیں۔ اور یہاں سے بھی ان کے یہاں بہت سی چیزیں گئی ہیں۔ اس طرح بوڈلین لائبریری، برٹش لائبریری، انڈیا آفس لائبریری اور یورپ کے دوسرے قومی اداروں میں ایک بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے۔ یہ کتب خانہ مغرب کی تاسیس سے بڑی حد تک ہماری ضرورت رفع کرتا ہے۔
یہ دیکھیے شوکیس میں رکھی کتابیں، دیواروں پر ٹنگی تصویریں اور الماریوں میں رکھی ہوئی برٹش اور مغلوں کے عہد حکومت کی چند کمیاب اور نایاب چیزیں۔ صرف ایک انچ کا قرآن شریف جسے قاسم حسین نے اس لائبریری کے لیے دیا تھا ـــــ یہ خنجر اورنگ زیب کے زمانے کا معلوم ہوتا ہے ـــــ اور یہاں جو سکّے ہیں جاپانی، یہ چینی اور یہ پاکستانی سکّے...... آیئے ہم آپ کو مغلوں کے دور کا آرٹ دکھاتے ہیں۔ اس تصویر کو دیکھیے، یہاں اکبر کا دربار ہے، یہ ہے راجپوت آرٹ، رام لکشمن اور ہنومان والا......
یہ رابندر ناتھ ٹیگور کی تحریر ہے ـــــ اس تصویر کو دیکھیے۔ روسی آرٹسٹوں نے مغل

آرٹ بنا کر یہاں بھیجا ہے — یہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کا خط سلطان احمد کے نام۔
یہاں جو نئی کتابیں آتی ہیں انھیں پہلے اس شوکیس میں ہی رکھا جاتا ہے
جی ہاں — یہ جو آلہ دیکھ رہے ہیں اس سے علم نجوم کی واقفیت حاصل کی جاتی تھی۔
یہاں جو طشتری رکھی ہوئی ہے۔ اسے لوگ زہریلی طشتری کہتے ہیں۔ مغلوں کے زمانے میں اس سے یہ کام لیا جاتا تھا کہ اگر کھانے میں زہر کی ملاوٹ کا پتہ لگانا ہوتا تھا تو اس طشتری میں رکھ کر بہ آسانی اس کا پتہ لگایا جاتا تھا — یہ بیرم خاں کا خنجر ہے — اور یہ اسی دور کا بات ہے — یہ نادر شاہ کی تلوار ہے — یہ تمام چیزیں اس لائبریری کو کس طرح حاصل ہوئیں؟
باہری ممالک سے جو لوگ یہاں آئے وہ تحفتاً یہ چیزیں دے جاتے تھے اور اکثر ہماری چیزیں بھی لے جاتے تھے۔
یہ دیکھیے لوگ مطالعہ میں مصروف ہیں۔ چاروں طرف الماریاں رکھی ہیں۔ ان میں کتابیں سجی ہیں۔
پاس کے دو کمرے مقفل ہیں — ان دو کمروں میں عربی فارسی کے مخطوطات ہیں۔
کچھ غیر ملکی لوگ بھی نظر آ رہے ہیں — یہ یہاں ریسرچ کی غرض سے آئے ہیں؛
آپ انھیں دیکھیے جو بے حد ضعیف ہیں — تاریخ کے بہت بڑے عالم ہیں۔ دنیا انھیں پروفیسر حسن عسکری کے نام سے جانتی ہے۔ یہ روزانہ یہاں تشریف لاتے ہیں اور مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں۔ پتہ نہیں کون سی کشش انھیں یہاں کھینچ کر لے آتی ہے۔
اب ہمیں یہاں سے آگے بڑھنا چاہیے۔
ہاں۔ وقت کم ہے اور ہمیں جلد ہی اس لائبریری کے ہر گوشے میں پہنچنا ہے۔
لائبریری کے اراکین سے انٹرویو کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ عربی مخطوطات میں قرآن شریف کے نہایت ہی بیش بہا نسخے یہاں موجود ہیں، چوتھی صدی ہجری کا قلمی نسخہ جس میں اعراب کے لیے ''سرخ'' نقطے استعمال کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد بہ لحاظ قدامت تحریر علاء الدین کے ہاتھ کا دیدہ زیب مصحف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ابن بوّا اب اس خط نسخ کا

موجود تھا۔ اس نے خطاطی کے فن کو آگے بڑھایا۔ موجودہ مصحف سنہ ۶۶۹ھ کا لکھا ہوا ہے۔ میر علی تبریزی کے ہاتھ کا ایک مصحف جو سنہ ۹۸۲ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اچھا یہ دیکھیے پہلے لائبریری کے سامنے ایک چمن تھا۔ چونکہ کتابوں کی تعداد دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔ اس لیے یہاں نئی عمارت تعمیر کی جا رہی ہے۔ سنہ ۱۹۳۴ء کے سیلاب میں جیسا کہ میں نے بتایا بھی تھا کہ یہ لائبریری تباہ ہوگئی تھی۔ خاص طور سے مسٹر صلاح الدین کی کافی کتابیں اس سیلاب کی نذر ہوگئیں۔

بانی کتاب خانہ کی وفات کے وقت عربی و فارسی کے مخطوطات کی تعداد ۵ ہزار تھی۔

عظیم آباد کے مسلم رہنماؤں میں ان دنوں خدا بخش خاں کے علاوہ اور جو شخصیتیں سامنے آئیں ان کے اسمائے گرامی قاضی رضا حسین اور مولوی محمد حسین ہیں جن کو امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ جہاں تک میں جانتا ہوں۔

یہ کافی اچھا انتظام ہے۔

کون سا......؟

یہاں جو تجیشن باکس اور کمپلین باکس رکھا ہے۔

خدا بخش خاں کی تحریر کردہ کوئی کتاب اس لائبریری میں ہے یا نہیں۔

ایک کتاب جو بہت مشہور ہوئی اس لیے میرے ذہن میں بھی محفوظ ہے ''محبوب الالباب'' یہ فارسی تصنیف ہے جس پر انھیں بے حد ناز تھا اور انھوں نے لارڈ بیکن کے مضامین کا انگریزی ترجمہ بھی پیش کیا تھا۔

اچھا اس لائبریری کے بارے میں خدا بخش خاں نے بھی کچھ کہا ہے۔

جی ہاں! یہ لائبریری قائم ہوئی تو انھوں نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا تھا کہ'' یہ کتب خانہ ان قلمی کتابوں کا مجموعہ ہے جو اس ملک میں مل سکتی ہیں۔ میں اپنے کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ اس کتب خانہ میں بعض قلمی کتابیں علم طبیعات اور ریاضی کے اگلے مصنفوں کی تصنیفیں ہیں''۔ اور انھوں نے ایک اور قابل ذکر بات یہ کہی کہ ہندوستان میں چند کتب خانے جن میں عمدہ عمدہ کتابیں

تھیں مگر ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد یہ کتب خانے غائب ہوگئے۔

اس وقت مسلمانوں کی حالت میں بھی کافی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں ـــــ ان کی تبدیلیوں نے بھی قلمی کتابوں کو سخت ضرر پہنچایا تھا۔ غربت اور اس سے بڑھ کر جہالت نے یہ دن دکھلایا کہ کتابیں کیڑوں کو کھلا دی گئیں۔ یا غیر ملک والوں کے ہاتھ بیچ دی گئیں۔ پھر انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ہندوستان میں جہاں تک میرا علم ہے کوئی کتب خانہ اس جامعیت کا نہیں ہے جو قاہرہ یا مدینہ کے کتب خانوں کے مقابلہ میں خیال کیا جا سکے۔

اچھا یہ مزار یں؟

ہاں! یہ خدا بخش خاں، ان کے بھتیجے اور بیٹوں کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ خدا بخش خاں مرحوم راسخ العقیدہ اور پابند شریعت مسلمان تھے۔ ان کی پنجگانہ نمازیں کبھی فوت نہیں ہوئیں۔ ان کے اندر اسلام کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ہم ان کے مزار کے پاس کھڑے ہیں اور ماضی کا دریچہ دھیرے دھیرے کھل رہا ہے۔ جب عظیم آباد کی ادبی سرگرمیاں اپنے شباب پر تھیں اور یہاں کے علم وفن پر یہ زمین ناز کرتی تھی۔ یادیں آج بھی سینے میں انگڑائیاں لے رہی ہیں اور فضا میں کسی کے کچھ گنگنانے کی آواز صاف سنائی دے رہی ہے۔

تو نے اور تیرے بزرگوں نے لگایا تھا جو باغ — ہو گیا وہ باغ اب شبیہ باغ بے خزاں
گو کہ سرچشمہ ہے یہ لیکن توقع ہے ہمیں — ایک دن ہوگا اسی سرچشمہ سے دریا رواں

☆☆☆

(آواز۔ اکتوبر ۱۹۸۲ء)

علم وادب کا تاج محل

خدا بخش لائبریری

عالمگیر شہرت کا مشرقی کتب خانہ جو خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے نام سے مشہور ہے، بہار کے ایک خوش نصیب مردخود آگاہ اور پٹنہ کے مشہور ومعروف اور کامیاب وکیل مولوی خدابخش خاں نے قائم کیا تھا تا کہ تشنگان علم وادب اپنی پیاس بجھا سکیں۔

خدابخش خاں مرحوم چھپرہ ضلع سارن میں ۲راگست ۱۸۴۲ءکو پیدا ہوئے۔ان کے والد مولوی محمد بخش خاں بھی علم و ادب کے رسیا تھے۔انھیں دونوں بزرگوں کی خداداد ذہنی صلاحیتوں سے اور ذوق وشوق سے یہ کتب خانہ عالم وجود میں آیا۔

مولوی خدابخش خاں ابتدائی تعلیم کے بعد پٹنہ ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔پھر کچھ دنوں کے بعد کلکتہ یونی ورسٹی سے ۱۸۶۱ء میں بدرجۂ اول انٹرنس کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔اپنی ابتدائی زندگی انھوں نے پیشکار کی حیثیت سے شروع کی۔کلکتہ سے واپسی کے بعد قانون کا امتحان بھی پاس کر چکے تھے۔بعد کوڈپٹی انسپکٹر اسکول بھی رہے۔

انھوں نے ملازمتیں بھی کیں لیکن ان کے ذہن وافکار کے چوکھٹے میں یہ ملازمتیں کچھ مناسبت نہیں رکھتی تھیں۔آخرکار ان سب کو ترک کر کے ۱۸۶۸ء میں باضابطہ طور پر وکالت شروع کردی۔قدرت فیاض نے ایک ایسا وقت بھی دکھلایا کہ وہ پٹنہ کے بہت کامیاب سول وکیلوں میں شمار ہونے لگے۔غیر معمولی ذہین تھے۔حافظہ بہت اچھا تھا اور قانون پر بھی عبور تھا۔

جب حکومت مقامی یعنی لوکل سلف گورنمنٹ کا وجود عمل میں آیا تو خدابخش خاں پٹنہ میونسپلٹی کے وائس چیئرمین ہوئے۔اسی طرح ڈسٹرکٹ بورڈ سے وابستہ رہے اور ۱۸۸۰ء میں سرکاری وکیل مقرر ہوئے۔اسی سال سوشل خدمات کے اعتراف میں ''خان بہادر'' کے اعلا

خطاب سے نوازے گئے۔

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کی ۱۸۹۱ء میں بنیاد رکھی گئی۔ مولوی خدا بخش خاں اپنی قانونی صلاحیتوں کی وجہ سے حیدر آباد دکن کی عدالت العالیہ کے میر مجلس یعنی حیدر آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مقرر ہوئے۔ حیدر آباد میں ان کا قیام حمایت نگر کلب میں تھا۔ یہ اب ملٹری کا ہیڈ آفس بن گیا ہے۔ اس عمارت میں مولوی خدا بخش خاں کے ساتھ ہمارے دادا سید عاشق حسین عرف ہمایوں مرزا بیرسٹر ابن سید شاہ الفت حسین فریاد عظیم آبادی بھی رہتے تھے جو خدا بخش خاں کے گہرے دوست تھے۔ حکومت ہند نے ۱۸۹۱ء میں مولوی خدا بخش خاں چیف جسٹس حیدر آباد ہائی کورٹ کی خدمات کے اعتراف میں سی۔ آئی۔ ای (C.I.E) کا اعلا انگریزی خطاب عطا کیا۔

مولوی خدا بخش خاں مرحوم کو علم و ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ حضرت حافظ شیرازی اور مولانا رومی ان کے پسندیدہ ترین شاعر تھے۔ وہ عربی و فارسی کی بھی صلاحیت رکھتے تھے۔ دونوں زبانوں کے کافی اشعار یاد تھے انھوں نے کئی مضامین بھی لکھے جو ملک کے کئی رسائل میں شائع ہوئے۔

اپنے وقت کی کئی مشہور و معروف ادبی و علمی شخصیتوں سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔ ان میں پروفیسر براؤن جنھوں نے فارسی ادب کی مشہور ادبی تاریخ لکھی ہے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

مولوی خدا بخش خاں مرحوم ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے لیکن بڑے ہی روادار اور فراخ دل تھے۔ کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کی۔ مشرقی لباس کے ہمیشہ دلدادہ رہے۔ کبھی سوٹ نہیں پہنا۔ افسروں کی کبھی بیجا خوشامد نہیں کی۔

ایک رنج و الم کی تاریخ ایسی بھی آئی جب کہ یہ آفتاب علم و ادب ۳ر اگست ۱۹۰۸ء کو ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ اور لائبریری کے احاطے میں سپرد خاک کیے گئے۔

مولوی محمد بخش مرحوم جو مولوی خدا بخش مرحوم کے والد تھے اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ قلمی کتابوں کی خریداری پر خرچ کرتے رہے۔ اس طرح ۱۸۷۶ء تک چودہ سو نادر قلمی کتابوں

کا ذخیرہ ہو گیا تھا۔ اس نادر ذخیرے کو انھوں نے اپنے فرزند مولوی خدا بخش خاں کے حوالہ کیا اور وصیت کی کہ عوام کی بھلائی کے لیے لائبریری میں یہ کتابیں رکھی جائیں۔

خدا بخش خاں نے بڑی عرق ریزی، محنت اور دشواریوں سے اور کافی روپے خرچ کر کے اپنی ذاتی زمین پر اپنے مکان کو منہدم کر کے لائبریری کی تعمیر کرائی اور اس طرح یہ شہرۂ آفاق لائبریری وجود میں آئی۔ سر چارلس ایلیٹ لفٹننٹ گورنر کے ہاتھوں سے اس لائبریری کا ۱۸۹۱ء میں افتتاح ہوا۔ اس وقت لائبریری میں چھ ہزار پانچ سو مطبوعہ اور چار ہزار عربی و فارسی کی قلمی کتابیں موجود تھیں۔

حکومت بنگال نے ۱۸۹۱ء میں اس لائبریری کی مالی امداد اور سرپرستی قبول کر لی۔

ابتدائے ۱۹۷۴ء تک خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری میں عربی، فارسی، اردو کے مخطوطات یعنی قلمی کتابوں اور مطبوعہ کتابوں اور رسائل کی کل تعداد چھیالیس ہزار دو سو اٹھانوے تھی۔ اس کے بعد سے اس میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ لائبریری کے نادر ذخیرے کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱- فارسی قلمی کتابوں کی تعداد ۳۸۸۳۔
۲- عربی کی قلمی کتابوں کی تعداد ۲۱۰۶۔
۳- اردو کی قلمی کتابوں کی تعداد ۲۴۳۔
۴- اردو انگریزی مطبوعہ کتابوں کی تعداد چالیس ہزار ہے جس میں عربی و فارسی کی بھی کتابیں شامل ہیں۔

ان نادر کتابوں کی حفاظت کا بہت اچھا انتظام ہے اور ایسے طریقے اختیار کیے جاتے ہیں جن سے سارے کے سارے مخطوطات ہر طرح کے کیڑوں مکوڑوں سے محفوظ رہیں۔ موجودہ ڈائرکٹر کی اس طرف خاص توجہ ہے۔ ان کی کوششوں سے لائبریری میں اضافہ بھی ہوا ہے اور پڑھنے والوں کی تعداد بھی بہت بڑھ گئی ہے۔ اپنی نادر قلمی کتابوں کی وجہ سے اس مشرقی کتب خانے کا شمار ایشیا کی سب سے اہم لائبریری میں ہوتا ہے۔

اس خزانۂ علم وادب کے جواہر پاروں کا تفصیلی ذکر مشکل ہے البتہ کچھ نادر مخطوطات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) تاریخ دمشق: یہ ابوالقاسم علی بن الحسن بن حیات اللہ معروف بہ ابن عساکر متوفی ۵۷۱ ہجری مطابق ۱۱۷۶ء کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب خط نسخ میں ہے جو ۶۱۴ھ مطابق ۱۲۱۹ء میں لکھی گئی۔ یہ نادر نسخہ کسی دوسری جگہ شاید موجود نہیں ہے۔

(۲) کتاب التصریف: مصنف خلف بن عباس الزہراوی متوفی ۴۰۴ھ مطابق ۱۰۱۳ء۔ یہ نادر کتاب ۵۸۴ ہجری مطابق ۱۱۹۰ء میں بخط نسخ لکھی گئی۔ عربی زبان کا یہ نادر مخطوطہ علم سرجری پر ہے اور مصوّر ہے۔ عرب میں جو اس وقت آلات سرجری استعمال کیے جاتے تھے، ان سب کی تصویر اس میں دی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ علم سرجری کے موجد اہل عرب ہیں، بعد کو یورپ نے اس علم کو معراج کمال تک پہنچایا۔ اس کتاب کی یورپ کے مشہور اسکالروں نے تعریف کی ہے۔

(۳) دیوان حافظ: مصنف خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی کے دیوان کا یہ نادر قلمی نسخہ نویں صدی ہجری میں بہ خط نستعلیق لکھا گیا۔ دیوان حافظ کا یہ حسین وجمیل نسخہ ہے۔ اس مخطوطہ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے حاشیہ پر شہنشاہ ہمایوں اور جہانگیر کی تحریریں ہیں جنھوں نے دیوان حافظ کے اشعار سے استخارہ کیا تھا۔

(۴) تاریخ خاندان تیموریہ: اس نادر قلمی کتاب میں شاہ تیمور سے شہنشاہ اکبر تک کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور نہایت حسین وجمیل خطِ نستعلیق میں لکھی گئی ہے۔ کاتب نے اپنا خون جگر صرف کردیا ہے۔ اس کتاب میں ایک سوبتیس (۱۳۲) نادر قلمی تصویریں شامل ہےں جو شہنشاہ اکبر کے دور کے مشہور ومعروف مصور نے بنائی ہیں۔ اس قلمی فارسی کتاب کو دیکھنے سے آنکھوں کو ٹھنڈک اور دلوں کو سرور ملتا ہے۔ یہ مخطوطہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے اس کتاب کا دوسرا نسخہ دنیا کی شاید کسی لائبریری میں موجود نہیں ہے۔

(۵) شہنشاہ نامہ: مصنف حسینی۔ یہ بھی خط نستعلیق میں لکھی گئی ہے۔ اس مخطوطے پر

سلطنت تیموریہ کے بعض شہزادوں کی مہریں ثبت ہیں۔ دوسری اہمیت اس نادر قلمی کتاب کی یہ ہے کہ شہزادی جہاں آراء بیگم دختر شاہ جہاں کے دستخط بھی ہیں۔ اس نادر کتاب کا کوئی دوسرا نسخہ کسی لائبریری میں موجود نہیں ہے۔ یہ کتاب خاص طور پر ترکی کے سلطان محمد ثالث کے لیے لکھی گئی تھی جو وہاں کی شاہی لائبریری میں محفوظ تھی۔ یہ نادر قلمی کتاب کسی طرح ہندوستان آئی۔ اور شاہ جہاں کے شاہی کتب خانہ میں داخل کی گئی۔ ایک زمانے کے بعد یہ نادر قلمی کتاب پٹنہ پہنچی۔

(۶) بادشاہ نامہ: مصنف محمد امین بن ابوالحسن قزوینی۔ یہ نہایت حسین خط نستعلیق میں لکھی ہوئی ہے۔ یہ شاہ جہاں کی زندگی کی مکمل تاریخ ہے جو اس کی پیدائش سے موت تک کے واقعات کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ کتاب دیدہ زیب اور نہایت حسین حروف میں لکھی گئی ہے اور باتصویر ہے کاتب کا معراج کمال پوری طرح جلوہ گر ہے۔ اس مخطوط کے حاشیہ پر سنہری اور رنگین گل کاریاں ہیں۔ اس نادر فارسی قلمی تاریخ کو دہلی میں ۱۹۱۱ء میں شاہ جارج پنجم اور شہزادی میری نے دیکھا اور اظہار پسندیدگی کے طور پر دونوں کے دستخط اس کتاب پر موجود ہیں۔

(۷) دیوان مرزا کامران: شہزادہ مرزا کامران شہنشاہ ہمایوں کے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ نادر قلمی دیوان فارسی نہایت حسین وجمیل خط نستعلیق میں شاعر کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔ اس کتاب کی تعریف جتنی کی جائے کم ہے۔ کاتب نے موتی پرو دیے ہیں۔ اس قلمی دیوان کی اہمیت اس لیے دو چند سہ چند ہوگئی ہے کہ اس پر شہنشاہ جہانگیر، شہنشاہ اکبر اور شاہ جہاں کے دستخط ہیں اور مہریں ہیں۔ یہ بہت ہی نایاب قلمی دیوان ہے۔

کہا جاتا ہے کہ قلمی دیوان کامران سید احسن شیر مرحوم سکریٹری خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری اور شری اس۔ دی۔ سوہنی کمشنر پٹنہ وچیئرمین لائبریری کے زمانے میں بنارس کے ایک تاجر سے کوئی پانچ ہزار روپے میں خریدا گیا تھا۔ اس وقت بھی یہ سودا بہت ارزاں تھا۔

(۸) مرقع الملوک: از منشی مہتاب ۱۸۲۹ء میں لکھی گئی۔ اس کتاب پر صاحب کتاب کے دستخط موجود ہیں جس کی وجہ سے اس قلمی کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اس کتاب کا کوئی دوسرا نسخہ موجود نہیں ہے۔

(۹) دیوان مصحفی: شیخ غلام ہمدانی مصحفی متوفی ۱۲۴۰ ہجری کا مجموعہ کلام جو خط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے۔ موجودہ جلدوں کے علاوہ خدا بخش اورینٹل لائبریری میں سات جلدیں اور ہیں گویا حضرت مصحفی کے مکمل دیوان صرف اس لائبریری میں موجود ہیں۔

۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین گورنر بہار کی دلچسپی اور توجہ سے اور شری اس۔ وی۔ سوہنی کمشنر پٹنہ و چیئرمین خدا بخش اورینٹل لائبریری اگزیکیٹو کمیٹی کی کوششوں سے دسنہ کا مشہور و معروف مشرقی کتب خانہ جس کا نام 'الاصلاح' تھا اور جس میں سات ہزار کتابیں تھیں، اس اورینٹل لائبریری میں شامل کر لیا گیا۔ ان تمام کتابوں کو جن میں کچھ قلمی کتابیں اور انیسویں صدی کے بعض مشہور و معروف رسالوں کا ذخیرہ بھی ہے، ایک معاہدہ کے تحت ایک الگ شعبے کی صورت میں رکھا گیا ہے۔ اسی دسنہ لائبریری کا ذکر جناب شاہ معین الدین صاحب ندوی ایڈیٹر معارف اور جناب صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کی تحریک پر میں نے ایک ملاقات میں پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہند سے کیا تھا جس کا نتیجہ بھی خوشگوار نکلا۔

بہار کی گورنری کے زمانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو خدا بخش اورینٹل لائبریری سے غیر معمولی دلچسپی رہی وہ ہفتوں روزانہ خدا بخش لائبریری میں بڑی پابندی سے آتے۔ ایک نوٹ بک ہمراہ لاتے اور نادر مخطوطات کی نقل فرماتے رہتے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کافی روپے خرچ کیے۔

موجودہ خدا بخش اورینٹل لائبریری کی مالی ترقی اور مرکزی حکومت کے محکمۂ تعلیمات سے اس کی وابستگی بھی تمام تر ڈاکٹر ذاکر صاحب اور سری اس۔ وی۔ سوہنی کمشنر پٹنہ کی مسلسل جدو جہد اور سعی کا نتیجہ ہے۔ آج جو کچھ رونق اور ترقی نظر آ رہی ہے مالی استحکام ہی کا نتیجہ ہے۔ حکومت بہار کی پچاس ہزار سالانہ امداد کے علاوہ لاکھوں روپے سالانہ مرکزی حکومت دیتی ہے۔

پارلیمنٹ میں جو بل خدا بخش اورینٹل لائبریری کے نام سے حکومت بہار کے توسط سے پیش ہوا اس کا مسودہ بھی شری اس۔ وی۔ سوہنی ہی کا تیار کیا ہوا تھا۔ اس وقت مرکزی حکومت دہلی کے وزیر تعلیمات ڈاکٹر وی۔ کے۔ آر۔ وی راؤ تھے۔ انھوں نے اس بل کو

پارلیمنٹ میں پیش کیااور کافی بحث ومباحثے کے بعد یہ بل منظور ہوگیا۔

ایک اعلا اختیارات بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی اور قدیم ایکزیکیٹو ختم کر دی گئی۔ حکومت بہار کے محکمۂ تعلیمات کی تجویز بذریعہ مراسلہ نمبر V./44055/60 Ed 120 مؤرخہ ۲۶ر ستمبر ۱۹۶۲ء کے ذریعہ قرار پایا کہ حکومت بہار کے چار نامزد ممبر ہوں گے اور چار مرکزی حکومت کے محکمۂ تعلیمات کے نامزد ممبر ہوں گے۔ گورنر بہار اس بورڈ کے چیئر مین مقرر ہوئے اور آج تک یہ سلسلہ قائم ہے موجودہ گورنر شری جگن ناتھ کوشل کی بیدار مغزی، ادب نوازی اور انصاف پروری سے امید ہے کہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری میں کچھ مفید کام ہو سکیں گے، اور ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔

☆☆

(نیا دور لکھنؤ، جون ۱۹۷۸ء)

رضا علی عابدی

انہیں خدا بخشے

جب کبھی کہیں اجاڑ موسم آتا ہے تو پرندے وہاں سے بہت دور چلے جاتے ہیں۔

کچھ یہی حال کتابوں کا ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ جب تاتاریوں نے بغداد کو لوٹا تو وہاں کی کتابیں ٹونک تک پہنچیں اور جب عیسائیوں نے قرطبہ پر دھاوا بولا تو وہاں کی کتابیں پٹنہ تک گئیں۔

ہمارا یہ باب پٹنہ کے لیے مخصوص ہے۔

ایک صاحب تھے، خدا بخش۔ علم وادب پر اُن کے اتنے احسانات ہیں کہ دل سے ان کے لیے یہی صدا نکلتی ہے کہ خدا بخشے۔ ان کے والد جب انتقال کرنے لگے تو ہاتھ سے لکھی ہوئی ایک ہزار چار سو کتابیں بیٹے کے حوالے کر گئے اور کہہ گئے کہ جوں ہی حالات اجازت دیں، ان کتابوں کو عوام کے لیے کھول دینا۔

خدا ایسی کتابیں اور ایسے بیٹے سب کو دے۔ خدا بخش علم کے اس خزانے میں نئے نئے جواہر بھرتے گئے یہاں تک کہ ان کے پاس چار ہزار مخطوطے جمع ہو گئے۔ اب یہ کھیتی پک کر تیار تھی۔ بیٹے نے باپ کا خواب پورا کر دکھایا۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۸۹۱ء کو یہ کتب خانہ وقف قرار پایا اور کتب خانے کا نام رکھا گیا ''اورینٹل پبلک لائبریری'' اس کے نام میں نہ کسی شخصیت کا نام شامل تھا نہ کسی کاروباری ادارے کا۔

مگر اُس زمانے میں عوام طے کیا کرتے تھے کہ ان کا محسن کون ہے۔ چنانچہ لوگ نہ مانے انہوں نے اورینٹل پبلک لائبریری کو اوّل دن سے خدا بخش لائبریری کہا اور بانکی پور کے بارونق علاقے میں وہ آج بھی خدا بخش لائبریری کے نام سے ماضی کی عظمتوں کا مینارہ بنی کھڑی ہے اور اس کی کرنیں کہاں کہاں نہیں بکھری ہیں۔

پہلے پہل اس کا تعارف پروفیسر گوپی چند نارنگ نے یوں کرایا۔

"اس وقت کتب خانہ جو سب سے اچھا کام کر رہا ہے وہ ہے خدا بخش لائبریری، بانکی پور پٹنہ۔ جس کے ڈائرکٹر ہیں عابد رضا بیدار صاحب۔ بڑی محنت سے، بڑے سلیقے سے، بڑی کوشش سے، بڑی لگن سے انہوں نے اہتمام کرایا ہے۔ پرانی چیزوں میں سے بعض بعض چیزوں کو چھاپ بھی رہے ہیں۔ سال میں ایک دو مرتبہ وہ خاص مشاہیر کو بلا کر ان کے توسیعی خطبات بھی کراتے ہیں اور خدا بخش جرنل کا بھی انہوں نے اجرا کیا ہے۔ جو بھی ملکی یا غیر ملکی اسکالر ہندوستان سے پاکستان سے، مغرب کے یورپی ملکوں سے یا امریکہ سے یا روس سے وہاں پہنچتا ہے، اسکی وہ ہر ممکن مدد کرتے ہیں۔"

پٹنہ کی خدا بخش لائبریری میں کتابیں اور خوبیاں دونوں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ یہ بنیادی طور پر مخطوطات کی لائبریری ہے۔ خصوصاً عربی اور فارسی کتابوں کا یہاں بے مثال ذخیرہ ہے۔ اس کتب خانے میں اُردو، فارسی اور عربی کے پندرہ ہزار قلمی نسخے ہیں جن میں سے ابھی صرف آدھے نسخوں کی فہرستیں چھپی ہیں اور وہ دو چار نہیں چونتیس جلدوں میں پھیلی ہوئی ہیں اور اشاعت کا یہ کام ابھی جاری ہے۔ اور نہ معلوم کتنے عرصے جاری رہے گا۔

لیکن خدا بخش کے والد نے تو انہیں صرف ۱۴ سو کتابیں سونپی تھیں، پھر یہ پندرہ ہزار کیسے ہو گئیں؟ یہی سوال میں نے لائبریری کے ڈائرکٹر جناب عابد رضا بیدار سے کیا۔ کہنے لگے۔

"یہ تو کچھ ایسا ہے کہ آدمی کو کسی بھی چیز کی لگن ہو۔ پیاس چاہئے انسان کو۔ شدت کی پیاس ہو تو شائد کنواں بھی پیاسے کے پاس آ جائے۔ یہ مثال کم سے کم ہمارے لیے تو سچ ثابت ہوئی کہ خدا بخش کے پاس کتابیں کھنچ کر آتی تھیں۔ انہوں نے یہ بھی کیا کہ ایک عرب کو ملازم رکھا جسے اُس زمانے میں وہ پچاس روپیہ مہینہ دیتے تھے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں پچاس روپے

بہت بڑی رقم تھی۔ وہ شخص ڈھونڈ ڈھونڈ کر کتابیں لاتا تھا اور اطلاعیں دیتا تھا
کہ فلاں جگہ کتابوں کا ذخیرہ ہے، آپ خود خط و کتابت کر لیجئے، یہ اطلاع
ہے۔ تو اس طرح مصر، حجاز، ایران و عراق سے کتابیں ان کو ملتی تھیں،
ہندوستان بھر سے کتابیں ملتی تھیں۔ ان کی کتابیں ایک بار چوری ہو گئیں۔
کتاب فروش کے ہاں پہنچیں۔ اس نے ان کو اطلاع دی کہ ہمارے پاس کچھ
کتابیں بکنے آئی ہیں۔ آپ خریدیں گے؟ اس طرح وہ کتابیں پھر ان کے
ہاں پہنچ گئیں اگرچہ قیمتاً پہنچیں۔"

خدا بخش لائبریری کی دوسری بڑی خصوصیت مغل عہد کی پینٹنگز ہیں اور خصوصاً
فارسی کی وہ قلمی کتابیں ہیں جن میں مصوروں نے اپنے شاہکار بنائے ہیں۔

پٹنہ کے اس کتب خانے کی ایک اور خصوصیت اردو کے پرانے رسالے اور
جریدے ہیں ان کا جتنا بڑا ذخیرہ یہاں ہے، دوسری جگہ شاید ہی ملے۔ خدا بخش لائبریری
میں گزرے وقتوں کے تقریباً ایک ہزار مختلف اردو رسالوں کے کئی لاکھ شمارے محفوظ
ہیں۔ مگر یہ ایسا بیکراں سمندر تھا کہ اس میں اگر آپ کسی خاص عنوان کی تلاش کرتے تو
بھوسے کے ڈھیر سے سوئی ڈھونڈنے کے مترادف ہوتا۔ لہٰذا لائبریری نے ان رسالوں
میں چھپے ہوئے مضامین کے فہرست وار کارڈ بنانے شروع کئے ہیں اور اب تک دو لاکھ سے
زیادہ اشاریتی کارڈ تیار کر لیے ہیں اور ابھی تو بہت کام ہونا باقی ہے۔

ان لاکھوں کارڈوں کی تیاری میں خدا بخش لائبریری نے ایک دلچسپ اور کامیاب
تجربہ کیا، یعنی اس کام میں طالب علموں کو بھی شریک کر لیا اور انہیں پانچ پیسے فی کارڈ کے
حساب سے معاوضے کی پیش کش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طالب علم دن میں دو تین گھنٹے کام
کر کے پانچ سے سات روپے تک کما لیتا تھا جس سے اسکا اپنا خرچ اور تعلیم کا خرچ نکل آتا
تھا۔ اس تجربے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سینکڑوں طالب علموں میں چار پانچ سال کے
اس کام کے دوران کتب خانے کا ذوق پیدا ہوا اور اب وہ باقاعدگی سے لائبریری کو استعمال

کرتے ہیں اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

"خدابخش لائبریری کی کچھ اور خصوصیات عابد رضا بیدار صاحب نے بیان کیں، "ہم دوسری جگہوں سے اہم مخطوطات کے مائکرو فلم حاصل کر رہے ہیں۔ کتب خانوں سے بھی اور ایسی جگہوں سے بھی جہاں برباد ہونے کے خطرے زیادہ ہیں، مثلاً خانقاہوں وغیرہ میں۔ ایک آدھ جگہ ایسی بھی ہے جہاں اصل مخطوطے تلف ہو چکے ہیں، صرف ان کے عکس ہمارے پاس محفوظ ہیں۔

ایک شعبہ ہم نے ابھی حال ہی میں کیسٹ اور ٹیپ کا قائم کیا ہے۔ جو اہم لوگ ہیں ان کی آوازیں صدابندی کے بعد یہاں محفوظ کر لی جاتی ہیں۔ ایک اور چیز جو شروع کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ مصنفوں سے اُن کے مسودے لے لیے جائیں جو چھپنے کے بعد عموماً پھینک دیئے جاتے ہیں۔ وہ بھی آیندہ ریسرچ کا موضوع بن سکیں گے۔"

ایک اور شعبہ جواب شروع ہو رہا ہے وہ "معاصر اسلام" یا CONTEMPORARY ISLAM کہلائے گا۔ مستقبل کا مورخ جب آج کے اسلام کی تاریخ لکھے گا تو وہ اس دور کی دستاویزوں کو خدابخش لائبریری میں اپنا منتظر پائے گا۔ اس نئے شعبے میں عالم اسلام کی وہ تمام دستاویزیں جمع ہوں گی۔ جن کا تعلق دین سے ہے۔

دستاویزوں کی بات چل رہی ہے تو یہ بھی سن لیجئے کہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی اردو دستاویزوں کا بڑا ذخیرہ خدابخش لائبریری میں محفوظ ہے۔ تحریک آزادی کے دور میں قلم کے محاذ پر جتنی جنگ اردو زبان میں لڑی گئی اُس کا کسی کو اندازہ نہیں۔ اپنی بات عوام تک پہنچانے کے لیے اس وقت کے بڑے بڑے رہنما اُردو میں لکھتے تھے چنانچہ خدابخش لائبریری کے شیلف تیج بہادر سپرو، موتی لال نہرو اور لاجپت رائے جیسے صف اول کے رہنماؤں کی اردو تحریروں سے بھرے پڑے ہیں۔ یہی حال مسلم رہنماؤں کی تحریروں کا ہے۔ بیدار صاحب

نے اچھی بات کہی کہ ان تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اردو کی ساری دولت صرف افسانے یا شعر نہیں تھے بلکہ غیر معمولی سنجیدہ موضوعات پر بھی لوگ دل جما کر لکھتے تھے۔

یہ اس دور کی بات ہے جب چکبست کا رسالہ صبح امید، پیارے لال شاکر کا العصر، نوبت رائے کا ادیب اور دیانرائن نگم کا رسالہ زمانہ شائع ہوا کرتے تھے۔ خدابخش لائبریری اپنے جرنل میں ان رسالوں کا انتخاب شائع کر رہی ہے جس میں، مثال کے طور پر منشی پریم چند کی بہت سی ایسی کہانیاں موجود ہیں جو ان کے مجموعوں میں نہیں آئیں۔ سائنس پر بھی بہت سے مضامین ہیں جبکہ اردو والے بھول گئے کہ سائنس میں کبھی ایسا لٹریچر بھی پیدا ہوا تھا۔

خدابخش لائبریری ایک اور بڑا کام یہ کر رہی ہے کہ نادر اور قابل ذکر قلمی نسخوں کو جدید کتابوں کی شکل میں چھاپ رہی ہے تاکہ علم کی اس بند سیپ سے نکل کر یہ موتی عام لوگوں کے گھروں کو بھی منور کر سکیں۔

ایسے ہی ایک مخطوطے کا ذکر عابد رضا بیدآر صاحب نے کیا۔

"یہاں دیوان حافظ کا ایک نسخہ ہے۔ ہمایوں کو جب ایران میں پناہ لینا پڑی تو وہ وہاں سے ایک نسخہ لایا، وہ نسخہ پھر دارا شکوہ تک چلتا رہا۔ دارا نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ ہمارے خاندان میں ایک نسخہ چلا آ رہا ہے جس سے ہمارے باپ دادا فال نکالا کرتے تھے۔ اس کے حاشیوں پر فال کا اندراج موجود ہے۔ مثلاً ہمایوں اور جہانگیر کی نکالی ہوئی فال۔ اور مجھے شبہ ہے کہ ایک جگہ شاہ جہاں کی نکالی ہوئی فال کا اندراج موجود ہے۔ وہ ہم جوں کا توں آفسٹ پر چھاپ رہے ہیں تاکہ ان کا اصل خط عوام کے سامنے آ جائے۔"

موبد، مغلوں کے آخری عہد کا بہت بڑا دانشور تصور کیا جاتا ہے۔ اس نے دبستان مذاہب لکھی تھی جس کا بعد میں سارے مغرب نے SCHOOLS OF RELIGION کے نام سے مطالعہ کیا۔ بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ موبد شاعر بھی تھا اور صاحب دیوان تھا۔ اس کے دیوان کا صرف ایک نسخہ تھا جو خدابخش لائبریری میں نکل آیا۔ اس دیوان کی

روشنی میں وہ اور بڑا دانشور نظر آتا ہے۔ یہ دیوان بھی چھاپا جارہا ہے۔اس کے علاوہ بیدار صاحب نے بتایا:

> "ہم نے عہد شاہ عالم کی ایک محاورات کی لغت چھاپی ہے جنہیں آپ ہندی یا اردو دونوں محاورات کہہ سکتے ہیں، اُس عہد میں ایسی کوئی تخصیص نہیں تھی۔اس سے قبل کی ایک لغت چھاپ رہے ہیں جو اورنگ زیب کے پوتے کے لیے لکھی گئی۔اورنگزیب نے اپنے پوتے کے لیے اتالیق مقرر کیا تھا۔ اس نے علوم ہندیہ پر ایک انسائیکلو پیڈیا لکھی اُس میں سے ہم نے لغت کا حصہ نکال لیا ہے جو ہندی اور اردو دونوں رسم الخط میں چھاپا جارہا ہے کیونکہ وہ ہندی کی بھی ایسی ہی لغت ہے جیسے اردو کی۔ایسے ہی ایک منصوبہ ہے، تاریخ خاندان تیموریہ چھاپنے کا جو مغل مصوری کا بہترین نمونہ کہا جاتا ہے اوراس کے لیے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ مصوری کا تاج محل ہے۔"

علوم مشرقی کے اس کتب خانے نے جو شاندار روایات قائم کی ہیں اُن کا اسے صلہ بھی خوب ملا اور نہ جانے کتنے بزرگ وصیت کر گئے کہ ان کی کتابوں کے ذخیرے خدا بخش لائبریری کو دے دیئے جائیں، یا پھر انکے پسماندگان نے ان کے ذخیرے اس کتب خانے کو پہنچادیے اور ظاہر ہے کہ اس کام کا ثواب کہاں کہاں تک پہنچا ہوگا۔ آرہ کے ڈاکٹر رشید الدین احمد مرحوم، پٹنہ کے ڈاکٹر اختر اوریِنوی مرحوم اور سابق وزیر تعلیم سر فخر الدین مرحوم کی کتابوں کے ذخیرے اس کتب خانے کو مل گئے۔

قاضی عبدالودود صاحب نے اپنی چھ سات ہزار تحقیقی کتابیں اس لائبریری کو دے دیں۔ کھجوہ میں دیوان ناصر علی صاحب کا ذخیرہ تھا جسے سخت نقصان پہنچا۔ مگر جو کتابیں اور مخطوطے بچ گئے وہ خدا بخش لائبریری نے حاصل کر لیے۔ان میں دیوان ہمایوں کا نسخہ بھی شامل ہے۔ حکیم علیم الدین بلخی صاحب نے اپنے والد کی کتابیں اس کتب خانے کو دے دیں جن میں مکتوبات صدی جیسی قیمتی کتاب شامل ہے جس پر مظفر شمس بلخی کی اپنی تحریر میں

حاشیوں پر NOTES لکھے گئے ہیں۔

ایک اور عظیم الشان کتب خانہ جو خدا بخش لائبریری میں منتقل ہوا اس کا احوال بھوپال میں اردو کے محقق اور استاد عبدالقوی دسنوی صاحب نے سنایا:

"پٹنہ سے تیس میل دور ایک گاؤں دسنہ ہے جہاں کے علامہ سلیمان ندوی ہیں۔ وہ میرا گاؤں ہے۔ وہاں ایک بڑا عظیم کتب خانہ تھا۔ الاصلاح لائبریری: اس میں بہت سے قلمی نسخے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں جب بہت سے لوگ وہاں سے چلے گئے اور ویرانی بڑھنے لگی تو ہم سب کو احساس ہوا کہ اس لائبریری کو محفوظ کیا جائے۔ چنانچہ اس زمانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب گورنر بہار تھے ان سے ہم لوگوں نے رجوع کیا۔ اُن تک پہنچے اور ان سے کہا کہ کسی طرح اس کتب خانے کو بچائیے کہ یہ قیمتی سرمایہ ضائع نہ ہو اور زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے فائدہ اُٹھائیں تو ذاکر صاحب نے بہت دلچسپی لی اور سارے کتب خانے کا بہت اچھا حصہ خدا بخش لائبریری منتقل کر دیا۔ یہ سب اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ پہلا گاؤں دسنہ ہے جس نے اتنی بڑی قربانی دی، صرف اس لیے کہ آئندہ کام کرنے والوں کے لیے یہ مفید طور سے استعمال ہو سکے اور زیادہ سے زیادہ لوگ تحقیق کر سکیں۔"

تو یہ ہے ایک جیتے جاگتے پھلتے پھولتے کتب خانے کا احوال۔ اس کی موجودہ عمارت اب بڑھا کر دوگنی کی جارہی ہے۔ اس میں ائرکنڈیشنڈ کمرے ہوں گے جن میں قلمی کتابیں محفوظ رہیں گی۔ میں جس روز وہاں پہنچا، بہت بڑے عملے کو مصروف پایا، کہیں تحقیق ہو رہی تھی۔ کہیں اشاراتی کارڈ بن رہے تھے۔ کہیں زیروکس کاپیاں اور مائیکروفلمیں بنائی جارہی تھیں اور کہیں خوشنویس بیٹھے پُرانی دستاویزوں کی نقلیں اتار رہے تھے۔ ایک شعبے میں جلد بندی ہو رہی تھی، ایک گوشے میں ناقص کاغذوں کو موسم کے اثرات اور کیڑے مکوڑوں سے بچانے کے لیے کیمیاوی عمل جاری تھا۔ خلیج کے علاقے سے ایک بزرگ

تشریف لائے تھے جو زکوۃ پر اتھارٹی ہیں، وہ قدیم کتابوں کا مطالعہ کر رہے تھے۔ کتب خانہ قارئین سے بھرا ہوا تھا اور طرف زندگی کے آثار اور ہر سمت چہل پہل تھی۔

یہ تو تھی زمین کی صورت حال، آسمانوں تک میری نگاہ تو نہیں پہنچی مگر مجھے محسوس ہوا کہ وہاں کہیں خدا بخش کی روح بے حد مسرور ہوگی۔

خدا کے ہاں ایسے ہی لوگوں کی بخشش ہوتی ہے، مجھے یقین ہے!!



(سعد پبلیکشنز، کراچی - ۱۹۸۵ء)

شہاب الدین انصاری
دہلی

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

اس لائبریری نے گذشتہ ایک ڈیڑھ دہے کے دوران اپنے دائرۂ کار میں وسعت پیدا کر کے خود کو ملک کا نہایت فعال ادارہ بنا لیا ہے۔ خدا بخش میموریل لکچر، اردو تحقیق سمینار اور جنوب ایشیائی قلمی کتب سمینار کی بدولت علوم مشرقی کے طالب علموں کے لیے اب یہ ادارہ کسی تعارف کا محتاج نہیں رہ گیا۔ ملک کی کئی یونی ورسٹیوں نے اسے علوم مشرقی میں تحقیق کے مرکز کی حیثیت سے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن کتب خانہ کی شہرت کی اصل بنیاد عربی و فارسی کے وہ نادر مخطوطات ہیں، جنھیں بانی کتب خانہ خدا بخش نے وہاں جمع کر دیا ہے۔ کتب خانہ کے ذخیرہ کی اساس وہ ۱۴۰۰ یا ۱۴۶۰ مخطوطات ہیں جنھیں ان کے والد محمد بخش نے اپنی حیات میں جمع کیا تھا اور جسے محفوظ رکھنے کی وصیت اپنے بستر مرگ پر کی تھی۔ والد کی وصیت، اپنا ذاتی شوق، اور محمد مکی نامی عرب متلاشی کتب، ان تینوں کے اجتماع نے ایک ایسے کتب خانہ کی داغ بیل ڈال دی کہ آج اسے عالمگیر شہرت حاصل ہے۔ ہندوستان کے سابق صدر ڈاکٹر ذاکر حسین کی کوششوں سے ۱۹۶۱ء میں بہار ہی میں موجود دیسنہ کے کتب خانہ کا ذخیرہ بھی اس کتب خانہ کا حصہ بن گیا۔ کتب خانہ کے ذخیرہ سے دنیا کو روشناس کرانے کی غرض سے مخطوطات کی فہرست سازی کا کام اس صدی کے ابتدائی برسوں میں ہی شروع ہو چکا تھا۔ سر ڈینیسن راس کی رہنمائی اور مولانا مقتدر کے تبحر علمی نے ۳۳ جلدوں کی تکمیل کر دی۔ ادھر چند برسوں سے ان پر نظر ثانی کر کے ۱۳ جلدوں کو دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ اور ایک نئی جلد ۳۴ بھی شائع ہوئی ہے۔ چند مخطوطات کو مرتب کر کے شائع کیا گیا ہے اور دوسرے مخطوطات کا تعارف وقتاً فوقتاً خدا بخش جرنل میں کرایا جاتا رہا ہے۔ کتب خانے میں موجود مخطوطات کا تعارف اکثر کرایا جاتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں ایک مشرقی کتب خانہ کے نام سے مبارز الدین رفعت کی کتاب

قابل ذکر ہے جو دراصل ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔لیکن نستعلیق خط میں لکھی ہوئی تاریخ خاندان تیموریہ کا ذکر غیر مناسب نہ ہوگا۔اس مخطوطے میں مغل شہنشاہ اکبر کے درباری مصوروں کی بنائی ہوئی ۱۳۲ تصویریں ہیں۔

اسی طرح ایک دوسرا انہایت خوشنما اور جاذب نظر مخطوطہ شاہ نامہ کا وہ نسخہ ہے جسے علی مردان خاں نے شاہ جہاں بادشاہ کو پیش کیا تھا اور جس میں ایرانی طرز پر بنی ہوئی باریک قلم کی ۲۳ تصاویر ہیں۔



(آج کل،نئی دہلی،دسمبر ۱۹۹۰ء)

دکتر محمد حسین تسبیحی (رہا)

آشنایی با کتابخانۂ عمومی شرق شناسی خدا بخش

آن روزہا کہ در دانشکدۂ ادبیات دانشگاہ تہران مشغول تحصیل بودم، بسیار علاقہ مند بودم کہ سانسکریت دارد و بخوانم۔ استاد زبان و خط سانسکریت مرحوم پرفسور ایندوشیکھر بود۔ استاد اردو مرحوم دکتر سید با حیدر شہر یار نقوی بود۔ من ہر دو درس اردو و سانسکریت را می خواندم۔ آقایان دانشجویان فقط برای نمرہ گرفتن آمدہ بودند۔ من کہ با علاقہ وعشق وافری خواندم و مطالعہ می کردم، گاہی مورد تمسخر واستہزاء واقع می شدم۔ زبان وخط سانسکریت را خوب یادگرفتم وہمین طور زبان وخط اردو را نیز یاد گرفتم و در امتحان نمرۂ خوب گرفتم۔

کتاب راہنمای سانسکریت تالیف آقای پرفسور ایندوشیکھر بود کہ از طرف ادارۂ انتشارات دانشگاہ تہران چاپ ومنتشر شدہ بود۔ بہ ہمین ترتیب کتاب راہنمای اردو نیز تالیف آقای دکتر با حیدر شہریار نقوی چاپ شدہ بود، واین ہر دو کتاب درسی بودند۔

امامن کہ علاقہ مند بودم بیشتر مطالعہ کنم وبہ زبان وادبیات وتاریخ سانسکریت دارد و آشنا گردم، ہموارہ از استادان ارجمند چیزہای می پرسیدم و پاسخ ہای می شنیدم۔ مرحوم پرفسور ایندوشیکھر شوق وعشق مرا بہ سانسکریت دریافت وگفت:

”شما باید با من بہ کار ترجمۂ 'شکونتلا' اثر کالیداس بپردازی و در این راہ بہ من کمک کنی، ہم خودت چیزی یاد می گیری وہم برای من فایدہ دارد“۔

کار ترجمۂ 'شکونتلا' داستان زیبای ہندی آغاز گردید وخیلی زود بہ پایان انجامید واز طرف بنگاہ ترجمہ ونشر کتاب (سابق) چاپ شد۔ من کہ باز ہم می خواستم چیزہای بہتر و بیشتر بفہمم و یاد بگیرم۔ از مرحوم پرفسور ایندوشیکھر درخواست کردم کہ مطالبی دربارۂ ہندوستان وشہر ہای آنجا وکتاب خانہ ہا وموزہ ومراکز علمی ودانشگاہی برای من بیان کند۔ ایشان با گشادہ رویی

مطالبی بسیار ارزنده برای من بیان کردند و من کوشش می کردم که آنها را یادداشت کنم ـ چوں علاقہ مند بہ کتاب و کتاب خانہ بودم، بیشتر آن چہ مربوط بہ کتاب خانہ ہای سرزمین ہند بود، یا می نوشتم و یا بہ خاطری سپردم۔

اکنون کہ این مطالب را می نویسم، درست ۳۵ سال از آن تاریخ گذشتہ است یعنی در سال ۱۹۵۶ء میلادی برابر ۱۳۳۵ھ ش من در دانش کدۂ ادبیات دانش گاہ تہران درس می خواندم، آن کتاب خانہ ی را کہ استاد مرحوم ایندوشیکھر در بارۂ آن بسیار گفت وگو کرد، کتاب خانۂ عمومی شرق شناسی خدابخش بود، او گفت این کتاب خانہ در شہر پتنہ قرار دارد و کتاب ہای فارسی بسیار در آن گردآوری شدہ است ـ مالک کتاب خانۂ خدابخش، مردی ثروتمند و مال دار است ـ او کتاب ہای چاپی و خطی در کتاب خانۂ خود گردآوری کردہ است ـ او ہمیشہ می گوید کہ:

ع

''زبہر روشنی دل مرا ندیم کتاب''

خدابخش ہماں خانۂ خود را کہ ہمانند یک کاخ باشد، بہ صورت کتاب خانہ درآوردہ است و از دور و نزدیک، کتاب فروشان ثابت و بسیار برای او کتاب می آورند، و او ی خرد و در قفسہ ہای کتاب خانہ اش قرار می دہد ـ البتہ کسانی ہم کہ علاقہ مند بہ کتاب باشند، بہ کتاب خانۂ خدابخش مراجعہ می کنند و گنجینہ ہای علوم و فنون و ادب و فقہ و اصول و زبان و فرہنگ و ہند و تاریخ و روزنامہ و مجلہ و غیرہم در اختیار آنان قرار می گیرد و از آن ہا بہرہ مندی شوند۔

این اطلاعات را در بارۂ کتاب خانۂ خدابخش از مرحوم پرفسور ایندوشیکھر شنیدم و یادداشت کردم ـ سپس در کلاس ہای درس استادان ایرانی ہموارہ می شنیدم کہ فلان نسخۂ خطی ارزندہ در کتاب خانۂ خدابخش موجود است ـ مثلاً مرحوم استاد عبدالعظیم خان قریب گرکانی می گفت:

''اصل کتاب'' کلیلہ و دمنہ'' در کتاب خانۂ خدابخش در ہندوستان موجود است''!!

اما مرحوم استاد ایندوشیکھر می گفت:

''اصل کتاب'' کلیله ودمنه''را'' پنجاتنترا'' می گویند یعنی'' ۵ فصل''
که به زبان سانسکریت می باشد و ممکن است در کتاب خانهٔ خدابخش باشد''۔

در کلاس درس مرحوم استاد دکتر محمد معین، مرحوم استاد بدیع الزمان فروزانفر، استاد جلال الدین همایی، مرحوم استاد ابراهیم پورداود و نیز در کتاب های آنان همواره سخن از کتاب خانهٔ خدابخش به میان می آمد و عاشقان کتاب و کتاب خانه را به هیجان در می آورد۔

روزها و ماه ها و سال ها گذشته است و روزگار من با کتاب و کتاب خانه می گذرد و بارها اتفاق افتاده که نامه هایی به کتاب خانهٔ خدابخش بنویسم و چون به زبان فارسی مکاتبه می کنم، پاسخ نیز به زبان فارسی دریافت می دارم۔

به تازگی نامه هایی برای دریافت مجلهٔ ارزندهٔ'' جرنل'' به جناب آقای استاد دکتر عابد رضا بیدار مدیر و سردبیر مجلهٔ جرنل نگاشتم و یک قصیدهٔ فارسی تحت عنوان خدابخش نامه نیز ارسال داشتم، خوش بختانه این قصیده که در حدود یک صد بیت دارد، مورد پسند استاد عابد رضا بیدار واقع شده و در نامهٔ خود نوشتند'' خوب است، خیلی خوب، آنرا در جرنل چاپ می کنیم'' این است که با ایماء و اشارهٔ جناب آقای عابد رضا بیدار، شوق و عشق خودم را به کتابخانهٔ خدابخش ظاهر کرده ام و به نثر مطالبی را به قلم آورده ام۔

باری، کتاب خانهٔ عمومی شرق شناسی خدابخش در سرتاسر ایران مخصوصاً و در سرتاسر جهان عموماً، مورد توجه و احترام ویژه می باشد و در کشور پاکستان نیز این کتاب خانه شهرت فراوان دارد۔ بنابراین دانشمندان و محققان از شش جهت جهان چهره های خود را به سوی کتاب خانهٔ خدا بخش گردانیده اند و دیدگان خود را به نوادر خطی و چاپی آن دوخته اند همواره با نامه و تقاضا نامه ها درخواست کتاب چاپی و مجلهٔ جرنل و فهرست های آن کتاب خانهٔ ارجمند را دارند و نیز برای فتوکپی یا فتواستیت و میکروفیلم از نسخه های خطی مورد نیاز درخواست می کنند۔ به همهٔ این درخواست ها و نامه ها، پاسخ مثبت داده می شود و در حقیقت خدمات علمی و تاریخی و ادبی کتاب خانهٔ خدابخش زیر نظر استاد عابد رضا بیدار به بهترین طریقه و سریع ترین زمان در اختیار جهان علم و

ادب قراری گیرد مثلاً نسخہ خطی کلیات ''ابوالبرکات منیر لاہوری'' در کتاب خانہ خدا بخش موجود است و محفوظ و مضبوط۔ کتاب خانہ گنج بخش مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان برائے میکرد فیلیم آن نامہ نوشت۔ بسیار زود آن را تہیہ کردند و ارسال داشتند۔ ''فرہنگ زفان گویا'' کہ اخیراً از طرف کتاب خانہ خدا بخش چاپ و نشر شدہ است، واقعاً شاہکار است۔ منتخب تذکرۂ بسیار مہم ''صحف ابراہیم'' افست کردن مجلہ با عکس ہای تاریخی و اسناد و مدارک ادبی و ہنری و فلسفی و طبی و غیرہم، خدمت بزرگ بہ عالم کثریت خاصہ بہ شناخت ہندستان بہ سرتاسر جہان است۔ کتاب خانہ خدا بخش گنجینۂ میراث عظیم مردم ہندوستان است۔

انتشارات کتاب خانہ خدا بخش مشتمل بر فہرست ہای فارسی و عربی و اردو و انگلیسی و ہندی می باشد کہ خدمت بزرگی برای شناختن گنجینہ ہای خدا بخش می باشد۔ دیگر رسالہ ہا و کتاب ہای تاریخی و ادبی است، مانند ''طلسم ہوشربا'' کہ یک اثر عظیم داستانی اساطیری و تاریخی است در دہ جلد ضخیم۔ این آثار ارزندہ، ہمہ فرہنگ و تمدن بشری را در بر دارند و بویژہ میراث عظیم مردم ہندوستان است کہ با چاپ و نشر آنہا، فواید آنہا بہ ہمۂ جہانیان می رسد۔

مجلۂ جرنل کہ تا کنون ۵۶ شمارہ از آن چاپ شدہ است، در حقیقت یک دائرۃ المعارف بزرگ دانش و عرفان و تاریخ و ہنر ہندستان مخصوصاً و جہان اسلام عموماً می باشد، این مجلہ را ہر کسی کہ می خواہد ہندستان را بشناسد و ہر کس کہ می خواہد جہان اسلام را بشناسد، بہ ناچار باید داشتہ باشد و آنرا مطالعہ کند و از آن بہرہ مند گردد۔

دانشمندان ایرانی و مراکز علمی و دانشگاہ ہای ایران و پاکستان از این کتاب خانہ خدا بخش در ہندستان فواید علمی و بہرہ ہائی تاریخی می گیرند، بدین جہت مسؤلان این کتاب خانہ باید مورد تشویق و تمجید قرار گیرند از جملہ استاد دکتر عابد رضا بیدار کہ با قلم توانائی او، جان و دل ما توانائی می گیرد و با نوشتہ ہای او چشم ما روشن می شود، پایندہ باد کتاب خانہ خدا بخش۔ زندہ باد استاد عابد رضا بیدار۔

(خدا بخش جرنل نمبر ۷۵-۷۷، ۱۹۹۲ء)

جاوید اشرف
اسسٹنٹ لائبریرین،
خدا بخش لائبریری، پٹنہ

ایک ادارہ
جو صدی پورا کرتے کرتے ایک تحریک بن گیا

خدا بخش لائبریری جو اپنے بیش بہا نادر قلمی ذخیروں کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے، خدا بخش لائبریری جو اپنی علمی ادبی سرگرمیوں، تحقیقی وتدوینی کارناموں سماجی وملی کارگزاریوں کے سبب ایک زندہ تحریک بن گئی ہے، خدا بخش لائبریری جسے اپنی نیک نامی، خوش انتظامی اور خدمت گزاری کے سبب پورے ہندوستان میں ایک فعال اور بے مثال ادارہ تصور کیا جاتا ہے، خدا بخش لائبریری جسے بہار کا ایک نامور سپوت، اپنی پوری دولت لٹا کر تنکا تنکا جمع کر کے علم وادب کا اتنا بڑا سرمایہ قوم کے ہاتھوں سونپ کر یہ کہتا ہوا اس جہان فانی سے گزر گیا۔ ع

اے اہل ادب آؤ یہ جاگیر سنبھالو

خدا بخش مرحوم کا بخشا ہوا یہ گرانمایہ سرمایہ "خدا بخش لائبریری" کی شکل میں عظیم آباد کی سرزمین پر ماضی کی عظمتوں کا بلند مینارہ بنا کھڑا ہے اور اپنے سینے میں علم وادب اور تہذیب و ثقافت کی شمع جلا کر دور دور تک اپنی ضوفشانیاں بکھیر رہا ہے۔ پیاسے دور دور سے اس چشمہ علم و عرفاں پر اترتے ہیں اور گھونٹ گھونٹ پی کر اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ سال رواں میں یہ لائبریری اپنے قیام عمر کے سو سال پورے کرنے جارہی ہے، یہ سال خدا بخش صدی کا سال ہے، جشن صدی کا سال ہے، یہ سال خدا بخش لائبریری کی اب تک کی ترقیوں اور کارگزاریوں کے محاسبے کا سال ہے، یہ سال خدا بخش لائبریری کے دوسری نئی صدی میں داخلے اور اگلی صدی کی ترقیاتی منصوبہ سازی کا سال ہے۔

خدابخش لائبریری نے صدی جشن کے لیے ایک تفصیلی پروگرام بنایا ہے جس کی تیاری زور شور سے چل رہی ہے، اس جشن صد سالہ کے موقع پر جنوبی ایشیائی اور وسط ایشیائی مطالعات فارسی و عربی اور اردو ادبیات، علوم اسلامیہ، طب، تصوف، تقابلی مذاہب، قومی یکجہتی اور ہندوستان کی مشترکہ تہذیب، تاریخ وثقافت کے ممتاز ترین فاضلوں کو خدابخش صدی کے موقع پر بطور اعزاز ایک لاکھ روپے کا خدابخش ایوارڈ دیا جائے گا، اس طرح ایوارڈ کا یہ سلسلہ آگے بھی رواں رہے گا اور سال بسال اسی قدر خطیر رقم کا ایوارڈ علم وادب کے بڑے بڑے خدمت گاروں کو تقسیم کیا جائے گا۔

اس جشن صدی کے موقع پر ہندومت، سکھ مت اور جین مت پر، ہندستان کے مذاہب پر اردو میں جتنا بڑا لٹریچر ہے ۱۹۴۷ء تک اور جتنا لٹریچر، اس کے اہم متون اور پوری فہرست لائبریری پیش کرے گی اور اس کے ساتھ دو دلوں کو ملانے والا لٹریچر جو کبیر سے شروع ہوا تھا، جس کے نغمے نانک نے گائے تھے چشتی نے گائے تھے، وہ لٹریچر سندر لال تک آ کر ختم ہوا، اس لٹریچر کے اہم متون بھی لائبریری پیش کرے گی، اسی طرح گیتا اور قرآن جیسی کتابیں اور اعلیٰ درجہ کی دوسری سو کتابیں چھاپ کر لائبریری عوام وخواص کے سامنے پیش کرے گی اور یہ ہندوستان میں تاریخ بنے گی کہ کم از کم ایک موقع پر ایک ادارے نے وہ فرض ادا کیا جو فرض کفایہ کہلاتا ہے۔ پروگرام یہی ہے کہ وہ کتابوں کا متوالا جو عمر بھر کتابوں سے محبت کرتا رہا، پل پل کتابیں جمع کرتا رہا، کتابوں ہی کے لیے جیتا رہا، کتابوں پر مرتا رہا ایسے کتابوں کے دلدادہ بانی کتب خانہ کی قائم کردہ خدابخش لائبریری کی جشن صدی بھی ایک یادگار کتابی صدی اور مثالی جشن صدی ثابت ہو۔

خدابخش لائبریری آج سے سترہ سال قبل اپنے قلب میں اپنے جواہر پاروں کو سمیٹے، لائبریری کے پرانے روایتی تصور کو اپنائے شہر کے ایک گوشے میں زمانے کی بے توجہی اور بے مروتی کی شکار ایک محدود اور محبوس کتاب خانے کی صورت میں جلوہ گر تھی لیکن اب گزشتہ سترہ سالوں سے خدابخش لائبریری، لائبریری کے پرانے تصور کو بدلنے پر چلی ہے۔ غلام ہندوستان

کے جہاں بہت سے تصورات تھے ان میں ایک لائبریری کا تصور بھی ہے جو چلا آرہا ہے کہ کتابیں منگالو اور ایشو کردو، آزاد ہندوستان کا پرانا تصور بدلنا چاہیے کہ یہ یونیورسیٹیز جو ایک فارمل ایجوکیشن کا ذریعہ ہیں ان میں انفارمل ایجوکیشن کا سب سے بڑا مرکز لائبریری بن سکتی ہے اس کے لیے جو بھی جدید سائنٹفک طریقہ کار ہو سکتے ہیں خدا بخش لائبریری اختیار کرتی رہی ہے اب اس سترہ سال کے عرصے میں خدا بخش لائبریری صرف ایک کتاب گھر نہ رہی بلکہ کارڈ سے کمپیوٹر تک بیشمار ترقیوں، نئے نئے شعبوں اور اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں، قومی و ملی، سماجی و معاشرتی خدمات کے سبب ایک متحرک وفعال تحریک بن چکی ہے۔

خدا بخش لائبریری کی ہمہ جہتی ترقیات میں جن نئے شعبوں کا اضافہ ہوا ان میں نشرو اشاعت کا شعبہ، ریفرنس شعبہ، رسائل و جرائد کا شعبہ، پریزرویشن کا شعبہ، کمپیوٹر کا شعبہ، ریپروگرافی کا شعبہ، مائکروفلم کا شعبہ، آڈیو ویڈیو ریکارڈنگ کا شعبہ، نیوز سروس کا شعبہ، توسیعی خطبات اور سمینار سمپوزیم کا شعبہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اتنے سارے نئے شعبوں کے اضافے کے ساتھ ساتھ لائبریری کی مالیات اور لائبریری اسٹاف میں بھی بدرجہا اضافے ہوئے۔ لائبریری کو حکومت ہند سے ملنے والی سالانہ گرانٹ جو ۱۷ سال قبل محض ۷۵ ہزار تھی وہ اب پچاس لاکھ سے زائد ہوگئی ہے۔

لائبریری میں فی الحال مطبوعہ کتابوں کی تعداد تقریباً سوا لاکھ ہے جن میں عربی، فارسی اور انگریزی کے علاوہ ہندی، بنگلہ، جرمنی، فرانسیسی، لاطینی، اطالوی، اسپینی، ترکی، جاپانی زبانوں کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کی تعداد تقریباً ۲۰ ہزار ہے، ان قلمی نسخوں میں سے تقریباً آدھے نسخوں کی توضیحی فہرست ۳۶ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، اسی طرح حال ہی میں عربی فارسی مخطوطات کے توضیحی کیٹلاگ کی آٹھ جلدوں کا ری پرنٹ بھی مع تصحیح و اضافہ شائع ہو چکا ہے جس میں لائبریری سائنس کے طریقے پر بہت ساری چیزوں کے انڈکس/ اشاریے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ مخطوطات کیٹلاگ کی ۱۶ جلدیں زیر ترتیب ہیں جو جلد ہی شائع ہو کر منظر عام پر آجائیں گی۔ اسی طرح فارسی، عربی مخطوطات کی ہینڈلسٹ بھی شائع شدہ

ہیں۔مرآۃ العلوم کے عنوان سے فارسی ہینڈلسٹ کی تین جلدیں شائع شدہ ہیں،چوتھی جلد پریس میں جاچکی ہے۔اسی طرح مفتاح الکنوز کے عنوان سے عربی ہینڈلسٹ کی تین جلدیں بھی شائع شدہ ہیں،اردومخطوطات کی ہینڈلسٹ کا جلد اول ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا تھا،دوسری جلد ۱۹۹۱ء میں شائع ہوگئی ہے۔جس میں پہلی جلد کو بھی سمیٹ لیا گیا ہے اب اس طرح جلد اول کو نقش اول کہنا چاہیے اور جلد دوم کو نقش ثانی۔اسی طرح جنوبی ایشیائی علاقائی سمینار کے ذریعہ جنوبی ایشیائی ممالک کے پانچ مختلف علوم پر غیر مطبوعہ مخطوطات کی ایک جامع فہرست (یونین کٹیلاگ) بھی خدابخش لائبریری نے تیار کر لی ہے ان میں سے عربی فارسی زبان میں طب کے موضوع پر قلمی نسخوں کا پہلا کٹیلاگ ۱۹۸۹ء میں شائع ہو چکا ہے،دوسرا کٹیلاگ تصوف کے موضوع پر پریس میں ہے۔علاوہ ازیں تین کٹیلاگ ابھی زیر ترتیب ہیں۔ان کے علاوہ بہار کے ذاتی ذخیروں میں موجود مخطوطات کی توضیحی فہرست سازی کا کام بھی جاری ہے۔

خدابخش لائبریری رسائل وجرائد کا بہت بڑا ذخیرہ بھی رکھتی ہے،رسائل وجرائد کا یہ شعبہ دن بدن بڑھتا پھیلتا اور پروان چڑھتا جا رہا ہے،آج خدابخش لائبریری کو خریداری، تبادلے اور تحفے میں حاصل ہونے والے ملک و بیرون ملک کے رسائل وجرائد کی مجموعی تعداد ۹۰۰ تک پہنچ چکی ہے جب کہ پندرہ سترہ سال قبل یہ تعداد ۱۰۰ سے زائد نہیں تھی۔لائبریری اردو،فارسی،عربی اور انگریزی اخبارات ورسائل کے قدیم وجدید ذخیروں کو مجلد شکل میں محفوظ کرتی ہے۔۱۹۷۵ء سے اردو انگریزی کے متعدد مقامی وغیر مقامی روزنامے،ہفت روزے، سہ روزے،پندرہ روزے اور ماہانہ جرائد بھی مجلد شکل میں پابندی کے ساتھ محفوظ کیے جارہے ہیں جو پہلے نہیں محفوظ کیے جاتے تھے۔

خدابخش لائبریری،رسائل میں شائع شدہ مضامین کی اشاریہ سازی کا کام بھی انجام دے رہی ہے لائبریری میں ۱۹۷۵ء تک محفوظ گذرے وقتوں کے ۲۷۷ اردو رسائل کے ہزارہا ہزار شماروں کے مضامین کا انڈکس کارڈ بھی تیار ہو چکا ہے جن کی مجموعی تعداد ۲ لاکھ سے اوپر ہے۔ اسی طرح ۱۹۷۶ء-۱۹۸۵ء کے رسائل کے مضامین کا دس سالہ اشاریہ موضوع وار تقسیم اور ابجدی

ترتیب کے ساتھ تیار ہو چکا ہے جو اشاعت کے مرحلے میں ہے۔ رسالہ تحریر اور عصری ادب کا توضیحی اشاریہ بھی لائبریری شائع کرا چکی ہے، اسی طرح رسالہ الناظر، ادیب، نگار، زبان و ادب، ہندوستانی، اقبالیات، (کشمیر)، جامعہ، معارف کا اشاریہ بھی زیر اشاعت ہے۔ اسی طرح لائبریری کے ذخیرۂ رسائل میں مولانا آزاد سے متعلق مضامین کا اشاریہ بھی زیر ترتیب ہے۔ اسی طرح یہ لائبریری ہندوستان کے اہم مشرقی کتب خانوں میں محفوظ اردو رسائل کا ایک یونین کیٹلاگ بھی تیار کرا رہی ہے جس پر کام جاری ہے اس سلسلے میں اب تک رضا لائبریری رامپور اور آزاد لائبریری علی گڑھ کے رسائل پر کام ہو چکا ہے، حیدرآباد، کلکتہ اور دوسرے مقامات پر کام باقی ہیں۔ ہند و پاک کی جامعات میں اب تک کی گئی اردو تحقیق کی فہرست بھی لائبریری شائع کر رہی ہے۔

خدا بخش لائبریری دوسری جگہوں سے اہم مخطوطات کے مائیکرو فلم بھی حاصل کر رہی ہے نیز ملک و بیرون ملک کی مشہور لائبریریوں کے کیٹلاگ کی نقل بھی جمع کر رہی ہے، اس طرح دنیا کے تمام بڑے کتب خانوں کی تقریباً پانچ سو مطبوعہ و غیر مطبوعہ فہرست مخطوطات لائبریری حاصل کر چکی ہے اس طرح خدا بخش لائبریری میں بیٹھ کر پوری دنیا کے اہم کتب خانوں کے مخطوطات کی سیر کی جا سکتی ہے۔

ایک شعبہ ابھی حال میں وڈیو کیسٹ اور آڈیو کیسٹ کا بھی قائم کیا گیا ہے تاکہ مشاہیر کی آوازیں صدا بندی اور فلم بندی کے بعد محفوظ کر لی جائیں۔ ایک اور چیز شروع کی گئی ہے کہ مصنفوں سے ان کی تصانیف کے مسودے حاصل کر لیے جائیں جو چھپنے کے بعد عموماً پھینک دیے جاتے ہیں تاکہ وہ آئندہ ریسرچ کا موضوع بن سکیں۔ مشاہیر کے خطوط کا البم بھی لائبریری تیار کر رہی ہے۔ اس طرح معاصر اسلام کا بھی ایک شعبہ قائم ہے جس میں عالم اسلام کی تمام دستاویزیں جمع ہوں گی، اسی طرح اسلامی سائنس کے موضوعات پر مضامین پہلی بار جمع کیے گئے ہیں جن میں علی گڑھ کے شبیر احمد خاں غوری کے کارنامے، پروفیسر حسن عسکری، قاضی عبدالودود کے کارنامے یہ سارے پچیس جلدوں میں تیار ہو گئے ہیں۔

اسی طرح تحریک آزادی کی دستاویزوں کا ایک بڑا ذخیرہ بھی خدا بخش لائبریری میں

محفوظ ہے، راجاؤں مہاراجاؤں اور مسلم بادشاہوں کے فرامین بھی لائبریری جمع کر رہی ہے جن میں خصوصیت کے ساتھ مسلم حکمرانوں کے ذریعہ مندروں، عبادت گاہوں کو دی گئی جاگیروں کے فرامین قابل ذکر ہیں۔

خدابخش لائبریری کے اشاعتی شعبہ سے مشرقی علوم وادبیات پر ایک دستاویزی مجلّہ خدابخش لائبریری جرنل (سہ ماہی) پوری پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اب تک اس مجلّے کے ۵۷ شمارے منظر عام پر آچکے ہیں، اسی طرح قدیم ادبی رسائل جو اب نایاب ہو چکے ہیں مثلاً چکبست کا رسالہ ''صبح امید''، پیارے لال شاکر کا رسالہ ''العصر''، نوبت رائے نظر کا ''ادیب''، قاضی عبدالودود کا رسالہ ''معیار''، خوشتر منگرولی کا رسالہ ''زبان'' لائبریری بتمام وکمال شائع کر چکی ہے۔ ''زمانہ''، ''ندیم''، ''الناظر'' اور رسالہ ''ہندوستانی'' سے انتخاب بھی لائبریری شائع کرنے جا رہی ہے۔

لائبریری اپنے نادر و نایاب مخطوطات کو بھی ترتیب و تدوین کے بعد شائع کرتی ہے، اس سترہ سال کے دوران مخطوطات میں گلزار ابراہیم، مجمع النفائس، باغ معانی، صحف ابراہیم، مثنوی تصویر محبت، شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان، قطعات حسرت عظیم آبادی، کنز التواریخ، مثنوی گلزار نسیم، فرہنگ زفان گویا، شائع ہو چکے ہیں، اسی طرح دیوان حافظ، دیوان مصحفی، دیوان موبد کے نسخوں کی طباعت بھی ہو چکی ہے ان پر مقدمے باقی ہیں، کام جاری ہے۔ اسی طرح مکتوبات صدی، دیوان نوازش کے نسخے بھی زیر ترتیب ہیں۔

خدابخش لائبریری نے عہد شاہ عالم کے ایک محاورات کی لغت بھی شائع کی ہے جنھیں ہندی یا اردو دونوں محاورات کہے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح بہار اردو لغت کی ایک جلد بھی شائع ہو چکی ہے دوسری جلد تیار ہو رہی ہے۔ فرہنگ آصفیہ پر قاضی عبدالودود کی کمنٹری بھی لائبریری شائع کر چکی ہے اسی طرح مغل پینٹنگ پر، اسلام اور ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر، علی گڑھ تحریک پر، قومی یک جہتی پر، اورنگ زیب پر، امیر خسرو پر، افسانہ، داستان، تذکرہ پر، جدید غزل گو پر لائبریری متعدد کتابیں شائع کرا چکی ہے تذکرہ میں تذکرہ کاملان رامپور، داستان میں دس

جلدوں پر مشتمل مکمل داستان مع مقدمہ طلسم ہوشربا بھی شائع کر چکی ہے اس طرح لائبریری کے اشاعتی شعبے میں اب تک سو کے قریب معرکۃ الآرا کتابیں شائع ہو چکی ہیں، دیگر بہت ساری کتابیں زیر طبع ہیں خدا بخش صدی جشن کے موقع پر اسی قسم کی دوسری سو اہم کتابیں لائبریری شائع کر کے پیش کرنے جا رہی ہے جن میں ہندی میں اور ہندو مذہب پر اب تک مندرجہ ذیل کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ ہے۔

ہندو تیوہاروں کی دلچسپ اصلیت، ترجمہ گیتا از مہاتما گاندھی، گیتا کا اردو ترجمہ اجمل خاں، گیتا کا اردو ترجمہ (لالہ لاجپت رائے) اور ہندی میں شاہ دلدار کے صوفیانہ خیالات پر مبنی ان کے قطعات، شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کا قرآن کی متعدد سورتوں کا خوبصورت ترجمہ ''من موہن کی باتیں'' اورنگ زیب پر ڈاکٹر اوم پرکاش کی کتاب جو اب تیسرے ایڈیشن میں جا رہی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد پر ڈاکٹر اجے انوپم کی کتاب بھارتیہ راشٹریہ آندولن اور مولانا ابوالکلام آزاد، جزیہ پر ایک تفصیلی کتاب، پھر مزید جہتوں میں ٹکر کے شاہکار کا اردو ترجمہ، فرقہ پرستی اور قومی یکجہتی پر خدا بخش خطبات کا اردو ہندی ورژن، اسی طرح اس جشن صدی میں پیش کی جانے والی دوسری زیر طبع کتابوں میں بی این پانڈے کی کتاب گاندھی جی اور ہندو مسلم ایکتا، مرآۃ الاحوال جہاں نما، ہند عہد اورنگ زیب میں، آئین اکبری، اعمال نامہ سر رضا علی، عبدالمالک آروی کی کتاب اقبال اور اس کا پیغام، تذکرہ مسرت افزا، حسن سمیع کی بیاض، خلفائے راشدین اور اہل بیت، دیوان دل، دیوان ضاحک، دیوان ہوس، رسائل دیدار، سفرنامہ حجاز، کتبات عظیم آباد، گروگرنتھ اور اردو، ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی میں مسلمانوں کی کوششیں، کتاب المشجر، حکایات لقمان، ردولوی کی کتاب میرا مذہب، منہاج السالکین، مفتاح الکمال از اسماعیل بن شاہ عالم عبدالعزیز، جواہر نامہ از محمد اشرف بن الحسن، ڈیسائی کی ڈائری، اصلاح، گلستان سعدی، پنجابی اور اردو، پیغام مولانا آزاد، تاریخ اودھ حصہ اول، دساتیر، شریمد بھگوت گیتا، کلمات الصادقین۔ مسلم انسکرپشنس ایٹ پٹنہ، اسی طرح مدرسہ سسٹم پر مقالات اور اصلاحی تجاویز وغیرہ۔ اس طرح یہ سو نادر و نایاب کتابوں کی

اشاعت کا جشن ہوگا جو خدا بخش جشن صدی کے شایانِ شان ہوگا۔

خدا بخش لائبریری اپنے توسیعی خطبات اور سیناروں میں پڑھے گئے مقالات بھی اپنے جرنل میں اور کتابی صورت میں شائع کرتی رہی ہے۔ مشاہیر کی آپ بیتیاں بھی شائع کر رہی ہے جس میں مسعود حسین خاں کی آپ بیتی ''ورود مسعود'' اور، ڈاکٹر اقبال حسین کی ''داستاں میری'' شائع ہو چکی ہیں۔ وامق جونپوری اور کچھ دوسرے بزرگوں کی آپ بیتیاں بھی شائع ہو رہی ہیں۔

خدا بخش لائبریری کے توسیعی، ترقیاتی اور تعمیری منصوبوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ عمارت کے توسیعی پروگرام میں لائبریری کے احاطے میں ایک شاندار، ایئر کنڈیشنڈ سہ منزلہ عمارت کی تعمیر بھی ہوئی ہے جس میں ایک شاندار آڈیٹوریم بھی ہے اور لائبریری سے استفادے کے لیے باہر سے آنے والے مہمانوں اور ریسرچ اسکالروں کے لیے آسائش کے پورے لوازمات کے ساتھ چند کمروں کا ایک گیسٹ ہاؤس بھی شامل ہے۔ اسی طرح لائبریری کے ایک حصے میں چار منزلہ دوسری نئی عمارت کی تعمیر کا بھی منصوبہ ہے۔

خدا بخش لائبریری نے گذشتہ دو سالوں سے مشرقی کتابداری سائنس کی تعلیم و تدریس کے لیے پوسٹ گریجویٹ کے معیار کا ایک باضابطہ مشرقی کتاب داری کورس کا بھی آغاز کیا ہے جس کی تعلیم ہندوستان میں کہیں نہیں ہوتی اور جو یقیناً مشرقی کتب خانوں کے لیے بہت اہم ہے۔ خدا بخش لائبریری ملک وملت کے افراد کو کتابوں سے قریب کرنے ان میں کتابی ذہن پیدا کرنے، علم و آگہی کو عام کرنے اور ذہن کی گرد صاف کرنے کے لیے وقت کے نئے نئے تقاضوں کے تحت نت نئے موضوعات پر سمینار و سمپوزیم اور توسیعی خطبات کا اہتمام بھی کرتی ہے۔ اسی طرح علم وفن کے نشر و توسیع اور بین الاقوامی مفاہمت کی فضا قائم کرنے کے لیے بین الاقوامی سمینار بھی کراتی ہے۔ اب تک اردو مخطوطات، طب، تصوف، تاریخ، قرآنیات کے مخطوطات پر بین الاقوامی سطح کے پانچ جنوبی ایشیائی علاقائی سمینار منعقد ہو چکے ہیں۔ اسی طرح ملکی سطح پر اردو کی بقا و ارتقا، اردو تخلیقات وتحقیقات کی معیار بندی کے مسئلے پر، اردو دانشوری کے

مسئلے پر، فرقہ واریت اور قومی یکجہتی کے مسئلے پر، نصابی کتابوں میں پھیلے ہوئے زہر کے مسئلے پر، ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر، مدارس کے نصابِ تعلیم، طریقۂ تعلیم میں اصلاح کے مسئلے پر، سامنے کے درپیش حالات پر اور اس قسم کے مختلف علمی، ادبی، قومی و ملی، سماجی و معاشرتی موضوعات پر سمینار، سمپوزیم، مذاکرے، مباحثے اور توسیعی خطبات کراتی رہی ہے۔ ایک کل ہند اردو ریسرچ کانگریس کا مرکزی نکتہ ہی یہی تھا کہ اردو کی جڑیں تو سوکھ رہی ہیں اور پتوں پر چھڑکاؤ ہو رہا ہے آخر اردو کیساتھ یہ ٹھٹھا مخول کب تک! اسی طرح گذشتہ اردو ریسرچ کانگریس جو اس قیامت کی گھڑی میں برپا ہوئی کہ جب پورا ہندوستان فرقہ واریت اور منافرت کی آگ میں جل رہا تھا، اس وقت کانگریس کا پورا رخ ہی اس سمت موڑ دیا گیا کہ اس قیامت کی گھڑی میں اگر دانشور خاموش رہتا ہے تو وہ ایسے جرم کا ارتکاب کر رہا ہے جو قوم وملت کی تباہی کا باعث ہو سکتا ہے اس لیے اس اہم مسئلے پر خصوصی بحث ہوئی کہ موجودہ ملکی اضطراب میں دانشور کی دانشورانہ اقدامیت کی آج ملک کو کتنی ضرورت ہے دانشوروں نے ہر اچھے برے حالات میں ملک کی ڈگمگاتی کشتی کو ترانے میں اہم کردار ادا کیا ہے آج اس طوفان سے مقابلے کے لیے دانشوروں کو ہی آگے بڑھنا ہوگا آج اگر ہم سے اتنا بھی نہ ہوا تو آنے والی نسلیں ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گی، اپنے وطن عزیز کی محافظت میں آج بھی اگر اردو دانشوروں نے یہ کام دوسرے غیر دانشوروں پر چھوڑے رکھا تو تاریخ کے صفحات میں یا تو سرے سے ان کا نام ہی نہ آئے گا یا آئے گا بھی تو لکھا جائے گا کہ روم کے نیرو کی طرح یہ بانسری بجانے میں مگن تھے جب ہندوستان نفرت اور حماقت کی آگ میں جل رہا تھا۔

اسی طرح تاریخ کی کتابوں میں جو زہر پھیلا ہوا ہے چھٹے سے لے کر دسویں درجے تک اس پر بیالیس سال سے ہندوستان میں کسی جگہ غور نہیں کیا گیا۔ خدابخش لائبریری نے اس پر غور کیا، ملک بھر کے ستر ماہرین تاریخ جمع کیے چار سو کتابیں جمع کیں پانچ دن اس پر مذاکرے ہوئے اور آٹھ سو صفحات میں اس کا مواد جمع کیا گیا یہ مکمل رپورٹ بھی جلد ہی شائع ہونے والی ہے۔

اسی طرح مدرسہ سسٹم جو بوعلی سینا پیدا کر سکتا ہے، البیرونی پیدا کر سکتا ہے، رازی

غزالی پیدا کرسکتا ہے ابن تیمیہ پیدا کرسکتا ہے، ابن رشد، خیام، فیضی پیدا کرسکتا ہے، شاہ ولی اللہ پیدا کرسکتا ہے، طوسی پیدا کرسکتا ہے، ابوالفضل پیدا کرسکتا ہے، سید احمد شہید، سید اسمٰعیل شہید پیدا کرسکتا ہے، حالی پیدا کرسکتا ہے، مولانا ابوالکلام آزاد پیدا کرسکتا ہے وہ مدرسہ سسٹم آج اتنا حقیر کیوں ہوگیا ہے۔ آزاد ہندوستان نے آج تک اس پر غور نہیں کیا، یہ مدرسہ سسٹم اور یونی ورسٹی سسٹم ایک دوسرے کے قریب کیوں نہیں آسکتے، مدارس کے نصاب میں عصر حاضر کے تقاضوں کے تحت اس میں کچھ تبدیلی یا ترمیم کیوں نہیں لائی جاسکتی۔ ان مسئلوں پر گفتگو کے لیے رانچی اور دہلی میں خدا بخش لائبریری نے پورے ہندوستان کے ممتاز علماء اور دانشوروں کو اکٹھا کیا، کافی بحثیں ہوئیں تبادلہ خیالات ہوئے، بہت ساری تجویزیں سامنے آئیں، مدرسہ سسٹم کی تفصیلی رپورٹ اور تجاویز بھی خدا بخش صدی کے موقع پر سامنے آنے والی ہیں۔

خدا بخش لائبریری کو حکومت ہند سے گذشتہ پندرہ سالوں کے دوران یہ اعزاز بھی ملا ہے کہ مشرقی علوم و ادبیات سے تعلق رکھنے والی پورے ہندوستان کی مشرقی لائبریریوں کو خدا بخش لائبریری کی سفارش پر گورنمنٹ آف انڈیا مالی گرانٹ بھی دیتی ہے۔

خدا بخش لائبریری کو ایک تحقیقی ادارہ کی حیثیت سے پی ایچ۔ ڈی، ڈی۔ لٹ کے ریسرچ کے لیے ہندوستان کی چھ یونیورسٹیوں سے منظوری بھی ملی ہے (یعنی کشمیر، گلبرگہ، جامعہ ملیہ، شانتی نکیتن، مگدھ اور بہار یونی ورسٹی)۔ یہ اعزاز بھی ہندوستان کی کسی دوسری لائبریری کو حاصل نہیں ہے صرف ایک اور لائبریری ہے جسے کسی ایک یونی ورسٹی نے منظوری دی ہے۔

خدا بخش لائبریری تحقیقی کام کرنے والے کو وظائف بھی دیتی ہے، یہ وظائف جونیر فیلوشپ، سینئر فیلوشپ، نیشنل فیلوشپ، ٹائم باؤنڈ پروجکٹ فیلوشپ، وزٹنگ فیلوشپ، فارسی عربی اردو کے نادر مخطوطات کے ترجمہ اور تدوین کی فیلوشپ کی شکل میں لائبریری اسکالروں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور ان سے تحقیقی کام کراتی ہے۔

خدا بخش وظائف کے ذریعہ بہت سارے تحقیقی کام انجام پذیر ہوئے اور بہت سارے کام جاری ہیں، یہ تحقیقی کام آزاد ریسرچ کی صورت میں بھی ہوتے ہیں اور پی ایچ۔ ڈی

کی صورت میں بھی۔ مختلف اسکالروں کے ذریعہ اب تک کے تکمیل شدہ کاموں میں مجموعہ نغز از وہاج الدین علوی، نسخہ عرفات العاشقین از لئیق النساء، دستور المفسرین (ریحانہ ضیا) تدبیر الحبلہ والصبیان اور خلاصۃ التذکرہ فی الطب التجربہ اور سفرنامہ روم، مصروشام (وصی اللہ فیصل اعظمی) لفظیات حاتم وجعفرزٹلی (طاہر بیگ) لفظیات یک رو، وسجاد (عبدالسلام) سوانح امداد امام اثر (عابد امام زیدی) قراۃ لٹریچر (حمید الدین) بہار اردو لغت (احمد یوسف) ہندوستانی جامعات میں تحقیق (جاوید اشرف) انیسویں صدی کی اردو صحافت (شعائر اللہ خاں، پی ایچ۔ ڈی مقالہ) ہندوستانی مذاہب کی ببلیو گرافی، اشاریہ تحریر، عصری ادب، نگار (عطا خورشید) جامعہ کا اشاریہ (شعائر اللہ خاں) لفظیات طلسم ہوشربا (شاہجہاں قاسمی) البرہان فی ترتیب القرآن (شاہ جہاں قاسمی) اشاریہ ہندوستانی (محمود ہاشمی) قابل ذکر ہیں، یہ کام جونیر سینئر ریسرچ فیلوز نے مکمل کیے۔ ان میں کچھ موضوعات پر کام جاری ہے۔ مثلاً گیسو دراز سے شیخ برہان الدین تک دکن میں تصوف کا مطالعہ (ڈاکٹر افتخار احمد مدنی) مصحفی وغیرہ۔

نیشنل فیلوشپ کے تحت ڈاکٹر محمود حسن نے انگریزی میں "ہندوستان عرب مؤرخین کی نظر میں" کے موضوع پر بہت اچھا کام مکمل کرلیا ہے۔

وزٹنگ فیلوشپ کے تحت کیے گئے کاموں میں ثناء اللہ پانی پتی (ڈاکٹر رضوان الدین خاں) عہد وسطی کے ہندوستانی مخطوطات کی روشنی میں سبزیوں اور جڑی بوٹیوں کی تاریخ اور ان کا استعمال (ڈاکٹر جاوید اشرف) ملفوظ لٹریچر کلمات الصادقین میں سماجی وسیاسی عناصر (ڈاکٹر ضمیر الدین صدیقی) تصوف پر خدا بخش مخطوطات (ڈاکٹر اقتدار حسین صدیقی) مجمع الافکار کا انتخاب مع ترجمہ (ڈاکٹر اقتدار حسین صدیقی) ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کا ادب (ذکیہ جیلانی) ۱۸ ہویں صدی بنگال کی تہذیبی تاریخ (ڈاکٹر عبدالسبحان) مغل ہندوستان میں خطاطی (ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ڈیسائی) ہندوستان اور ویسٹ ایشیا میں کتابی علوم (ڈاکٹر محمود حسن قیصر) ۱۹۳۵ء-۱۹۵۵ء کے دوران اردو اور عربی افسانوں کا تقابلی مطالعہ (ڈاکٹر مہدی انصاری) نسخہ الاسد والغواص کی تنقیدی تدوین (ڈاکٹر مہدی انصاری) حیرت نامہ سفرا (ڈاکٹر قمر غفار) تحریک

آزادی آخری دہائی میں (شہید الحسن) اردو ادب کی تاریخ (ڈاکٹر محمد انصار اللہ) اسلامی معاشیات (ڈاکٹر محمد شبیر خاں) اردو گرامر (ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ) مولانا آزاد کی غزلیات (ڈاکٹر غفار شکیل) حیرت نامہ سفرا کا انگریزی ترجمہ (مہر افشاں فاروقی)۔

پروجکٹ کے طور پر مختلف اسکالروں سے کرائے گئے کاموں میں، معین احسن جذبی، ڈاکٹر اقبال حسین، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، وامق جونپوری، عطاء اللہ پالوی اور قیوم قائد کی آپ بیتیاں ہیں ان آپ بیتیوں میں صرف قیوم قائد کی آپ بیتی ابھی مکمل نہیں ہوسکی ہے کام جاری ہے۔ اسی طرح دوسرے تکمیل شدہ پروجکٹ کے کاموں میں تحریک آزادی میں بہار کے مسلمانوں کا حصہ (تقی رحیم) منشی نول کشور کی خدمات (امیر حسن نورانی) نسخہ سوانح دکن اور پنجہ آفتاب کی تدوین (ڈاکٹر سید نجم الدین علی خاں) نادر اسلامی مخطوطات کا تجزیہ (ابو محفوظ الکریم المعصومی) اردو فارسی عربی مخطوطات کی یونین کیٹلاگ سازی (محمود حسن قیصر —— کام جاری) نسبتی اور خریطۂ جواہر کے مستحبات کی تدوین (نواب رحمت اللہ خاں شیروانی) دکنی تہذیب (جیلانی بانو) روہیلہ تہذیب (رئیس رامپوری) اردو میں ریفرنس کی کتابیں (مہر الٰہی) رفیع احمد قدوائی کی سوانح (انور جمال قدوائی —— کام جاری) تحفۃ السعداء کا ترجمہ اور تدوین (حکیم یوسف وحکیم حسین) کتاب البول کی تدوین اور ترجمہ (حکیم اسرار الحق) مکتوبات رشید احمد صدیقی کی تدوین (ڈاکٹر مسعود حسین خاں) سائنسی موضوعات پر عہد وسطی کے مخطوطات کی تدوین (شبیر احمد خاں غوری) مناظرہ لٹریچر (عطاء اللہ پالوی) عربی فارسی اردو کی غیر منقوط تحریریں (عطاء اللہ پالوی) فرہنگ زفان گویا کی تدوین (ڈاکٹر نذیر احمد) گلزار ابرار کی تدوین (ڈاکٹر محمد ذکی) شبلی لائبریری لکھنؤ کے نادر مخطوطات (رئیس نعمانی) آئینۂ حیرت کی تدوین (رئیس نعمانی) ہندوستانی کتاب خانوں میں محفوظ طبی مخطوطات (نظام الدین کاظمی) خدابخش، رضا، ہمدرد، ایشیاٹک، آصفیہ کتابخانوں کے نادر طبی مخطوطات (نظام الدین کاظمی) حکیم علوی خاں کے کارناموں کا تعارف (نظام الدین خاں)۔

خصوصی پروجکٹ پر کیے گئے کاموں میں بہار میں آزادی کی تحریک (کامریڈ صبیب

الرحمٰن) بہار کی تہذیبی تاریخ (واقف عظیم آبادی)، ڈگر کی کتابوں کا ترجمہ (عابد امام زیدی)۔

خدابخش لائبریری کے شعبہ اشاعت سے دوسرے محققین کے اہم کاموں کی اشاعت بھی ہوتی ہے، جن میں مولانا آزاد کا ہفتہ وار پیغام (ابوسلمان شاہجہاں پوری) پٹنہ کی یادگاریں (فصیح الدین بلخی) پروفیسر سید حسن عسکری کے مجموعہ مقالات چار جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں، مزید چھ جلدوں کی اشاعت کی اسکیم ہے اسی طرح مدن موہن مالویہ پر مولانا مودودی کی کتاب، پٹنہ کے مشاہیر کا تذکرہ یادگار روزگار کی دس جلدیں جو زیر اشاعت ہیں، مولانا آزاد کے غیر مطبوعہ خطوط، مولانا آزاد کی یاد میں (ہندی) مولانا آزاد کی یاد میں (اردو) مولانا آزاد پر اجے انوپم کی پی ایچ۔ ڈی تھیسس۔

لائبریری کے جاری تحقیقی کاموں میں دیوان موبد، دیوان حافظ، دیوان راسخ، دیوان نوازش، دیوان آبرو پر کام جاری ہے، اسی طرح اورنگ زیب کی ہدایت پر مرتب کردہ پہلی ہندی ڈکشنری، اسی طرح اٹھارہویں صدی کی ترتیب کردہ دوسری ہندی ڈکشنری، اسی طرح نسخہ زبدۃ الرموز، قرآنیات پر اہم مخطوطات، آزادی سے قبل کی اردو دانشوری، اردو کے اہم مخطوطات، تذکرہ مسرت افزا (شاہ اسماعیل) کتاب المشجر (قمر آستاں خاں) آداب المریدین (شاہ اسمٰعیل) عربی خط کا ارتقاء عربی فارسی مخطوطات کیٹلاگ نمبر ۲ تا نمبر ۲۴ کے تصحیح واضافے پر تیزی سے کام جاری ہیں۔

خدابخش لائبریری میں تراجم کا کام بھی زور وشور سے چل رہا ہے۔ علی اشرف کی ایک انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ بعنوان مسلم خواص، تقی رحیم صاحب نے کیا ہے، راج موہن گاندھی کی کتاب کا ترجمہ '' آٹھ بڑے مسلمان'' کے نام سے ہو چکا ہے، نقی احمد ارشاد نے بھی سنتقالی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے اور بہت ساری مختلف زبانوں کی کتابوں کا اردو ہندی ترجمہ لائبریری کرا رہی ہے۔

خدابخش لائبریری کا ایک خصوصی پروجکٹ بہاریات سے متعلق ہے اس پروجکٹ کے تحت بہار کے ہندی شاہکاروں کے تراجم، تذکرہ مشاہیر بہار، بہاری اردو لغت جلد اول، جلد

دوم بہار کے مسلمانوں کا حصہ تحریک آزادی میں، بہار کے کتبات، بہار کے مسلم خواص وغیرہ۔

خدابخش لائبریری نے ایک سلسلہ عصری اسلام کی دستاویزات کو جمع کرنے اور منظر عام پر لانے کا بھی شروع کیا ہے۔ عصری اسلام دوسرے لفظوں میں اپنے عہد کے اسلام کی فکری دستاویزات کی پیشکش کے منصوبہ کے تحت ہندی فکر کو اولین ترجیح دینا مقصود ہے۔ اس سلسلے کی پہلی پیشکش علی گڑھ تحریک کے عنوان سے شائع ہو کر منظر عام پر آئی، اس طرح یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے علماء، جامعہ ملیہ کے قیام کے پس پردہ اسلامیان ہند کی فکری، عملی تحریک پر مشتمل دستاویزات پر مخصوص ہوگا۔

پچھلے پندرہ سالوں میں کم از کم چار پانچ سو نوجوانوں نے اس لائبریری سے فائدہ اٹھایا، وہ پڑھتے بھی رہے اور لائبریری میں پارٹ ٹائم کام بھی کرتے رہے، یہ طریقہ سکھایا لائبریری نے، اس تجربے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سینکڑوں طالب علموں میں لائبریری میں کام کے دوران کتابوں کا اور کتب خانے کا ذوق پیدا ہوا، ان میں خود اعتمادی اور خود کفیلی پیدا ہوئی۔

زمانہ کتابوں سے بھاگنے کا ہے، کتابوں سے کس طرح محبت پیدا کی جائے، لوگوں میں پڑھنے کا شوق کیسے پیدا کیا جائے یہ سیکھا سکھایا اس لائبریری نے۔ لائبریری میں جتنے بھی جلسے سمینار مذاکرے ہوا کرتے ہیں مرکزی نکتہ کتاب ہوتی ہے، کیسے کتاب سے قریب لایا جائے، مدفون خزانوں کو کیسے لوگوں میں عام کیا جائے۔ جمہوریت کے دور میں کوئی کسی خزانے پر سانپ بن کر بیٹھا رہے دوسروں کو خزانے کے قریب آنے سے روک رکھے یہ علمی خزانے اور علم کے پیاسے کے ساتھ سراسر ظلم کے مترادف ہے۔

اسی طرح ہندوؤں میں اسلام سے محبت اور اسلام کی قدر و قیمت کا احساس جگانا کہ یہ ایک نعمت ہے جو ہندوستان کو تحفے کے طور پر ورثے میں ملی ہے اور مسلمانوں میں اس ملک کے اول درجے کے شہری ہونے کا احساس اور اس ملک سے جذباتی وابستگی ہو، اس کے لیے اور اس بہانے یہاں کے علوم اور اسلامی علوم دونوں سے یکساں محبت، یکساں قدر دانی اور دونوں کے لیے پوری محنت اور محبت کے ساتھ کام کرنے کا جذبہ پیدا کرنا، یہ خدابخش لائبریری کے پچھلے

پندرہ برس کے کاموں میں سب سے زیادہ نمایاں بات ابھرتی ہے۔

عام بات کہنے کی تفصیل سے ضرورت نہیں ہے جو لائبریری کے فرائض میں داخل ہیں کہ کیسے یہاں کے قیمتی سرمائے کو محفوظ کیا جائے اور اس کے لیے تازہ ترین سائنٹفک طریقے اختیار کیے جائیں کیسے اسے جدید ترین عہد میں پورے اعتماد کے ساتھ داخل کیا جائے۔ جہاں وڈیو گرافی سے ایک طرف کمپیوٹر سے دوسری طرف موجودہ اور آئندہ اسکالروں کے لیے پوری آسانیاں پیدا کرنے کے واسطے ایک طویل المدت منصوبہ بندی کے ساتھ ایک کثیر الجہاتی کام چھڑ گیا ہے۔ جس کے نتیجے میں آپ اپنے اہم ترین مشاہیر سے چلتے پھرتے اس لائبریری میں مل سکتے ہیں ان کی باتیں سن سکتے ہیں دوسری طرف پانچ منٹ میں پانچ ہفتے کا کام آپ کے لیے کمپیوٹر کر کے آپ کی رضا کے مطابق پیش کر سکتا ہے۔

اس سیاست آلود فضا میں جو آج کے دور کی سب سے بڑی پہچان ہے خدا بخش لائبریری ایک جزیرہ بن کر کام کرتی رہی ہے جس میں نادر کتابیں قیمتی مخطوطات، تازہ ترین سائنسی ذرائع حصول علم، آڈیو کیسٹ، وڈیو کیسٹ، کمپیوٹر کی خدمات، برصغیر اور مغربی دنیا کے مشاہیر کے خطبات، علم اور انسانیت کو بچانے کے لیے بے چین تڑپتے اظہار اور ہر اس فرض کفایہ میں اپنا حصہ بٹانے کے لیے اضطراب جس کے لیے آزادی کی تقریباً نصف صدی گزرنے کے بعد بھی کوئی نظر نہیں آتا، یہ جزیرہ، ان سب ساری کرنوں کو دور دور پھیلانے والا سرچ لائٹ، چوطرفہ پھیلے ہوئے سیاسی سیلاب کی زد میں آنے سے کب تک اپنے آپ کو بچا پاتا ہے۔ یہی اس کی صلابت کا امتحان ہوگا لیکن اس سے بھی بڑھ کر اگر یہ صرف اپنے آپ کو بچا لے گیا اور دوسرے اداروں کو اپنی اپنی جگہ تحریک بننے کا انسپائریشن، ولولہ نہ دے سکا تو بھی اس کی کامیابی مکمل نہیں کہلائے گی۔

یہ خدا بخش لائبریری زمانے کے بڑے بڑے حوادث وزلازل سے ٹکراتی پیچ وخم کھاتی اور ترقی کے منازل طے کرتی ہوئی، اپنے سو سال پورے کرتے کرتے امید و یاس کی اس دہلیز پر کھڑی ہمیں دعوت غور وفکر دے رہی ہے کہ زمانے کی آلائشوں سے اب تک پاک صاف یہ کتب

خانہ، خدا بخش مرحوم کے خونِ جگر سے سینچا ہوا یہ چمن، خدا بخش مرحوم کی امیدوں اور سنہرے خوابوں کا یہ نشیمن اگلی صدی میں قدم رکھتے رکھتے اور اگلی صدی طے کرتے کرتے کیا زمانے کی بری نظروں سے محفوظ رہ سکے گا، اور کیا زمانے کی آلائشات سے اپنا دامن بچا پائے گا۔ زمانے کا اندتا ہوا سیاہ بادل کب سے اس تاریخی نشیمن پر منڈلا رہا ہے اور بجلی گرانے کو تڑپ رہا ہے، وقت کی گرائی ہوئی ایک بجلی قصہ تمام کر سکتی ہے اور وقت کے ماچس کی ایک تیلی نشیمن پھونک سکتی ہے، یہ خدا بخش صدی، ایسی گھڑی، ایسے حالات اور ایسے امکانات سے ہمیں ہوشیار اور خبردار کر رہی ہے اور خدا بخش مرحوم کی روح بھی اپنے مرقد سے چیخ چیخ کر ہمیں یہ صدا دے رہی ہے۔

سینچا ہے اسے خون سے ہم تشنہ لبوں نے
تب جا کے اس انداز کا میخانہ بنا ہے



(تہذیب کراچی۔ جون، جولائی ۱۹۹۳ء)

خلیق انجم
دہلی

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری

ایک شخص کا اہم کارنامہ

سرزمین بہار ہندوستان کا غیر معمولی مردم خیز علاقہ ہے۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں اشوک جیسے عظیم انسان نے جنم لیا۔ بہار میں سنسکرت، عربی، فارسی اور اردو کے ممتاز نثر نگار اور شاعر پیدا ہوئے۔ یہیں موضع اوکھی ضلع چھپرا میں ایک صاحب تھے مولوی محمد بخش۔ ان کا تعلق پانچویں پشت میں قاضی ہیبت اللہ سے مل جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ہیبت اللہ غالباً وہی بزرگ تھے جو ''فتاویٰ عالمگیری'' کو مرتب کرنے میں شریک تھے۔ مولوی محمد بخش خود ایک عالم اور پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے۔ ان کے یہاں ۲ راگست ۱۸۴۲ء کو ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام خدا بخش خاں رکھا گیا۔ ابھی یہ بچہ دو ہی سال کا تھا کہ ان کا خاندان ترکِ وطن کر کے بانکی پور آ گیا۔ وہاں اس خاندان نے مستقل سکونت اختیار کر لی۔

خدا بخش خاں کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد پٹنہ کے ایک اسکول میں داخل ہوئے اور پھر کلکتے چلے گئے جہاں سے ۱۸۶۱ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کر کے پٹنہ واپس آ گئے۔ یہاں انھوں نے قانون کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ بدقسمتی سے والد بیمار پڑ گئے اور خدا بخش خاں پر گھر کے اخراجات کی ذمہ داری آ پڑی۔ انھیں پٹنہ کے ضلع جج کے یہاں ملازمت مل گئی۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے وکالت کا امتحان پاس کر لیا اور انھیں سرکاری وکیل کی حیثیت سے ۱۸۸۰ء میں ملازمت مل گئی۔ عمدہ کارکردگی اور اعلیٰ سماجی خدمات کی وجہ سے انھیں حکومت نے خان بہادر کے خطاب سے نوازا۔ ۱۸۹۵ء میں انھیں نظام حیدرآباد نے بلا کر نظام ہائی کورٹ حیدرآباد میں چیف جسٹس کے عہدے پر فائز کیا۔ خدا بخش خاں نے اس

عہدے پر لگ بھگ تین سال تک کام کیا۔ ۱۸۹۸ء میں پٹنہ واپس آکر پھر وکالت شروع کر دی۔ ۱۹۰۳ء میں انھیں حکومت نے سی۔ آئی۔ ای کے اعزاز سے نوازا۔ کہا جاتا ہے کہ خدا بخش خاں نے وکالت کے پیشے میں بہت شہرت اور دولت کمائی۔

خدا بخش خاں کے والد مولوی محمد بخش چونکہ اپنے عہد کے بہت بڑے عالم تھے، اس لیے ان کے پاس نادر و نایاب عربی، فارسی اور اردو کے مخطوطات اور مطبوعات کا بیش بہا ذخیرہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ پٹنہ میں ایک ایسی پبلک لائبریری قائم کریں جس سے اہل علم استفادہ کر سکیں۔ ابھی ان کی اس خواہش نے عملی صورت اختیار نہیں کی تھی کہ ۱۸۷۶ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ بستر مرگ پر انھوں نے اپنے بیٹے خدا بخش خاں سے خواہش ظاہر کی کہ وہ پٹنہ میں ایک عوامی کتب خانہ قائم کریں اور ان کے پاس جو چودہ سو عربی، فارسی اور اردو مخطوطات ہیں انھیں اس لائبریری میں محفوظ کر دیں۔ خدا بخش خاں اگرچہ پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے۔ انھوں نے ساری زندگی اپنے والد کی اس وصیت پر عمل کیا۔ پٹنہ میں ۲۹/اکتوبر ۱۸۹۱ء کو اورینٹل پبلک لائبریری کے نام سے ایک لائبریری قائم کی جس کا ایک باقاعدہ ٹرسٹ بنایا گیا۔ اس وقت تک خدا بخش خاں تقریباً چار ہزار مخطوطات اور مطبوعات جمع کر چکے تھے۔ انھوں نے یہ سب کتابیں اس لائبریری میں داخل کر دیں۔

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے ڈائرکٹر حبیب الرحمٰن چغانی صاحب نے اپنے ایک مقالے (مطبوعہ قومی آواز نئی دہلی، شمارہ ۲۲/جولائی ۲۰۰۰ء) میں لکھا ہے کہ ''خدا بخش خاں کو کتابیں جمع کرنے کا سودا تھا۔ وہ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے۔ انھوں نے محمد مقی نام کے ایک عرب کی خدمات حاصل کیں جو اٹھارہ سال تک پچاس روپے ماہوار پر ان کے لیے کام کرتا رہا۔ اس نے بلاد اسلامیہ عرب، شام، دمشق، مصر اور ایران سے مخطوطات جمع کرا کے ان کے سامنے ڈھیر کر دیے۔ خود ملک کے طول و عرض سے کتابیں ان کے پاس کھنچ کر آنے لگیں۔ وہ ایک ایسے خریدار کی حیثیت سے اُبھرے کہ جو کتاب کے منہ بولے داموں کے علاوہ کتب فروش کو آمد و رفت کا کرایہ بھی دیتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر بلکہ پہلی جنگ آزادی میں جب شاہان دہلی

اورنوابانِ اودھ کے کتاب خانے تباہ و برباد ہونے لگے تو نواب رام پور نے تیزی سے کتابیں جمع کرنا شروع کردیں۔ انھوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا اس لیے فاتح سپاہیوں سے فی مخطوطہ ایک روپے کے حساب سے خریدنے لگے۔ اس کے باوجود بہت سے مخطوطات بیرون ملک چلے گئے۔ خدا بخش خاں نے کتب اندوزی بہت بعد میں شروع کی تھی اور مقابلہ تھا نواب رام پور سے جہاں دولت وثروت ہم رکاب تھی۔ خدا بخش کو بہت جدوجہد کرنا پڑی۔ انھوں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ انجام کار کامیابی انھی کو نصیب ہوئی۔ مخطوطہ فروش سب سے پہلے انھی کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ اگر وہ مخطوطات نہیں بھی خریدتے تو بھی آمد ورفت کا کرایہ ادا کرتے تھے''۔ اِس وقت خدا بخش لائبریری میں بیس ہزار ایک سو ایک عربی، فارسی اور اردو مخطوطات اور دو لاکھ کے قریب نایاب اور جدید مطبوعات موجود ہیں۔

مشرقی علوم سے دلچسپی رکھنے والوں کی خوش نصیبی ہے کہ اس لائبریری کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے تحت دسمبر ۱۹۶۹ء میں اس لائبریری کو قومی اہمیت کا ادارہ بنا دیا گیا۔ مرکزی حکومت نے اس ادارے کے لیے ایک بورڈ قائم کیا جس کے Ex-officio صدر بہار کے گورنر ہوتے ہیں اور یہ ادارہ اب خودمختار ہے۔

اپنے قیام سے لے کر اب تک اس لائبریری میں ہر ممکن ذرائع سے اضافہ ہوتا رہا ہے۔ تقریباً ۲۸ رلائبریریوں کی کتابوں کو حاصل کر کے اس لائبریری میں داخل کیا گیا ہے۔ حاصل کیے جانے والے ذخیروں میں پٹنہ کا تحقیقاتِ اردو کلکشن، آرہ کا ڈاکٹر شمیم کلکشن، پٹنہ کا پروفیسر اختر اورینوی کلکشن، پٹنہ ہی کا آل انڈیا ریڈیو کلکشن، بہار شریف کا مدرسہ عزیزیہ کلکشن، پٹنہ کی خانقاہ سلیمانیہ کلکشن، ڈاکٹر اے۔ آر قدوائی کلکشن، جناب یونس سلیم کلکشن وغیرہ شامل ہیں۔ یہ سارے کلکشن وہ ہیں جو لائبریری کو تحفے کے طور پر حاصل ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ لائبریری نے اختر انصاری کلکشن، مولانا سعید احمد اکبرآبادی کلکشن، مختار الدین احمد کلکشن، مہر الٰہی کلکشن اور کلام حیدری کلکشن کی کتابیں بھی خرید کر اس لائبریری میں داخل کی ہیں۔ اس لائبریری سے استفادے کے لیے ہندوستان کے علاوہ تمام دنیا سے اسکالر یہاں آتے ہیں۔

ریڈنگ روم

اس لائبریری کا ایک ریڈنگ روم ہے جسے کرزن ریڈنگ روم کہا جاتا ہے۔ اس ریڈنگ روم میں اردو، ہندی اور انگلش کے اخبار اور رسائل مہیا کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں حوالے کے طور پر کچھ لغات اور دیگر کتابیں بھی رکھی گئی ہیں۔ یہ ریڈنگ روم پڑھنے والوں کے لیے دن میں بارہ گھنٹے کھلا رہتا ہے۔

شعبۂ حوالہ

اس لائبریری کا ایک شعبۂ حوالہ بھی ہے جو لوگ بعض کتابوں اور رسالوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنا چاہتے ہیں، یہ شعبہ ان کی خدمت کرتا ہے۔ اس شعبے سے صرف لائبریری میں آنے والے لوگ ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے کونے کونے اور دنیا بھر کے اسکالر خط لکھ کر کتابوں اور رسالوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں۔

مائیکروفلم اور زیروکس سکشن

لائبریری میں ایک ایسا شعبہ بھی قائم کیا گیا ہے جو اسکالر کو مخطوطات اور نایاب کتابوں کی مائیکروفلم اور مطبوعہ کتابوں کی زیروکس کاپیاں فراہم کرتا ہے۔

پی ایچ۔ڈی، ڈی۔لٹ

خدابخش اورینٹل لائبریری میں طالب علم پی ایچ۔ڈی اور ڈی۔لٹ کی ڈگریوں کے لیے تحقیق کرتے ہیں۔ طلبہ اور یونی ورسٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ کو پی ایچ۔ڈی اور ڈی۔لٹ کے لیے یو۔جی۔سی کے انداز پر معقول ریسرچ فیلوشپ دیے جاتے ہیں۔ اس لائبریری کی ڈگریوں کو کشمیر یونی ورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، گلبرگہ یونی ورسٹی، ہمدرد یونیورسٹی، شانتی نکیتن، مگدھ یونی ورسٹی اور بہار یونی ورسٹی نے تسلیم کر رکھا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری اپنے انداز کی پہلی لائبریری ہے۔

آڈیواینڈ ویڈیو سکشن

لائبریری نے ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کے مصنفوں اور دانشوروں کے آڈیواورویڈیو کیسٹیں تیار کیے ہیں جو اس سکشن میں محفوظ ہیں۔

کٹیلاگنگ

لارڈ کرزن نے اس لائبریری کے بیش بہا مخطوطات کی وضاحتی کٹیلاگ تیار کرانے کا کام شروع کیا تھا۔ یہ کام سرڈینی سن راس کی نگرانی میں ہوا اور مخطوطات کی ۳۶ جلدیں شائع ہوئیں۔ یہ جلدیں نایاب ہوگئی تھیں اور اب ان کے جدید اڈیشن تیار کیے گئے ہیں۔

کمپیوٹر سکشن

لائبریری میں ایک باقاعدہ کمپیوٹر سکشن ہے جس میں لائبریری کی مطبوعات کی کمپوزنگ کی جاتی ہے۔

توسیعی لکچرز

لائبریری پابندی سے اہم موضوعات پر توسیعی لکچرز دلواتی ہے۔ اب تک مانچسٹر یونی ورسٹی کے جورج ڈیوڈ سکینز، پروفیسر فضل الرحمن فریدی، جناب سید حامد، پروفیسر آفتاب حسین اور پروفیسر اختر الواسع وغیرہ اس اسکیم کے تحت لکچرز دے چکے ہیں۔

لائبریری میں اہم موضوعات پر سمینار منعقد کیے جاتے ہیں جس میں قومی اور بین الاقوامی دانشوروں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ اس اسکیم کے تحت یونانی طب، تصوف کے موضوعات پر مخطوطات، اردو مخطوطات، اردو میں دانشوری کی روایت، عہد وسطی کی ہندوستانی تاریخ اور قرآنی مطالعہ پر سمینار منعقد کیے گئے۔ اس کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد، فیض احمد فیض، ہندوستان اور ازبکستان وغیرہ پر بھی سمینار منعقد کیے گئے۔

خدابخش لکچرز

ان توسیعی لکچروں اور سیمناروں کے علاوہ لائبریری میں خدابخش لکچرز بھی پابندی سے ہوتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت اب تک پچیس تیس سے زیادہ اسکالرز لکچرز دے چکے ہیں۔

خدابخش لائبریری جرنل

اس لائبریری سے خدابخش لائبریری جرنل کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ ۱۹۷۷ء سے بڑی باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے۔ اس رسالے میں لائبریری میں محفوظ نایاب کتابوں کا تعارف کرایا جاتا ہے اور بعض اہم موضوعات پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔

تنقیدی اڈیشن

لائبریری کا ایک اہم کام یہ بھی ہے کہ وہ لائبریری میں محفوظ اہم مخطوطات اور مطبوعات کے تنقیدی اڈیشن شائع کرتی ہے۔ میری نظر سے اب تک جو کتابیں گزری ہیں۔ ان کے نام ہیں: شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان (اردو، ہندی لغت)، باغ معانی، دیوان حافظ، پنج آہنگ، آثار آزاد، رباعیات باخرزی، مجمع النفائس، رسالہ خیرخواہ مسلمانان وغیرہ۔

لائبریری نے اب تک جو کتابیں چھاپی ہیں ان کی تعداد ساڑھے چار سو کے قریب ہے۔ لائبریری کی خوش نصیبی ہے کہ اسے دو ڈائرکٹرز ایسے ملے جنھوں نے اپنی محنت، لگا تار جدوجہد اور ذہانت سے اس لائبریری کو ایشیا ہی نہیں بلکہ دنیا کی اہم ترین لائبریری کی فہرست میں شامل کر دیا ہے۔ میری مراد ہے ڈاکٹر عابد رضا بیدار اور جناب حبیب الرحمن چغانی۔ چغانی صاحب اس لائبریری کو مزید ترقی دینے کے لیے جو مسلسل جدوجہد کر رہے ہیں وہ لائق صد تحسین ہے۔ انھیں لائبریری کا بہت اچھا تجربہ ہے اور اپنے اس تجربے ہی سے انھوں نے خدابخش لائبریری کو یہ غیر معمولی مقام دلایا ہے۔

خدابخش خاں نے لائبریری کے لیے اسّی ہزار روپے خرچ کر کے جو عمارت بنائی تھی

اس میں اگر چہ بعد میں بہت ترمیم اور اضافے کیے گئے لیکن اب یہ عمارت کچھ چھوٹی نظر آ رہی ہے۔ اس لیے میری گزارش ہے کہ چغتائی صاحب حکومت سے مطالبہ کریں کہ وہ لائبریری کی نئی عمارت تعمیر کرے اور اس عمارت میں یہ خیال رکھا جائے کہ لائبریری میں ہمیشہ توسیع ہوتی رہتی ہے اس لیے عمارت بہت بڑی بنائی جانی چاہیے۔

اس مختصر سے مضمون میں خدا بخش لائبریری کے تمام گوشوں پر تفصیلی روشنی ڈالنا ممکن نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ لائبریری پی ایچ۔ ڈی کا موضوع ہے اور لائبریری کو چاہیے کہ کسی طالب علم کو فیلوشپ دے کر اس موضوع پر مقالہ لکھوائے۔



(ہماری زبان ۸-۱۴ نومبر ۲۰۰۰ء)

حبیب الرحمٰن چغانی
سابق ڈائرکٹر، خدابخش لائبریری

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری

گنگا کے جنوب میں اشوک راج پتھ پر ایک عالیشان اور پرشکوہ عمارت ایستادہ ہے جس کا چاردانگ عالم میں اتنا چرچا ہے کہ ہرسمت سے تشنگانِ علم اور جویائے فن اس کا رخ کرتے ہیں اور سیراب ہوکر جاتے ہیں۔ یہ بہار خاص کر عظیم آباد کا نشانِ امتیاز اور ہندستان کے لیے وجہ افتخار ہے۔ یہ علمی سرچشمہ عرف عام میں خدابخش لائبریری کے نام سے موسوم ہے۔

خدابخش لائبریری مولوی محمد بخش کے ذاتی ذخیرے کتاب خانہ محمدیہ سے وجود میں آئی تھی۔ ان کا تعلق صوبہ بہار کے ضلع چھپرہ کے موضع اوکھی کے ایک علمی خانوادے سے تھا۔ انھیں کتابوں سے عشق تھا۔ وہ عربی، فارسی کے نادر مخطوطات اور اہم مطبوعات جمع کرتے رہے۔ مخصوص لوگوں نے محدود پیمانے پر ان سے استفادہ بھی کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ اہل عظیم آباد کے لیے ایک لائبریری قائم کی جائے تاکہ عام فائدے کی صورت پیدا ہو۔ ابھی وہ اپنی خواہش کو عملی شکل بھی نہ دے پائے تھے کہ ۱۸۷۶ء میں بستر مرگ پر جا پہنچے۔ مرتے دم انھوں نے اپنے بیٹے خدابخش سے کہا کہ جب بھی ممکن ہو پٹنہ کے عوام کے لیے ایک کتابخانہ قائم کرو اور اپنی زندگی کی کل متاع جو چودہ سو عربی اور فارسی مخطوطات و مطبوعات پر مشتمل تھی ان کے حوالے کی۔ لائق بیٹے نے باپ کے اس خواب کو اپنا مقصد حیات بنالیا۔

خدابخش خاں (جن کا حقیقی نام بوعلی خاں تھا) ۲ راگست ۱۸۴۲ء کو موضع اوکھی ضلع چھپرہ میں پیدا ہوئے۔ ابھی وہ دو سال کے تھے کہ ان کے والد بانکی پور میں سکونت پذیر ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم حسب دستور گھر پر ہی ہوئی۔ وہ اپنے باپ کے سایۂ عاطفت میں جوان ہوئے۔ اس طرح پدری اقدار عالیہ ان میں منتقل ہوئیں۔ ابھی وہ پٹنہ ہی میں زیر تعلیم تھے کہ غدر کے ہنگاموں کی وجہ سے ان کا اسکول بند ہوگیا اور انھیں کلکتہ کا رخ کرنا پڑا۔

۱۸۶۱ء میں وہاں سے ہائی اسکول پاس کیا۔ پٹنہ واپسی پر قانون کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ والد کی علالت کی وجہ سے ان کی ذمے داری بڑھ گئی۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ ضلع جج کے یہاں پیشکار کی حیثیت سے ملازمت کرنا پڑی۔ رفتہ رفتہ ان کی صلاحیتیں ظاہر ہونے لگیں۔ مختلف تعلیمی اور فلاحی اداروں سے وابستہ ہوئے۔ قانون کی ڈگری لی اور ۱۸۸۰ء میں پٹنہ میں سرکاری وکیل مقرر ہوئے۔ ان کی خدمات کے پیش نظر ایک سال بعد ہی ۱۸۸۱ء میں انھیں خان بہادر کے لقب سے نوازا گیا۔ تین سال کے لیے ۱۸۹۵ء سے ۱۸۹۸ء تک نظام ہائی کورٹ حیدرآباد میں انھوں نے بحیثیت چیف جسٹس خدمات انجام دیں۔ ۱۸۰۳ء میں انھیں CIE کے اعزاز سے بھی سرفراز کیا گیا۔

مولوی محمد بخش کی بیاض سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق پانچویں پشت میں جا کر قاضی ہیبت اللہ سے مل جاتا ہے۔ مگر کون قاضی ہبت اللہ اس کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ مشہور مورخ سر جادوناتھ سرکار کا کہنا ہے کہ یہ قاضی ہبت اللہ وہی تھے جنہوں نے فتاویٰ عالمگیری کی تدوین میں ہاتھ بٹایا تھا۔ مگر خدابخش کے بیٹے صلاح الدین خدابخش لکھتے ہیں کہ اس کی کوئی سند نہیں ملتی۔ خدابخش بھی اس روایت کو لائق اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ خاندانی وقار و مرتبے سے زیادہ شخصی اوصاف میں یقین رکھتے تھے۔ جو لوگ اسلاف کے معرکوں میں سرمست و سرشار رہتے ہیں وہ خود زندگی میں مشکل ہی سے کوئی کارنامہ انجام دے پاتے ہیں۔ بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کا تعلق ذی عزت اور تعلیمی خانوادے سے تھا۔ مولوی محمد بخش خود ایک عالم تھے۔ پیشہ ان کا وکالت تھا جس میں ان کو اچھی شہرت حاصل تھی۔

والد کی طرح خدابخش خاں کا پیشہ بھی وکالت تھا جس میں انھوں نے خوب نام کمایا اور دولت بھی خوب کمائی۔ حالات سازگار تھے اور والد کی وصیت بھی یاد تھی۔ وہ اس کو پورا کرنے میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا وہ اس کے لیے کچھ بھی کرسکتے تھے۔ انھوں نے محمد مقی (صلاح الدین خدابخش نے MAQI لکھا ہے، جس کے ہجے ہم نے مقی کیے ہیں۔ بعض نے محمد مکی تحریر کیا ہے۔ تحقیق طلب ہے) نام کے ایک عرب

کتاب جو کی خدمات حاصل کیں جو اٹھارہ سال تک پچاس روپے ماہوار پر ان کے لیے کام کرتا رہا۔ اس نے بلاد اسلامیہ عرب، شام، دمشق، مصر اور ایران سے مخطوطات جمع کر کے ان کے سامنے ڈھیر کر دیے۔ خود ملک کے طول و عرض سے کتابیں ان کے پاس کھنچ کھنچ کر آنے لگیں۔ وہ ایک ایسے خریدار کی حیثیت سے ابھرے کہ جو کتاب کے منہ بولے داموں کے علاوہ کتب فروش کو آمد و رفت کا کرایہ بھی دیتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر بلکہ پہلی جنگ آزادی میں جب شاہان دہلی اور نوابان اودھ کے کتاب خانے تباہ و برباد ہونے لگے تو نواب رامپور نے تیزی سے کتابیں جمع کرنا شروع کر دیں۔ انھوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا اس لیے اُس کا فائدہ بھی اٹھایا۔ فاتح سپاہیوں سے فی مخطوطہ ایک روپے کے حساب سے خریدنے لگے۔ اس کے باوجود بہت سے مخطوطات بیرون ملک چلے گئے۔ خدابخش نے کتب اندوزی بہت بعد میں شروع کی تھی اور مقابلہ تھا نواب رامپور سے جہاں دولت و ثروت بمر کاب تھی۔ خدابخش کو بہت جدوجہد کرنا پڑی اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ انجام کار کامیابی انھیں کو نصیب ہوئی۔ مخطوطہ فروش سب سے پہلے انھیں کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ اگر وہ مخطوطات نہیں بھی خریدتے تو بھی آمد و رفت کا کرایہ ادا کرتے تھے۔ کتابیں جمع کرنے کے ساتھ ان کو رکھنے کے لیے ایک دومنزلہ عمارت کی داغ بیل بھی ڈال دی۔ یہ عمارت جس کی تعمیر پر خدابخش نے بے دریغ روپیہ صرف کیا ۱۸۸۸ء میں ۸۰ ہزار روپے کی لاگت سے تیار ہوگئی۔ ساری کتابیں قرینے سے الماریوں میں سجادی گئیں۔ جب ان کے پاس عربی، فارسی اور اردو کے چار ہزار مخطوطات اور تقریباً ڈھائی ہزار انگریزی، عربی، فارسی اور اردو کی اہم مطبوعات جمع ہوگئیں تو ۱۸۹۱ء میں اس کے دروازے عوام کے لیے کھول دیے گئے۔ اس کا افتتاح لیفٹننٹ گورنر چارلس ایلیٹ نے کیا۔ اسے باقاعدہ عوام کے لیے وقف کر دیا اور حکومت بنگالہ کو اس کا متولی بنایا۔ اس کا نام وقف نامے کے مطابق اورینٹل پبلک لائبریری رکھا اور حکومت بنگالہ سے پچاس روپے ماہوار ہمیشہ کے لیے بغرض مصارف مقرر ہوئے۔ یہ کتاب خانہ جس کی ابتداء مولوی محمد بخش کے نجی ذخیرے سے ہوئی جس کے باقاعدہ قیام، توسیع و ترقی کے

لیے خدابخش نے اپنا مال وزر حتیٰ کہ اپنی زندگی بھی وقف کردی عوام کو یہ بات پسند نہ آئی کہ اس کا نام صرف اورینٹل پبلک لائبریری رہے۔ انھوں نے اس عظیم شخص کی بے لوثی، فیاضی اور خدمت خلق کے اعتراف میں ان کے نام کو بطور سابقہ شامل کردیا۔ اس طرح اس کا نام خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری قرار پایا۔ مگر یہ ادارہ زبان زد ہوا خدابخش لائبریری کے نام سے۔ اکثر حوالوں میں صرف خدابخش ہی لکھا گیا اور لفظ لائبریری بھی محذوف کردیا گیا۔ خدابخش کی شخصیت اس طرح لائبریری میں مدغم ہوئی کہ وہ خود لائبریری کی علامت بن کر رہ گئی۔ شروع میں یہ لائبریری گرچہ پٹنہ کے عوام کے لیے قائم کی گئی تھی مگر علم کا یہ سرچشمہ جب جاری ہوا تو ساری سرحدیں معدوم ہوگئیں۔ ہر کوئی بقدر ہمت اوست عالمگیر سطح پر سیراب ہوتا رہا۔

خدابخش نے خلوص نیت سے اس لائبریری کی بنیاد رکھی تھی۔ ان کا یہ جذبۂ ایثار و محبت ہی تھا جو لائبریری کے تحفظ کا ضامن ہوا۔ ایک مرتبہ کسی جلدساز نے نقب لگا کر چند قیمتی مخطوطات چوری کرلیے اور انھیں لاہور میں ایک کتب فروش کو فروخت کردیا۔ خدابخش مخطوطات کی دنیا میں بہت مشہور ہوچکے تھے اس نے وہ مخطوطات ان کی خدمت میں پیش کردیے۔ انھوں نے اپنے ہی مخطوطات کو دوبارہ خرید لیا البتہ چور کو سزائے واجبی دی گئی۔

جب وہ حیدرآباد میں چیف جسٹس تھے تو ایک دن ہائی کورٹ سے واپسی پر ان کی نگاہ ایک دوکان پر پڑی جہاں کچھ پرانی کتابیں پڑی تھیں۔ انھیں اس ڈھیر میں کچھ کام کی چیزیں نظر آئیں اس لیے ٹھہر گئے اور قیمت معلوم کی۔ دوکاندار نے کہا کہ اگر کوئی اور خریدتا تو وہ اس ردّی کے تین روپے مانگتا مگر جب حضور لینا چاہتے ہیں تو یقیناً کوئی خاص بات ہے لہٰذا اس کی قیمت بیس روپے ہوگی۔ انھوں نے قیمت ادا کردی۔ بعد میں نظام حیدرآباد نے انھیں کتابوں کے لیے چار سو روپے کی پیش کش کی مگر لاحاصل وہ تو فروخت ہوچکی تھیں۔

جب قسمت مہربان ہوتی ہے تو ناقابل یقین باتیں بھی ظہور پذیر ہوجاتی ہیں۔ پٹنہ کے صوبائی جج جے۔ بی ایلیٹ (جو مخطوطات کے جامع اور بوڈلین لائبریری کے معطی تھے)

نے خدابخش سے قصائد کمال الدین اصفہانی کا نسخہ مستعار لیا۔ نیت میں فتور آ گیا اور واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ قیمتاً ایک بڑی رقم کی پیش کش کی۔ انھیں بہت ناگوار ہوا۔ کیا کرتے صبر کر کے بیٹھ گئے۔ پٹنہ سے سبکدوش ہونے پر جب ایلیٹ نے رخت سفر باندھا تو ایک صندوق میں اہم اور پسندیدہ مخطوطات رکھے اور لندن بھیجنے کا حکم صادر فرمایا۔ دوسرے صندوق میں بیکار قسم کی کتابیں بھر دیں اور نیلام کرنے کے لیے یہیں چھوڑ دیا۔ لندن جا کر یہ عقدہ کھلا کہ اہم مخطوطات کا صندوق پٹنہ میں ہی رہ گیا اور مسترد کتابیں وہاں پہنچ گئیں۔ بس سر پیٹ کر رہ گئے۔ خوبیٔ قسمت کہ خدابخش کو قصائد کمال الدین اصفہانی کے علاوہ دیگر مخطوطات بھی مل گئے۔ ان میں مجالس خمسہ کا وہ نسخہ بھی شامل تھا جس پر شاہجہاں کے دستخط ہیں۔

خدابخش لائبریری کا پہلا دور اس کے بانی کی زندگی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ خدابخش کا انتقال ۳ راگست ۱۹۰۸ء میں ہوا۔ وصیت کے مطابق ان کی تدفین لائبریری کے احاطے میں ہی ہوئی۔ انھوں نے بہت کمایا مگر سب لائبریری پر صرف کر دیا۔ بالکل تہی دست ہو گئے۔ جب بیمار ہوئے تو علاج کے لیے قرض لینا پڑا۔ حکومت کی امداد سے یہ آٹھ ہزار روپے کا قرض ادا ہوا۔ وہ لائبریری کے پہلے سکریٹری مقرر ہوئے جنھیں ماہانہ دو سو روپے ادا کیے جاتے تھے۔ جب صحت جواب دینے لگی تو لائبریری سے سبکدوش ہو گئے اور اپنی توجہ پڑھنے اور لکھنے پر مرکوز کر دی۔ انھوں نے چند مضامین اور کتابچوں کے علاوہ عربی فارسی مخطوطات کی ایک توضیحی فہرست بھی تیار کی تھی۔

یہ اس لائبریری کی خوش نصیبی ہے کہ قیام کے دس بارہ سال بعد ہی قلمی کتابوں کی فہرست سازی شروع ہو گئی۔ لارڈ کرزن جو اس وقت ہندستان کے وائسرائے تھے ۱۹۰۳ء میں پٹنہ تشریف لائے۔ لائبریری کے کلکشن کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ خواہش ہوئی کہ اس خزانے کی اطلاع یورپ میں بھی پہنچنا چاہیے۔ چنانچہ عربی کے ایک عالم اور مشہور مستشرق سر ایڈورڈ ڈینسن روس کو جو کلکتہ میں مقیم تھے حکم دیا کہ وہ اپنی نگرانی میں مخطوطات کی توضیحی فہرست تیار کرائیں۔ ۱۹۰۸ء میں توضیحی فہرست کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ مخطوطات کے لیے

Descriptive Catalougue کی جو اہمیت ہوتی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ توضیحی فہرست کی یہ اشاعت اس اعتبار سے لائبریری کی تاریخ میں ایک سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے اور اس کا سہرا لارڈ کرزن کے سر جاتا ہے۔ لہٰذا ۱۹۰۵ء میں جب ایک ریڈنگ ہال تعمیر ہوا تو اسے لارڈ کرزن کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔

لائبریری کے آغاز سے ہی یعنی جب محمد بخش نے اس کی بنیاد اپنے نجی ذخیرے سے رکھی، مشاہیر کے آنے کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ جو بھی یہاں آیا وہ خدا بخش خاں کے کارنامے سے متاثر ہو گیا۔ لارڈ لٹن، لارڈ منٹو، علامہ شبلی نعمانی، سر ظفر اللہ، لارڈ ریڈنگ، جون سمن، لارڈ ارون، جی سی بوس، گاندھی جی، نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، راجہ محمود آباد، سی وی رمن اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن وغیرہ نے نابغہ روزگار بانی کتابخانہ خدا بخش خاں کو ہدیۂ تبریک پیش کیا اور نادر و نایاب ذخیرے کی ستائش کی۔

پنڈت جواہر لال نہرو جمہوریہ ہند کے پہلے وزیر اعظم ۱۹۵۳ء میں لائبریری آئے۔ انھوں نے اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا ''فن کے ان حسین شہ پاروں کو دیکھ کر عجیب سرخوشی کا احساس ہوا۔ انھوں نے ہندستان کی تاریخ کے ایک دور کو جاوداں کر دیا۔ ان پر خصوصی توجہ دینا چاہیے۔ میں تو یہ چاہوں گا کہ انھیں جدید تکنیک کے ذریعہ دوسروں تک پہنچانا چاہیے تاکہ وہ بھی انھیں دیکھیں اور ہماری خوشی میں شریک ہو سکیں۔'' لائبریری نے عکسی نقل فراہم کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا اور ۱۹۵۴ء میں ایک چھوٹا سا مائکروفلمنگ سیکشن قائم کیا۔ یہ ان لوگوں کو یہاں کے مخطوطات کی مائکروفلم فراہم کرتا ہے جو اپنے تحقیقی کام کے لیے لائبریری نہیں آ سکتے ہیں۔

لائبریری کی تاریخ نے ۱۶/اکتوبر ۱۹۶۲ء کو ایک نیا موڑ لیا جب گیارہ رکنی اعلیٰ اختیاری بورڈ نے انتظامی کمیٹی کی جگہ لی۔ اس بورڈ کا چیئرمین بہار کا گورنر ہوا۔ مرکزی حکومت نے جدید خطوط پر اس کے انتظام، تنظیم نو اور توسیع کے مصارف کی کفالت کی آمادگی اس شرط پر ظاہر کی کہ ریاستی حکومت بھی پچاس ہزار روپے سالانہ اس مد میں فراہم کرے۔

یوں لائبریری کے لیے ترقی کی ایک راہ کھل گئی۔

اس مشرقی کتاب خانے کی قسمت اس وقت جاگی جب دسمبر ۱۹۶۹ء کو حکومت ہند پارلیمانی ایکٹ کے ذریعہ اسے قومی اہمیت کے ادارے کا مرتبہ عطا کیا اور اس کے مصارف کی تمام تر ذمے داری قبول کی۔ اب یہ لائبریری Ministry of Tourism and Culture کے تحت ایک خودمختار ادارے کی حیثیت سے کام کررہی ہے۔ احسان ناشناسی ہوگی اگر ہم اپنے مربی ڈاکٹر ذاکر حسین کی خدمات کا اعتراف نہ کریں جن کی کوشش کے نتیجے میں اس لائبریری کو قومی ادارہ تسلیم کیا گیا۔ لائبریری بورڈ بارہ ارکان پر مشتمل ہے۔ اب اس کا بجٹ تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپیہ سالانہ ہے۔ حکومت بہار بھی پچاس ہزار روپے سالانہ بطور امداد دیتی ہے۔

اس کی پیشانی پر ایک اور ستارہ ۱۹۹۸ء میں چمکا جب کمپیوٹر سنٹر کا قیام عمل میں آیا۔ ای۔میل اور انٹرنٹ کی سہولتیں فراہم ہوئیں۔ اردو، فارسی اور عربی کے ہندستانی کتابخانوں میں یہ سرفہرست آتا ہے جہاں جدید آلات کی تنصیب ہوچکی ہے۔ ایک لائق اور تجربہ کار انچارج کا تقرر ہوچکا ہے جو لائبریری کی جدید کاری میں مصروف ہے۔ گزشتہ تین سالہ تاریخ اس کی حسن کاری، قارئین کو مزید سہولتوں، ریپروگرافی کی بہتر خدمات اور کرزن ریڈنگ روم میں اضافۂ اوقات کی شاہد ہے۔

لائبریری ذخائر وخدمات

اڈن برا کے ایک مستشرق وی سی اسکاٹ اوکونر کا قول ہے کہ ''پٹنہ اورینٹل پبلک لائبریری دنیا میں مسلم ادب پر بہترین ذخائر میں سے ایک ہے''۔ خدابخش نے سالہا سال کی جدوجہد کے بعد بھاری قیمتیں ادا کرکے نادر ونایاب مخطوطات ومطبوعات جمع کیں جن کی شہرت ساری سرحدیں پار کرگئی۔

انھیں کتابوں سے بے پناہ عشق تھا۔ برٹش میوزیم نے ایک مرتبہ خدابخش کو ان کے کلکشن کے عوض ایک خطیر رقم کی پیشکش کی۔ خدابخش نے اپنے دوست اوکونر کو یہ واقعہ بیان

کرتے ہوئے کہا'' میں ایک غریب آدمی ہوں اور انھوں نے جس رقم کی مجھے پیشکش کی وہ تو ایک غیر معمولی رقم تھی ---لیکن کیا میں پیسے کی خاطر اس سے دست بردار ہوسکتا ہوں جس کے لیے میرے باپ اور میں نے اپنی زندگیاں وقف کردی تھیں۔'' یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں بھر آئیں،''نہیں یہ کلکشن پٹنہ کے لیے ہے اور یہ تحفہ پٹنہ کے عوام کے قدموں پر نچھاور ہوگا۔''

اسلامی علوم، طب یونانی، تذکرے، تصوف، تقابل ادیان، عہد وسطی کی تاریخ جنوبی مشرقی ایشیائی تاریخ، مغربی ایشیائی تاریخ، قرونِ وسطی کے سائنسی علوم، تحریک آزادی اور قومی یکجہتی کا ادب، اردو، فارسی اور عربی ادبیات وہ موضوعات ہیں جو اس کے دائرہ اختصاص میں آتے ہیں۔

اس کا خطی ذخیرہ بیس ہزار سے اوپر ہے جبکہ مطبوعات تقریباً دولاکھ ہیں۔ مزید برآں مجلد رسائل تقریباً ساڑھے سینتیس ہزار ہیں۔ شہنشاہ اکبر، تغلق، شاہجہاں اور شاہ عالم کے دور کے آٹھ سو سکے بھی یہاں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ مائکروفلمز، مائکروفشز، سلائڈز، ویڈیو اور آڈیو کیسٹس خاصی تعداد میں ہیں۔ یہاں کئی نادر اصطرلاب بھی محفوظ ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں مخطوطات ۸۴۸۷ اور مطبوعہ کتابیں ۴۱۴۱۱ تھیں جب کہ ۳۱ مارچ ۱۹۹۹ تک قلمی ذخیرے کی تعداد ۲۱۱۰۱ اور مطبوعات ۱۹۵۵۳۸ تھیں۔ ۳۴ سال کے عرصے میں کتابوں کی تعداد میں ایک غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔

لائبریری کا قلمی ذخیرہ ہی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ بعض مخطوطات تو یہاں ایسے نادرو نایاب ہیں کہ دنیا میں کہیں اور نہیں ملتے۔ شاہوں اور نوابوں کے اہم مخطوطات اس لائبریری میں موجود ہیں۔ عہد وسطی کے بعض وہ مخطوطات جن پر بادشاہوں کے دستخط اور مہریں ثبت ہیں یہاں کی زینت ہیں۔ اکبری دور کے دلکش فن پارے اور خطاطی کے حسین نمونے، ایرانی، کشمیری اور راجستھانی دبستان فن کی تصویریں دیکھ کر بے ساختہ واہ نکلتی ہے کہاں تک ان کا ذکر ہو۔ دفتر کے دفتر سیاہ ہوجائیں مگر ان کا قصہ تمام نہ ہوگا۔ صرف چند نوادر کا مختصر

تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ یہاں قرآن شریف کے بعض بہت ہی نایاب نسخے ہیں۔ خلافت عباسیہ کا ایک بے حد مشہور خطاط یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہایت ہی خوبصورت قرآن شریف کا نسخہ جس پر اس کے دستخط ہیں اور ۶۶۸ھ درج ہے۔ یہ خطاطی کا بہترین نمونہ ہے۔

۲۔ قرآن شریف کا ایک بہت بڑی تقطیع پر لکھا ہوا نہایت ہی مرصع اور مطلا نسخہ۔ شروع کے دو صفحات بے حد مزین ہیں۔ بین السطور فارسی میں ترجمہ خط نستعلیق میں ہے۔

۳۔ قرآن شریف کا ایک اور قدیم نسخہ جو خط کوفی میں ہے۔ جگہ جگہ سے حروف اڑ گئے ہیں۔ اس میں اعراب نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ خط کوفی میں سورۂ ابراہیم کی صرف تین آیتیں ہرن کی کھال پر لکھی ہوئی ہیں اور فریم کی ہوئی ہیں۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں صحابہ کے زمانہ کے لکھے ہوئے ہیں۔

۴۔ ایک قدیم ترین نسخہ "الرسالۃ القشیریہ" ہے جس کی کتابت مصنف کی زندگی میں ہوئی۔ اس پر ۴۳۸ھ درج ہے۔ فارسی میں بہت نایاب نسخے یہیں محفوظ ہیں۔

۵۔ "تاریخ خاندان تیموریہ" نستعلیق میں لکھا ہوا دنیا کا واحد نسخہ ہے۔ یہ تیمور سے اکبر کے بائیسویں سال جلوس تک کی تاریخ ہے۔ اکبر کے دربار کے مشہور مصوروں کی بنائی ہوئی ایک سو بتیس تصویریں اس میں شامل ہیں۔ مصوری کا ایک بے مثال نمونہ۔ ہر تصویر کے نیچے تصویر بنانے والے اور رنگ بھرنے والے کا نام درج ہے۔

۶۔ "بادشاہ نامہ" دو جلدوں میں ہے۔ یہ شاہجہاں کی مکمل تاریخ ہے۔ پچیس انتہائی خوبصورت تصویروں پر مشتمل ہے۔ مصوری کا انمول نمونہ ہے۔ اس میں چند عمارتوں کی تصویریں بھی شامل ہیں۔ آخری تصویر میں شاہجہاں کا جنازہ تاج محل جاتا دکھایا گیا ہے۔ جارج پنجم اور ان کی ملکہ ۱۹۱۱ء میں جب دہلی دربار میں آئے تو ان کے ملاحظہ کے لیے یہ پیش کیا گیا اور ان دونوں نے اس پر دستخط کیے۔

۷۔ ''شہنشاہ نامہ'' فاتح قسطنطنیہ سلطان محمد ثانی کی تاریخ ہے۔ شاہجہاں کے زمانے میں یہ نسخہ ہندستان پہنچا۔ اس پر مغل بادشاہوں اور شہزادوں کے اتنے دستخط ہیں کہ یہ صفحہ بھر گیا ہے۔ اس پر شاہجہاں کی بیٹی جہاں آرا بیگم کے بھی دستخط ہیں جو کسی اور نسخے پر نہیں ملتے۔

۸۔ محمود غزنوی کی مدح میں فردوسی کے ''شاہنامہ'' کا بہت ہی خوبصورت مصور قلمی نسخہ۔ کابل وکشمیر کے گورنر علی مراد خاں نے شاہجہاں کے حضور اسے بطور تحفہ پیش کیا تھا۔

۹۔ جامی کی مشہور کتاب ''یوسف زلیخا'' جسے عبدالرحیم خان خانان نے بیس ہزار روپے خرچ کر کے جہانگیر کے لیے تیار کرائی تھی۔

۱۰۔ جامی کی کتاب ''سلسلۃ الذہب'' خود مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی موجود ہے۔ اس میں ان کے بیٹے کی ولادت کی تاریخ درج ہے۔

۱۱۔ ''دیوان حافظ'' جو خاندان مغلیہ میں فال نکالنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس پر ہمایوں اور جہانگیر کی تحریر اور دستخط ہیں۔

۱۲۔ ''سفینۃ الاولیا'' داراشکوہ کی تصنیف ان کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔

۱۳۔ جہانگیر کا ''جہانگیر نامہ'' نایاب کتاب ہے جسے انھوں نے اپنے دربار کے سب سے بڑے کاتب سے لکھوایا اور گولکنڈہ کے بادشاہ قطب شاہ کو تحفتاً دیا تھا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں جب گولکنڈہ فتح ہوا تو ان کے بیٹے شہزادہ سلطان محمد کے قبضے میں یہ کتاب آئی۔ اس کے پہلے صفحے پر سلطان محمد کے دستخط ہیں۔ اس کا عکسی ایڈیشن مع مقدمہ لائبریری سے شائع ہو گیا ہے۔

۱۴۔ الزہراوی کی ''کتاب التصریف'' ۱۱۹۰ء میں لکھی گئی۔ یہ عمل جراحت پر مصور نسخہ ہے۔ اس میں جراحت کے جو آلات دکھائے گئے ہیں وہ آج بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔

۱۵۔ مصحفی کے آٹھویں دیوان کا واحد نسخہ صرف خدا بخش لائبریری میں دستیاب ہے۔

شری مدبھگوت گیتا، پران اور مہابھارت کے فارسی تراجم محفوظ ہیں۔ پالی اور سنسکرت میں کئی سوتاڑ پتر موجود ہیں۔ ان کے علاوہ کثیر تعداد میں مشاہیر کے خطوط بھی محفوظ ہیں۔ مثلاً علامہ اقبال، ڈاکٹر راجندر پرساد، مولانا ابوالکلام آزاد، اکبرالہ آبادی، محمد علی جوہر، ڈاکٹر ذاکر حسین اور جوش ملیح آبادی کے خطوط اردو زبان میں دستیاب ہیں۔

مطبوعہ ذخیرہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ انیسویں صدی کے ربع ثالث کے بعض اردو کے پرچے اور اخبار موجود ہیں۔ اردو، انگریزی، عربی اور فارسی میں تذکرے سیکڑوں کی تعداد میں دستیاب ہیں۔ قرآنیات، حدیث وفقہ پر بڑی تعداد میں کتابیں لائبریری کی زینت میں اضافہ کررہی ہیں۔

خدابخش ایک سچے اور پکے مسلمان تھے اور ان کے تعلقات اہل ہنود سے بے حد خوشگوار تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ان کے جسم میں ایک پنڈتانی کا خون دوڑ رہا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ ان کے والد محمد بخش کی رضائی ماں ایک برہمن خاتون تھیں۔ ان کے احترام میں انھوں نے اور خدابخش نے کبھی گائے کے گوشت کو ہاتھ نہیں لگایا۔ یہی سبب ہے کہ ذخائر میں ہندستانی مذاہب اور قومی ہم آہنگی پر معتد بہ ادب دستیاب ہے۔

بعض انگریزی زبان میں بھی نادر کتابیں موجود ہیں۔ ۱۸۱۴ء کی لارڈ بائرن Ode to Nepolean محفوظ ہے جس میں شاعر کے اپنے خط میں دو بند شامل ہیں۔ Memories of Napolean Buoneparte ملتا ہے جس پر نپولین کے دستخط اور ان کے سکریٹری کی مہر ثبت ہے۔ یہ نسخہ کبھی نپولین ثالث کی شاہی لائبریری کی ملک تھا۔

خدابخش کی زندگی میں ہی بعض رؤسا نے اپنے ذاتی ذخیروں کو حفاظت کی غرض سے اورینٹل پبلک لائبریری کو ہدیہ کردیا تھا۔ عطایا کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے توسط سے لائبریری کو دسنہ کلکشن حاصل ہوا۔ اس میں مطبوعات کے علاوہ مخطوطات بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے کلکشن ملے ہیں جن کا ذکر ممکن نہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں : ادارہ تحقیقات اردو (قاضی عبدالودود)، سرفخرالدین کلکشن، اختر اورینوی کلکشن،

پروفیسر کلیم الدین احمد کلکشن، یونس سلیم کلکشن، سہسرام کلکشن اور ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی کلکشن وغیرہ۔

جس رفتار سے کتابوں اور مخطوطات میں اضافہ ہوا اس مناسبت سے ملازمین کی تعداد نہیں بڑھی۔ اس وقت لائبریری میں ساٹھ اسامیاں ہیں جن کو مختلف خدمات انجام دینا پڑتی ہیں۔

ایک اچھی لائبریری کی پہچان اس کے ذخائر اور خدمات سے ہوتی ہے۔ دانشور اور قارئین ہمیشہ اس لائبریری کے مشتملات کی تعریف کرتے رہے ہیں اور اس کی بھر پور خدمات کے بھی معترف رہے ہیں۔ ریپروگرافی کی خدمات کو بہتر بنایا گیا ہے۔ محققین اکثر مخطوطات کی زیروکس کاپی کا مطالبہ کرتے رہے ہیں۔ ماضی میں ان کا یہ مطالبہ پورا بھی کیا گیا ہے۔ لیکن اب زیروکس کاپی کے لئے معذرت کرلی جاتی ہے۔ دراصل مخطوطات کی زیروکسنگ سے بہت نقصان پہنچتا ہے۔ کاغذ، رنگ و روشنائی بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ لیکن تحقیق کرنے والوں کی اس جائز ضرورت کو پورا کرنا بھی لازم تھا۔ لہذا لائبریری نے ڈیڑھ سال قبل منولٹا مائکروفلم ریڈر پرنٹر خرید لیا۔ اب مخطوطے کی مائکروفلم تیار کرکے اس کا پرنٹ آؤٹ ضرورت مند کو فراہم کردیا جاتا ہے۔ مطبوعہ مواد کی زیروکس کاپی ماسوا تصاویر اور سلائڈس حسب دستور مہیا کی جاتی ہے۔ حوالہ جاتی خدمات فیکس، فون اور ای میل کے ذریعے دی جاتی ہیں۔ مزید برآں جو لوگ لائبریری آتے ہیں ان کی ہر ممکن مدد کی جاتی ہے۔

کرزن ریڈنگ روم صبح آٹھ بجے سے رات کے آٹھ بجے تک کھلا رہتا ہے۔ اس میں انگریزی، اردو اور ہندی کے اخبارات اور رسائل بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ پہلے یہ ریڈنگ روم صرف ساڑھے چھ گھنٹے کے لئے کھلتا تھا۔ لائبریری نے بارہ گھنٹے کی سروس اس لئے شروع کی کہ تنگیٔ مکان کی شکایت کسی حد تک دور کی جاسکے۔ پٹنہ کے اکثر کتابخانے کس مپرسی کی حالت میں ہیں لہٰذا سارا دباؤ خدا بخش لائبریری پر ہے۔ یہ ریڈنگ روم صرف پبلک کے لئے مخصوص ہے۔ اوسطاً ایک مہینے میں نو دس ہزار قارئین آتے ہیں۔

متنوع سرگرمیاں

خدا بخش لائبریری محض ایک لائبریری ہی نہیں بلکہ رنگارنگ سرگرمیوں کا ایک مرکز بھی ہے۔ یہ تحقیقی اور تخلیقی کاموں میں محققوں اور دانشوروں کی ہر ممکن مدد کرتی ہے۔ اگر یہاں مطلوبہ مواد موجود نہیں ہے تو دوسرے کتابخانوں سے، خواہ بیرون ملک کیوں نہ ہوں، حاصل کر کے فراہم کرتی ہے۔ اس لائبریری کا دنیا کی اہم لائبریریوں سے مبادلے کا نظم قایم ہے۔ مختلف موضوعات پر توسیعی خطبات کا اہتمام کرتی ہے۔ اب تک متعدد نامور ہستیوں کے خطبات منعقد ہو چکے ہیں جن کے آڈیو اور ویڈیو کیسٹ یہاں موجود ہیں۔ مذاکروں کا انعقاد اس کی ایک اور خصوصیت ہے۔ اردو زبان و ادب، مذہب، تصوف اور تاریخ وغیرہ پر کئی اہم سیمنار ہو چکے ہیں جن کے مقالے طبع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ سارک ممالک پر مشتمل کئی اہم مذاکرے ہوئے ہیں جن کا مقصد ان ملکوں میں دستیاب مخطوطات کی فہرست سازی اور تعارف تھا۔ اس طرح چند موضوعات پر خطی ذخائر کے یونین کیٹالاگ مرتب ہو گیے۔

طلبہ میں علمی ذوق کو مہمیز کرنے کے لیے تقریری مقابلوں کا یہاں اہتمام کیا جاتا ہے۔ ان میں کامیاب مقررین کو انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ یہ علم کتابخانہ پر ریفریشر کورسوں کا انتظام کرتی ہے۔ مزید برآں تحفظ مخطوطات اور دیگر موضوعات پر ورکشاپ منعقد کرتی ہے۔

اس لائبریری کے بانی قومی یکجہتی کی زندہ مثال تھے۔ وہ مختلف فرقوں میں یگانگت کے خواہاں تھے اور کوشاں بھی۔ لہذا یہ لائبریری فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لیے مباحثوں اور تقریروں کا پروگرام کرتی ہے۔ امن عامہ کے لیے جلسے کرتی ہے۔ ہر مذہب سے متعلق مختلف زبانوں میں یہاں بڑی تعداد میں کتابیں موجود ہیں۔

اپنی ثقافت کو نہ صرف برقرار رکھنے بلکہ اس کی ترویج کے لیے بہت سے ثقافتی پروگرام منعقد کرتی ہے جن میں سرفہرست مشاعرے آتے ہیں۔ یہاں ہند و پاک مشاعرہ

پہلی بار ۱۹۹۷ء میں ہوا۔شعری نشستیں اکثر ہوتی رہتی ہیں۔کوی سمیلن کا اہتمام کرتی ہے۔ محفل سماع بھی ہوتی ہے۔عوام کو گاہے گاہے ایسی فلمیں بھی دکھائی جاتی ہیں جو ہندستانی اور مسلم ثقافت کی اچھی عکاسی کرتی ہیں۔

حفظان صحت اور صفائی سے متعلق خاص کر عوام الناس کی معلومات کے لیے پروگرام کرتی ہے۔غرضیکہ حفظان صحت ہو یا ثقافت، ملکی ترقی ہو یا مسلم مسایل، سیکولرزم ہو یا گنگا جمنی تہذیب، زبان ہو یا ادب، تاریخ ہو یا مذہب، تحقیق ہو یا تدوین، مخطوطات کے مسایل ہوں یا ذرایع ابلاغ یہ سب موضوعات اس کے دائرۂ عمل میں آتے ہیں جن پر عوام وخواص کے لیے پروگرام منعقد کرتی ہے۔

کتابوں کی نمائش کا لائبریری سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ان نمایشوں کا بنیادی مقصد ان کتابوں کو سامنے لانا ہوتا ہے جو قارئین کی نظر سے پوشیدہ ہوتی ہیں۔اس طرح کتابوں کو ان کے قارئین مل جاتے ہیں۔تحریک آزادی سے متعلق یہاں بہت مواد ہے جس کی نمایش کی جاچکی ہے۔ہندستانی مذاہب پر بھی ایک خصوصی نمایش کا اہتمام کیا جاچکا ہے۔ ہمارے قارئین کا خیال تھا کہ اس لائبریری میں صرف اسلامی علوم پر ہی معتد بہ ذخیرہ ہے۔لیکن دیگر مذاہب پر نمایش دیکھ کر انھیں لائبریری کے سیکولر کردار کا احساس ہوا۔ ہمارا ارادہ ہے کہ کتابوں کی نمایش موضوع وار ہوتی رہیں تاکہ قارئین ان ذخائر سے بھر پور استفادہ کرسکیں۔ یہ لائبریری Closed Access ہے یعنی کتابوں تک رسائی براہ راست نہیں ہوتی ہے اس لیے اور بھی ضروری ہے کہ اکثر کتابوں کی نمایش ہوتی رہے۔لیکن جگہ کی کمی ہمارے اس پروگرام میں حایل ہے۔

۲ر اگست کو یوم خدا بخش منایا جاتا ہے اور ۳ر اگست کو سیرت پاک کا جلسہ ہوتا ہے۔ اس نسبت سے اس دن اکثر قرآن، حدیث، فقہ، سیرت اور اسلامی تاریخ پر مخطوطات کی نمایش کا اہتمام کیا جاتا ہے۔اس نمایش کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ مخطوطات جن کے بارے میں صرف سن رکھا تھا ہمارے قارئین نے ان کا خود مشاہدہ کیا اور جو خوشی ان کو ہوئی اس کا اظہار

ممکن نہیں۔منتخب نئی کتابیں بھی کچھ عرصے کے لیے شوکیسوں میں رکھی جاتی ہیں۔

نشر واشاعت

لائبریری کا ایک شعبہ نشر واشاعت کے لیے مختص ہے۔لائبریری کی مطبوعات نے علمی وتحقیقی حلقے میں ایک مقام حاصل کرلیا ہے۔اب تک اردو، ہندی، انگریزی، فارسی اور عربی میں تقریباً چارسو پچیس عنوانات شائع کرچکی ہے جو اہل علم کی داد وتحسین حاصل کرچکے ہیں۔لائبریری کے مخطوطات کو مرتب کراکے شائع کرنا یا ان کے فیکسی میل ایڈیشن چھاپنا، مذاکروں کے مقالات کو طبع کرنا اس کی اشاعتی پالیسی میں شامل ہیں۔

تحقیقی کاموں میں رسالوں کے اشاریوں کی اہمیت مسلم ہے۔لائبریری اشاریہ سازی پر خصوصی توجہ دیتی ہے۔اردو کے کئی موقر رسالوں کے اشاریے مرتب کراکے شائع کرچکی ہے۔کئی اشاریے زیرترتیب ہیں۔ان کاموں کے لیے سات جونیر ریسرچ فیلو مصروف رہتے ہیں۔تین سینئر ریسرچ فیلو مخطوطات کی تحقیق وتدوین اوران کی توضیحی فہرستوں کی ترتیب کے لئے مقرر ہیں۔

ایک ذولسانی سہ ماہی جریدہ ''خدابخش لائبریری جرنل'' کے نام سے ۱۹۷۷ء سے نکل رہا۔اس میں تحقیقی مقالات اردو انگریزی میں شامل کیے جاتے ہیں۔کبھی کبھی عربی اور فارسی میں بھی مضامین شائع ہوتے ہیں۔اہمیت اور مناسبت کے لحاظ سے قدیم رسالوں سے اہم مضامین بھی نقل کیے جاتے ہیں۔مشرقی واسلامی علوم کے علاوہ ادبی تحقیق میں یہ جرنل معاون ہوتا ہے۔

خدابخش ایوارڈ

بانی کتاب خانہ کی یاد میں ۱۹۹۲ء سے سالانہ اعزاز دینا شروع کیا ہے۔توصیفی سند اور شال کے علاوہ ایک لاکھ روپئے کا انعام صدر جمہوریہ کے ذریعے ان حضرات کو دیا جاتا

ہے جنھوں نے لائبریری کے اختصاصی موضوعات پر کوئی وقیع کام کیا ہو۔ آنجہانی ڈاکٹر بشمبھر ناتھ پانڈے، ڈاکٹر انور جمال قدوائی مرحوم اور محترمہ سبھدرا جوشی کو قومی یکجہتی اور مخلوط تہذیب پر ان کے زندگی بھر کے کارناموں پر نوازا گیا۔ کئی انعامات واجب ہو چکے ہیں جو دیئے جانا ہیں۔

مشرقی علم کتاب خانہ اور مخطوطہ شناسی

لائبریری نے کئی سال پہلے مشرقی علم کتاب خانہ اور مخطوطہ شناسی پر ایک سالہ تربیتی کورس شروع کیا تھا۔ تین چار سال یہ جاری رہا لیکن بعد میں بند ہو گیا۔ اس کورس کی اہمیت سے انکار نہیں۔ لیکن اس کو فعال بنانے کی ضرورت ہے۔ جب تک کسی تعلیمی ادارے یا ایجنسی کی سرپرستی حاصل نہیں ہوگی یہ مفید ثابت نہیں ہوسکتا۔ بہرحال لائبریری کے منصوبوں میں یہ شامل ہے۔

لائبریری کی عمارت اور آلات

خدابخش خاں نے زرِ خطیر سے دو منزلہ عمارت بڑے اہتمام سے تعمیر کرائی تھی۔ اسی عمارت میں لائبریری کا افتتاح ہوا تھا۔ اس کی بالائی منزل تحقیق کرنے والوں کے لئے مخصوص تھی۔ کتابیں صرف نیچے کی منزل میں تھیں۔ ۱۹۳۴ء میں پٹنہ میں شدید زلزلہ آیا اور بالائی منزل مسمار ہوگئی۔ زیریں منزل متاثر نہیں ہوئی اور کتابیں محفوظ رہیں۔ حکومت بہار نے منہدم منزل کا ملبہ صاف کرا کے چھتیں ٹھیک کرائیں۔ چھ ماہ تک مرمت کا کام چلتا رہا۔ اس دوران ساری کتابیں ایک ملحقہ عمارت سنگ مین انسٹی ٹیوٹ میں منتقل کردی گئیں۔ مرمت کے بعد یہ کتاب خانہ اپنی اصلی عمارت میں واپس آ گیا۔

حکومت بہار نے ۱۹۳۸ء میں ایک بہت ہی خوبصورت عمارت تعمیر کروائی جس میں سنگ سرخ کا کثرت سے استعمال کیا۔ یہی وہ عمارت ہے جہاں آجکل لائبریری ہے۔ جب

یہ جگہ ناکافی ہوگئی تو ۱۹۶۹ء میں حکومت ہند نے اس پر دوسری منزل تعمیر کرائی۔ یہ دونوں منزلیں بھی بڑھتی ہوئی لائبریری کے لئے مختصر پڑ گئیں تو لائبریری کی پشت پر ایک سہ منزلہ عمارت ۱۹۸۳ میں بنوائی گئی۔ جس رفتار سے لائبریری میں توسیع ہوئی یہ عمارت بھی اس کا ساتھ نہ دے سکی۔ آج لائبریری کے لئے سب سے بڑا مسئلہ جگہ کی شدید قلت ہے۔ شش منزلہ عمارت کا پونے چھ کروڑ روپے کا ایک منصوبہ بورڈ سے پاس کراکے محکمہ ثقافت میں بھیجا گیا ہے۔ امید ہے یہ منظور ہو جائے گا۔ جب مجوزہ عمارت تعمیر ہو جائے گی تو ہمارے کئی نئے منصوبے نافذ ہو سکیں گے۔

توسیع عمارت کے لیے تو ابھی انتظار کرنا پڑے گا۔ سردست لائبریری کی حسن کاری کو ضروری سمجھا اور دھول پور کے بادامی پتھروں کے ٹائلز سے اس کو ایک نیا چہرہ دیا ہے۔ خوبصورتی کے لیے دروں اور دریچوں کی سنگی محرابوں کو قرمزی رنگ سے سنوارا ہے۔ اندر سے بھی اسے ٹھیک کرایا ہے۔ رنگ و روغن سے اس کی شکل نکل آئی ہے۔ اس کی کشادہ سیڑھیاں سفید سنگ مرمر سے بنوائی گئی ہیں۔ اس کی پیشانی پر سفید سنگ مرمر کی سل پر سبز گرینائٹ سے نام چسپاں کرایا گیا ہے۔ اب یہ ایسی جاذب نظر ہوگئی ہے کہ راہگیر دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

نادر کتب، اور مخطوطات کی حفاظت کے لیے درجۂ حرارت اور رطوبت کو کنٹرول کرنا ضروری ہے اور اس کے لیے ایرکنڈیشنگ لازمی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ مخطوطات کے اسٹیکس، ریڈنگ ھال اور ریررروم ایرکنڈیشن ہو گئے ہیں۔ فایر الارم کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ باہر سے تو لائبریری کی تزئین پہلے ہی ہو چکی تھی اب اندر سے بھی اس کی ہیئت بدل گئی ہے۔ پانی کی قلت کو دور کرنے کے لیے اپنا ٹیوب ویل ہے۔ ہمہ وقت روشنی کے لیے ایک بڑا جنریٹر دو تین سال پہلے نصب ہو چکا ہے۔ ایک چھوٹے جنریٹر کا بھی انتظام کیا گیا ہے تا کہ کرزن ریڈنگ روم اور آفس وغیرہ میں کم خرچ پر روشنی فراہم کی جا سکے۔

جھاڑ جھنکاڑ کو صاف کر کے لان کو خوبصورت بنایا ہے۔ گلابوں کے تختوں، موسمی

پھولوں کی کیاریوں، چھوٹی چھوٹی دورنٹا کی جھاڑیوں، گھاس اور درختوں کی تراش نے اس کا حسن دوبالا کردیا ہے۔ لان کو دیکھ کر طراوت اور فرحت کا احساس ہوتا ہے۔

صاف پانی کے لیے جگہ جگہ ایکوا گارڈ نصب کرائے ہیں۔ گندگی سے بچنے کے لیے پیک دان رکھوائے ہیں۔ عمدہ فرنیچر فراہم کیا گیا ہے۔ لیکچر ہال میں نیا کارپٹ بچھوایا ہے۔ گودریج کی کرسیاں اور صوفہ سیٹ لگوائے ہیں۔ ماحول کو ہر اعتبار سے خوشگوار اور خوبصورت بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

مخطوطات کے لیے کنزرویشن لیب ناگزیر ہے۔ یہاں جو لیب ہے اسے جدید خطوط پر بنانا ضروری ہے۔ لیمی نیشن کے لیے امپریگنیٹر (impregnator) درآمد کرنے کا منصوبہ ہے نئی طرز کا فیومیکیشن چیمبر بھی خریدنا ہے۔ دو ٹیلی فون لائنوں کا اضافہ ہوا ہے۔ فوری سروس کے لیے نیا ٹیلی کوم سسٹم لگوایا ہے۔

خدابخش کی خواہش تھی کہ اگر ان کے پاس ایک پرنٹنگ پریس ہوتا تو نادر مخطوطات کی نقلیں ضرورت مندوں کو فراہم کردیا کرتے۔ ان کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے عمل تو بہت پہلے شروع کردیا گیا تھا۔ لیکن ایک سال پہلے ایک بڑا پرنٹنگ پریس بھی خرید لیا ہے اور ایک فورمین کی خدمات حاصل کرلی ہیں۔ زیادہ تر طباعت کا کام اب یہیں ہو رہا ہے۔ اب رنگین پرنٹنگ بھی یہیں ہوتی ہے۔ نادر مخطوطات شائع کیے جارہے ہیں۔

جدید کاری

لائبریری کی جدید کاری اگر زیر بحث ہو تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی کا ذکر نہ ہو۔ میرے تقرر کے وقت انھوں نے اپنی دیرینہ خواہش کا اظہار کیا کہ لائبریری میں کمپیوٹر کاری شروع کی جائے۔ دو سال ہم نے بڑی تگ و دو کی۔ نیشنل انفارمیشن سینٹر دہلی اور پٹنہ برانچ کے مشوروں سے لائبریری کی کمپیوٹر کاری کے لیے ایک جامع منصوبہ بنایا گیا۔ لائبریری بورڈ سے منظور کرا کے محکمہ ثقافت کی رضامندی اور رقم کی فراہمی کے لیے

پیش کردیا۔منظوری ملتے ہی خریداری کا سلسلہ شروع ہوا اس ساری مہم میں قدوائی صاحب نے ہر ہر قدم پر ہماری رہنمائی اور مدد کی۔ کسی صورت سے لائبریری کی نئی عمارتیں ایک جگہ خالی کی اور وہاں کمپیوٹر سنٹر تعمیر کرایا۔ پینٹیم II کے تیرہ عدد، کلر ڈیسکجیٹ پرنٹرز، اسکینر اور ڈیجیٹل کیمرہ خریدا گیا۔ LAN سسٹم کی تنصیبات مکمل کیں۔ اب یہاں ای میل اور انٹرنٹ کی سہولتیں دستیاب ہیں۔ ۳۱ رمئی ۱۹۹۹ء کو اس کا افتتاح بھی ڈاکٹر قدوائی سے کرایا۔ حال ہی میں ایک کمپیوٹر کنسلٹنٹ کا تقرر بھی ہوگیا ہے۔

تین مرحلوں میں لائبریری کی کمپیوٹر کاری ہونا ہے۔ پہلا مرحلہ پورا ہو چکا ہے۔ لائبریری کے ویب پیج (WebPage) پر لائبریری کی مختصر تاریخ، اس کی سرگرمیاں اور یہاں کی شائع شدہ کتابوں کی فہرست اور مخطوطات کی توضیحی فہرستوں کی ۳۶ جلدیں ہمہ وقت انٹر نٹ پر دستیاب ہیں۔ Web Page کا پتا ہے WWW.kblibrary.org۔ دوسرا مرحلہ ہے مخطوطات کی سی ڈی تیار کرانا۔ اس کا دوہرا فائدہ ہوگا۔ سی ڈی بن جانے پر اصل مخطوطات کا استعمال خود بخود کم ہو جائے گا۔ جب بھی ضرورت ہوگی سی ڈی کا استعمال ہوگا۔ قارئین کے مطالبے پر سی ڈی کو انٹرنٹ سے جوڑ دیا جائے گا تاکہ عالمی سطح پر ابلاغ ممکن ہو سکے۔ اور تیسرا مرحلہ ہوگا لائبریری کی تمام دیگر مطبوعہ مندرجات کا آن لائن کیٹلاگ۔ لائبریری میں اردو کی کتابیں بڑی تعداد میں ہیں اور ابھی تک کوئی ایسا لائبریری سافٹ ویر تیار نہیں ہوا ہے جو اردو مشمولات کا احاطہ کر سکے۔ کچھ لوگ کام کر رہے ہیں جیسے ہی وہ کامیاب ہوگئے خدابخش لائبریری ہی میں سب سے پہلے اردو کیٹلاگنگ شروع ہوگی۔ انگریزی کتابوں کی کمپیوٹر فہرست سازی کی عنقریب شروعات ہونے والی ہے۔ بعد میں لائبریری کے دیگر شعبوں میں کمپیوٹر کا استعمال ہوگا۔ تیسرا مرحلہ ہوگا لائبریری کی دیگر مندرجات کا آن لائن کیٹلاگ مرتب کروانا۔ بعد میں لائبریری کے دوسرے شعبوں میں بھی کمپیوٹر داخل کیا جائے گا۔

ہر چند کہ لائبریری میں ۱۹۸۰ء کے عشرے میں کمپیوٹرس سے کام لیا جانے لگا تھا لیکن ان کا استعمال اردو، ہندی اور انگریزی کی Desk Top Publishing تک محدود تھا۔ یہ سلسلہ

اب بھی جاری ہے بلکہ کوشش یہ ہے کہ زیادہ تر کمپوزنگ کمپیوٹر سے ہی کی جائے۔ اس میں جو آسانیاں ہیں وہ کتابت میں نہیں۔ بہرحال فن کتابت کی حفاظت بھی کرنا ہے۔ اردو کے لیے ان پیج سافٹ ویر بھی خرید لیا گیا ہے۔

کتابت، طباعت اور اشاعت پر خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔ طباعت کے معیار کو بلند کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ ادھر تین چار سال کے عرصے میں جو کتابیں چھپی ہیں وہ اس کا ثبوت ہیں۔ حال ہی میں فارسی کے دو نادر مخطوطات ''سیرت فیروز شاہی'' اور ''جہانگیر نامہ'' منظر عام پر آیے ہیں۔ متن کے عکس کے ساتھ بطور تعارف مقدمے کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مزید برآں ''دیوان عرفی شیرازی'' مرتبہ ولی الحق انصاری شایع کیا ہے۔ بعض کتابوں کے تراجم ہندی اور اردو میں اشاعت پذیر ہوے ہیں۔

قلمی ذخیرے کی کل ۳۶ جلدیں اب تک شایع ہوئی ہیں۔ وہ ناپید ہوگئی تھیں اس لے ان کو دوبارہ شایع کر دیا گیا ہے۔ لیکن کوئی اضافہ نہیں ہوسکا۔ ہم نے محدود وسایل خاص کر فہرست سازوں کا عدم حصول کے باوجود کوشش کی ہے اور عربی مخطوطات کی ایک توضیحی فہرست مرتب ہوگئی ہے۔ عنقریب شایع ہونے والی ہے۔ یہ انگریزی میں نہیں اردو میں ہے جو ہمارے یہاں کی روایت رہی ہے۔ اس سے یہ انحراف ہے کچھ نہ ہونے کے مقابلے میں ہم نے کچھ ہونے کو ترجیح دی تاکہ ہمارے قارئین کو کسی صورت میں فائدہ پہنچے۔ عربی مخطوطات کی ایک اور توضیحی فہرست زیر ترتیب ہے۔

اس مضمون میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ لائبریری کا ہر پہلو زیر بحث آجائے تاکہ اس کی ایک جامع تصویر ابھر کر سامنے آسکے۔ اس کے نگہبانوں کا فرض ہے کہ اس کے تحفظ و ترقی کے لیے مستقل سرگرم عمل رہیں اور یہ گنجینۂ عرفان و آگہی دنیائے علم و ادب کو فیض یاب کرتا رہے۔

(افکار ملی، بہار نمبر ۲۰۰۰ء)

****

ڈاکٹر سلیم الدین احمد
اسسٹنٹ ڈائرکٹر،
خدا بخش لائبریری، پٹنہ

علم وادب کا مخزن

خدا بخش لائبریری

کتب خانے زندہ سماج کی علامت ہوتے ہیں۔ یہ ایک طرف تو ایک ملک، ایک قوم اور ایک سماج کی علمی وادبی کاوشوں کا مخزن اور امین ہوتے ہیں تو دوسری طرف علم وادب کا ایک سرچشمہ، ایک راہ ہدایت اور ایک روشن چراغ کا کام کرتے ہیں۔ پٹنہ میں خدا بخش خاں کا قائم کردہ کتب خانہ جو ان کے نام پر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کہلاتا ہے ایسا ہی ایک اہم کتب خانہ ہے جو عربی، فارسی، اردو کے اہم و نادر مخطوطات، مغل، ایرانی، ترکی اور وسط ایشیائی مصوری کے نادر نمونوں، مشاہیر کی اپنی تحریروں میں ان کے مکتوبات، عربی، فارسی، اردو کے علاوہ انگریزی ہندی، جرمن، فرنچ کی قدیم اور نادر مطبوعات، اردو رسائل کے مکمل فائل اور بادشاہوں کے فرامین کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے۔

لائبریری کا قیام:

اس کتب خانے کا قیام اکتوبر ۱۸۹۱ء میں عمل میں آیا۔ اس کے بانی خدا بخش خاں تھے۔ کہا جاتا ہے کہ خدا بخش خاں کے والد محمد بخش کتابوں اور مخطوطات کے جمع کرنے کا شوق رکھتے تھے چنانچہ انھوں نے ۱۴۰۰ مخطوطات جمع کر رکھے تھے جو خدا بخش کو ورثے میں ملے۔ خدا بخش خاں نے اس میں ۲۶۰۰ مخطوطات کا مزید اضافہ کیا اور ۱۸۹۱ء میں قیام لائبریری کے وقت کل مخطوطات کی تعداد چار ہزار ہوگئی۔ خدا بخش خاں نے یہ سارے مخطوطات مع زمین اور عمارت ایک دستاویز کے ذریعہ ۱۸۹۱ء میں عوام کے حوالے کر دیا۔

لائبریری کے بانی خدابخش خاں:

لائبریری کے بانی خدابخش خاں کاتعلق دہلی کے ایک خاندان سے تھا جوگذشتہ ایک صدی سے بہار میں چھپرہ کے ایک گاؤں اوکھی میں سکونت پذیر تھا، خدابخش کے والد محمد بخش پٹنہ میں ایک بڑے وکیل تھے اور کتابوں اور مخطوطات کے جمع کرنے کے شوقین تھے۔ان کی خواہش تھی کہ وہ مخطوطات کی ایک لائبریری قائم کریں لیکن زندگی نے وفا نہ کی۔آپ نے مرتے وقت اپنے بیٹے خدابخش کو وصیت کی کہ جو کام وہ نہ کرسکے وہ خدابخش کریں اور وہ مخطوطات جو انھیں ورثے میں مل رہے ہیں ان میں اضافہ کرکے عوام کے لیے ایک عظیم لائبریری قائم کریں۔ سعادت مند بیٹے نے باپ کی اس وصیت کو گرہ سے باندھ لیا اور اپنی ساری زندگی اور زندگی کی ساری کمائی اس ایک مقصد کی حصولیابی میں لگادیا۔ ولولۂ صادق اور عزم مصمم کے نتیجے میں یہ عظیم الشان لائبریری عالم وجود میں آئی اور خدابخش کو حیات دوام بخش گئی۔

خدابخش ۲/اگست ۱۸۴۲ء میں پیدا ہوئے اور ۳/اگست ۱۹۰۸ء کو انتقال کیا۔ ابتدائی تعلیم پٹنہ ہائی اسکول میں حاصل کی۔ جب ۱۸۵۷ء کے غدر کی پاداش میں پٹنہ ہائی اسکول بند ہوگیا تو انھیں تعلیم کے لیے کلکتہ بھیج دیا گیا جہاں دوسال قیام رہا اور ۱۸۶۱ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔اسی دوران والد کی طبیعت خراب ہوگئی ان پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ کسی کام کے لائق نہ رہے، چنانچہ معاشی پریشانیاں شروع ہوگئیں خدابخش کو کلکتہ سے واپس آنا پڑا اور گھر کو چلانے کے لیے ملازمت شروع کرنی پڑی۔سب سے پہلے نائب منصفی کے لیے درخواست دی لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ پھر ضلع جج کے پیشکار ہوگئے لیکن جج سے اختلاف کی بنیاد پر استعفیٰ دے دیا۔اس کے بعد پندرہ مہینوں تک آپ نے بحیثیت ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس کام کیا پھر جنوری ۱۸۶۸ء میں جب آپ نے ہائر گریڈ پلیڈرشپ اکزامنیشن پاس کرلیا تو پھر آپ نے ملازمت چھوڑ کر لوکل بار جوائن کرلیا۔اس وقت آپ کی عمر صرف ۲۵ سال کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ بار جوائن کرنے کے پہلے ہی دن آپ نے ایک سوایک وکالت نامے پر

دستخط کیا جو اپنی مثال آپ ہے۔

خدا بخش بڑے ذہین و فطین تھے، اسلامیات کا بڑا گہرا مطالعہ تھا۔ چنانچہ اسلامی کتب خانوں پر آپ کا جو مضمون انگریزی میں Eighteen Century میگزین میں شائع ہوا تھا، بڑا مقبول ہوا، آپ نے لائبریری کے مخطوطات کے تعارف پر بھی ایک ضخیم کتاب جسے مخطوطات کا ایک توضیحی کیٹلاگ کہا جا سکتا ہے، لکھی تھی جو حیدرآباد سے ۱۳۱۴ھ میں شائع ہوئی اس میں تقریباً ۱۳۸۸ مخطوطات اور ۸۸۵ مصنفین کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اسکول کمیٹی کے سلسلہ میں آپ کی خدمات کے اعتراف میں دہلی دربار سے آپ کو ۱۸۷۷ء میں سرٹیفیکیٹ آف آنر ملا تھا۔ آپ پٹنہ میونسپلٹی اور پٹنہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے پہلے چیئرمین مقرر کیے گئے تھے۔ ۱۸۸۰ء میں سرکاری وکیل بنائے گئے، ۱۸۸۱ء میں آپ کی عوامی خدمت کے اعتراف میں آپ کو خان بہادر کے خطاب سے نوازا گیا۔ ۱۸۹۴ء میں نظام ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مقرر ہوئے اور اس عہدے پر تین سال تک فائز رہے۔ ۱۹۰۳ء میں (Companion of Indian Empire),C.I.E. کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔ نظام ہائی کورٹ سے ۱۸۹۸ء میں پٹنہ واپس آنے کے بعد آپ نے پھر بار جوائن کیا لیکن آپ پر فالج کا حملہ ہوا جس نے آپ کو پورے طور پر مفلوج کر دیا۔ صحت یاب ہوئے لیکن صحت گرتی چلی گئی اور کمزور ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۳ء تک تقریباً پانچ چھ سال نہایت کسمپرسی کی حالت میں گذرے اور اس دوران علاج و معالجہ اور گھریلو اخراجات کے سلسلہ میں آپ تقریباً دس ہزار روپے کے مقروض ہو گئے۔ بہر حال ۱۹۰۳ء میں حکومت نے انھیں دو سو روپے ماہانہ تنخواہ پر تاحیات لائبریری کا سکریٹری اور لائبریرین مقرر کر دیا اور آٹھ ہزار روپے کی خطیر رقم بھی مہیا کر دی تاکہ وہ اپنے قرض کا بوجھ اتار سکیں۔

لائبریری کی اہمیت:

یہ لائبریری بنیادی طور پر مخطوطات کی لائبریری ہے۔ اور اس بنا پر یہ ایک ریسرچ

لائبریری ہے۔ یہاں عربی، فارسی، اردو، ترکی اور سنسکرت کے بیس ہزار سے زائد مخطوطات محفوظ ہیں۔ بعض مخطوطات تو یہاں ایسے نادر و نایاب ہیں کہ دنیا میں کہیں اور نہیں ملتے۔ چند نادر مخطوطات کا مختصر تعارف بطور مثال پیش ہے:

۱۔ خلافت عباسیہ کا ایک بے حد مشہور خطاط یاقوت مستعصمی (متوفی ۶۹۸ھ) کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہایت ہی خوبصورت قرآن شریف کا ایک نسخہ جس پر اس کے دستخط ہیں اور ۶۶۸ھ درج ہے۔ یہ خطاطی کا بہترین نمونہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ابن بواب (متوفی ۴۲۳ھ) خط نسخ کا موجد تھا اسکے بعد یاقوت ہی نے اسکو درجہ کمال تک پہنچایا۔

۲۔ خط کوفی میں سورۂ ابراہیم کی تین آیتیں ہرن کی کھال پر لکھی ہوئی ہیں۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ٹکڑا تیسری صدی ہجری کا ہے۔ اس میں اعراب کے لیے سرخ نقطے استعمال کئے گئے ہیں۔

۳۔ ''الرسالة القشیریه'' کا قدیم ترین نسخہ ہے جس کی کتابت مصنف کی زندگی میں ہوئی۔ اس پر ۴۳۸ھ درج ہے۔

۴۔ مغل مصوری کا شاہکار ''تاریخ خاندان تیموریہ'' دنیا کا واحد نسخہ ہے۔ یہ تیمور سے اکبر کے بائیسویں سال جلوس تک کی تاریخ ہے۔ اکبر کے دربار کے مشہور مصوروں کی بنائی ہوئی ایک سو بتیس تصویریں اس میں شامل ہیں۔ ہر تصویر کے نیچے تصویر بنانے اور رنگ بھرنے والے کا نام درج ہے۔

۵۔ شاہجہاں کی تاریخ پر مشتمل ''بادشاہ نامہ'' جو دو جلدوں میں ہے۔ اس میں پچیس انتہائی خوبصورت تصویریں بھی ہیں۔ مصوری کا انمول نمونہ ہے۔ اس میں چند عمارتوں کی تصویریں بھی شامل ہیں۔ آخری تصویر میں شاہجہاں کا جنازہ تاج محل جاتا دکھایا گیا ہے۔ جارج پنجم اور ان کی ملکہ ۱۹۱۱ء میں جب دہلی دربار میں آئے تو ان کے ملاحظہ کے لیے یہ پیش کیا گیا اور ان دونوں نے اس پر دستخط کیے۔

۶۔ فاتح قسطنطنیہ سلطان محمد ثانی کی منظوم تاریخ ''شہنشاہ نامہ'' کا یہ مصور نسخہ ہے جسے

سلطان محمد ثالث کے لئے مولف نے اپنے ہاتھ سے مرتب کیا تھا۔ کچھ عرصہ قسطنطنیہ کے سلطانی کتب خانے میں محفوظ رہنے کے بعد شاہجہاں کے زمانے میں یہ نسخہ ہندوستان پہنچا۔ اور دہلی کے شہنشاہی کتب خانہ میں داخل ہوا۔ اس پر مغل بادشاہوں اور شہزادوں کے متعدد دستخط ہیں۔ اس پر شاہجہاں کی بیٹی جہاں آرا بیگم کا بھی دستخط ہے جو کسی اور نسخے پر نہیں ملتا۔ اس نسخے کی تصویریں ہندوستانی اور ایرانی طرز کی تصویروں سے بالکل جداگانہ ہے۔

۷۔ فردوسی کے ''شاہ نامہ'' کا بہت ہی خوبصورت مصور قلمی نسخہ۔ کابل و کشمیر کے گورنر علی مردان خاں نے شاہجہاں کے حضور اسے بطور تحفہ پیش کیا تھا۔

۸۔ جامی کی مشہور تصنیف ''یوسف زلیخا'' جسے عبدالرحیم خانخاناں نے بیس ہزار روپے خرچ کر کے جہانگیر کے لیے نقل کرایا تھا۔ یہ نسخہ مشہور کاتب میر علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جس پر ۹۳۰ھ کی تاریخ ثبت ہیں۔

۹۔ جامی کی تصنیف ''سلسلۃ الذہب'' خود مصنف کے ہاتھ کا تحریر کردہ۔ اس میں ان کے بیٹے کی ولادت کی تاریخ بھی درج ہے۔ یہ پہلی جلد ہے دوسری جلد سینٹ پیٹرسبرگ کے کتب خانہ میں تھی۔

۱۰۔ ''دیوان حافظ'' جو خاندان مغلیہ میں فال نکالنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس پر ہمایوں اور جہانگیر کی تحریریں اور دستخط ثبت ہیں۔ کتاب کے اول صفحہ پر سلطان حسین بایقرا اور دوسرے سلاطین و امراء کے دستخط ہیں۔

۱۱۔ داراشکوہ کی مشہور و معروف تصنیف ''سفینۃ الاولیا'' کا نسخہ خود اسکے ہاتھ کا لکھا ہے موجود ہے۔

۱۲۔ جہانگیر کے ''جہانگیر نامہ'' کا نایاب نسخہ ہے جسے انھوں نے اپنے دربار کے سب سے بڑے کاتب سے لکھوایا اور گولکنڈہ کے بادشاہ قطب شاہ کو تحفۃً دیا تھا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں جب گولکنڈہ فتح ہوا تو ان کے بیٹے شہزادہ سلطان محمد کے قبضے میں یہ

کتاب آئی۔ اس کے پہلے صفحے پر سلطان محمد کا دستخط ہے۔

۱۳۔ الزہراوی کی مشہور زمانہ تصنیف ''کتاب التصریف'' جو ۱۱۹۰ء میں لکھی گئی۔ یہ عمل جراحت پر مصور نسخہ ہے۔ اس میں جراحت کے جو آلات دکھائے گئے ہیں ان میں سے کچھ آج بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ سرجری پر پہلی کتاب مانی جاتی ہے جس کا دنیا کی بیسیوں زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔

۱۴۔ مصحفی کے آٹھ دواوین پر مشتمل مکمل سیٹ کا واحد نسخہ جو صرف خدا بخش لائبریری میں دستیاب ہے۔

۱۵۔ فن تجوید میں ابوعلی الفارسی (متوفی ۳۷۷ھ) کی کتاب ''الحجۃ فی القراآت السبعہ'' نہایت اہم و نادر تصور کی جاتی ہے۔ اس کتاب کا ایک ناقص مگر نہایت ہی قدیم نسخہ اس کتب خانہ میں موجود ہے، یہ وہ نسخہ ہے جس میں امام تاج الدین الکندی (متوفی ۶۱۳ھ) نے درس دیا ہے اور کتاب کے آخری صفحہ پر اپنے تلامذہ کے لئے اپنے قلم سے سند سماع تحریر فرمائی ہے۔

۱۶۔ علم الدین سخاوی (متوفی ۶۴۳ھ) کی ''الوسیلہ الی کشف العقیلہ'' جو ۸۰۷ھ کی لکھی ہوئی ہے یہاں موجود ہے کہا جاتا ہے کہ یہ ایک عرصہ تک ملا علی قاری (متوفی ۱۰۱۴ھ) کے پاس رہی، اسکے بعد خانخانان عبدالرحیم خاں کے کتب خانہ میں داخل ہوئی اور وہاں سے یہاں آ گئی۔

۱۷۔ جاراللہ زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) کی مشہور تصنیف ''الکشاف عن حقائق التنزیل'' کا ایک نسخہ جو ۸۳۴ھ میں سلطان شاہرخ کے کتب خانہ کے لئے لکھا گیا تھا یہاں موجود ہے۔ یہ نسخہ ملک التجار خواجۂ جہاں محمود جو نظام شاہ بہمنی کے وزیر اعظم اور ملا عبدالرحمٰن جامی (متوفی ۸۹۸ھ) کے معاصر تھے، کی ملکیت میں تھا۔ ۸۸۶ھ میں محمد شاہ ثانی کے حکم سے خواجۂ جہاں کے قتل کے بعد ۱۰۰۳ھ میں یہ نسخہ ابراہیم شاہ والی بیجاپور کے کتب خانہ میں داخل ہوا، پھر جب بیجاپور مفتوح ہوا تو اورنگ زیب

کے حکم سے دہلی کے شہنشاہی کتب خانہ میں منتقل ہوا۔ نقش ونگار نیز فن خطاطی کے لحاظ سے یہ نسخہ یکتائے روزگار ہے۔

۱۸۔ عبدالرحمٰن جامی (متوفی ۸۹۸ھ) کی مشہور تصنیف ''شرح فصوص الحکم'' کا ایک نسخہ یہاں موجود ہے جسکو انہوں نے ۸۹۶ھ میں اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔

۱۹۔ شاہزادہ کامران (متوفی ۹۶۴ھ) کے نادر دیوان کا ایک نسخہ جو محمود بن اسحاق شہابی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، موجود ہے۔ اس کے اول صفحہ پر جہانگیر اور شاہجہاں کی خود نوشتہ تحریریں ہیں۔

۲۰۔ طب پر ابوزکریا یوحنا ابن ماسویہ (متوفی ۲۴۳ھ) کی مشہور تصنیف کتاب ''المشجر'' کا ایک قدیم اور نادر نسخہ بھی ہے۔ یہ نویں صدی ہجری کا نسخہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کتاب کے کسی دوسرے نسخے کا ابتک پتا نہیں چلا ہے۔

۲۱۔ اسطرلاب کی بناوٹ اور اسکے استعمال پر نصیرالدین طوسی کی مشہور تصنیف پر نظام الدین حسین البرجندی کی شرح ''شرح بست باب در معرفت اسطرلاب'' کا ایک نسخہ یہاں محفوظ ہے۔ اس کتاب کا سال تصنیف ۸۸۹ھ ہے۔ خط نستعلیق میں یہ نسخہ ۱۱۶۵ھ کا کتابت کردہ ہے۔

ان کے علاوہ شری مدبھگوت گیتا، پران اور مہابھارت کے فارسی تراجم بھی محفوظ ہیں۔ پالی اور سنسکرت میں کئی سوتاڑ پتر موجود ہیں۔ کثیر تعداد میں مشاہیر کے خطوط مثلاً علامہ اقبال، ڈاکٹر راجندر پرشاد، مولانا ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ کے خطوط۔

مخطوطات کے علاوہ لائبریری کا مطبوعہ کتابوں کا کلکشن بھی بڑا قیمتی اور نادر ہے۔ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کے قدیم و نادر مطبوعات جدید مطبوعات کو چھوڑ کر جن کی ہر سال بڑی تعداد میں خریداری ہوتی ہے۔ تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہے ساتھ ہی مختلف اردو رسائل کی تقریباً ۳۸ ہزار جلدیں ہیں۔ ایسا نادر ذخیرہ کسی اور لائبریری میں مشکل سے ملے گا۔ اس طرح مطبوعات کا کل ذخیرہ جدید مطبوعات سمیت سوا دو لاکھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ

ڈھائی ہزار کے قریب مخطوطات کی مائکروفلمیں، ایک ہزار کے قریب مائکروفش، ڈیڑھ ہزار کے قریب مغلیہ عہد کے سکّے اور اچھی تعداد میں آڈیو اور ویڈیو کیسٹ بھی ہیں۔

طب، تصوف، تاریخ ہند (عہد وسطیٰ)، تذکرہ، اسلامیات، عربی، فارسی، اردو ادب، وسط ایشیائی، جنوبی ایشیائی اور مغربی ایشیائی مطالعات ہندوستان کی گنگا جمنی مشترکہ تہذیب اور قومی یکجہتی لائبریری کے خصوصی موضوعات میں جن پر ریسرچ و تحقیق کے لیے یہ لائبریری خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔

مخطوطات کے توضیحی کیٹلاگ:

خدابخش کے زمانے میں ۱۹۰۳ء میں وائسرائے ہند لارڈ کرزن کتب خانہ تشریف لائے اور خدابخش خاں کے اس کارنامے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ زبان پر بے ساختہ یہ شعر آگیا:

اگر فردوس بر روئے زمین است — ہمیں است وہمیں است وہمیں است

آپ نے کتب خانے کی ترقی کے لیے بہت سے مشورے دیئے ان میں سے ایک اہم مشورہ انگریزی میں لائبریری کے مخطوطات کے توضیحی کیٹلاگ تیار کرانے کا تھا، چنانچہ آپ کے ایما پر ڈاکٹر ڈینسن راس کی نگرانی میں یہاں کے مخطوطات کی کیٹلاگنگ کا کام ۱۹۰۵ء میں شروع ہوا اور ۱۹۱۰ء سے کیٹلاگ کی طباعت کا کام شروع ہوگیا چنانچہ ۱۹۴۶ء تک اسکی اکتیس جلدیں (جلد ۱ تا ۲۶ اور ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۵، ۳۶) شائع ہوکر منظر عام پر آگئیں۔ ان کیٹلاگ کی مقبولیت کا حال یہ تھا کہ ۱۹۶۲ء سے ان کیٹلاگ کے دوسرے ایڈیشن کی ضرورت محسوس ہونے لگی چنانچہ ۱۹۶۲ء میں اسکی پہلی جلد کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ساتھ ہی کیٹلاگ کی نئی جلدیں بھی شائع ہوتی جارہی تھیں۔ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۸۰ء کے درمیان پانچ مزید جلدیں (۲۷ تا ۳۰ اور ۳۴) شائع ہوئیں۔ ۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۰ء کے درمیان کوئی جلد شائع نہ ہوسکی۔ انگریزی زبان کے ان توضیحی کیٹلاگ نے دنیا بھر میں بالخصوص یوروپی ممالک اور امریکہ میں لائبریری اور

لائبریری کے مخطوطات کو متعارف کرانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔علمی دنیا میں یہ کیٹیلاگ اتنے مقبول ہوئے کہ ۱۹۷۷ء تک یہ Out of print ہو گئے چنانچہ لائبریری نے انکا دوسرا ایڈیشن ضروری تصحیح و اضافے اور انڈکس کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔

مخطوطات کے توضیحی کیٹیلاگ کا کام اعلیٰ درجہ کا تحقیقی اور علمی کام ہے اور اس میدان میں اسکالرز کی کمی کے باعث فی الحال یہ انتہائی ضروری اور اہم کام نہیں ہو پا رہا ہے۔ لائبریری عربی، فارسی کے پروفیسرز و اسکالرز سے رابطہ کر رہی ہے کہ وہ آگے آئیں اور اس کام کی تکمیل میں لائبریری سے تعاون فرمائیں۔

کتب خانہ کا آغاز چار ہزار مخطوطات سے ہوا تھا آج مخطوطات کی تعداد بیس ہزار سے اوپر ہے۔ توضیحی کیٹیلاگ کی جو ۳۶ جلدیں اب تک تیار ہوئی ہیں وہ صرف مخطوطات کے ایک تہائی حصہ کو محیط ہیں بقیہ دو تہائی مخطوطات پر کام ہنوز باقی ہے۔

قومی اہمیت کا ادارہ:

اس کتب خانہ کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ۱۹۶۹ء میں حکومت ہند نے پارلیامنٹ کے ایک ایکٹ کے ذریعہ اس کتب خانہ کو قومی اہمیت کا ایک ادارہ قرار دیا اور اس کی ساری ذمہ داری مرکزی حکومت نے اپنے سر لے لی۔ چنانچہ اب لائبریری کا انتظام ایک خود مختار بورڈ کے ذریعہ چلتا ہے جس کا چیرمین گورنر بہار ہوتا ہے۔ اور لائبریری کا ڈائرکٹر بورڈ کا ممبر اور سکریٹری ہوتا ہے۔ فی الحال لائبریری کا سالانہ بجٹ تقریباً ڈیڑھ کروڑ کا ہے جسے مرکزی حکومت پورا کرتی ہے۔

کرزن ریڈنگ روم:

لارڈ کرزن کے نام پر یہ ریڈنگ روم اخبارات و میگزین (روز نامے، ہفتہ وار اور پندرہ روزے) کے لیے مخصوص ہے۔ ساتھ ہی مقابلاتی امتحانات کے لیے ہندی اور انگریزی میں کتابیں اور ڈکشنریاں بھی طلباء کے لیے مہیا کی گئی ہیں۔ یہ ریڈنگ روم بارہ گھنٹے صبح آٹھ بجے

تارات آٹھ بجے کھلا رہتا ہے۔ ہر ماہ تقریباً نو ہزار طلباء اس سے مستفید ہوتے ہیں۔

ریسرچ ریڈنگ روم:

کتب خانہ کا ریسرچ ریڈنگ روم صبح ۹-۱-۲ سے شام ۵ بجے تک کھلا رہتا ہے۔ یہ مخطوطات اور مطبوعہ کتابیں پڑھنے والے ریسرچ اسکالرز کے لیے مخصوص ہے۔ ریسرچ کرنے والوں کو ہر طرح کی سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔ ہر ماہ تقریباً ڈیڑھ ہزار اسکالرس اس ریڈنگ روم سے مستفید ہوتے ہیں۔ اسکالرس کو ٹھہرانے کے لئے ایک مہمان خانہ بھی ہے جس میں باہر سے آئے ہوئے اسکالرس کو ٹھہرنے اور لائبریری سے بھرپور استفادہ کرنے کی سہولت دی جاتی ہے۔ ایسے اسکالرز جو یہاں نہیں آسکتے انھیں کتابوں کی زیراکس کاپی اور مخطوطات کی مائکروفلم یا پرنٹ آؤٹ بھیج کر ان کی مدد کی جاتی ہے۔ اسکالرز کو گھر پر پڑھنے کے لیے بھی کتابیں اشو کی جاتی ہیں ایسے ممبروں کی تعداد تقریباً ڈھائی ہزار ہے۔ خطوط کے ذریعہ بھی حوالے فراہم کیے جاتے ہیں اور ریسرچ کے کام کو آگے بڑھانے میں تعاون دیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ کتب خانہ اپنی مثال آپ ہے۔

تحفظ کتب و مخطوطات:

مخطوطات، و مطبوعات کے اس قیمتی ذخیرے کی معقول دیکھ ریکھ اور تحفظ کے لئے لائبریری نے خصوصی انتظام کیا ہے۔ تحفظ کے لئے ایک لیبریٹری (Conservation Laboratory) ہے جسے جدید انداز پر منظم کیا گیا ہے اور مزید جدید آلات و مشینری کی خریداری کا منصوبہ ہے تاکہ نادر و اہم مخطوطات و مطبوعات کا مناسب طور پر تحفظ کیا جاسکے۔ ایک سیکشن جلد سازی کا ہے تاکہ قیمتی کتابوں کی مرمت و جلد سازی لائبریری ہی میں ہوسکے۔ تحفظ کتب کا یہ سیکشن Repair & Restoration, Deacidification, Lamination اور Fumigation کا کام مستقل طور پر کرتا ہے۔ ساتھ ہی ایک سیکشن مائکروفلمنگ کا بھی ہے جو اسکالرز کو ان کے مطلوبہ مخطوطات کا مائکروفلم تیار کر کے انھیں بھیجتا ہے

ساتھ ہی نادر اور اہم مخطوطات کی مائکروفلم تیار کرتا ہے اور اسے محفوظ کرتا ہے۔ حال ہی میں ایک Microfilm Reader Printer خریدا گیا ہے جس سے مائکروفلم کا پرنٹ آوٹ تیار کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ بڑا فائدہ ہے کہ اصل مخطوطات کے استعمال کے بجائے مخطوطہ کو محفوظ کردیا جاتا ہے اور پڑھنے کے لئے مخطوطے کا پرنٹ آوٹ استعمال میں لایا جاتا ہے۔ ساتھ ہی اسکالرز کو بھی مائکروفلم کے بجائے پرنٹ آوٹ بھیجدیا جاتا ہے جس سے استفادہ مائکروفلم کے مقابلے میں کہیں آسان ہے۔ تحفظ کتب کے اس سیکشن کو مزید کارآمد بنانے کی ضرورت ہے۔

سمینارز اور لکچرز:

اشاعت علم کی غرض سے سمینارز اور لکچرز کا انعقاد اس کتب خانہ کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ ہر سال علوم مشرقیہ کے ماہرین کو ان کے مخصوص موضوعات پر لکچرز کے لیے دعوت دی جاتی ہے اور سال میں چار سے لے کر آٹھ لکچرز تک کرائے جاتے ہیں۔ سال میں ایک بار قومی سمینار اور تین چار سال میں ایک بین الاقوامی سمینار کا انعقاد کیا جاتا ہے۔

گزشتہ سالوں میں طب، تصوف، تاریخ ہند (عہد وسطی)، قرآنیات اور اردو کے پانچ بین الاقوامی سمینار منعقد ہوئے جو غیر مطبوعہ مخطوطات کے لئے مخصوص کیے گئے تھے۔ چنانچہ جنوبی ایشیائی ممالک میں مذکورہ بالا موضوعات پر جو غیر مطبوعہ اہم مخطوطات مختلف لائبریریوں اور نجی کلکشنوں میں محفوظ ہیں اور جو ضروری تدوین وتصحیح کے بعد اشاعت کے محتاج ہیں، کی جامع فہرست اس موقع پر مرتب ہوگئیں۔ ایک بین الاقوامی سمینار ہند از بک تعلقات پر بھی منعقد ہوا جس میں پڑھے گئے مقالات بھی لائبریری نے شائع کردیے ہیں۔

دیگر علمی سرگرمیاں:

سمینارز اور لکچرز کے علاوہ علمی ذوق پیدا کرنے کے لیے کتابوں اور مخطوطات کی نمائش، مشاعرے اور طرحی مشاعرے، کوئی سمیلن طلباء کے لیے انعامی مقابلے وغیرہ بھی منعقد کیے جاتے ہیں تاکہ کتب خانے کی طرف لوگوں کی توجہ کھینچی جاسکے اور علم کی نشر واشاعت ہو۔

ریسرچ فیلوشپ:

کتب خانہ میں محفوظ اہم و نادر مخطوطات پر ریسرچ و تحقیق کے لیے دو دو سال کے لیے یو۔جی۔سی کے طریقہ پر دس فیلوشپ کا انتظام کیا گیا ہے تاکہ ریسرچ اسکالرز مخطوطات پر کام کرسکیں۔ اس طور پر جو کام ہوئے ہیں انھیں لائبریری نے شائع بھی کیا ہے۔ کتب خانہ کو جن سات یونی ورسٹیوں نے پی ایچ۔ ڈی اور ڈی۔لٹ کے لیے ایک تحقیقی مرکز کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے وہ یہ ہیں: کشمیر یونی ورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، گلبرگہ یونی ورسٹی، جامعہ ہمدرد، وشو بھارتی، مگدھ یونی ورسٹی اور بہار یونی ورسٹی۔

خدابخش سالانہ ایوارڈ:

کتب خانہ نے ایک سالانہ ایوارڈ، خدابخش ایوارڈ کے نام سے جاری کیا ہے۔ یہ ایوارڈ اس کتب خانہ کے مخصوص موضوعات یعنی تصوف، مذاہب کا تقابلی مطالعہ، ہندوستان کی گنگا جمنی مشترکہ تہذیب، طب، وسط ایشیائی، جنوبی ایشیائی اور مغربی ایشیائی مطالعات، مطالعات اسلامی، تاریخ ہند، عربی، فارسی اور اردو ادب، عہد وسطیٰ کے سائنس، آرٹ اور تعمیرات کی تاریخ پر نمایاں کام انجام دینے والے اسکالر کو دیا جاتا ہے۔ یہ ایوارڈ ایک لاکھ روپے کا ہوتا ہے جسے صدر جمہوریہ کے ہاتھوں راشٹر پتی بھون میں دیا جاتا ہے۔ اب تک یہ ایوارڈ تین اسکالرز جناب بی۔این پانڈے، جناب انور جمال قدوائی اور مسز سبھدرا جوشی کو قومی یکجہتی اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے لیے دیا جاچکا ہے۔ فارسی ادب، تاریخ ہند اور تصوف کے لیے تین ایوارڈ جلد ہی دیے جائیں گے۔

خدابخش لائبریری جرنل اور دیگر مطبوعات:

لائبریری نے ۱۹۷۷ء سے ایک سہ ماہی تحقیقی مجلہ شائع کرنا شروع کیا جو اب تک پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ اب تک اس کے ۱۲۳ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔

اس مجلّہ کے علاوہ لائبریری نے تقریباً ساڑھے چار سو کتابیں، عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور ہندی میں شائع کی ہیں اور اشاعت کی یہ اسکیم جاری ہے۔ یہ کتابیں زیادہ تر تحقیق و تدوین سے متعلق ہیں اور کتب خانہ میں محفوظ نادر مواد پر مشتمل ہیں۔ لائبریری میں محفوظ عربی و فارسی کے جو اہم مخطوطات مدون ہو کر یا عکسی شکل میں لائبریری نے شائع کیے ہیں ان میں قابل ذکر درج ذیل ہیں:

۱۔ جہانگیر نامہ: وہ نایاب نسخہ جس میں جہانگیر کے ابتدائی تین سالہ عہد کی تاریخ ہے اور جسے جہانگیر نے اپنے دربار کے سب سے بڑے کاتب سے لکھوایا اور گولکنڈہ کے بادشاہ قطب شاہ کو تحفۃً دیا تھا۔ اس کے پہلے صفحے پر سلطان محمد کا دستخط بھی ہے۔ اس مخطوطے کی کوئی دوسری کاپی کہیں اور نہیں ملتی لائبریری نے اسے عکسی شکل میں شائع کر دیا ہے۔

۲۔ سیرت فیروز شاہی: فیروز شاہ کی حکومت کے ابتدائی عہد کی ایک اہم و نایاب تاریخ جس کا کوئی دوسرا نسخہ کہیں دستیاب نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ اس کا مصنف نامعلوم ہے لیکن واقعات و حالات کا عینی شاہد ہے۔ اس نسخے کی اس تاریخی اہمیت کی بنا پر مشہور مورخ پروفیسر سید حسن عسکری نے اس پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا۔ عسکری صاحب کے اسی مقالہ کو اس کتاب کا مقدمہ بنا کر مخطوطے کو عکسی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے۔

۳۔ دیوان حافظ: حافظ کے دیوان کا وہ نادر نسخہ جو شاہان مغلیہ کے ذاتی استعمال میں رہا اور جس سے ہمایوں اور جہانگیر فال نکالا کرتے تھے۔ نسخے پر جا بجا نکالے گئے فال کی تفصیل خود ہمایوں اور جہانگیر کے قلم سے ہے۔ اس نسخے کو بڑے اہتمام سے لائبریری نے عکسی شکل میں شائع کر دیا ہے۔

۴۔ کتاب الاسد والغواص: چھٹی صدی ہجری کی ایک نامعلوم مصنف کی تصنیف ہے جسکی ادبی اہمیت کے پیش نظر ڈاکٹر مہدی انصاری، شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اسے ایڈٹ کیا ہے اور لائبریری نے شائع کیا ہے۔

۵۔ اختیار الرفیق لطلاب الطریق: یہ آٹھویں صدی ہجری تک کے صوفیا کا ایک نادر تذکرہ ہے جسکے مصنف احمد بن سلامۃ المقدسی ہیں۔ لائبریری کے ایک رسرچ فیلو ڈاکٹر محمد ذاکر حسین

نے اسے ایڈٹ کیا ہے اور لائبریری نے اسے شائع کر دیا ہے۔

اہم و نادر مخطوطات کے علاوہ اہم و نادر مطبوعات بھی طباعت کیلئے منتخب کئے جاتے ہیں چنانچہ اس کے تحت اہم قدیم مطبوعات بالخصوص قدیم اردو رسائل مثلاً نوبت رائے نظر کے ادیب، پیارے لال شاکر کے العصر، چکبست کے صبح امید، قاضی عبدالودود کے معیار، رسالہ ہندوستانی، دیانرائن نگم کے رسالہ زمانہ (کانپور)، ندیم (گیا) اور رسالہ الناظر (لکھنو) وغیرہ کے انتخابات موضوع وار متعدد جلدوں میں شائع کئے گئے۔ اس طرح مختلف النوع موضوعات پر قدیم وجدید تحقیقات کو شائع کیا گیا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

انٹرنیٹ:

لائبریری نے گذشتہ سال اپنا ویب سائٹ تیار کر لیا ہے اور اس طرح لائبریری انٹرنیٹ سے جڑ گئی ہے۔ لائبریری کے مخطوطات اور مطبوعات کو انٹرنیٹ پر دینے کا کام شروع ہو گیا ہے۔ فی الحال لائبریری کا تعارف اس کی سرگرمیاں، یہاں سے شائع شدہ کتابوں کی فہرست اور مخطوطات کی توضیحی فہرست (۳۶ جلدیں)، نیز لائبریری کے قوانین وضوابط انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں۔ آگے چل کر آن لائن کیٹلاگ کی سہولت بھی دستیاب ہو جائے گی۔ اس طرح لائبریری نے جدید کاری کی طرف بھی بھر پور توجہ دی ہے تاکہ لائبریری کی افادیت کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جاسکے۔

لائبریری کے اسٹاف:

گذشتہ بیس پچیس سالوں کے درمیان لائبریری کی سرگرمیاں جہاں دوگنی تگنی ہوگئی ہیں وہیں لائبریری میں اسٹاف کی کمی شدت سے محسوس کی گئی ہے۔ یہ جان کر تعجب ہوگا کہ ۱۹۶۵ء میں لائبریری میں کل ۴۲ اسٹاف تھے اور آج اسٹاف کی تعداد ۵۹ ہے گویا گذشتہ ۳۵/۳۶ سالوں کے دوران صرف ۱۷ اسٹاف کا اضافہ ہوا ہے جبکہ لائبریری کے ذخیرہ کتب اور لائبریری کی دیگر علمی سرگرمیوں میں قابل ذکر اضافہ ہوا ہے۔ یہ امر قابل افسوس ہے اور اس

پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

لائبریری بلڈنگ:

لائبریری کے بانی خدابخش خاں نے ۱۸۸۸ء میں لائبریری کے لئے ایک دومنزلہ عمارت اپنے خرچ سے بنوائی تھی جسے انہوں نے عوام کے حوالے کر دیا تھا۔ ۱۹۳۴ء کے زلزلے میں اس کی اوپری منزل گرگئی بہر حال ۱۹۳۸ء میں حکومت بہار نے ایک نئی عمارت اسی احاطہ میں بنوائی۔ ۱۹۶۹ء میں حکومت ہند نے پھر اسکی اوپری منزل بنوائی لیکن مشکل سے تیرہ سال کا عرصہ گزرا تھا کہ پھر جگہ کی کمی ہوئی اور ۱۹۸۳ء میں اس عمارت سے ملحق ایک سہ منزلہ عمارت حکومتِ ہند نے بنوائی جسکا افتتاح صدر جمہوریہ ہند جناب گیانی ذیل سنگھ نے کیا۔ اب پھر لائبریری میں جگہ کی کمی ہوگئی ہے اور کتابیں زمین میں رکھی جارہی ہیں۔ ایک چھ منزلہ عمارت کا منصوبہ تیار ہے اور حکومت ہند کی منظوری کے لئے بھیجا جاچکا ہے۔ اس کی تعمیر میں تقریباً پونے چھ کروڑ روپے کے خرچ کا تخمینہ ہے۔ امید ہے اگلے پنچسالہ منصوبے میں یہ کام ہوسکے گا۔



(خدابخش لائبریری جرنل شمارہ ۱۲۴)

ڈاکٹر محمد ذاکر حسین
لائبریری اسسٹنٹ،
خدا بخش لائبریری، پٹنہ

خدا بخش خاں اور ان کی لائبریری

قدیم اور نادر قلمی کتابوں اور مغل اور راجپوت دور کے قلمی نسخوں کے لیے پٹنہ کی شہرہ آفاق خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے بانی خدا بخش خاں ایک سیدھے سادے انسان تھے۔ پٹنہ کے رئیس اور بڑے لوگ انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہ اپنے وقت کے پٹنہ کے بہت ہی مشہور وکیل تھے۔ وکالت سے انھوں نے بہت پیسہ کمایا مگر اپنی زندگی بھر کی کمائی انھوں نے قلمی اور چھپی ہوئی کتابوں کو خریدنے اور خدا بخش لائبریری کی عمارت بنوانے میں لگادی۔ انھوں نے لگ بھگ ۵۰۰۰ قلمی اور ۲۰۰۰۰ مطبوعہ کتابیں خریدیں۔ ان میں سے ۱۲۰۰ قلمی کتابیں ان کے والد مرحوم چھوڑ گئے تھے۔

خدا بخش خاں کی پیدائش ۲؍اگست ۱۸۴۲ء کو صوبہ بہار کے چھپرہ ضلع میں ہوئی۔ ان کی پیدائش کے بعد ان کے والد محمد بخش اپنے پورے کنبے کے ساتھ پٹنہ چلے آئے اور یہاں وکالت کرنے لگے۔ خدا بخش خاں کی تعلیم و تربیت بانکی پور پٹنہ ہی میں شروع ہوئی۔ ۱۸۵۴ء میں ان کا داخلہ پٹنہ ہائی اسکول میں کرایا گیا۔ لیکن ابھی تین چار کلاس ہی اس اسکول میں پڑھے ہوں گے کہ ہندوستان ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے دوچار ہوا اور پٹنہ بھی اس سے بچ نہ سکا۔ اسی طوفان میں پٹنہ ہائی اسکول کا خاتمہ ہوگیا۔ چنانچہ انھیں تعلیم پوری کرنے کے لیے کلکتہ بھیجا گیا۔ وہاں اپنے رشتہ دار نواب امیر علی خاں کے یہاں رہ کر ۱۸۶۱ء میں انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ خدا بخش خاں بغیر بی۔ اے پاس کیے کلکتہ نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ مگر وہاں کی آب و ہوا ان کو راس نہیں آئی۔ اس لیے مجبور ہو کر اسی سال یعنی ۱۸۶۱ء میں پٹنہ واپس لوٹ آئے۔ یہاں آکر انھوں نے لا کالج میں داخلہ لیا مگر اس وقت خدا بخش خاں

کی زندگی میں ایک مشکل وقت آ گیا۔ بڑھاپے کی وجہ سے ان کے والد کو طرح طرح کی بیماریوں نے گھیر لیا تھا۔ دھیرے دھیرے ان کی صحت اتنی خراب ہو گئی کہ وہ کچہری جانے سے معذور ہو گئے۔ وکالت کے سوا ان کی آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا اس لیے خاندان کا سارا بوجھ خدا بخش خاں پر آ پڑا لیکن وہ ذرا بھی پریشان نہیں ہوئے اور خاندان کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ انھوں نے قانون کی تعلیم جاری رکھی۔ پھر وہ ڈسٹرکٹ جج کے یہاں پیشکار ہو گئے۔ اس طرح برسوں انھوں نے بے پناہ محنت کے دن گزارے۔ قانون کا امتحان پاس کر کے ۱۸۶۸ء میں انھوں نے وکالت شروع کی۔ ۱۸۸۰ء میں انھیں سرکاری وکیل مقرر کیا گیا۔ اسی سال خان بہادر کا خطاب بھی ملا جو اس وقت ہندوستانیوں کے لیے بڑی عزت اور فخر کی بات تھی۔

۱۸۹۸ء میں حیدرآباد سے پٹنہ لوٹنے پر انھوں نے دوبارہ وکالت شروع کی لیکن خرابی صحت کی وجہ سے جم نہیں سکے۔ دراصل برسوں سخت محنت کرتے کرتے ان کا دل اور دماغ جواب دے چکا تھا۔ بالآخر تھک ہار کے بستر پر گر گئے۔ اچانک فالج کا حملہ ہوا۔ ہاتھ پاؤں بڑی حد تک بے کار ہو گئے جس کے نتیجے میں آمدنی بند ہو گئی اور قرض بڑھنے لگا۔ جب حکام کو خبر ملی تو سرکار نے فوراً مدد کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ دو سو روپے ماہانہ پر خدا بخش لائبریری کے سکریٹری مقرر ہوئے، ساتھ ہی قرض کی ادائیگی کے لیے سرکار نے یکمشت آٹھ ہزار روپے انھیں دیے۔ اتنا ہی نہیں، سرکار نے انھیں ۱۹۰۳ء میں سی۔ آئی۔ اے کے خطاب سے نوازا جو اس وقت بہت ہی کم ہندوستانیوں کو دیا جاتا تھا۔

۳ر اگست ۱۹۰۸ء کو رات ایک بجے بہار کی اس عظیم شخصیت کا انتقال ہو گیا اور ۴ر اگست ۱۹۰۸ء کو خدا بخش لائبریری کے احاطہ میں ہی انھیں بڑے احترام کے ساتھ سپرد خاک کر دیا گیا۔

خدا بخش خاں کو کتابوں سے بے حد لگاؤ تھا، تبھی تو برٹش میوزیم کے ذریعہ منہ مانگی قیمت دینے پر بھی انھوں نے اپنے ذخیرہ کو بیچنے سے انکار کر دیا تھا۔ برٹش مصنف وینسنٹ کلارنس اسکاٹ اوکانر کے مطابق خدا بخش خاں کا جواب اس طرح تھا:

''میں ایک غریب آدمی ہوں اور برٹش میوزیم میرے ذخیرے کے
لیے جو رقم دے رہی ہے وہ شاہی قیمت ہے، لیکن میں صرف پیسہ کے لیے اپنا
ذخیرہ انھیں کیسے دے دوں، یہ میرے اور میرے والد کی زندگی بھر کی کمائی ہے یہ
ذخیرہ پٹنہ کے لیے ہے اور میں یہ تحفہ اپنے باشندگان پٹنہ کو ہی پیش کروں گا''۔

۱۸۹۰ء میں خدا بخش نے لائبریری کی عمارت بنوائی۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۸۹۱ء کو ٹرسٹ بنا کر انھوں نے جب اس لائبریری کو عوام کے نام معنون کر دیا تو ایک شرط لگا دی، وہ شرط یہ تھی کہ لائبریری ہمیشہ پٹنہ میں ہی رہے گی۔

خدا بخش خاں کو اس لائبریری اور لائبریری کی کتابوں سے بے حد لگاؤ تھا، اپنی موت سے دو دن قبل تک وہ کتابوں اور الماریوں کی صفائی کرتے رہے تھے۔

خدا بخش خاں کے والدین باعزت اور اعلیٰ تعلیم یافتہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد محمد بخش خاں نامی گرامی وکیلوں میں تھے۔ وہ فارسی زبان کے مشہور استاد تھے اور عربی زبان بھی خوب جانتے تھے۔ ان کو قلمی کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ مرتے وقت انھوں نے بارہ سو قلمی کتابوں کے علاوہ اپنی ساری جائداد اپنے لڑکے خدا بخش خاں کو سونپتے ہوئے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ لائبریری کی ایک اچھی سی عمارت تعمیر کرائی جائے جہاں عام لوگ علم کی دولت سے مالا مال ہو سکیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے والد کی رہبری میں خدا بخش خاں کو بھی قلمی کتابیں جمع کرنے کا شوق ہو گیا تھا۔

اس زمانے میں یعنی ۱۸۸۰ء میں جب روپیہ کی قیمت بہت زیادہ تھی، خدا بخش خاں کے لگ بھگ پانچ لاکھ روپے اس لائبریری پر خرچ ہوئے۔ اسی ہزار روپے میں تو صرف عمارت تعمیر ہوئی۔

وکالت کا امتحان پاس کر کے ۱۸۶۸ء میں خدا بخش خاں نے وکالت شروع کی۔ انھوں نے اتنی محنت اور لگن سے کام کیا کہ دو چار مقدموں میں ہی ان کی قابلیت اور صلاحیت کا چرچا جگہ جگہ ہونے لگا۔ صرف دو سال کی قلیل مدت میں ان کا شمار پٹنہ کے نامی گرامی وکیلوں میں

ہونے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ خدا بخش جس مقدمہ کو ہاتھ میں لیتے تھے اس میں جی جان لگا دیتے تھے۔ مقدمہ کے متعلق نکات کے ایک ایک لفظ کو غور سے پڑھتے تھے اور مقدمہ کو حاکم کے سامنے اس طرح پیش کرتے تھے کہ اس کی حیثیت ہی بدل جاتی تھی۔ کمزور سے کمزور مقدمہ میں بھی حاکم کو قلم لگانا مشکل ہو جاتا تھا۔ یادداشت بھی انھوں نے غضب کی پائی تھی۔ جس قانونی دفعہ یا نظیر کو ایک مرتبہ دیکھ لیتے تھے کیا مجال کہ وہ دماغ سے ہٹ جائے۔ نتیجتاً وکالت میں ان کا نام اتنا آگے نکل گیا کہ نوٹوں کی بارش ہونے لگی۔ اس زمانے میں ایک دن میں پانچ پانچ چھ چھ سو روپے کما لیتے تھے۔ اس طرح انھوں نے ۲۷ سال وکالت کی اور بے شمار دولت کمائی۔ لیکن ایک ہاتھ سے کمایا اور دوسرے ہاتھ سے لٹایا۔ ساری کی ساری دولت انھوں نے کتابوں کی خریداری میں لگا دی۔

خدا بخش خاں کی قابلیت کی شہرت سن کر نظام حیدرآباد نے انھیں ۱۸۹۵ء میں اپنی ریاست کا چیف جسٹس بنالیا۔ تین سال تک انھوں نے وہاں بڑی کامیابی کے ساتھ خدمت انجام دی اور پھر ۱۸۹۸ء میں وہ پٹنہ لوٹ آئے۔

انگریزی میں تعلیم پانے اور وکیل ہونے کی وجہ سے خدا بخش خاں کے انگریزوں سے گہرے روابط تھے۔ پھر بھی انگریزی تہذیب ان کے دامن کو چھو نہ سکی۔ وہ اپنے رہن سہن، چال ڈھال اور افکار و خیالات کے اعتبار سے خالص ہندوستانی ہی رہے۔

لکھنے پڑھنے کے بہت شوقین تھے۔ وکالت کی مصروفیات کے باوجود اپنے لکھنے پڑھنے کے لیے روزانہ وقت نکال لیتے تھے۔ کچہری سے آنے کے بعد رات کا کھانا شام ہی کو کھا لیتے تھے اور تھوڑا سا آرام کرنے کے بعد اپنی کتابوں کے کمرے میں چلے جاتے اور رات میں دیر تک وہیں پڑھتے لکھتے رہتے۔ دنیا کی ہزاروں اچھی سے اچھی کتابیں ان کی نظر سے گزر چکی تھیں۔

غریب ہو یا امیر انھوں نے سب کی یکساں طور پر عزت کی۔ اپنے دوستوں کے ساتھ ہمیشہ ایک سا برتاؤ رکھا، اور دوستی کو زندگی بھر نبھایا بھی۔ کسی کا دل دُکھانا ان کے نزدیک سب سے بڑا گناہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ملازموں کے ساتھ بھی بہت نرمی اور محبت سے پیش آتے تھے۔

خدا بخش خاں قلمی کتابوں کے قدردان تھے اور انھیں جمع کرنے کے شوقین۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اودھ میں لوٹ مچی ہوئی تھی۔ اودھ کی عمارتیں زمین بوس ہو رہی تھیں، نتیجتاً شاہی لائبریری کی قیمتی کتابیں بھی تتر بتر ہونے لگی تھیں۔ ہندوستان کے پانچ چھ سو برسوں کے علم کا خزانہ ہمارے عالموں اور پنڈتوں کی کمائی شاہی لائبریری میں جمع تھی۔ لیکن جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندوستانیوں اور انگریز سپاہیوں کے درمیان تصادم ہوا تو یہ انمول خزانہ ہاتھوں ہاتھ لٹ گیا۔

ویسے تو خدا بخش خاں نے بہت بعد میں کتابیں جمع کرنے کا کام شروع کیا مگر اپنی سوجھ بوجھ اور انتھک کوشش کے ذریعہ انھیں لوٹی ہوئی ساری کی ساری کتابیں تحفہ میں حاصل ہو گئیں۔ کتابیں اکٹھا کرنے کے کام میں خدا بخش خاں کے ایک ملازم محمد مکی نے بھی بہت اہم رول ادا کیا۔ وہ پچاس روپیہ ماہانہ تنخواہ پر ۱۸ برسوں تک خدا بخش کے لیے ملک و بیرون ملک کا سفر کر کے عربی، فارسی کی نادر قلمی اور مطبوعہ کتابیں حاصل کرتا رہا۔ اس کام کے لیے اس نے بیروت، شام، مصر، سعودی عرب، ایران، اردن وغیرہ ملکوں کا سفر کیا۔ محمد مکی نے رامپور کے نواب کے دربار سے بھی ڈھیر ساری کتابیں خدا بخش خاں کے لیے حاصل کیں۔

اپنے زمانے میں خدا بخش خاں پرانی کتابیں خریدنے کے لیے پورے ملک میں مشہور تھے۔ دور دراز سے لوگ ان کے پاس کتابیں لے کر آتے تھے اور یہ ان کو آمد و رفت کا کرایہ دے کر باعزت واپس کرتے تھے۔ خدا بخش خاں پر قلمی کتابیں جمع کرنے کی دھن سوار تھی، اس لیے مختلف مقامات پر آدمی بھیج کر اور دُگنی قیمت دے کر بھی قلمی و مطبوعہ کتابیں حاصل کر لیتے تھے۔ اسی زمانے میں جب انگلینڈ میں کتابیں نیلام کی جا رہی تھیں تو ان میں سے بھی بڑی تعداد میں کتابیں خدا بخش خاں کے لیے حاصل کی گئی تھیں۔

خدا بخش خاں کتابوں کے ایسے رسیا تھے کہ اپنے حیدرآباد کے قیام کے دوران ایک دن جب کورٹ سے لوٹ رہے تھے تو ایک کباڑی والے کے پاس پرانی کتابوں کا ایک بنڈل دیکھا۔ انھوں نے اس سے بنڈل کی قیمت پوچھی۔ کباڑی والے نے انھیں غور سے دیکھا اور ان

کی وضع قطع اور بولنے کے انداز سے سمجھ گیا کہ وہ بڑے آدمی ہیں۔ چنانچہ وہ بولا:

''ویسے تو ہم اسے دوتین روپے میں بیچتے لیکن جب آپ لے رہے ہیں تو یقیناً یہ کوئی قیمتی کتاب ہے، اس لیے میں ۲۰ روپے لوں گا''۔

خدابخش نے اس کو ۲۰ روپے میں خرید لیا۔

دراصل اس بنڈل میں عربی تاریخ کی نادر کتابیں تھیں جنھیں بعد میں نظام حیدرآباد نے ۴۰۰ روپے میں ان سے خریدنا چاہا لیکن خدابخش خاں نے انھیں فروخت نہیں کیا۔

خدابخش خاں کو ڈھیر ساری قلمی اور مطبوعہ کتابیں اور کچہریوں کی دستاویزات تحفہ میں حاصل ہوئیں۔ مغل بادشاہ اکبر کی لائبریری میں لگ بھگ ۲۴۰۰ کتابیں تھیں، تقریباً وہ ساری کتابیں مختلف ذرائع سے خدابخش خاں کو حاصل ہو گئیں۔

جن دنوں خدابخش خاں پٹنہ میں وکالت کر رہے تھے، انھیں دنوں کلکتہ میں بلاک مین نامی ایک انگریز دانشور رہا کرتے تھے۔ وہ خدابخش خاں کے دوست تھے۔ جب وہ لندن واپس جانے لگے تو اپنی ڈھیر ساری قیمتی کتابیں اور دستاویز خدابخش خاں کو تحفے میں دے گئے۔

قلمی کتابوں کا انوکھا اور بہترین خزانہ

بہار کی راجدھانی پٹنہ کے اشوک راج پتھ پر آباد خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری میں دنیا بھر کی نادر اور انمول قلمی کتابیں اور دست کاریاں جتنی کثیر تعداد میں موجود ہیں اتنی ہندوستان ہی کیا، ایشیا کے کسی اور ملک کی کسی بھی دوسری لائبریری میں شاید ہی ہوں۔ عربی، فارسی اور اردو کی قلمی کتابوں کا جتنا بہترین ذخیرہ اس لائبریری میں ہے اتنا عام طور پر کسی مسلم ملک میں بھی نہیں ہے۔ بہت سی ایسی قلمی و مطبوعہ کتابیں اور قلمی نسخے اس لائبریری میں موجود ہیں جو دنیا میں نایاب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عرب اور مسلم ممالک سے ہر سال کثیر تعداد میں لوگ یہاں آتے ہیں اور قلمی کتابوں کے اس انوکھے اور نایاب ذخیرہ کو دیکھ کر ششدر رہ جاتے ہیں۔

اس لائبریری میں عربی زبان کی قلمی کتابوں میں قرآن شریف کے مخطوطے خاص طور

سے قابل ذکر ہیں۔ ان میں ۱۲۶۹ء میں المستعصمی کا تحریر کردہ قرآن شریف فن کتابت کا بہترین نمونہ ہے۔ المستعصمی آخری عباسی خلیفہ المستعصم باللہ کے دربار کے بہترین کاتب تھے۔ ان کے دور میں ان کے تحریر کردہ مخطوطے جواہرات کی طرح قیمتی مانے جاتے تھے۔ اس قرآن کے ہر صفحے پر خط نسخ، ریحان اور ثلث کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ ان میں خط نسخ خود کاتب کا ایجاد کردہ ہے۔ اس کے کناروں کو رنگین پھول اور بیل بوٹوں کی تصاویر سے سجایا گیا ہے۔ اس قرآن پر کچھ مشہور عرب دانشوروں کے دستخط بھی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قرآن شریف کا یہ مخطوطہ ان سبھی دانشوروں کے پاس رہا ہوگا جن کے دستخط اس پر موجود ہیں۔ ایک عرب دانشور نے ہی اسے سو روپے کا عطیہ لے کر خدا بخش خاں کو دیا تھا۔

قرآن شریف کا ایک دوسرا نسخہ ایسا ہے جس میں فارسی میں نوٹ لکھے ہوئے ہیں۔ اس کے صفحات بڑے بڑے اور اس کی لکھاوٹ بھی بڑی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قلمی کتاب بغداد میں لکھی گئی تھی۔

''دیوان حافظ'' کا قلمی نسخہ بھی اس لائبریری میں موجود ہے جس کا استعمال مغل بادشاہ ہمایوں اور جہانگیر مصیبت کی گھڑیوں میں اور کسی خاص کام کو شروع کرنے سے قبل اس سے فال نکالنے کے لیے کیا کرتے تھے اور جو نتیجہ نکلتا اس کو حاشیے پر لکھ دیا کرتے تھے، جس پر ان بادشاہوں کے دستخط بھی موجود ہیں۔

فردوسی کی شہرہ آفاق تصنیف ''شاہنامہ'' بھی یہاں موجود ہے۔ یہ رزمیہ اسلوب میں لکھی گئی ایران کی تاریخ ہے۔ کابل اور کشمیر کے گورنر علی مردان خاں نے یہ نادر نسخہ شاہجہاں کی نذر کیا تھا۔

''شہنشاہ نامہ'' بھی اس لائبریری کا ایک اہم مخطوطہ ہے۔ اس قلمی نسخہ پر تیموری خاندان کے کچھ خاص افراد کے دستخط اور مہریں ثبت ہیں۔ ان میں سب سے اہم شاہجہاں کی چہیتی بیٹی جہاں آرا بیگم کی مہر ہے۔ یہ قلمی کتاب ترکی کے سلطان محمد سوئم کی تھی جو وہاں کی شاہی لائبریری میں محفوظ تھی۔ لیکن پتہ نہیں یہ قلمی کتاب ہندوستان کیسے پہنچی اور شاہجہاں کے ہاتھ کیسے

گئی۔شاہجہاں کی یہ پسندیدہ قلمی کتاب تھی اوران کی لائبریری میں اسے نمایاں مقام حاصل تھا۔ یہ بھی خدا بخش لائبریری میں موجود ہے۔

محمد امین بن ابوالحسن قزوینی کی تصنیف کردہ'' بادشاہ نامہ'' اس لائبریری کی بہت اہم اور قیمتی کتاب ہے۔اس میں شاہجہاں کے دور حکومت سے لے کر ان کی وفات تک کی پوری تاریخ درج ہے۔اس کے صفحات پر کئی بہترین تصویریں ہیں جن میں تاج محل کی تعمیر کے بعد بنائی گئی اس کی پہلی تصویر، شاہجہاں کا دربار، لال قلعہ، شاہجہاں کے لڑکے داراشکوہ کی شادی وغیرہ کی تصویریں شامل ہیں۔اس کے حاشیہ پر خوبصورت پھولوں کے جاذب نظر نمونے بنے ہوئے ہیں۔۱۹۱۱ء میں جارج پنجم اوران کی مہارانی نے اسے دلی میں دیکھا تھا۔ان کے دستخط بھی اس قلمی کتاب پر موجود ہیں۔

''دیوان کامران'' نامی قلمی کتاب یہاں کا انمول خزانہ ہے۔ بادشاہ ہمایوں اسے ایران سے لایا تھا۔اس میں ہمایوں، جہانگیر، شاہجہاں اور اکبری دربار کے مشہور لوگوں کے دستخط اور مہریں موجود ہیں۔

اس لائبریری میں ڈھیر ساری قلمی کتابیں تصوف سے متعلق ہیں ان میں سب سے پرانی ''الرسالۃ القشیر یہ'' ہے اور سب سے زیادہ مشہور ''کتاب فی التصوف'' ہے۔اس کے مصنف مشہور صوفی مفکر بشر الحافی تھے۔اس کتاب کی دوسری کاپی اور کہیں نہیں ملتی۔ احمد بن سلامہ کی تصنیف اختیار الرفیق لطلاب الطریق اور عبدالرحمن جامی کی تلخیص کردہ خلاصہ انیس الطالبین بھی لائبریری کے نوادرات میں شامل ہیں جن کا دوسرا نسخہ اور کہیں دستیاب نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سارے نوادرات اور جواہرات اس لائبریری کی زینت ہیں، جن کی تفصیل کا یہ مختصر مقالہ متحمل نہیں ہوسکتا۔

خدا بخش لائبریری میں ایرانی، ترکی، راجپوت اور مغل اسکول کی Miniature Paintings کا ایک عظیم ذخیرہ بھی موجود ہے۔اس میں مغلیہ دور کی پینٹنگ اتنی اہم ہیں کہ ہمارے ملک میں تعمیراتی آرٹ کے نقطۂ نظر سے جو مقام تاج محل کو حاصل ہے Miniature

Paintings کے نقطۂ نظر سے وہی مقام خدابخش لائبریری کو حاصل ہے۔ مثلاً ''تاریخ خاندان تیموریہ'' ہی کو لے لیجیے۔ یہ خدابخش لائبریری کی بہت ہی نادر قلمی کتاب ہے اس میں ہندوستان کے مغل حکمراں بابر، ہمایوں اور اکبر کی تاریخ درج ہے، آغاز کتاب میں فارسی میں شاہجہاں کی ایک تحریر ملتی ہے جسکا مفہوم اردو میں یہ ہے:

''اس کتاب کو شاہ بابا (اکبر اعظم کو شاہجہاں اسی نام سے پکارتے تھے) نے اپنے دور حکومت کے ۲۲ ویں سال میں تیار کرایا تھا''۔

اس قلمی کتاب میں ۱۳۲ رنگین تصویریں ہیں جنھیں مغل بادشاہ اکبر کے دربار کے نامی گرامی مصوروں نے تیار کیا تھا، وہ نامی گرامی مصور تھے: جگجیون، دسونت، مکند، محمد کشمیری، مسکین اور نقاش وغیرہ۔ اس قلمی کتاب پر فارسی میں اس کی قیمت درج ہے جو اس زمانے میں آٹھ ہزار روپیہ تھی۔ اب اس کی قیمت ایک کروڑ سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ اس کی نقاشی سونے سے کی گئی ہے۔ ان میں ۱۳۲ نقاشیاں اتنی جاذب نظر ہیں کہ ہر ایک کی قیمت ۷۵ ہزار روپے لگائی گئی ہے۔



(نیا دور لکھنؤ جون ۲۰۰۰ء)

ڈاکٹر محمد ذاکر حسین
لائبریری اسسٹنٹ،
خدابخش لائبریری، پٹنہ

خدابخش لائبریری کی علمی وادبی خدمات
خدابخش مطبوعات کی روشنی میں

پٹنہ میں اشوک راج پتھ پر واقع ایک پرشکوہ عمارت میں قائم خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری تقریباً ایک صدی سے علم وادب کی اہم خدمت انجام دے رہی ہے۔ اس کتاب خانہ کی بنیاد اول بقول علامہ شبلی نعمانی (متوفی ۱۹۱۴ء) خدابخش خاں کے والد مولوی محمد بخش (متوفی ۱۸۷۶ء) نے ۱۸۲۸ء میں رکھی۔ مرتے وقت انہوں نے اپنی جمع کردہ ساری کتابیں اپنے لائق فرزند خدابخش خاں کے حوالہ کرتے ہوئے وصیت کی کہ اس کام کو آگے بڑھانا۔ اپنے والد کی وصیت پر عمل کرنے کو خدابخش خاں نے اپنی زندگی کا مشن بنالیا اور اس محبوب عمل میں اس قدر مگن ہوئے کہ پھر ان کو دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہی اور آنے والی نسلوں کے لئے علم وعمل اور خلوص وایثار کا ایک شاندار نمونہ چھوڑ گئے۔ علامہ شبلی نعمانی ان کی حوصلہ مندی کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''بے شبہ ایسا اولوالعزم شخص ان نامور قدیم مسلمانوں کا نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے، جن کی حوصلہ مندیوں کا ہم افسانہ سنایا کرتے ہیں''۔ نیز اپنے والد کی وصیت پر اس مضبوطی اور ہمت وجرأت کے ساتھ عمل پیرا ہونے والے دنیا میں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ خود خدابخش خاں کے معاصرین میں ایک سے ایک اولوالعزم پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے مشن کو کامیابی وکامرانی سے ہم کنار کیا لیکن ان سب کے مقابلے میں خدابخش خاں کی انفرادیت بقول مولانا حاجی معین الدین ندویؒ یہ ہے کہ ''ان کے معاصرین میں سرسید مرحوم اور محسن الملک کو غیر معمولی شہرت حاصل ہے لیکن درحقیقت ہمارے اس بہاری قائد اعظم نے فیاضی اور ایثار کا جو نمونہ پیش کیا ہے، وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ اگر ایک طرف انہوں نے اپنی قوم کو بام عروج تک پہنچانے کے لئے دماغی وجسمانی مشقت

برداشت کی، قومی فلاح و بہبود کے افکار میں شب بیداری کو اپنا شیوہ بنایا اور تحریر و تقریر سے قوم خفتہ کو جگانے کی کوشش کی تو دوسری طرف انہوں نے اپنی ساری کائنات اور اپنی تمام عمر کا دوحتہ 'کتب خانہ مشرقی' کی صورت میں وقف کر دیا اور اس طرح انہوں نے اہل وعیال کے حقوق کو قومی ضرورت کے مقابلے میں پس پشت ڈال دیا۔ ایک بڑے فرنچ فلسفی کا مقولہ ہے 'میں اپنی ذات سے زیادہ اپنے خاندان کو، اپنے خاندان سے زیادہ اپنے وطن کو، اور وطن سے زیادہ انسانیت کو محبوب رکھتا ہوں' خدابخش خاں کی زندگی اس مقولہ کی عملی تشریح ہے۔''
جناب حبیب الرحمٰن چغتائی نے '' نجوم ثلاثہ '' کے عنوان سے اس عہد کی تین عظیم ہستیوں۔ سرسید، خدابخش خاں اور حکیم عبدالحمید — کی انسانی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے خدابخش لائبریری جرنل شمارہ ۱۱۴ کے اداریہ میں لکھا ہے کہ '' تینوں نے علم کی شمع روشن کی۔ ان سب کا صرف ایک ہی نصب العین تھا انسان کی فلاح و بہبود۔ تینوں کے قائم کردہ اداروں نے عالمی سطح پر اپنا مقام پیدا کیا۔ حکیم صاحب اور خدابخش مالی مشکلات کا شکار رہے۔ کم عمری میں ہی ان کو زندگی کا بار اٹھانا پڑا۔ مگر کسب معاش کے ساتھ اکتساب علم بھی جاری رہا۔ دونوں نے اپنے باپ کے لگائے ہوئے پودوں کی خون جگر سے آبیاری کی اور انہیں تناور درخت بنا دیا — ان لوگوں نے کتاب وقلم کو عزیز رکھا اسی لئے عظیم علمی مراکز وجود میں آئے۔ تینوں کی روشن خیالی اور وسیع القلبی اظہر من الشمس ہے۔'' ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے اپنے مخصوص لب ولہجہ میں خدابخش خاں کو شہادت کا درجہ عطا کیا ہے اور لکھا ہے کہ '' کتابوں کا ایسا شہید آپ کو خال خال ہی ملے گا، جو اچھی کتابیں اور ان پر مشتمل ایک اچھا کتاب خانہ بنانا اپنی زندگی کا مشن بنالے۔ جینا، مرنا، کھانا اور پینا، اوڑھنا بچھونا سب کچھ کتابیں ہوں اور صرف کتابیں۔'' مشہور مورخ سرجدوناتھ سرکار نے تو یہاں تک لکھدیا کہ '' وہ خواب بھی دیکھتے تھے تو قلمی کتابوں کے بارے میں ''۔

خدابخش خاں کی کتابوں سے سچی محبت اور ان کے خلوص وایثار کا ہی نتیجہ تھا کہ ان کے اس کام کو تائید غیبی کی بشارت بھی مل گئی پھر تو ہر چہار جانب سے علمی وادبی جواہر پارے

اس کی زینت بننے لگے اور خدا بخش خاں نے بھی نادر و نایاب کتابوں پر زر کثیر صرف کرنے سے بھی دریغ نہ کیا اور اتنی حوصلہ مندی دکھائی کہ علامہ شبلی نعمانی کو یہ کہنا پڑا کہ'' ہندوستان میں صرف مولوی خدا بخش خاں ایسے شخص ہیں جنہوں نے ان چیزوں کے لیے زر کثیر صرف کرنے میں یورپ کے حوصلہ مندوں کا مقابلہ کیا ہے''۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی علوم و ادبیات کا ایک ایسا انمول ذخیرہ یہاں جمع ہو گیا کہ جس کی نظیر ملنی محال ہے۔ اور جس سے متاثر ہو کر علامہ شبلی نعمانی نے ۱۸۹۱ء میں اعتراف کیا کہ'' ان (خدا بخش خاں) کا کتب خانہ — اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے روم و مصر و عرب و ہند کے نامور کتاب خانوں کی صف میں جگہ پانے کے قابل ہے۔'' اور برملا اس کا اظہار کیا کہ'' یہ پٹنہ اور پٹنہ والوں کے لئے بڑے فخر کی بات ہے بلکہ ہندوستان کے عام مسلمان اس پر فخر کر سکتے ہیں۔'' اور ایک صدی گزر جانے کے بعد یہ لائبریری نہ صرف اہل پٹنہ، عام ہندستانی مسلمان بلکہ ہندوستان کے ہر ہر فرد کے لیے فخریہ علامت بن گئی ہے۔

نادر و نایاب قلمی نسخوں اور کمیاب مطبوعہ کتابوں کے ساتھ ایرانی، وسط ایشیا، راجپوت اور مغل اسکول کی مصوری کا بھی ایک بڑا ذخیرہ یہاں موجود ہے اور یہ اتنا اہم ہے کہ ہمارے ملک میں فن تعمیر کے نقطہ نظر سے جو مقام تاج محل کو حاصل ہے وہی مقام Miniature paintings کے نقطۂ نظر سے خدا بخش لائبریری کو حاصل ہے۔ اس کے علاوہ حافظ ابن حجر عسقلانی (جامع و صحیح البخاری، البذل الماعون)، جامی (شرح فصوص الحکم، سلسلۃ الذھب، خلاصہ انیس الطالبین)، علی بن حسام الدین متقی (جوامع الکلم)، علامہ فیضی (موارد الکلم)، تقی الدین کاشی (خلاصۃ الاشعار وزبدۃ الافکار)، نوراللہ شوستری (حاشیہ علی حاشیہ قدیمہ)، شیخ عبدالحق محدث دہلوی (شرح سفر السعادت)، ظفر احسن خاں (کلیات احسن)، مرزا عبدالقادر بیدل (مجموعہ رباعیات)، شاہ ولی اللہ دہلوی (الصحیح البخاری)، شیخ علی حزیں (دیوان مجذوب، دیوان حزیں)، اندرامن (بہار عجم)، غلام علی آزاد بلگرامی (ید بیضا)، نذیر حسین محدث دہلوی (المجموعہ) کامران مرزا، شاہنشاہ محمد بابر، (دیوان کامران)، ہمایوں، جہانگیر

(دیوان حافظ)، شاہ جہاں (تاریخ خاندان تیموریہ)، محمد سلطان بن اورنگ زیب (جہانگیر نامہ) جیسے یگانہ روزگار اور فخر زمانہ اشخاص کی تحریریں بھی اس لائبریری کی زینت ہیں۔

انہیں تمام خصوصیات کی وجہ سے یہ لائبریری ابتدا ہی سے اہل دانش و بینش کی خصوصی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے چنانچہ علامہ شبلی نعمانی (۱۸۹۱، ۱۹۰۷ء)، لارڈ لٹن (۱۸۹۵ء)، حکیم اجمل خاں (۱۹۰۱ء)، افتخار عالم مارہروی (۱۹۰۲ء)، عبدالسلام ندوی (۱۹۰۲ء)، لارڈ کرزن (۱۹۰۳ء)، وائسرائے لارڈ منٹو (۱۹۰۶ء)، علامہ سید سلیمان ندوی (۱۳۳۲ھ، ۱۹۰۹ء)، مولانا ظفر علی خاں (۱۹۰۷ء) شاہ منیر عالم (۱۹۰۸ء) سر عبدالقادر (۱۹۰۹ء)، مولانا ثناء اللہ امرتسری (۱۹۰۹ء)، سید امداد امام اثر (۱۹۰۹ء)، شرف الدین یاس ٹونکی (۱۹۱۲ء) حکیم عبدالحئی (۱۹۱۲ء)، لارڈ ہارڈنگ (۱۹۱۳ء)، وائسرائے لارڈ ریڈنگ (۱۹۲۲ء)، سر جگدیش چندر بوس (۱۹۲۴ء)، گاندھی جی (۱۹۲۵ء)، وائسرائے لارڈ اِرون (۱۹۲۸ء)، جان سائمن (۱۹۲۸ء)، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (۱۹۳۸ء)، بابائے اردو مولوی عبدالحق (۱۹۴۰ء)، ڈاکٹر عابد حسین (۱۹۴۰ء)، سی وی رمن (۱۹۴۴ء) لارڈ ماؤنٹ بیٹن (۱۹۴۸ء)، سید مسعود حسین رضوی ادیب (۱۹۵۰ء) قاضی عبدالغفار (۱۹۵۱ء)، عبدالماجد دریا بادی (۱۹۵۲ء)، عبدالباری ندوی (۱۹۵۲ء)، رضا علی خاں نواب رامپور (۱۹۵۲ء)، جواہر لال نہرو (۱۹۵۳ء)، ہمایوں کبیر، ڈاکٹر ذاکر حسین (۱۹۵۷ء)، قاضی عبدالودود، سید حسن عسکری، مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی اور نہ جانے کتنے علم و ادب اور فکر و سیاست کے آفتاب و ماہتاب نے اس لائبریری سے اپنی علمی پیاس بجھائی اور اس لائبریری کی عظمت کا اعتراف و احترام کیا۔

کسی بھی ادارے کی سطح ارتقا کو سمجھنے کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ وہ عصری تقاضوں کو پورا کرنے کی کس درجہ صلاحیت رکھتا ہے۔ جدید علوم و فنون اور جدید افکار و نظریات کے ابلاغ و ترسیل میں وہ کہاں تک مددگار ثابت ہوتا ہے، اس بات کا ادراک بڑی حد تک اس ادارے سے شائع ہونے والی کتابوں کی کیفیت، تعداد اور موضوعات کے تنوع

سے ہوسکتا ہے اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ لائبریری اس کسوٹی پر کھری اترتی ہے چنانچہ خدابخش لائبریری کی اہمیت جس طرح اس کے قلمی نوادر، علمی و ادبی جواہراور فن مصوری کے اہم ذخیرہ کی وجہ سے ہے اسی طرح اس کا شعبۂ نشرواشاعت بھی کم اہمیت کا حامل نہیں۔ اگرچہ باضابطہ طور پر اس شعبہ کی بنیاد کافی بعد میں رکھی گئی لیکن طباعت و اشاعت کا کام تو خدابخش خاں کے زمانے یعنی ۱۸۹۸ء ہی سے شروع ہوگیا تھا البتہ یہ ایک ہی میدان تک محدود رہا یعنی لائبریری مخطوطات کی توضیحی فہرستوں کی طباعت تک۔ اور یہی سلسلہ ۱۹۷۷ء تک جاری رہا۔ ۱۹۷۷ء سے لائبریری باضابطہ طور پر علم وادب کے مختلف میدانوں میں اشاعت وطباعت کے توسط سے اپنی خدمات پیش کرنے لگی اور جلد ہی اس میدان میں بھی اس کی پیش رفت کو وقعت اور قدر کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار جب اپریل ۱۹۹۶ء میں اپنے عہدہ سے سبکدوش ہوئے تو جناب حبیب الرحمٰن چغانی اس لائبریری کے ڈائرکٹر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ چغانی صاحب کو گرچہ اس لائبریری کی خدمت کرنے کا زیادہ وقت نہ ملا تاہم اس قلیل مدت میں بھی انہوں نے لائبریری کو فروغ دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ لائبریری کو عالمی شہرت تو ڈاکٹر بیدار کے دور میں ہی حاصل ہوگئی تھی اور اس کا ایک علمی وادبی معیار بھی متعین ہوگیا تھا۔ چغانی صاحب نے نہ صرف اس معیار کو برقرار رکھا بلکہ اس میں تازگی لانے کی کوشش کی اور سابق ڈائرکٹر کی قائم کردہ ساری سرگرمیوں اور پروگراموں کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ اس میں تازگی اور تنوع لانے کی بھی سعی کی اور خاص طور سے لائبریری کی تزئین اور جدید کاری میں نمایاں خدمت انجام دیں۔ چنانچہ جدید تکنیکوں کے توسط سے لائبریری کی ہمہ جہت افادیت بڑھائی اس طرح وہ خدابخش خاں کے خواب کو عملی جامہ پہنانے میں ہمہ تن مصروف رہے۔ دیگر شعبوں کی طرح شعبۂ نشرو اشاعت بھی جاری و ساری رہا اور چغانی صاحب کے آنے کے بعد جو غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی کہ اب نشرواشاعت کا کام بند ہوجائے گا، وہ نہ صرف غلط ثابت ہوا بلکہ انہوں نے خاص دلچسپی لے کر اس کے معیار پر خاص دھیان

دیا۔ جرنل پابندی سے اپنے وقت پر نکلتا رہا۔ اس سے قبل کئی نمبر ایک ہی شمارے میں ضم ہوتے تھے، وہ ختم ہوا اور علیحدہ نمبر پر مشتمل شمارہ جاری ہونے لگا۔ جرنل میں اداریہ لکھنے کا سلسلہ بھی ان کے دور میں شروع ہوا۔ ان کا ایک خاص کارنامہ ایک شش منزلہ عمارت کا منصوبہ ہے جس پر تقریباً پانچ کروڑ روپیہ صرف ہوگا۔ اس منصوبہ کو لائبریری بورڈ سے منظور کرا کر حکومت ہند کو روانہ کر دیا گیا ہے۔ جزوی طور پر منظور بھی ہو گیا ہے۔ اس کے نفاذ کے ساتھ ہی لائبریری میں جگہ کی جو شدید قلت ہے اس کا حل نکل آئے گا اور ساتھ ہی بہت سی نئی خدمات کا اضافہ بھی ہوگا۔ لائبریری کی گوناگوں خدمات انجام دینے کے بعد جناب حبیب الرحمٰن چغانی ۳۱ جنوری ۲۰۰۱ء کو سبکدوش ہو گئے۔ ان کے بعد ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری نے یکم فروری ۲۰۰۱ء کو یہ عہدہ سنبھالا جو قبلاً مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں ڈپٹی لائبریرین کے عہدہ پر فائز تھے۔

مولوی خدابخش خاں کی یہ دلی تمنا تھی کہ نشر واشاعت کے ذریعہ اس لائبریری میں موجود علمی وادبی نوادر کو عام کیا جائے تا کہ اس وقیع خزانہ میں جو جواہر محفوظ ہیں وہ لوگوں کی نظروں میں آجائیں اور اہل علم ان سے بآسانی استفادہ کر سکیں۔ لیکن محدود وسائل کی بناء پر وہ اپنے اس خواب کو عملی جامہ نہ پہنا سکے البتہ انہوں نے اس کی پہلی بنیاد رکھ دی اور ۱۸۹۸ء میں ایک کتاب ''محبوب الالباب فی تعریف الکتب والکتاب'' کے نام سے حیدرآباد سے طبع کرائی۔ ۸۵۸ صفحات پر مشتمل یہ کتاب لائبریری کے مخطوطات عربی و فارسی کی توضیحی فہرست ہے، جسے خود انہوں نے مرتب کیا تھا۔ یہ فارسی زبان میں ہے۔ ان کے زمانے میں صرف یہی ایک توضیحی فہرست شائع ہو سکی۔ البتہ انہیں کے زمانے میں لارڈ کرزن جب ۱۹۰۳ء میں پٹنہ آئے اور اس لائبریری کے نوادر کو دیکھا تو یہاں کے مخطوطات کی توضیحی فہرست مرتب کرانے کی فکر دامن گیر ہوئی تا کہ انگریز بھی اس ذخیرہ سے کما حقہ استفادہ کریں۔ چنانچہ اس پر کام شروع ہو گیا اور اس کی پہلی جلد خدابخش خاں یا شہاب الدین خدابخش کے زمانے میں منظر عام پر آئی۔ پھر محی الدین خدابخش اور صلاح

الدین خدابخش صاحبان کے دور میں دوسری، چوتھی اور چھٹی جلد، ابوالحسن خاں کے عہد میں تیسری، ولی الدین خدابخش کے وقت میں ۵، ۷، ۸، ۹، ۱۰-۲۴، ۳۱، ۳۳، ۳۵، ۳۶ یعنی ۲۴ جلدیں، قاسم حسن خاں کے زمانے میں ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، پروفیسر کلیم الدین احمد کے دور میں ۲۹، ۳۰ اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے عہد میں جلد ۳۴ شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ مفتاح الکنوز اور مراۃ العلوم کے نام سے عربی اور فارسی مخطوطات کی تعارفی فہرست بھی تیار کرائی گئی۔ ۱۹۷۷ء میں باضابطہ نشرواشاعت کا شعبہ قائم ہوا۔ خدابخش خاں کے خواب کی تکمیل کی طرف پہلا مثبت قدم تھا۔ اس کے علاوہ لائبریری آرگن کے طور پر ایک سہ ماہی جرنل کا اجرابھی ۱۹۷۷ء سے ہوا۔ جو آج تک بلا ناغہ اپنے وقت مقررہ پر شائع ہورہا ہے۔ اس کے اب تک ۱۲۲ شمارے منظرعام پر آچکے ہیں۔ اس کے ساتھ مختلف علوم وفنون سے متعلق کتابیں بھی شائع ہونا شروع ہوئیں۔ ابتدا میں اس کی رفتار کچھ دھیمی رہی لیکن ۱۹۹۵ء سے اس میں کافی تیزی آئی جو آج تک برقرار ہے اور ان شاء اللہ یہ مستقبل میں جاری وساری رہے گی۔ اب تک خدابخش لائبریری کے شعبہ نشرواشاعت کی جانب سے اردو، فارسی، عربی، ہندی اور انگریزی کی ۴۰۰ سے زائد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ ان کی قدروقیمت کا اندازہ مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت درج کتابوں سے بخوبی ہو جائے گا۔ چونکہ اس مختصر مقالہ میں ہر کتاب کا تفصیلی تعارف ممکن نہیں اس لیے صرف اس کی فہرست پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے:

اسلامیات : (۱) اسلام اور ہندستانی ثقافت / بی این پانڈے (اردو، انگریزی) (۲) اسلامیان ہند (۳) اسلامیان ہند کے مسائل (۴) اسلامی تہذیب و ثقافت (۲ جلدیں) (۵) اسلامی ثقافت / غوری (۶) الجزیہ / سعید انصاری

ہندوستانی مذاہب: (۱) بھگوت گیتا یا نغمہ خداوندی / محمد اجمل خاں (۲) سری کرشن گوتم بدھ اور دوسرے رہنما / منمتھ ناتھ دت (۳) شریمد بھگوت گیتا بودھ / گاندھی جی (۴) کبیر صاحب / پنڈت منوہر لال زتشی (۵) کچھ ہندومت کے بارے میں

(۶) ہندو تیوہاروں کی دلچسپ اصلیت رنشی رام پرشاد ماتھر (۷) ہندو دھرم اکبر کے عہد میں ر ابو الفضل (۸) ہندو دھرم ہزار برس پہلے رالبیرونی (۹) ہندو مت (۳ جلد میں) (۱۰) ہندو مذہب رمنوہر لال زتشی (۱۱) ہندوؤں کے تیوہار/ لالہ بالکشن بترہ ابر (۱۲) ہندوؤں کے اوتار/ لالہ بالکشن بترہ ابر (۱۳) ہندو دھرم اردو میں/ ڈاکٹر عطا خورشید (۱۴) اہل ہندوستان یعنی ہندواں/ طباطبائی (۱۵) سکھ مت رمیجر بلبیر سنگھ (۱۶) جین دھرم روشنو جین (۱۷) جین دھرم کے مقدس مقامات ر بابو نیمی داس (۱۸) بدھ، جین، سکھ رادھا سوامی۔

قرآنیات : (۱) تفسیر سورہ فاتحہ و اخلاص/ خدابخش خاں (۲) تفسیر القرآن/ سرسید (۳) تحریر فی اصول التفسیر/ سرسید (۴) مقدمہ تفسیر سرسید (۵) تفسیری نکات/ مولانا آزاد (۶) حجۃ ابراہیمی/ مولانا آزاد (۷) صراط مستقیم/ مولانا آزاد (۸) قرآن مجید کی تفسیریں چودہ سو برس میں (۹) گیتا اور قرآن/ پنڈت سندر لال (اردو، ہندی) (۱۰) من موہن کی باتیں/ شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی (اردو، ہندی) (۱۱) مولانا آزاد اور رفاقت قرآنی (۱۲) برصغیر میں علوم قرآنیہ کے مخطوطات

تصوف : (۱) تحفۃ السعداء/ خواجہ کمال (۲) تصوف برصغیر میں (۳) خلاصہ انیس الطالبین/ تدوین ڈاکٹر محمد ذاکر حسین (۴) اختیار الرفیق لطلاب الطریق / تدوین ڈاکٹر محمد ذاکر حسین (۵) مکتوبات صدی رشیخ شرف الدین یحییٰ منیری۔

نفسیات : (۱) انسانی کردار — ایک نفسیاتی و معاشرتی تجزیہ/ پروفیسر شمشاد حسین

تاریخ : (۱) آزاد ہندوستان ۔ ماضی اور مستقبل (سیمنار کے مقالات) (۲) تاریخ (۳) تاریخ بہار ۔ چند مقالات (۴) تاریخ کشمیر/ محمد اعظم (۵) تاریخ کے ساتھ کھلواڑ (۶) تاریخ ہند (۷) تاریخ ہند عہد وسطی (۸) تاریخ ہند وممالک غیر (۹) حکایات کشمیر/ محمد الدین فوق (۱۰) مظفر نامہ/ کرم علی (اردو، فارسی) (۱۱) نیا ہندوستان مشاہیر کے آئینہ میں (دو جلدیں) (۱۲) ہندستان وممالک غیر/ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم (۱۳) ہندوستان

کے عہد وسطیٰ پر مقالات/ حسن عسکری (۱۴) سیرت فیروز شاہی (۱۵) مجمع الافکار (۱۶) مراۃ الکاملین یا آئینہ کالپی (۱۷) جہانگیر نامہ۔

تحریک آزادی: (۱) بی اماں کا دورہ بہار/ ترجمہ ڈاکٹر انجمن آرا انجم (۲) تحریک آزادی کے چالیس سال (دو جلدیں) (۳) تحریک آزادی میں بہار کے مسلمانوں کا حصہ /تقی رحیم (۴) حسرت موہانی اور انقلاب آزادی/ ڈاکٹر نفیس احمد صدیقی (۵) رسالہ اسباب بغاوت ہند/ سرسید (۶) رسالہ خیر خواہ مسلمانان/ سرسید (۷) شعلہ آزادی/تقی احمد ارشاد (۸) کرنل محبوب احمد (۹) مولانا عبید اللہ سندھی کا انقلابی منصوبہ/ ابوسلمان شاہجہاں پوری (۱۰) ہندستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ/ ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین۔

اورنگ زیب عالمگیر: (۱) اورنگ زیب اور ہندوؤں کے تعلقات (۲) اورنگ زیب: ایک نیا زاویہ نظر/ ڈاکٹر اوم پرکاش (اردو ہندی) (۳) اورنگ زیب کے خطوط/ ترجمہ عبدالوحید خاں۔

تذکرہ شعرا: (۱) اردو شعرا (۲) تذکرے (۳) تذکرہ شعرا/ ابن امین اللہ طوفان (۴) تذکرہ مسرت افزا/ امر اللہ الہ آبادی (۵) تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ فکر اقبال کی روشنی میں/عبدالمغنی (۶) سرود رفتہ/ امیر چند بہار (۷) شعرا کے تذکرے/ قاضی عبدالودود (۸) آئینہ حیرت/سحر کاکوروی (۹) انیس الاحبا/ موہن لال انیسؔ (۱۰) باغ معانی/نقش علی (۱۱) مجمع النفائس/ خان آرزو (۱۲) مشاہیر ادب اردو (۱۳) مشاہیر اردو ادب (۱۴) تعین زمانہ/قاضی عبدالودود۔

تذکرہ علما و صوفیا: (۱) اختیار الرفیق لطلاب الطریق/ المقدسی (۲) برصغیر کے علمائے معقولات اور ان کی تصانیف/عبدالسلام خاں (۳) تحفۃ السعد/ خواجہ کمال۔

تذکرہ مشاہیر: (۱) بہار کے مسلم خواص/ علی اشرف (۲) تذکرہ مشاہیر کاکوروی/علی حیدر کاکوروی (۳) شخصیات و واقعات جنہوں نے مجھے متاثر کیا/ جنید احمد (۵) تذکرہ کاملان رامپور/احمد علی خاں شوق (۶) مشاہیر بہار (۷) یادگار روزگار/سید بدرالحسن

(۸) کاروان رفتہ/نقی احمد ارشاد۔

آپ بیتی : (۱) اعمال نامہ/سر رضا علی (۲) داستان میری/ڈاکٹر اقبال حسین (۳) گفتنی ناگفتنی/وامق جونپوری (۴) وردِ مسعود/ڈاکٹر مسعود حسین۔

سوانح : (۱) سوانح منشی نولکشور/سید امیر حسن نورانی (۲) شاد عظیم آبادی/قیس رضوی عظیم آبادی (۳) قاضی سید رضا حسین/مولوی عبدالغنی (۴) مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری۔ احوال و افکار/سید ضمیر الدین احمد (۵) مولوی چراغ علی کی علمی خدمات/ڈاکٹر منور حسین (۶) پروفیسر سید مقبول احمد حیات و خدمات/مسعود الرحمٰن خاں ندوی (۷) حکیم شیخ حسین شہرت شیرازی/ڈاکٹر غلام مجتبیٰ انصاری (۸) علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت مورخ/ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی

سفر نامے : (۱) جین دھرم کے مقدس مقامات/بابو نیمی داس (۲) سفر نامہ روس / جواہر لال نہرو (۳) سفر نامے (۴) شگرف نامہ ولایت/منشی اعتصام الدین (۵) سفر نامہ : مرآۃ احوال جہاں نما/احمد بہبہانی۔

سائنس و طب : (۱) سائنس (۲) فہرست قرابادین معدن تجربات/ حکیم محمد مہدی اکبر آبادی (۳) طب اسلامی برصغیر میں (۴) کتاب المشجر الکبیر/ابو زکریا یوحنا، یحییٰ بن ماسویہ۔

تعلیمات : (۱) تعلیمات (۲) تعلیمات و علمی ادارے/ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم

فہارس مخطوطات : (۱) برصغیر کے کتب خانوں میں اردو مخطوطات (۲) برصغیر میں تاریخ ہند کے مخطوطات (۳) برصغیر میں عربی فارسی کے نادر مخطوطات/ ڈاکٹر شائستہ خاں (۴) برصغیر میں علوم قرآنیہ کے مخطوطات (۵) پاکستان نیشنل میوزیم کراچی کے اردو مخطوطات، ڈاکٹر ظفر اقبال (۶) تصوف برصغیر میں (۷) دہلی کی درگاہ شاہ ابو الخیر کے مخطوطات کی فہرست/ زید ابو الحسن فاروقی (۸) بہار کی خانقاہوں میں فارسی عربی اردو کے مخطوطات/ڈاکٹر عطا خورشید (۹) علی گڑھ کی مزمل لائبریری کے اردو مخطوطات کی توضیحی فہرست/ڈاکٹر عطا خورشید (۱۰) فہرست مخطوطات اردو خدابخش لائبریری/عابد امام زیدی (۱۱) فہرست مخطوطات فارسی حمیدیہ لائبریری بھوپال (۱۲) فہرست مخطوطات و مسودات

اردو ریسرچ سنٹر حیدرآباد (۱۳) مرأۃ العلوم (تین جلدیں)، (۱۴) مفتاح الکنوز (تین جلدیں)، (۱۵) فہرست مخطوطات فارسی رامپور رضا لائبریری/ڈاکٹر شائستہ خاں (۱۶) ملیشیا میں اردو فارسی اور عربی مخطوطات کی ایک دستی فہرست/ڈاکٹر محمد ذاکر حسین (۱۷) مولانا آزاد لائبریری کے اردو مخطوطات/ ڈاکٹر عطا خورشید (۱۸) طب اسلامی برصغیر میں (۱۸) خدابخش کے نادر عربی مخطوطات کی توضیحی فہرست/ڈاکٹر محمد ذاکر حسین (۱۹) خدابخش کے عربی فارسی مخطوطات کی توضیحی فہرست (۳۶ جلدیں) (۲۰) خدابخش میں نادر فارسی مخطوطات/شائستہ خاں۔

نصاب تعلیم: (۱) عربی اسلامی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم اور عصری تقاضے (چار جلد۔ س۔)۔

اردو ادبیات: (۱) ادب زبان قواعد (۲) ادبیات اردو (۳) اردو ادب (۴) اردو مسئلہ (۵) اردو میں ادبی تحقیق کے بارے میں/ قاضی عبدالودود (۶) اردو میں دانشوری (۷) اردو ہندی ہندستانی (۸) تبصرے / قاضی عبدالودود (۹) تحقیقات ودود رقاضی عبدالودود (۱۰) تہذیب زبان ادبیات (۱۱) درد و سودا رقاضی عبدالودود (۱۲) زبان شناسی / قاضی عبدالودود (۱۳) فیض کی شاعری/ عبدالمغنی (۱۴) گارساں دتاسی/قاضی عبدالودود (۱۵) میر/ قاضی عبدالودود (۱۶) میر کا تغزل/عبدالمغنی (۱۷) میری تنقید ایک بازدید/کلیم الدین احمد (۱۸) مصحفی اوران کے اہم معاصرین/ قاضی عبدالودود (۱۹) ہندوستانی زبان کا مسئلہ۔

شاعری / دواوین: (۱) آوارہ گرد اشعار (اردو) رقاضی عبدالودود (۲) اردو شعر وادب چند مطالعے/ قاضی عبدالودود (۳) اردو غزل (۴) بیاض آزاد (۵) بیاض رنجور عظیم آبادی (۶) جدید اردو غزل ۱۹۴۰ء کے بعد (۷) جدید غزل گو (۱۹۴۱ء) (۸) جدید غزل گو (۱۹۸۵ء۔ ۱۹۹۵ء) (۹) چار بیت/شبیر علی خاں (۱۰) حسن سمیع کا کلام/حسن سمیع قیس (۱۱) دیوان ابوالکلام آزاد رعبدالغفار شکیل (۱۲) دیوان رضا عظیم آبادی/ قاضی عبدالودود (۱۳) دیوان راسخ عظیم آبادی (۱۴) دیوان غالب (۱۵) دیوان مصحفی/ امیر مینائی و امیر لکھنوی (۱۶) دیوان مصحفی ہشتم (۱۷) دیوان مصحفی کا تقابلی مطالعہ/ محمد بدرالدین

(۱۸) دیوان ناسخ / حنیف نقوی (۱۹) دیوان نعیم / قاضی عبدالودود (۲۰) دیوان نوازش لکھنوی / قاضی عبدالودود (۲۱) شاہ کمال علی کمال اور ان کی تصانیف / قاضی عبدالودود (۲۲) غزلیات میر حسن / ڈاکٹر محمد ذکی الحق (۲۳) قطعات دلدار / قاضی عبدالودود (۲۴) کلام رنجور عظیم آبادی / معین الدین عقیل (۲۵) کلام شاد / قاضی عبدالودود (۲۶) گاہے گاہے / لارنس (۲۷) مسدس حالی۔

ناول / ناولٹ: (۱) پیر علی / شاد عظیم آبادی (۲) جمیل مظہری کا شاہکار ناولٹ فرض کی قربان گاہ پر (۳) شہر میں کرفیو / وبھوتی نارائن رائے۔

افسانے / ڈرامے / انشائیے: (۱) پریم چند کے افسانے (۲) پریم چند مزید افسانے (۳) زندگی کی موت / ابرارالرحمٰن قدوائی (۴) کانٹے / محمد زماں آزردہ

داستان وقصص: (۱) زبدۃ الرموز / ترجمہ عبدالرحیم ٹونکی (۲) طلسم ہوشربا (دس جلدیں) (۳) مقدمہ طلسم ہوشربا۔

لغت وقواعد: (۱) اردو لغت (۲) بہار اردو لغت / یوسف الدین بلخی واحمد یوسف (۲ جلد میں) (۳) تحقیقات الفاظ اردو / سید سلیمان ندوی (۴) روہیل کھنڈ اردو لغت / رئیس رامپوری (۵) لغات غالب / یونس سلیم (۶) مخزن فوائد / نکہت دہلوی، مرتبہ ڈاکٹر محمد ذاکر حسین (۷) شمس البیان فی مصطلحات الہند وستان / محمد جان طپش (۸) فرہنگ زفان گویا / بدر ابراہم (دو جلدیں) (۹) قواعد اردو / فدا علی خاں۔

مکاتیب: (۱) آثار آزاد (۲) اورنگ زیب کے خطوط (۳) ذاکر صاحب کے خط (چار جلدیں) (۴) رقعات رشید احمد صدیقی (۵) مکاتیب مرزا مظہر جانجاناں (۶) مکتوبات مشاہیر (۷) رشید احمد صدیقی کے کچھ خطوط کچھ رقعات۔ (۸) چند خط میرے نام

اردو رسائل کی فہرستیں: (۱) اردو رسائل ۱۹۹۲ء میں (۲) اردو رسائل ۱۹۹۳ء میں (۳) اردو رسائل ۱۹۹۴ء میں (۴) اردو رسائل کا ذخیرہ رضا لائبریری رامپور میں (۵) رامپور کی صولت پبلک لائبریری میں محفوظ اردو رسائل (۶) ادارہ علوم اسلامیہ علی گڑھ

میں اردو رسائل کا اشاریہ (۷) اردو رسائل کا ذخیرہ خدا بخش لائبریری میں (۸) اردو جرائد خدا بخش لائبریری میں/ خورشید عالم (۹) ہمدرد میں محفوظ اردو رسائل واخبارات/شکیل احمد شمسی، ڈاکٹر محمد ذاکر حسین۔

اردو رسائل کے اشاریے : (۱) خدابخش لائبریری جرنل ۱-۱۰۰ کے مضامین کی فہرست (۲) برھان کا اشاریہ ۱۹۳۸ء — ۱۹۶۵ء (۳) سوغات بنگلور ۱۹۵۹ء - ۱۹۷۴ء، (۴) نیاز فتحپوری کا نگار (۵) نیادور کراچی (۶) ہفتہ وار سچ کا توضیحی اشاریہ/عبدالعلیم قدوائی۔

اردو رسائل کی عکسی اشاعت : (۱) اخبار بہار (۲) پٹنہ ہرکارا (۳) زبان (۴) پیغام (۵) معیار۔

اردو رسائل کا انتخاب : (۱) ادیب/نوبت رائے نظر (۲) زمانہ/ دیا نرائن نگم اس کی حسب ذیل جلدیں شائع ہوئیں: ۱-۳ ہندومت، ۴ بدھ جین راد ھا سوامی، ۵۔ ہندو مسلم مسئلہ، ۶۔ اسلامیان ہند، ۷۔ تاریخ ہند، ۸۔ پریم چند افسانے، ۹۔ پریم چند مزید افسانے، ۱۰۔ پریم چند ادبیات، ۱۱۔ پریم چند متفرقات، ۱۲-۱۵ مشاہیر ادب اردو، ۱۶-۱۷۔ نیا ہندستان مشاہیر کے آئینے میں، ۱۸-۱۹ تحریک آزادی کے چالیس سال، ۲۰۔ ترکی، ایران، افغانستان اور دوسرے ممالک، ۲۱۔ ادبیات ہندی، ۲۲۔ زمانہ کی غالبیات، ۲۳۔ ادبیات فارسی، ۲۴۔ ادب زبان قواعد، ۲۵۔ ہندستانی زبان کا مسئلہ، ۲۶۔ اخبارات و رسائل، ۲۷۔ ہندو مسلم یونیورسٹیاں/کتابخانے/علمی خبریں/کتابیں، ۲۸۔ فنون لطیفہ، ۲۹۔ مذہب، ۳۰۔ زمانہ ۱۹۴۳ء--۱۹۴۹ء: ایک انتخاب، ۳۱۔ باقیات زمانہ، ۳۳۔ دیا نرائن نگم اور رسالہ زمانہ واخبار آزاد، ۳۴۔ مشتملات زمانہ۔

(۳) صبح امید لکھنؤ/برج نرائن چکبست (۴) العصر/پیارے لال شاکر (۵) معاصر/قاضی عبدالودود (۶) ندیم/انجم مانپوری ودیگر۔ اس کی حسب ذیل جلدیں اب تک شائع ہو چکی ہیں: ۱۔ بہار میں علوم وادبیات، ۲۔ تاریخ بہار، ۳۔ جمیل مظہری کی شاہکار ناولٹ فرض کی قربان گاہ پر، ۴۔ شاد عظیم آبادی چند مطالعے، ۵۔ مکتوبات مشاہیر،

۶۔ سفر نامے، ۷۔ غالب ، اقبال اور ٹیگور، ۸ ۔ ادبیات اردو ،۹۔ علی گڑھ تحریک ، ۱۰۔ادبیات عربی، فارسی ، ہندی، سنسکرت، انگریزی، ۱۱ تاریخ ہند وممالک غیر، ۱۲۔اسلامی تہذیب وثقافت، ۱۳۔تعلیمات۔

(۵) ہندستانی الہ آباد، حسب ذیل جلدیں ہیں:

۱۔اردو ادب، ۲۔اردو لغت، ۳۔ چند ادبی مشاہیر کی/پر تحریریں، ۴۔اردو ہندی ہندستانی، ۵۔ہندی ادبیات، ۶۔تاریخ، ۷۔سائنس۔

عربی فارسی ادبیات : (۱) ادبیات عربی فارسی ہندی سنسکرت (۲) ادبیات فارسی (۳) فارسی شعر وادب/ قاضی عبدالودود (۴) آوارہ گرد اشعار/نواب رحمت اللہ خاں شروانی (۵) تاریخہائے پیدائش و وفات/حسرت عظیم آبادی (۶) دیوان اظہر علی آزاد کاکوروی/ ڈاکٹر محمد ذاکر حسین (۷) دیوان حافظ (۸) دیوان غزلیات عرفی شیرازی (۹) دیوان مطہر (۱۰) رباعیات باخرزی (۱۱) غزلیات شبلی (۱۲) کنز تواریخ/شاہ غلام یحییٰ عظیم آبادی (۱۳) مثنوی تصویر محبت: داستان رانجہا ر/میر شمس الدین فقیر۔

ہندی ادبیات : (۱) ادبیات ہندی (۲) عہد وسطیٰ کی ہندی ادبیات میں مسلمانوں کا حصہ/حسن عسکری

غالبیات : (۱) جہان غالب (۲) زمانہ کی غالبیات (۳) کچھ غالب کے بارے میں (۴) لغات غالب (۵) آثار غالب (۶) پنج آہنگ (۷) دیوان غالب۔(۸) غالب بحیثیت محقق۔

شاد عظیم آبادی : (۱) شاد عظیم آبادی (۲) شاد عظیم آبادی: چند مطالعے (۳) کچھ شاد عظیم آبادی کے بارے میں (۴) کلام شاد۔

آزادیات : (۱) آثار آزاد (۲) بیاض آزاد (۳) تفسیری نکات (۴) جامع الشواہد (۵) حجۃ ابراہیمی (۶) دیوان ابوالکلام آزاد (۷) صراط مستقیم (۸) کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں (۹) مولانا آزاد اور رفاقت قرآنی (۱۰) مولانا آزاد اور مدارس اسلامیہ

(۱۱) مولانا آزاد اور بہار کے رشتے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین: (۱) ڈاکٹر ذاکر حسین: حیات و خدمات (۲) ذاکر صاحب ذاتی یادیں ۳ جلدیں (۳) ذاکر صاحب کے خط ۴ جلدیں (۴) تعلیمات و علمی ادارے (۵) سیاسیات و معاشیات (۶) متفرقات (۷) ہندستان و ممالک غیر (۸) ذاکر صاحب (۹) نقوش ذاکر۔

تحقیقات قاضی عبدالودود: (۱) آوارہ گرد اشعار (۲) اردو شعر و ادب (۳) اردو میں ادبی تحقیق کے بارے میں (۴) اخبار بہار (۵) پٹنہ ہرکارا (۶) تبصرے (۷) تحقیقات ودود (۸) تذکرہ شعرا (۹) تذکرہ مسرت افزا (۱۱) تعین زمانہ (۱۱) جہان غالب (۱۲) چند اہم اخبارات ورسائل (۱۳) درد وسودا (۱۴) دیوان نعیم (۱۵) دیوان نوازش (۱۶) زبان شناسی (۱۷) شعرا کے تذکرے (۱۸) عبدالحق بحیثیت محقق (۱۹) غالب بحیثیت محقق (۲۰) دیوان رضا عظیم آبادی (۲۱) محمد حسین آزاد بحیثیت محقق (۲۲) فارسی شعر و ادب (۲۳) قطعات ولدار (۲۴) کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں (۲۵) کچھ شاد عظیم آبادی کے بارے میں (۲۶) کچھ غالب کے بارے میں (۲۷) کلام شاد (۲۸) گارساں دتاسی (۲۹) مآثر غالب (۳۰) مصحفی اور ان کے اہم معاصرین (۳۱) میر

غوری تحقیقات: (۱) اسلامی ہند میں علوم عقلیہ (۲) اسلامی ہند میں کلام و فلسفہ (۳) اسلامی منطق و فلسفہ (۴) مسلم علم الہیت (۵) اسلام میں سم وحکمت کا آغاز (۶) ریاضیات کی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ (۷) اسلامی ثقافت (۸) اقبالیات۔

اردو، فارسی اور عربی زبانوں کے لیے ہندی اور انگریزی کی بھی متعدد موضوعات پر مختلف کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ہنوز جاری ہیں۔ چنانچہ ہندی کی پندرہ اور انگریزی کی ۹۴ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ چونکہ اس مختصر مقالے میں لائبریری سے شائع تمام زبانوں کی کتابوں کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اسی پر اکتفا کیا جارہا ہے۔

(نذر خدا بخش مطبوعہ ۲۰۰۱ء)

*****

محمد بدرالدین
لائبریری اسسٹنٹ،
خدابخش لائبریری، پٹنہ

خدابخش لائبریری کا کرزن ریڈنگ روم

ایک تاریخی جائزہ

جارج نتھانیل مارکوئس کرزن آف کیڈلسٹن جسے عرف عام میں لارڈ کرزن کہا جاتا ہے ۱۸۵۹ء میں لندن میں پیدا ہوا۔ انگریزوں کے عروج کے دور کا ایک مشہور سیاستداں تھا۔ ہندوستان میں تاج برطانیہ کا وائسرائے بننے سے پہلے انڈر سکریٹری اسٹیٹ فار انڈیا تھا۔ ۱۸۹۵ء سے لے کر ۱۸۹۸ء تک یہ برطانیہ کی وزارت خارجہ میں بھی انڈر سکریٹری رہا۔ اس کے بعد ۱۸۹۹ء میں جب کہ اس کی عمر چالیس سال تھی، ہندستان کا گیارہواں وائسرائے بنا کر بھیجا گیا۔ لارڈ کچنر سے اختلاف کی بنیاد پر ۱۹۰۵ء میں مستعفی ہو کر واپس برطانیہ چلا گیا۔ وہاں اسے آکسفورڈ یونی ورسٹی کا وائس چانسلر بنا دیا گیا۔ اس کے بعد یہ برطانیہ کی سیاسی پارٹیوں میں بھی رہا کبھی سرگرم کارکن کبھی بحیثیت سربراہ ذمہ داریاں بھی نبھائی۔ چونکہ کچھ دنوں (۱۸۹۵ء-۱۸۹۸ء) تک برطانوی وزارت خارجہ کا انڈر سکریٹری بھی رہ چکا تھا اس لیے ۱۹۱۹ء میں برطانیہ کا وزیر خارجہ بنا دیا گیا۔ جس پر وہ اپنی مرض الموت ۱۹۲۴ء تک برقرار رہا۔ وزارت سے دستبردار ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد ۱۹۲۵ء میں وہ راہی ملک عدم ہوا۔

لارڈ کرزن کے عہد وزارت میں برطانوی سیاست نے کئی اہم موڑ لیے۔ خود اس نے دنیا کی سیاست میں بڑا اہم اور فعال کردار ادا کیا۔ ایشیاء کے تقریباً چپے چپے سے یہ واقف تھا۔ اس نے ایشیائی ممالک کا کافی سفر کیا تھا۔ ایران، مشرق بعید اور مشرق قریب کے بارے میں اس نے کئی کتابیں بھی لکھیں۔

ہندوستان کی تہذیب وثقافت سے اسے گہری دلچسپی تھی۔ کلکتہ کا وکٹوریہ ہال اور امپیریل لائبریری اسی نے قائم کی۔ ہندوستان میں آثار قدیمہ کا محکمہ اسی کی کوششوں سے وجود میں آیا۔ کئی اسکول کالج اس کی ذاتی دلچسپیوں سے کھلے اور اسی نے اعلیٰ تعلیمی اداروں پر حکومت کا کنٹرول بھی سخت کیا۔

لارڈ کرزن ۱۹۰۳ء میں خدا بخش لائبریری کا معائنہ کرنے پٹنہ آیا۔ اس کے بعد اس نے لائبریری پر خصوصی توجہ دینا شروع کیا۔ اس کی خواہش تھی کہ لائبریری کے نوادر سے پوری دنیا کو مستفید ہونے کا موقع فراہم کرایا جائے۔ اس کے تحت اس نے اپنے قریبی عزیز مشہور مستشرق سرڈینی سن راس کو اس بات کے لیے آمادہ کیا کہ لائبریری کے مخطوطات کی توضیحی فہرست تیار کردیں۔ چنانچہ اس نے اپنی ذاتی دلچسپی سے اس وقت تک دستیاب ذخیرہ کی فہرست مرتب کروادی جو سلسلہ برابر جاری رہا۔ اب تک ۳۶ جلدوں میں خدا بخش لائبریری کے مخطوطات کی توضیحی فہرست شائع ہو چکی ہے۔

چونکہ لارڈ کرزن کی آمد خدا بخش لائبریری کے لیے اس وقت ایک بڑی اہمیت کی بات تھی اس لیے اس کی یادگار کے طور پر بانی کتاب خانہ خان بہادر خدا بخش خاں نے کرزن ریڈنگ روم بنوایا۔ اس کی اپنی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ مگر جن لوگوں نے کرزن ریڈنگ روم کا تذکرہ اپنی تحریروں میں کیا ہے انھوں نے اس کی جگہ کو معلوم نہیں کیوں کچھ کا کچھ لکھ دیا ہے۔ چنانچہ جناب عطاءاللہ پالوی نے مشرقی بوڈلے صفحہ ۱۲۰ پر اور محبی ڈاکٹر محمد ذاکر حسین نے نذر خدا بخش میں ص ۱۷ پر یہ لکھ دیا ہے کہ:

> "۱۹۰۵ء میں خدا بخش خاں نے لارڈ کرزن کی یاد تازہ رکھنے کے لیے اپنی نشست گاہ یا آفس کو لائبریری کا جزو بنادیا اور اس کو کرزن ریڈنگ روم کے نام سے موسوم کردیا"

ہمیں ان حضرات کے ماخذ کی کوئی اطلاع نہیں ہے اور نہ ہی ان لوگوں نے اپنے ماخذ کا کوئی تذکرہ کیا ہے۔ مگر اتنا طے ہے کہ اس ریڈنگ روم کا افتتاح ۱۹۰۵ء میں ہوا ہے۔ تاہم یہ گمان غالب ہے کہ اس عمارت کی بنیاد ۱۹۰۳ء میں ہی رکھی گئی ہوگی۔ دونوں حضرات کی مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ کرزن ریڈنگ روم کی جگہ پہلے خدابخش خاں مرحوم کی نشست گاہ تھی یا ان کا آفس تھا۔ جب کہ یہ دونوں باتیں درست نہیں ہیں نہ وہاں نشست گاہ تھی نہ وہاں آفس تھا۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اس جگہ پہلے چودھری ظہور الحق رئیس اسلام پور (موجودہ ضلع نالندہ) کا اصطبل تھا جو کبھی اصطبل رہا ہوگا مگر ۱۸۹۲ء سے وہ تھیٹر گاہ کی صورت میں استعمال ہونے لگا تھا۔ بہار شریف کے ایک رئیس مختار صاحب تھے جنھوں نے ۱۸۹۱ء میں ایک تھیٹر کمپنی کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس کا کھیل پہلی دفعہ پٹنہ میں ۱۸۹۲ء میں ہوا۔ اس سلسلے میں جناب محمد بشیر الحق دیسنوی، انسپکٹر آف پولس راگھوپور، مظفرپور یہ اطلاع دیتے ہیں کہ:

> ''چھتر کے میلے میں کھیل کر جب تھیٹر ۱۸۹۲ء کے جاڑوں میں بانکی پور (پٹنہ) آیا تو اس کا اسٹیج محلہ چوہٹہ میں جناب چودھری ظہور الحق صاحب رئیس اسلام پور ضلع پٹنہ کے اصطبل میں گڑا جو خدابخش لائبریری سے دکھن جانب تھا''۔
>
> (رسالہ ندیم مئی ۱۹۳۶ء)

آگے اس کے متعلق یوں لکھتے ہیں کہ:

> ''خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور جو اس وقت قائم ہو چکی تھی اور اسٹیج کے بیچ میں صرف اصطبل کی ایک دیوار حائل تھی''۔

چونکہ بات تھیٹر کی آگئی ہے اس لیے ادبی دلچسپی کے بطور اتنا سنتے چلیے کہ

خلاف معمول جب تھیٹر کا پٹنہ میں اس جگہ پر قیام طول پکڑنے لگا تو پروفیسر عبدالغفور شہباز متوفی ۱۹۰۸ء نے قوم کو جھنجھوڑنا شروع کر دیا اور پے در پے تین خمسے لکھ ڈالے جو اس وقت اخبار الپنچ کے شماروں میں چھپتے رہے۔ جن میں راہ پر لانے والا خمسہ کا تعلق چونکہ لائبریری سے نہیں ہے اس لیے اس کا ذکر چھوڑتا ہوں۔ بقیہ دو یعنی چونکانے والا خمسہ اور علمی مذاق کا خمسہ خدا بخش لائبریری سے تعلق رکھتا ہے اس لیے ان دونوں خمسوں کے ایک ایک بند ملاحظہ ہوں:

چونکانے والا خمسہ

عینی کا کسی شوخ کے غمزوں پہ ہے عالم ہے سلسلۂ زلف کسی شوخ کا سلَم
دیوان ہلالی ہے کوئی ابرو پر خم لونڈے بھی تھیٹر کے کتابوں سے نہیں کم
ہے خان مکرر کا کتب خانہ تھیٹر

(خان مکرر یعنی خان بہادر خدا بخش خان)۔

علمی مذاق کا خمسہ

کبھی سادہ کبھی پُر زر خدا بخشے تھیٹر کو ہریش چندر کبھی اندر خدا بخشے تھیٹر کو
کبھی عیش و خوشی کا گھر خدا بخشے تھیٹر کو کبھی اندوہ و غم گھر بھر خدا بخشے تھیٹر کو
عجب عبرت کا ہے دفتر خدا بخشے تھیٹر کو

شہباز مرحوم کے مذکورہ خمسوں کا فوری اثر ہوا اور مختار صاحب کو اپنا تھیٹر جھٹ پٹ اٹھا کر دوسری جگہ لے جانا پڑا۔

بہر حال آگے چل کر اسی تھیٹر گاہ والی زمین کو خان بہادر خدا بخش خاں مرحوم نے حاصل کر کے انجمن اسلامیہ ہال بنانے کے لیے دے دیا تھا اور انجمن کی عمارت بھی اس پر بننا شروع ہو گئی تھی مگر چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر وہاں ہال کی

تعمیر نہیں ہو سکی اور بہت دنوں تک یونہی بیکار پڑی رہی۔ جب عمارت نہیں بنی تو خدا بخش مرحوم نے اس زمین کو دوبارہ اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اسی اصطبل والی زمین پر یہ تاریخی کرزن ریڈنگ روم ہے۔ جناب بشیر الحق دیسنوی آگے لکھتے ہیں:

''بعد کو اصطبل والی زمین خان بہادر خدا بخش خاں مرحوم نے حاصل کر کے انجمن اسلامیہ ہال بانکی پور کے حوالے کی۔ انجمن کی عمارت بھی اس پر بننا شروع ہو گئی مگر سرمایہ کی کمی کی وجہ سے عمارت پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی تو مجبوراً خدا بخش خاں مرحوم نے پھر اس زمین کو حاصل کر لیا اور اب اصطبل والی زمین لائبریری کے احاطہ میں آگئی ہے جس پر لائبریری کا کرزن ریڈنگ روم ہے۔''

مذکورہ بالا عبارت بالکل واضح ہے تاہم یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ خدا بخش لائبریری کا موجودہ آفس جس کی دکھن جانب خدا بخش مرحوم کا مزار اور کرزن ریڈنگ روم ہے حقیقتاً وہ آفس ابتدا میں مین لائبریری کی عمارت تھی اور خدا بخش خاں کا جس جگہ مزار ہے اسی حصہ میں کہیں پر وہ دیوار رہی ہوگی جو اصطبل کو لائبریری سے جدا کرتی تھی۔ موجودہ مین لائبریری والی زمین افتادہ تھی جس پر ۱۹۳۴ء/ ۱۹۳۵ء میں سرکار نے نئی عمارت لائبریری کے لیے بنوائی۔

یہاں یہ بات بھی واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پٹنہ کا موجودہ انجمن اسلامیہ ہال خدا بخش خاں کی زمین پر واقع نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں کو یہ التباس ہوا ہے۔ اس کی کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں ہے نہ ہی ایسی کوئی تحریر ملتی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ انجمن اسلامیہ ہال خدا بخش کی زمین پر واقع ہے۔

سب سے پہلے ایک غیر ضروری بحث کے طور پر جناب عطاء اللہ پالوی نے یہ شوشہ چھوڑ دیا کہ:

''۱۹۰۴ء میں خدا بخش خاں نے کوشش کی کہ یونس خاں

والی زمین کو حاصل کرلیں۔ اس زمین کو یونس خاں نے ان لوگوں
کے ہاتھ سے فروخت کردیا تھا جو وہاں انجمن اسلامیہ ہال بنانے کا
خیال رکھتے تھے۔ آخرش خدابخش خاں کی کوشش کامیاب ہوئی اور
انجمن کی کمیٹی نے وہ زمین خدا بخش خاں کے ہاتھوں فروخت کر
دیا۔ خدابخش خاں نے اس زمین پر پختہ دو منزلہ مکان بنوایا''۔
(مشرقی بوڑلے ص ۱۲۰)

یہ صرف جناب پالوی کا گمان ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یونس خاں والی زمین نہ کبھی انجمن والوں کے ہاتھ فروخت ہوئی نہ انجمن والوں نے خدا بخش خاں کے ہاتھوں دوبارہ فروخت کیا۔ بلکہ یونس خاں والی زمین تو وہ ہے جس میں آج کل لائبریری کا آفس ہے جو پہلے دو منزلہ عمارت تھی جس میں خدا بخش کی رہائش بھی تھی اور کچھ حصے میں کتب خانہ بھی تھا۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے واضح ہو گیا کہ انجمن اسلامیہ ہال کی عمارت اور خدا بخش کا ذکر پالوی صاحب نے غیر ضروری طور پر ایک ساتھ کر دیا ہے اور اس کی کوئی معقول دلیل بھی نہیں دی ہے۔

اس سلسلے میں سابق ڈائرکٹر خدابخش لائبریری جناب حبیب الرحمن چغانی کی بھی ایک تحریر ملتی ہے جو اس طرح ہے:

''انجمن اسلامیہ ہال کو انھیں (خدابخش) کے قول کے
مطابق نہ صرف زمین دی بلکہ اس کے لیے ہر ممکن تعاون دینے کا
وعدہ کیا''۔ (نذر خدابخش ص ۱۳)

چغانی صاحب کا یہ بیان محبی ڈاکٹر محمد ذاکر حسین صاحب کی تحریر کا ملخص ہے جو الپنچ ۸ر نومبر ۱۹۰۲ء سے ماخوذ خدا بخش خاں کی تقریر پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا بیان اس طرح ہے:

> ''لوگوں کو خدا بخش خاں کے بارے میں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ نہیں چاہتے ہیں کہ انجمن کی عمارت بنے خدا بخش نے اپنے خطاب میں یہ کہتے ہوئے لوگوں کی غلط فہمی دور کی کہ ہماری طرف سے جو لوگوں کو شبہ ہے کہ ہم اس کے بننے میں مخل ہیں بالکل غلط ہے۔ ہمیں نے اس انجمن کو جگہ دی۔ ہم ہرگز اس کے مخالف نہیں ہیں۔ اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ سو روپے تعمیر مکان کے لیے بھی دیں گے''۔ (نذر خدا بخش ص ۷۰)

اسے موجودہ اسلامیہ ہال کی بابت اطلاع نہیں مانی جانی چاہیے جیسا کہ بیان سے ظاہر ہے بلکہ یہ اس انجمن کی عمارت کی بات ہے جس جگہ پر ابھی کرزن ریڈنگ روم کی عمارت کھڑی ہے۔ یہ گمان غالب ہے کہ چونکہ وہ زمین خدا بخش لائبریری سے بالکل متصل تھی جسے خدا بخش خاں نے حاصل کیا تھا اور انجمن کی عمارت بنانے کے لیے دے دیا تھا۔ اس پر انجمن اسلامیہ ہال کی تعمیر بھی شروع ہو گئی تھی لیکن بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر اس کی تعمیر کی تکمیل نہیں ہو سکی اور برسوں یونہی پڑی رہی جیسا کہ بشیر الحق دیسنوی کے محولہ بالا بیان سے واضح ہے۔ تاخیر والتواء کے اسی درمیانی وقفے میں لوگوں کو یقیناً یہ شبہ پیدا ہو گیا ہو گا کہ خدا بخش خاں انجمن اسلامیہ ہال کی عمارت نہیں تعمیر ہونے دینا چاہتے ہیں۔ اسی کی صفائی میں خدا بخش خاں نے مذکورہ بالا تقریر عوام کے سامنے کی۔

دوسری بات یہ ہے کہ خدا بخش لائبریری میں لارڈ کرزن کی آمد ۱۹۰۳ء میں ہوئی اس وقت تک انجمن کی عمارت اس جگہ نہیں بن سکی تھی۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۰۲ء تک تو خدا بخش کا ارادہ انجمن اسلامیہ ہال ہی بنانے کا رہا ہو گا۔ پھر کچھ عجب نہیں کہ لارڈ کرزن کی آمد کے بعد ۱۹۰۳ء میں ان کا ارادہ بدل گیا ہو۔ مذکورہ بالا معروضات کا خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ کرزن ریڈنگ روم کی

جگہ پہلے چودھری ظہور الحق رئیس اسلام پور کا اصطبل تھا۔اس کے بعد وہ تھیٹر گاہ کے مصرف میں رہا۔بعد میں اسے حاصل کر کے انجمن کے حوالے کیا جس پر انجمن اسلامیہ ہال کی بنیاد بھی پڑی مگر کسی وجہ کر وہ نہیں بن سکا تو خدا بخش نے اسے لائبریری کا حصہ بنالیا اور اسی جگہ پر موجودہ تاریخی کرزن ریڈنگ روم کی عمارت تعمیر ہوئی۔

(روزنامہ سنگم ۲۱،۲۳ رمارچ ۲۰۰۱ء)

☆☆

پردیپ کمار جھا
مترجم: انور علی وارثی
کمپیوٹر سکشن، خدا بخش لائبریری

خدا بخش لائبریری- مخطوطات کا عظیم ذخیرہ

پٹنہ کی خدا بخش لائبریری میں مخطوطات کی عظیم دنیا آباد ہے، جہاں ہندستان، وسط ایشیا، عرب، ایران، ترکی وغیرہ ممالک کے عربی، فارسی، اردو، ترکی اور پشتو جیسی زبانوں میں ہاتھ کی لکھی ہوئی قدیم اور نادر کتابیں محفوظ ہیں۔ ان مخطوطات کی کل تعداد ۱۸ ہزار ہے، جو گزرے زمانے کی یاد تازہ کراتے ہیں۔ ساتھ ہی یہاں ۶۳۰ فرامین اور ہندستان کے ممتاز لوگوں کے لگ بھگ ۱۵ سو خطوط بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں وسط ایشیا، ایران، ترکی، مغل، راجپوت اور پٹنہ اسکول کے جانے مانے کلاکاروں کی بنائی ہوئی نادر تصویریں اور دو لاکھ اہم کتابیں بھی اس لائبریری کی زینت ہیں۔

اس لائبریری کو سب سے پہلے خدا بخش خاں کے والد محمد بخش خاں نے ''محمدیہ لائبریری'' کے نام سے چھپرہ میں قائم کیا تھا اور ۱۶ سو مخطوطات جمع کئے تھے۔ تب شاید ہی کسی کو اس بات کا احساس تھا کہ ایک دن یہ لائبریری پوری دنیا میں مشہور ہوگی۔ محمد بخش خاں چھپرہ میں وکالت کرتے تھے بعد میں وہ اپنے کچھ ہندستانی اور انگریز احباب کے مشورے پر چھپرہ ترک کر کے پٹنہ آکر چوہٹہ محلے میں رہنے لگے۔ ۱۸۷۶ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو اس سے پہلے انہوں نے اپنے لخت جگر خدا بخش خاں سے کہا تھا کہ وہ محمدیہ لائبریری کو مزید آگے بڑھائیں، زیادہ سے زیادہ تعداد میں مخطوطات اور نادر کتابوں کی جمع آوری پر توجہ دیں۔

خود خدا بخش ایک اچھے وکیل تھے اور اچھی کمائی کر لیتے تھے اس لیے وہ اپنی آمدنی کا زیادہ تر حصہ کتابوں کی خرید پر خرچ کرتے تھے۔ انہیں پورے ملک میں کتاب خریدنے والے کے نام سے جانا جانے لگا۔ اس کے علاوہ عرب کے ایک آدمی کو ۵۰ روپیہ مہینے پر اپنا معاون رکھا تھا، جو ہندستان کے علاوہ عرب ایران، مصر، اور دوسرے اسلامی ملکوں سے نادر کتابیں

خرید کر خدا بخش کو بھیجتا تھا۔ اس طرح اس لائبریری میں دنیا بھر کی نادر کتابوں کا ذخیرہ جمع ہونے لگا۔

جب کتابوں کا انبار لگ گیا تو خدا بخش نے ۱۸۹۱ء میں ''پبلک لائبریری'' کے نام سے ایک لائبریری قایم کی۔ بعد میں لارڈ کرزن نے اس لائبریری میں دلچسپی لینی شروع کی۔ ۱۹۰۵ء سے یہاں کے مخطوطات کی توضیحی فہرستیں بنی شروع ہوئیں۔

خدا بخش کے انتقال کے بعد ان کے لائق فرزندوں نے اس روایت کو آگے بڑھانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ خاص طور سے صلاح الدین خدا بخش کی کوششوں سے ہی یہاں انگریزی، جرمن اور فرنچ زبانوں کی کتابیں جمع ہوسکیں۔ ۱۹۵۷ء میں جب ڈاکٹر ذاکر حسین بہار کے گورنر بن کر آئے تو انہوں نے دو قابل قدر کاموں کو انجام دیا۔ پہلا، دسنہ کلکشن کو لائبریری میں منتقل کرایا جس سے اس لائبریری کی حیثیت مزید بڑھ گئی اور دوسرا، انہوں نے مرکزی حکومت سے سفارش کی کہ خدا بخش لائبریری کو مرکزی حکومت کی تحویل میں لے لیا جائے۔ لہٰذا ۱۹۶۹ء میں اس لائبریری کو قومی اہمیت کا ادارہ مانا گیا تبھی سے یہ لائبریری مرکزی حکومت کی نگرانی میں کام کر رہی ہے۔

جتنے مخطوطات خدا بخش لائبریری میں ہیں، اتنی کسی دوسری لائبریری میں نہیں ہیں۔ ''تاریخ خاندان تیموریہ'' ایک نادر مخطوطہ ہے جس کے مصنف کی شناخت نہیں ہوسکی ہے۔ اسے اکبر کی حکومت کے ۲۲ ویں سال میں لکھا گیا تھا۔ گمان ہے کہ اکبر کے کسی درباری تاریخ داں نے اسے لکھا ہوگا۔ اس مخطوطے میں ۱۳۲ نادر تصویریں ہیں۔ تصویروں کے نیچے مصوروں کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ اس مخطوطے کو کتنی اہمیت دی گئی ہے، اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اسے جس الماری میں رکھا گیا ہے اسے دو کنجیوں سے کھولا جاسکتا ہے اور ان دو کنجیوں میں سے ایک لائبریری کے ڈائرکٹر کے پاس اور دوسری کمشنر پٹنہ کے پاس رہتی ہے۔

اس لائبریری کا سب سے پرانا اور اہم دستاویز ہے قرآن شریف کا ایک ورق۔ چھٹی صدی میں یہ ہرن کے چمڑے پر کوفی رسم الخط میں لکھا گیا جسے شیشے میں رکھا گیا ہے۔ اس لائبریری میں ''کتاب الحشیر'' نامی عربی میں ایک مخطوطہ ہے اور یہ دنیا کا سب سے پرانا نسخہ

ہے۔ اکبر نے ابوالفضل سے مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ کروایا تھا اس کے بھی نسخے یہاں موجود ہیں۔ داراشکوہ نے اپنشد کا فارسی میں ترجمہ ''سرِ اکبر'' کے نام سے کیا تھا۔ یہ ترجمہ بھی یہاں محفوظ ہے۔ اسپین کے ایک مشہور سرجن الزہراوی کی تصنیف کردہ ''کتاب التصریف'' بھی یہاں موجود ہے۔ طب کے فن میں اسے ایک اہم کتاب مانی جاتی ہے۔ اسی طرح یونانی سے عربی میں ترجمہ کی ہوئی کتاب ''کتاب الحشائش'' بھی توجہ کا مرکز ہے۔ یہ کتاب نباتات کے فن پر لکھی گئی ہے۔ ۱۱ویں صدی کی یہ ایک نادر کتاب ہے۔ اس کی دوسری کاپی پوری دنیا میں کہیں دستیاب نہیں ہے۔ حافظ شیرازی کے ''دیوان حافظ'' کا وہ نسخہ جو ہمایوں کو ایرانی بادشاہ نے تحفے میں پیش کیا تھا، یہ کتاب ہمایوں سے ہوتے ہوتے داراشکوہ تک آئی اور اب خدابخش لائبریری کی زینت ہے۔ خمسہ نظامی فارسی شاعری کا مجموعہ ہے جو چارسو سال قبل لکھا گیا۔ خدابخش لائبریری میں ان قدیم اور نادر مخطوطات کی حفاظت کا بھی اچھا انتظام ہے۔ ان کی حفاظت کے لیے سائنٹفک طریقے اپنائے گئے ہیں۔

اس لائبریری نے بڑے پیمانے پر اشاعت وطباعت کا بھی کام کیا ہے۔ اس نے ان نادر نسخوں کی بھی اشاعت کی ہے جس کی ضرورت محققین اور ریسرچ اسکالرز کو ہوتی ہے۔ ایسی تقریباً ۱۰۰ کتابوں کی طباعت ہوئی ہے۔ لائبریری ہر سال ان دانشوروں کو ایوارڈ دیتی ہے جنھوں نے ہندستان کی قومی یکجہتی کے ارتقا کے لیے تعمیری کام کیا ہو۔ اس لائبریری میں لائبریری سائنس کی بھی تربیت دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں مخطوطات کی سائنسی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ اور وقتاً فوقتاً بین الاقوامی سیمنار کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ ۱۹۹۳ء میں یہاں ایک بین الاقوامی سیمنار منعقد ہوا جو ہندستان اور ازبکستان کے تاریخی رشتوں کے موضوع پر تھا۔ خدابخش لائبریری بلاشبہ مخطوطات کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ہے جو ہمارے سامنے ماضی کی سماجی، معاشی، ثقافتی اور سائنسی حصولیابیوں کی زندہ تصویر پیش کرتی ہے۔



(سنگم، پٹنہ ۲۸ رفروری ۲۰۰۱ء)

(ہندی میں یہ مضمون گرہ شوبھا جنوری ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا تھا)

فضل حق آزاد عظیم آبادی

جشن افتتاح

کتب خانۂ خدا بخش خاں مرحوم

دن خوشی کے گو بہت گذرے ہیں زیر آسماں
آج کا دن ہم نہ بھولیں گے کبھی تیرا سماں
گو گذر جائے گا تو گذرے ہوئے دن کی طرح
یاد تیری پر نہ جائے گی دلوں سے بے گماں
گو نہ ہوں گے ایک دن ہم بھی مگر ہوگی ضرور
تیری یاد آئندہ نسلوں کے دلوں کا حرز جاں
فخر جو تیری سعادت سے ہمیں حاصل ہے آج
ہیں شریک اس میں یہاں جتنے ہیں سب پیر و جواں
قدر کوئی تیری کیا جانے وہی جانیں تجھے
جو ہنر کے دوست ہیں جو علم کے ہیں قدرداں
تو وہ دن ہے جس سے روشن ہوگی تاریخ بہار
تو وہ دن ہے خوبیاں جس دن کی ہیں سب پر عیاں
تیری رونق سے ہے ہر دیوار و در کو وہ عروج
ہے بجا کہیے جو پٹنہ کی زمیں کو آسماں
فرش تھی چشم تمنا کب سے تیری راہ میں
کتنی مدت بعد لایا ہے تجھے دورِ زماں

تیری آمد تھی مگر آمد پہ اس کی منحصر
جس کی آمد سے نہالِ خشک بھی ہو گل فشاں
کب توقع تھی کھلے گا یاں کتب خانہ کوئی
اور اسے کھولیں گے سر چارلس ایلیٹ آ کر یہاں
قدردانِ علم گو آگے بھی گذرے ہیں مگر
قدردانی ایسی ایسی عزت افزائی کہاں
علم کو دیکھو کہ اسجادیں لیے آتا ہے ساتھ
ہند میں منزل بہ منزل کارواں در کارواں
یہ وہ دورہ ہے کہ جس میں قدر و قیمت کے سبب
علم و حکمت کا ہے اک اک حرف گنجِ شایگاں
چشم بینا ہے تو ہے اچھی بری سب شئے کا لطف
یہ نہیں تو ہے برابر کیا بہار اور کیا خزاں
قدردانی علم و اہلِ علم کی دیکھیں جو ہم
قدرداں کی مدح میں کیونکر نہ ہو رطب اللساں
یوں ادا ہو جس کتب خانہ کی رسم افتتاح
کیوں نہ ہو اس کے مقاصد کامیاب اور کامراں
کچھ نہ کچھ اونچی ہی ہو جاتی ہے اپنی سطح سے
خاک رہ بھی اونچے دامن سے لپٹتی ہے جہاں
جانور بھی ڈھونڈ لیتے ہیں کوئی شاخ بلند
باندھتے ہیں تب کہیں رہنے کو اپنے آشیاں
وقف نامہ میں ادا کی ہے جو شرط احتیاط
اس سے دور اندیشیاں واقف کی ہوتی ہیں عیاں

شکر سے واقف کا اس کے شکر ہرگز کم نہیں
تولیت کا کچھ لیا جس نے کہ یہ بارِ گراں

ہاں ٹرسٹی جب گورنمنٹ اس کتب خانہ کی ہے
کیا عجب یاں تک نہ پہنچے گردِ آسیب زماں

کھینچتی ہے عنصروں کو جس طرح کڑوی کشش
جانبِ ممدوح کھینچ جاتی ہے مدح مدح خواں

نقش کی خوبی ہے خوبی جس طرح نقاش کی
مدح پھولوں کی حقیقت میں ہے مدح باغباں

ہے سراسر وہ گورنمنٹ اور ہز آنر کی مدح
مدح میں واقف کی ہم کھولیں گے گر اپنی زباں

اے خدا بخش اے مرے خانِ بہادر آفریں
تیری ہمت پر کہ ہے ممنون جس کا اک جہاں

یہ کتابیں تھیں جو تجھ کو تیرے بچوں سے عزیز
وقف کرنا ان کا تھا الحق بہت سخت امتحاں

پر خدا کا شکر کر جس نے تجھے توفیق دی
جس سے تیری زندگی نے پائی عمر جاوداں

لن تنالو البر حتیٰ تنفقوا پڑھتے تھے ہم
مطلب اس کا کر دیا تو نے مگر خاطر نشاں

تو نے اور تیرے بزرگوں نے لگایا تھا جو باغ
ہو گیا وہ باغ اب بے شبہ باغِ بے خزاں

اس کتب خانہ میں آئیں گے جب اہلِ علم و فضل
تیری ہمت پر زباں ہو گی کچھ ان کی دُرفشاں

گو کہ سرچشمہ ہے یہ لیکن توقع ہے ہمیں
ایک دن ہوگا اسی سرچشمہ سے دریا رواں
کی اعانت جن بزرگوں نے تری اس کام میں
اجر پائیں گے وہ فیاضی کا اپنی بے گماں
ختم کرتا ہوں سخن مدح ہز آنر پر کہ ہے
آج کی صحبت کو جس کے دم قدم سے عزّ وشاں
عزت افزائی جو کی ہے آپ نے اس بزم کی
شکر سے اس عزت افزائی کے قاصر ہے زباں
بارگاہ احدیت میں ہے دعا آزادؔ کی
دن خوشی کے لائے ایسے نت نئے دورِ زماں

(اکتوبر ۱۸۹۱ء)

☆☆☆

قطعہ تاریخ

شادؔ عظیم آبادی

این عمارت کہ بہر جمع کتب — شد بنائش چو قصرِ شاہانہ
چو کریماں کشادہ رو ہر در — کوس کش جملہ فیض کاشانہ
پیش افکار ایں ہمایوں طاق — قصۂ طاقدیس افسانہ
ایں مزین بہ جوہر ذاتی — واں بہ الماس و لعل و دُر دانہ
یادگاریست در صحیفۂ دہر — از خدا بخش خانِ فرزانہ
بے تصنع دریں عظیم آباد — ایں یکے بود، کارِ مردانہ
منحصر نیست بر خزائن دہر — صرف شد، بہمت کریمانہ
کتب نادرِ علوم و فنون — جمع ز اصناف، پنج دہ گانہ
چین و تاتار و ہند و سند نثار — بر صبیحان ایں صنم خانہ
صفحہ و سطرِ جملہ اوراقش — بہتر از زلف و رُوئے جانانہ
کتب اکثر خطِ مصنف اوست — شاہدش آشنا و بیگانہ
ہم بر اکثر نوشتہ ہائے شاں — می دہد خود نشانِ شاہانہ
گشت ایں شمع فیض چوں روشن — علماء گرد او چو پروانہ
روحِ طوسی و رازی و مقتول — کرد، ادا سجدہ ہائے شکرانہ
ایں کتب خانہ می دہد بہ شکوہ — یاد از اصفہان و فرغانہ
شادؔ، سالِ بنائے اُو بر گفت — جاوداں ماند ایں کتب خانہ

۱۲۹۹ھ

(مشرقی بوڈ لے/عطاء اللہ پالوی، پٹنہ ۱۹۸۵ء)

خمسۂ چقندری

انسانی سرسبزی پر نباتاتی دنیا میں فطرتی شادمانی

عبدالغفور شہبازؔ

نہ ہو حیدرآباد کیوں شادماں   کہ سرسبزیِ عدل کا ہے زماں
ہے فالیز میں خوش دلی کا سماں   ملی خربُزے کو چھری سے اماں
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

ہو تربوز کیوں تیرِ غم کا ہدف   ہو گنّے کی کیوں جانِ شیریں تلف
ملیں کھیرے کیوں فرطِ حسرت سے کف   کہ ''راجس'' کا نادر ہوا برطرف
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

ہوا بند جور و تعدی کا گیٹ   جمی باغ میں ہے خوشی کی پریٹ
بھرے اس کے احشا سے کیوں اب پلیٹ   کٹھل کا ہے محفوظ پھٹنے سے پیٹ
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

وہ سفاکِ غم کی گئی خود سری   کہ ہے سر پہ اب معدلت گستری
رہے کیوں نہ مغزِ خوشی سے بھری   چپت سے بچی بیل کی کھوپری
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

کسی کو نہیں تھامتیں مکڑیاں   نہیں مار کو مارتیں لکڑیاں
کدو سے چھری سنتی ہے پھکویاں   ہیں کھیتوں میں اکڑی ہوئی ککڑیاں
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

خوشی سے چقندر کا چہرا ہے لال   ہے گاجر بھی چہرے پہ چھڑکے گلال
نہیں دل میں بیگن کے اصلاً ملال   بنیں کیوں نہ مطلع پہ سیمیں ہلال
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

بھسم کر کے خود ظلم کے بھوت کو ملی معدلت روح کے قوت کو
کچھ ایسی خوشی آج ہے توت کو سمجھتا نہیں کچھ بھی یاقوت کو
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

ہر اک گام میں راہِ مقصود پر چھری بھی چلی خط بہبود پر
چلی تیغ جب ظلمِ مردود پر خوشی کا چڑھا رنگ امرود پر
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

خوشی کیوں نہ ہو آج آموں میں خاص کہ ہے ان کے قاتل پہ واجب قصاص
ہوئیں رنج سے ان کی جانیں خلاص جھکائیں نہ کیوں سر کو بالاختصاص
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

شگفتہ ہیں ہر سو خوشی کے ریاض کھلی ہے مسرت کی گلگوں بیاض
بڑھل پر کرے کوئی کیوں اعتراض کہاں اس کی صورت پہ وہ انقباض
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

کدو کے جو چہرے پہ ہے آب و تاب بھری اس نے تونبے میں شاید شراب
خوشی پاس ہے، دور ہے اضطراب علی الرغم کدلک ہے وہ کامیاب
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

نہ اب کیریاں دل میں رنجور ہوں عبث غم کے ہاتھوں نہ امچور ہوں
مصائب کے زخموں سے کیوں چور ہوں بڑی بات ہے، دل میں مسرور ہوں
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

چڑھاے ہے ہر پھانک اپنی کماں چھپائے ہے ہر بیج نوکِ سناں
اگرچہ ہے نظروں سے ترکش نہاں نہیں دشمن خربزہ کو اماں
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

وکالت کرے گی چقندر کی بیر دکھائے گی مولی نظائر کا ڈھیر
ترازو پہ رکھ کر عدالت کا سیر خود انصاف تولے گا پلّے کو پھیر
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

ستم کا ہے حال اب بہت ہی برا ہوا ظلم کا میان میں اب چھرا
کسیرو کا گھر ہے بھرا اور پُرا نہیں سر پہ پھرتا وہ اب استرا
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

ہے اس بات پر سب کا اب اتفاق کہ اب پھوٹ میں بھی ہے رنگ وفاق
نہ شق ہے جگر اور نہ جینا ہے شاق کہ ہے ناوکِ ظلم بالائے طاق
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

چنوں نے جو تھی حق سے فریاد کی کہ کچھ حد نہیں ہم پہ بیداد کی
تو دی حق نے اب داد یوں داد کی ہے کیا بات عدل خدا داد کی
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

مٹر اور چنے ہیں ہرے اور بھرے خوشی سے ہے جلو میں ورے اور پرے
بلا ان کی اب بکریوں سے ڈرے یہ بکری میں طاقت کہاں جو چرے
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

نظر آتے ہیں باغ میں فالسے خوشی کی حلاوت سے خوش حال سے
ہیں ماموں یہ ظالم کے افعال سے کہ اس عہد میں ان کے اقبال سے
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

زرہ پہنے ہیں لیچیاں شاخ پر نہیں ان کو تیرِ حوادث سے ڈر
نہ ہو کس طرح ان کو حاصل ظفر کہ انصاف ہے آگے آگے سپر
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

وہ شفتالوؤں کی گئیں تلخیاں بھریں رنگ عشرت نے شیرینیاں
خوش آیند سیبوں کی سرسبزیاں دکھاتی ہیں گالوں پہ اب سرخیاں
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

خوشی سے ہیں پھولے ہوئے رنگترے　　مسرت کے رس میں ہیں نیبو بھرے
ہیں نارنج بھی رنج وغم سے پرے　　عجب کیا چھری بھی دم ان کا بھرے
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

نہیں ان کو اصلاً غم روزگار　　ہیں مارے خوشی کے یہ بے اختیار
ہیں دانتوں پہ یاقوت کی سی بہار　　پڑے شاخ پر ہنس رہے ہیں انار
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

گئیں سر سے بیگن کے وہ خواریاں　　مسلّم ہیں گھیئے کی سرداریاں
کہاں شلجم آلو کی اب ''کاریاں''　　کہ ہیں بے خطر ساری ترکاریاں
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

کریلے کا بیجا نہیں کچھ سرور　　کہ ہے عیش اب اس کا تلخی سے دور
سمجھ کر کسی دن کمیتِ غرور　　چڑھے گا یہ اب نیم پر بھی ضرور
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

جب ایماء سے دہقانِ تقدیر کے　　چقندر نے 'چ' دی، کریلے نے 'ے'
دیا 'جیم' گاجر نے، خرفے نے 'ف'　　دیے 'سین' کسیرو نے، بھٹے نے 'ٹ'
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

رہے جب تلک یاں ترازو پہ سیر　　ہو جب تک کہ منڈی میں سبزی کا ڈھیر
مذاقوں میں جب تک کہ یخوش ہو بیر　　نہ ہوں کان اس لَے کے سننے سے سیر
ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں

☆☆☆

(تفریح القلوب، ستارۂ ہند پریس کلکتہ ۱۹۳۲ء)

کتب خانۂ خدا بخش خاں

حضرت العلام جناب اصغر امام فلسفی

بنام خداوند لوح و قلم   سر اہل دانش بہ او پیش، خم
تواں شد گرگاریں بہ افلاک رفت   نہ در کنہ ذاتش بہ ادراک رفت
حکیمان عالم، در اسرار گم   ہمہ اہل حکمت، بہ افکار گم
بخود را نمائش جہاں آفرید   بسا جلوہ ہا در زماں آفرید
فرستاد ما را کتابِ مبیں   فرستاد ما سید المرسلیں
سلامٌ علیٰ سید الانبیاء   سلامٌ علیٰ احمد مجتبیٰ
سلامٌ علیٰ آلِ اطہار او   سلامٌ بہ اعوان و انصارِ او
عطا کرد انسان را عقل و شعور   قلم کرد کاغذ سیہ از سطور
نوشتند صدہا کتب در جہاں   کہ کردند از علم روشن زماں
کہ صدہا کتب آنکہ تصنیف شد   کہ صدہا کتب آنکہ تالیف شد
کتب ہائے دانش بہ از مہر و ماہ   کہ دورِ فلک کرد اکثر تباہ
و لیکن خدا خالق مہرباں   عطا کرد ما را خدا بخش خاں
بہ شد نامور مغربی بوڈلے   بہ جمعِ کتب نام دارد، ولے
خدا بخش، از وے گذشتہ بسے   کہ کم گوئمش، مشرقی بوڈلے
سن ہیژدہ صد و ہشتاد و ہشت   کہ قائم کتب خانہ ایں شان گشت
بہ پٹنہ بر افروخت شمع انیق   کہ یَاتُونَ مِنۡ کُلِّ فَجٍّ عَمِیۡقٍ(۱)
کتب خانہ در ہند، قائم نمود   درش بر ہمہ اہل دانش کشود

(۱) قرآن مجید کی سورۂ حج کے چوتھے رکوع میں حج کے موقع پر قربانی کی اونٹنیوں کے بارے میں آیا ہے کہ یاتین من کل فج عمیق (۲۲/۲۷) یعنی "اونٹنیاں دور دراز راستوں سے وہاں پہنچیں گی"۔ یہاں شاعر نے صیغہ بدل دیا ہے اور کہا ہے "یاتون من کل فج عمیق"۔ مطلب یہ ہے کہ خدا بخش لائبریری سے استفادہ کے لیے دور دراز راستوں سے لوگ پٹنہ پہنچا کریں گے۔

که بود اہل دانش به ہندوستان　　گلِ علم آراست در گلستاں
کتب خانهٔ ہم چناں شان ہست　　که دانشوراں، گردِ آیند مست
نه شد سیر ہرگز بجمع کتب　　نگه داشت او، از قطب تا قطب
به فکر کتب عبقری مرد بود　　بجمع کتب آں جری مرد بود
شود رحمت و نور در تربتش　　که یا شد خدا نور بر تربتش
که یک مرد بیدار عابد رضا　　ؤرکز کتب خانهٔ ما شده
چو شد جلوه افروز بر علم تخت　　چه بیدار مغز و چه بیدار بخت
حسیں کرد نظم خدا بخش را　　که ترتیب نو داد، بہر خدا
بجمع کتب حفظ و تزئین کرد　　ز تنظیم نو، کارِ تحسین کرد
ز جورِ فلک، کینهٔ دشمناں　　ترا حفظ دارد، خدائے جہاں
سلامت بمانی تو عابد رضا!　　شوی مہر روشن، به فضل خدا
به پٹنه مرا ہمدم مہرباں　　که محبوب من ہست از قلب و جاں
به پٹنه مرا ہست مرد شفیق　　به من ہست پیہم رفیق خلیق
که نامش عطاء الله پالوی　　محبّے محبّان، از فلقی
که آں صاحب طرز تصنیف ہست　　که اہل قلم، اہل تالیف ہست
به فرمائش او، قلم شد رواں　　حقیقت رقم کردم و شد بیاں
منم فلقی، عمر ہشتاد ام　　که در فن خود، فردِ استاد ام
کتب ہائے منقول و معقول را　　ہمه علم عصری و معمول را
ہمه طے نمودم به عمر دہم　　دہم درس از عمر بست و دوم
صحافت، قیادت و اصلاح شعر　　ہمه عمر سازم به ایضاحِ شعر
دعاء می کنم از خدائے جہاں　　که جنت به بخشد خدا بخش خاں

بکن فلقی، ایں سخن را تمام
کتب خانهٔ ایں، بماند مدام

(مشرقی بوڈلے/عطاء الله پالوی، پٹنه ۱۹۸۵ء)

سید سعید رضا گہر عظیم آبادی
خلف الرشید حضرت سید حسن رضا ثاقب عظیم آبادی

خدابخش لائبریری

پٹنہ، بنا جہان میں مرکز وقار کا
آیا ادب کے باغ میں موسم بہار کا
خونِ جگر سے سینچا خدابخش نے جسے
دنیا کو دے رہا ہے سبق، وہ نثار کا
اُس نے تو وہ کیا، جو کسی سے نہ ہو سکا
پٹنے کو علم وفضل کا مرکز بنا دیا
سرمایۂ حیات کیا، اپنے ساتھ، وقف
"جب یادگار کام خدا بخش نے کیا"

۱۸۹۱ء

آتے ہیں دُور، دُور سے اہلِ قلم، یہاں
کرتے ہیں، اپنے کام کی باتیں رقم، یہاں
دنیا میں ڈھونڈ نے سے ملے گا کہیں، کہیں
شرقی علوم کا ہے خزانہ بہم، یہاں
مخطوطے بے شمار، کتابیں بھی بے حساب
ہے مشرقی علوم کا سرمایہ لا جواب
دنیا میں اس کا کوئی بھی ثانی کہیں نہیں
کتنے کو کرچکا، یہ کتب خانہ، کامیاب

بخشے خدا جناب خدابخش کو، ارم
تاحشر، ان پہ ہوتا رہے فضل اور کرم
دریا دلی سے جس نے کتب خانے کے لیے
سب کچھ لٹایا اپنا، کہ سب کا رہے بھرم

کرتا ہوں احترام، ہر اک کی خوشی کا میں
ممنون ہوں، جناب عطا پالوی کا میں
ہے وقف زیست، خدمت اردو کے واسطے
خادم ہوں، اے گہر، ادب و شاعری کا، میں

بیدار، بخت خفتہ بھی، بیدار سے ہوا
تحقیق کا جو شعبہ، کتبخانے میں،کھلا
ہر طرح سے، ادارہ ترقی پذیر ہے
" دارالمطالعہ" میں، ہمیشہ ہے، جگمگھٹا

پڑھنے کا انتظام ہے شاہانہ، دیکھئے
منطق کہیں، غزل کہیں، افسانہ، دیکھئے
سرمایۂ علوم، عجب بے مثال ہے
"موقع ہو گر تو آج، کتب خانہ، دیکھئے

۱۹۸۵ء

(مشرقی بوزلے / عطاءاللہ پالوی، پٹنہ ۱۹۸۵ء)

دکتر محمد حسین تسبیحی (رهآ)

خدابخش نامه

نشان علم و عرفاں شد خدابخش　　سر یر کشور جاں شد خدابخش
کتب خانه از و آباد گشته　　بهارستانِ نیکاں شد خدابخش
حدیث و فقه و حکمت باقراءت　　همه تفسیر قرآں شد خدابخش
بود گنجینۂ اشعار زیبا　　مثال گنج پنهاں شد خدابخش
ببیں آں شاعران صف در صف　　غزل گویان خوباں شد خدابخش
همه آں نسخه های خوب و نایاب　　چو دُرّ بحر عماں شد خدابخش
بود جرنل یکی گنج سخن در　　چو گوهر در بهاراں شد خدابخش
تصاویرش بود خوب و فریبا　　چو خورشید درخشاں شد خدابخش
خطوطِ شاعران و خوشنویساں　　سرای خوشنویساں شد خدابخش
تواریخ دل انگیز و شکوفاں　　سندهای فراواں شد خدابخش
برای خدمتِ مردانِ اسلام　　کمال عشق انساں شد خدابخش
کمربسته به تعلیم و تعلم　　نهال باغِ نعماں شد خدابخش
صفاتِ مردمی رازندگی داد　　محبت را گلستاں شد خدابخش
همه آثار و عرفانِ الٰهی　　خزاین راشبستاں شد خدابخش
گر از یعقوب و یوسف عشق جوئی　　تو گوئی ماه کنعاں شد خدابخش
چو گنج داستاں های ادیباں　　ادب را نکته گویاں شد خدابخش
نشان از گلشنِ حسنِ صداقت　　بهارستان ایماں شد خدابخش
جهانِ عشق و عرفاں را وفا بود　　مسلمان خداداں شد خدابخش
دلش غرقِ محبت های اسلام　　عزیزِ هر مسلماں شد خدابخش
خدا رحمت کند اورا همیشه　　غریقِ لطف رحماں شد خدابخش

وجودِ او سراسر شوقِ عرفاں　　بہ عرفاں روح یزداں شد خدا بخش
کتاب آئینۂ احوالِ انساں　　ہماں آئینِ انساں شد خدا بخش
کتب خانہ بود نور علیٰ نور　　از آں نورِ درخشاں شد خدا بخش
نوادر را ببیں در آں نمایاں　　نوادر را نمایاں شد خدا بخش
ہنر ہای جہانِ پاکِ اسلام　　خزاین را نگہباں شد خدا بخش
بُود عابد رضا بیدار و دانا　　از او چوں گوستاں شد خدا بخش
بہ خلقِ خوش بود چوناں فرشتہ　　بہ پاکی چوں شہیداں شد خدا بخش
بہ تاریخ و ادب یکتا مسلماں　　یکی مہد دبستاں شد خدا بخش
برائی جذبۂ حق و حقیقت　　کلیمِ طورِ عمراں شد خدا بخش
کمالِ مردم دانا در او بود　　سخن گوئی فقیراں شد خدا بخش
زبہر عاشقانِ علم و فرہنگ　　بہ میداں شیر غراں شد خدا بخش
بُود پٹنہ مکانِ علم و ایماں　　چو ہندوستاں صفاہاں شد خدا بخش
نسیم شہر پٹنہ مشک بوشد　　ابو ریحانِ ایراں شد خدا بخش
بُود پٹنہ یکی شہر بزرگاں　　دل و جانِ بزرگاں شد خدا بخش
صبا از کوچۂ پٹنہ گذر کن　　ببیں آنجا غزل خواں شد خدا بخش
الٰہی کن نصیبم تا ببینم　　ہم آنجا کہ شگوفاں شد خدا بخش
سراسر خاکِ ہندوستاں بگردم　　صفای پاکبازاں شد خدا بخش
بہ ہر جای بود آثارِ ایماں　　چو جبرئیل پیکِ شاہاں شد خدا بخش
نگر بر کاروانِ علم و حکمت　　چراغِ راہِ آناں شد خدا بخش
گلستانِ ہمہ عشاقِ دانش　　گلِ خوشبوی نازاں شد خدا بخش
یکی از رازہای عشقِ اللہ　　بدان اللہ گویاں شد خدا بخش
مسیر او بہ سوی درگہِ حق　　بہ آنجانب شتاباں شد خدا بخش
الٰہی در بہشتِ عنبریں باد　　چو طوبیٰ نخلِ ایماں شد خدا بخش

درودِ من بود بر بار گاہش　　مسلمانِ جہانداں شد خدابخش
صبا از من بگو باشہر پٹنہ　　سفیر نوجواناں شد خدابخش
بہ ایراں گشتہ مشہور بزرگان　　بہ کرماں ماہ ماہاں شد خدابخش
تمام مثنوی گویان تاریخ　　اساس قصہ ہاشاں شد خدابخش
اگر از شمس واز رومی بخواہی　　ہمہ شو رنیستاں شد خدابخش
اگر آثارِ سعدی را بجوئی　　حکایاتِ گلستاں شد خدابخش
گلستاں را بداں چوں کاغذ زر　　زر و گوہر بہ داماں شد خدابخش
نصیحت نامۂ سعدی اثر بخش　　سخن ار گنج شاداں شد خدابخش
فراواں جنگِ اشعار و غزل را　　ببیں ہمچوں حدی خواں شد خدابخش
چو از فردوسی و شہنامہ پُرسی　　بداں کاخِ سخنداں شد خدابخش
نظامی آں حکیم خمسۂ عشق　　یکی از خمسہ خواناں شد خدابخش
بود خسرو شہِ موسیقی و شعر　　برای او ثنا خواں شد خدابخش
اثر از ابن سینا گر بجوئی　　شفای جسم و ابداں شد خدابخش
بجو از فخر رازی علم و حکمت　　مباحث را ادب داں شد خدابخش
رباعی ہای خیام و ریاضی　　بداں اختر شناساں شد خدابخش
بہ طب و فلسفہ او را محبت　　طبیب دردمنداں شد خدابخش
خراماں و شتاباں بہر تعلیم　　چو دریای خروشاں شد خدابخش
خوشا آں درگہِ عشاق ہندو　　بہار خوشہ چیناں شد خدابخش
محقق عاشق و یار خدا بخش　　کہ خورشید خراساں شد خدابخش
رہا از عاشقان درگہ او　　کہ غمخوارِ ادیباں شد خدابخش

(خدابخش لائبریری جرنل ۷۵-۷۷، ۱۹۹۲ء)

صابر آروی
پٹنہ

نذرِ خدابخش خاں

سوسال ہوئے اس شہر میں جب اک مرد مجاہد اٹھا تھا
اور علم وادب کی تیغ سے جس نے جہل کے پیکر کاٹے تھے
میدان عمل میں جس نے یہاں نافہمی کے شہپر کاٹے تھے
اس شہر عظیم آباد میں ایسا عابد و زاہد اٹھا تھا

ایوان بنایا اُس نے یہاں، تدریس ،جہاں پروان چڑھے
ہر جام ہو علم ودانش کا، وہ میکدۂ تعلیم دیا
تعمیر ہی جس کا مقصد ہو، وہ سلسلہ تنظیم دیا
ذہنوں کو متاع علم ملے، اندازِ بیاں پروان چڑھے

ایک ایسی فضا قائم کر دی"افکار "جہاں ندرت پائے
"تحقیق "کی شمع نورانی ہر قلب ونظر میں روشن ہو
"تخییل "کی مہکی کلیوں سے مسحور فضائے گلشن ہو
جو علم و ادب کا جویا ہو، بے دام وہ یہ دولت پائے

جتنا بھی کریں ہم فخر ہے کم ،یہ بیش بہا سرمایہ ہے
ہے نام "خدابخش "اس کا جلی، وہ مرکز علم ودانش ہے
ہر ذہن منور اس سے ہوا، ہر فکر و نظر میں تابش ہے
ہم کیوں نہ بچائے رکھیں اسے سو سال میں جو کچھ پایا ہے

اے جانِ بہارِ گلشنِ دل ،ہم تحفۂ الفت لائے ہیں
شاداب رہے آباد رہے ،رندوں سے بھرا یہ میخانہ
دائم رہے بزمِ علم یہاں ،چلتا رہے دورِ پیمانہ
خوشبوئے وفا، خوشبوئے نظر، خوشبوئے عقیدت لائے ہیں

(خدابخش لائبریری جرنل ۱۱۰، ۵؍نومبر ۱۹۹۱ء)



ڈاکٹر غلام مجتبیٰ انصاری
پٹنہ

عالم میں ہے ممتاز کتب خانہ خدا بخش

دنیا میں یگانہ ہے کتب خانہ خدا بخش — مشہور زمانہ ہے کتب خانہ خدا بخش
دانش کا ٹھکانہ ہے کتب خانہ خدا بخش — ملت کا خزانہ ہے کتب خانہ خدا بخش
عالم میں ہے ممتاز کتب خانہ خدا بخش

ہے مخزن اسرار کتب خانہ خدا بخش — تحقیق کا بھنڈار کتب خانہ خدا بخش
دانش کا نگہدار کتب خانہ خدا بخش — فرہنگ کا انبار کتب خانہ خدا بخش
عالم میں ہے ممتاز کتب خانہ خدا بخش

آتے ہیں جہاں بھر سے یہاں اہل ضرورت — تحقیق کی خواہش لیے پروانوں کی صورت
بھر لیتے ہیں دامن میں دُرِ دانش و حکمت — تحصیل کیا کرتے ہیں دستار فضیلت
عالم میں ہے ممتاز کتب خانہ خدا بخش

ہے نسخہ خطّی میں یہ لاثانی و یکتا — مطبوعہ کی رُو سے بھی ہے دنیا میں بے ہمتا
آثار قدیمہ کا ہے سورج یہ چمکتا — دنیا کے نوادر کا ہے معدن یہ دمکتا
عالم میں ہے ممتاز کتب خانہ خدا بخش

بے شک ہے کتابوں سے محبت کی نشانی — مرحوم خدا بخش کی، جن کا نہیں ثانی
اللہ سے کرتا ہے دعا احقر فانی — انوار کی تربت میں رہے ان کی روانی
عالم میں ہے ممتاز کتب خانہ خدا بخش

۱۰/اپریل ۲۰۰۱ء